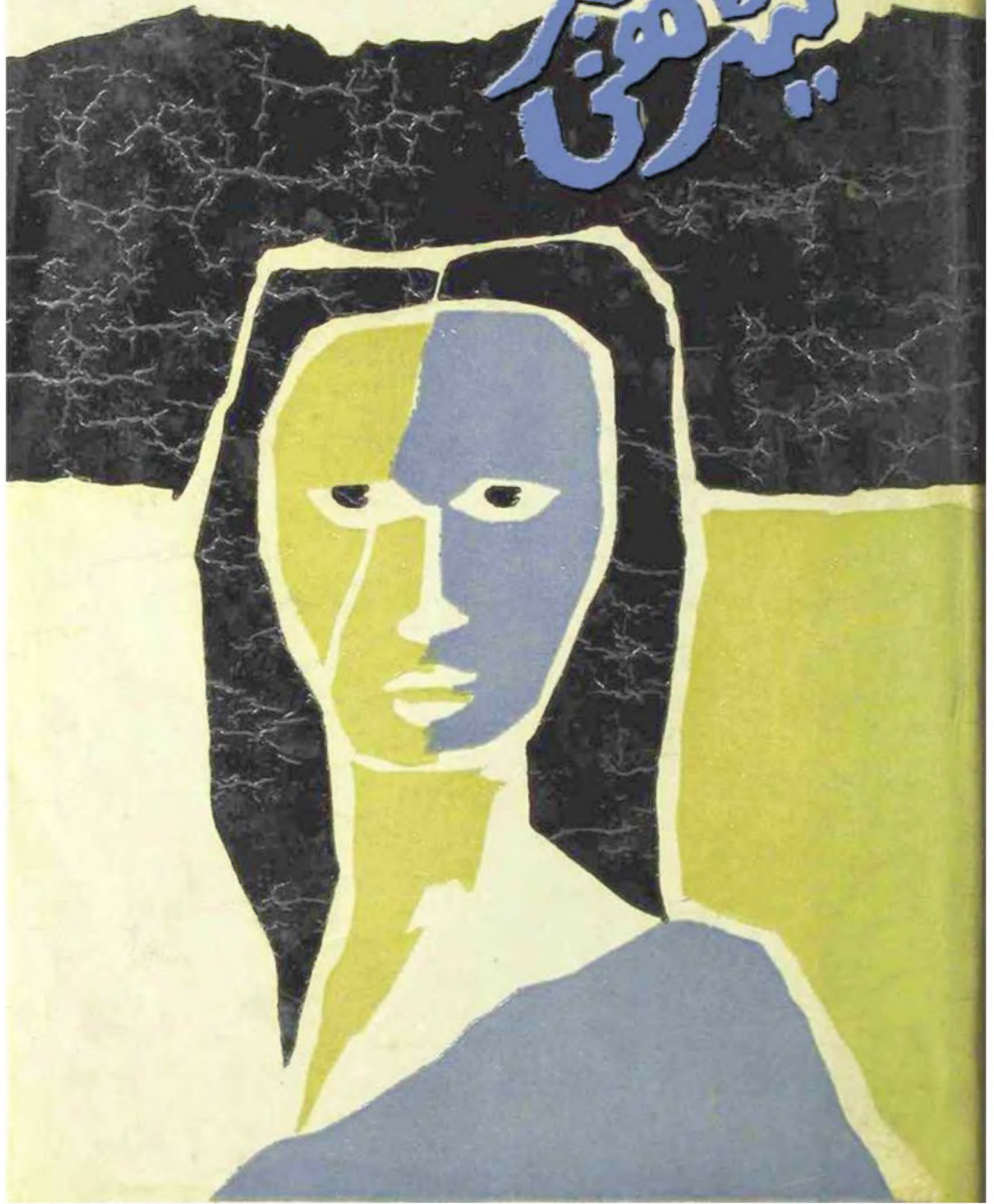
عصمت چغتائی

ٹیڑھی لکیر



عصمت کو سماج سے نہیں شخصیتوں بلکہ اشخاص سے شغف ہے اُن کے جوش و ہوس میں اُن کی تھرتھراہٹ اور کپکپی سے ان کی کشمکش سے عداوت اور فریب کاری سے جو انسان پر جب طاری ہوتی ہے تو جسم تھرکنے لگتا ہے اس کے فن میں خاموش آسودگی یا مسرت عالیہ کہیں نہیں ملے گی۔ بلکہ انسانی خون آپ کو رگوں میں دوڑتا نظر آئے گا جیسے پہاڑی ندی کا پانی دوڑتا ہے۔ لبالب اور ابلتا ہوا ٹکراتا ہوا اور رستہ چیرتا ہوا۔

عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لیے باعثِ فخر ہے انھوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیے ہیں کہ جب تک وہ کھڑی تھیں کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اردو ادب میں جو امتیاز عصمت کو حاصل ہے اُس سے منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا۔

پطرس

ٹیڑھی لکیر پر لوگ کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں لیکن عصمت کی سچائی، جرأت، بے باکی، ناقابلِ تقلید حد تک فنی چابک دستی اور تحریر کی سطر سطر میں جاری و ساری خلوص کی لہروں سے انکار کیجائے خود معترضین کی ذہنی ناپختگی کی دلیل ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ مرض کا علاج چاہنے والے مرض کی تشخیص سے گھبراتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسباب کی اس دنیا میں سیدھے آنکھ چرالیں اور ہولناکی کہہ کر اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیں۔

اکبر علی خاں

قیمت:

اُردو کے زندہ ناولوں کا سلسلہ ۱

ٹیڑھی لکیر

عصمت چغتائی

کتاب کار رام پور، یوپی

اشاعت مئی ۱۹۶۷ء

ٹیڑھی لکیر پہلی بار مئی ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔ زیر نظر ایڈیشن جو اس کا صحیح ترین ایڈیشن ہے۔ اور جس میں عصمت کا پیش لفظ پہلی بار شامل ہوا ہے مئی ۱۹۶۷ء میں چھپ رہا ہے

مطبوعہ دہلی پرنٹنگ پریس رامپور

اُن یتیم بچّوں کے نام

جن کے

والدین بقیدِ حیات ہیں۔

ٹیڑھی لکیر

(ناول)

عصمت چغتائی

پیش لفظ

جب ناول ٹیڑھی لکیر شایع ہوئی تو کچھ لوگوں نے کہا ہم نے ایک جنسی مزاج اور بیمار ذہنیت والی لڑکی کی سرگذشت لکھی ہے۔ علم نفسیات کو پڑھیے تو یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون بیمار ہے اور کون تندرست۔ ایک پارسا ہستی جنسی بیمار ہو سکتی ہے اور ایک آوارہ اور بدچلن انسان صحت مند ہو سکتا ہے۔ جنسی بیمار اور تندرست میں اتنا باریک فاصلہ ہوتا ہے کہ فیصلہ دشوار ہے۔ مگر جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے ٹیڑھی لکیر کی ہیروئن نہ ذہنی بیمار ہے اور نہ جنسی۔ جیسے ہر تندرست انسان کو گندے ماحول اور آس پاس کی غلاظت سے ہیضہ، طاعون ہو سکتا ہے اسی طرح ایک بالکل تندرست ذہنیت کا مالک بچہ بھی اگر غلط ماحول میں پھنس جائے تو بیمار ہو جاتا ہے اور موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

مگر شمن زندہ ہی نہیں ہے جان دار ہے اس پر مختلف حملے ہوتے ہیں لیکن ہر حملے کے بعد وہ پھر ہمت باندھ کر سلامت اٹھ کھڑی ہوتی ہے وہ ہر امتحان سے گزر کر پُرسکون انداز میں اپنا سر تکیے پر ٹکا دیتی ہے اور ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کرنے کے بعد دوسرا قدم اٹھاتی ہے۔ یہ اس کا قصور نہیں ہے کہ وہ بے حد حساس ہے اور ہر چوٹ پر منہ کے بل گرتی ہے مگر پھر سنبھل جاتی ہے۔ نفسیاتی اصولوں سے ٹکرانے کر وہ انہیں جھٹلا دیتی ہے —— ہر طوفان سے گزر جاتی ہے۔

"شمن" کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ کوئی اُسے سمجھ نہیں پاتا وہ پیار محبت اور دوستی کی بھوکی ہے اور انہیں نعمتوں کی تلاش میں بھیانک جنگلوں کی خاک چھانتی ہے۔ اس کا دوسرا عیب ہے —— ضد یا شاید یہی اس کی خوبی ہے ہتھیار ڈال دینا اس کی طبیعت نہیں۔

کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ٹیڑھی لکیر میری آپ بیتی ہے —— مجھے خود یہ آپ بیتی ہی لگتی ہے۔ میں نے اس ناول کو لکھتے وقت بہت کچھ محسوس کیا ہے میں نے شمن کے دل میں اترنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ آنسو بہائے ہیں اور قہقہے لگائے ہیں۔ اس کی کمزوریاں

سے جل بھی اٹھی ہوں، اس کی ہمت کی داد بھی دی ہے۔ اس کی نادانیوں پر رحم بھی آیا ہے۔ اور شرارتوں پر پیار بھی آیا ہے۔ اُس کے عشق و محبت کے کارناموں پر چٹخارے بھی لیے ہیں اور حسرتوں پر دکھ بھی ہوا ہے۔ ایسی حالت میں اگر میں کہوں کہ یہ میری آپ بیتی ہے تو کچھ زیادہ مبالغہ تو نہیں:

اور جگ بیتی اور آپ بیتی میں بھی تو بال برابر کا فرق ہے۔ جگ بیتی اگر اپنے آپ بیتی محسوس نہ کی ہو تو وہ انسان ہی کیا؟ اور بغیر پرائی زندگی کو اپنائے ہوئے کوئی کیسے لکھ سکتا ہے۔

شمن کی کہانی کسی ایک لڑکی کی کہانی نہیں ہے یہ ہزاروں لڑکیوں کی کہانی ہے۔ اُس دور کی لڑکیوں کی کہانی ہے جب وہ پابندیوں اور آزادی کے بیچ ایک خلا میں لٹک رہی ہیں اور میں نے ایمانداری سے اُن کی تصویر اِن صفحات میں کھینچ دی ہے تاکہ آنے والی لڑکیاں اس سے ملاقات کر سکیں اور سمجھ سکیں کہ ایک لکیر کیوں ٹیڑھی ہوتی ہے۔ اور کیوں سیدھی ہو جاتی ہے۔ اور اپنی بچیوں کے راستے کو الجھانے کے بجائے سلجھا سکیں۔ اور بجائے تنبیہ الغافلین کے اپنی بیٹیوں کی دوست اور رہنما بن سکیں۔

بمبئی

عصمت چغتائی

ٹیڑھی لکیر

(ناول)

عصمت چغتائی

پہلی منزل

1

وہ پیدا ہی بہت بے موقع ہوئی۔ بڑی آپا کی چہیتی سہیلی سلمیٰ کی شادی تھی اور وہ بیٹھی چھپا چھپ سرمئی کریپ کے دوپٹے پر لچکا ٹانک رہی تھی۔ اماں اتنے بچے جننے کے بعد بھی ننھی ہی بنی ہوئی تھیں۔ بیٹھی جھانوے سے ایڑیوں کی مردہ کھال گھس گھس کر اتار رہی تھیں کہ ایکا ایکی گھٹا جھوم کر گھر آئی اور وہ دُہائی ڈالی کہ حکیم کو بلانے کا سارا ارمان دل کا دل ہی میں رہا اور وہ آن دھمکی۔ دنیا میں آتے ہی بغیر گلے میں گھانٹی کیے ایسا دہاڑی کہ توبہ بھلی۔

نو بچوں کے بعد ایک کا اضافہ، جیسے گھڑی کی سوئی ایک دم آگے بڑھ گئی اور دس بج گئے۔ کیسی شادی اور کس کا بیاہ، حکم ملا ننھی سی بہن کے نہلانے کے لیے گرم پانی تیار کر دیا۔ پانی سے زیادہ کھولتے آنسو بہاتی آپا نے کوستے ہوئے چولھے پر پتیلی چڑھا دی، پانی بھی مذاق میں ذرا سا چھلک گیا اور سارا ہاتھ اُبل کر رہ گیا۔

"خدا غارت کرے اس منّی سی بہن کو، اماں کی کوکھ کیوں نہیں بند ہو جاتی۔"

حد ہو گئی تھی! بہن بھائی اور پھر بہن بھائی! بس معلوم ہوتا تھا بھک منگوں نے گھر دیکھ لیا ہے! اُمڈے چلے آتے ہیں۔ ویسے ہی کیا کم موجود تھے جو اور پے در پے آ رہے تھے، کتے بلیوں کی طرح 'ازل کے مر بھکے' اناج کے کھن ٹوٹے پڑتے ہیں۔ دو بھینسوں کا دودھ تبرک ہو جاتا پھر بھی اُن کے تندور ٹھنڈے ہی پڑے رہتے۔

اور یہ سب ابّا کا قصور تھا، کیا مجال جو اماں دودھ پلا جائیں۔ اِدھر بچّہ پیدا ہوا اُدھر آگرے سے گوالن بلوائی، وہ دودھ پلائے اور بیگم کی پٹی سے پٹی جڑی رہے۔ پھر بھلا بچّے کیوں سانس لیتے۔ گھر کیا تھا جیسے گائے بیلوں کا باڑہ۔ کھانا ہے تو پتیلیوں، پینا ہے تو گھڑوں، سوتا ہے تو گھر کا کونا کونا زندگی سے لبریز چھلکنے کو تیار۔

اور یہ پیٹ کی کھرچن کالی پیلی دھنیا سی ناک، چیاں سی آنکھیں، چڑیا سے زیادہ تیز۔ بڑی آپا اور منجھو دونوں نے کئی دفعہ اس کے چوہے کے بچے جیسے منہ کو مسکراتے ہوئے دیکھا

گویا وہ انھیں چھیڑنے کو مسکرا رہی ہے وہ خوب سمجھتی تھی کہ یہ اس کی زرخرید لونڈیوں کی طرح خدمت کریں گی۔ امّاں کو کیا کم فکر ہو رہی ہوگی۔ آخر یہ اتنی ڈھیر سی لڑکیوں کا نصیبہ کہاں کھلے گا۔ مانا کہ روپیہ بھی ہے اور لڑکی کو دکھانے کا فیشن نہیں پھر بھی کہاں تک ٹالنے ڈالے جائیں گے کیا ہوگا؟

نہ اس کا پیٹ پھولا نہ بیمار ہوئی اور روز بروز پھول کر کُپّا ہوتی گئی۔ دو ایک بھائی بہنوں تک تو ذرا چاؤ چونچلے کیے پر اب بڑی آپا کا بھی جی بھر چکا تھا اور وہ بیزار تھی خیر انّا موجود تھی اور وہ پل رہی تھی۔

انّا بالکل جوان تھی سولہ سترہ برس کی۔ تبھی تو راتوں کو وہ گھنٹوں غلاظت میں لتھڑی پڑی رہتی اور اس کی آنکھ بھی نہ کھلتی۔ انّا کو جگانا کوئی آسان کام نہ تھا مگر دودھ خوب ہوتا تھا۔ دوسرے انّا کا عاشق جب اُسے کندھے پر بٹھا کر گھوڑے کی طرح دوڑتا تو وہ سب دُکھ درد بھول کر کلکاریاں مارنے لگتی۔ وہ تینوں گھر والوں کی آنکھ بچا کر بھینسوں کے بھوسے والی کوٹھری میں دُبک رہتے انّا بھوسے پر لوٹیں لگاتی اور اس کا عاشق اس کے پیچھے پیچھے لڑھکتا تب وہ بھی تالیاں بجا بجا کر گھٹنیوں دوڑتی مگر جب وہ انّا سے لڑنا شروع کرتا تو وہ منہ بسور کر اپنا نچلا ہونٹ آگے پھیلا دیتی۔ اُسے لڑائی سے سخت پریشانی ہوتی تھی جب وہ گتھے آپس میں بھاؤں بھاؤں کرکے لپٹ جاتے تو اس کا سارا جسم خوف سے لرزنے لگتا اور وہ بے طرح بلبلانے لگتی یہاں تک کہ وہ بھی پریشان ہو کر علیحدہ ہو جاتے۔ جب تک وہ جاگتی رہتی انّا کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ یونہی اگر اُسے چھیڑنے کو انّا کا عاشق اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتا "انّا ہماری ہے" تو وہ فوراً صدائے احتجاج بلند کرتی اور اُسے چھوڑنا پڑتا۔

مگر اُسے اپنی اس سینہ زوری کا جلد ہی خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ایک دن جب وہ تینوں حسب معمول خشک پیال پر لوٹیں لگا رہے تھے تو نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اور وہ اپنی ننھی سی دُنیا کے معصوم خوابوں میں کھو گئی ——— آگے پیچھے، دائیں بائیں انّائیں ہی انّائیں بکھری ہوئی تھیں۔ خوشی سے دیوانی ہو کر ایک گود سے دوسری گود میں ٹُھمک ٹُھمک کر لپکنے لگی۔ مگر پھر اچانک دیکھا، یکایک ساری انّائیں کہیں غائب ہو گئیں۔ اس کا جی گھبرا گیا۔ نہ یہی گُتّیا کی طرح منہ کھول کر

وہ ڈھونڈنے لگی ـــــــ اُس نے پا لیا۔ پیال کے ایک کونے میں اس کی نرم گرم انّا پکے آم کی طرح گول مٹول سی ہو رہی تھی۔ گوں گوں کر کے وہ اُس میں گھسنے لگی اس کے ہونٹ جلنے لگے اور حلق کی رگیں پھڑک اٹھیں گویا دودھ کے گھونٹ حلق میں ہوتے ہوئے پیٹ میں جا رہے ہوں۔ اُسے اچھوسا لگ گیا۔ کچھ پکڑنے کے لیے اُس نے اپنے موٹے موٹے ہاتھ بڑھائے مگر ایک بھیانک بلا نے اُسے دور جھٹک کر انّا کو دبوچ لیا اور جھنجھوڑنا شروع کیا۔ حلق پھاڑ کر وہ دہاڑی جیسے اُسے سانپوں نے ڈس لیا ہو۔ اس کی معصوم آنکھیں اس کریہہ منظر کو دیکھ کر پتھرا گئیں۔ اس کی ننھی منی چیخیں سن کر باہر سے بھشتی، بھنگی اور باورچی دوڑ پڑے اور ملزم گرفتار ہو گئے۔

بسور بسور کر وہ انّا کے پیارے مکھڑے کو تکتی گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہی ہو "چوٹ تو نہیں لگی؟ ـــــــ میں نے تمہیں بچا لیا نا؟" مگر انّا آج کچھ بے مزہ سی تھی اور اس کی شرارتوں پر بجائے پیار سے ہنسنے کے رکھائی سے جھٹک رہی تھی۔ اپنے تمام معصوم اور کمزور حربے اس نے انّا کو منانے کے لیے کر ڈالے مگر وہ اُسے ہنسا نہ سکی۔ کاش وہ پوچھ سکتی کہ وہ کیوں روٹھی ہوئی تھی۔ مگر آج تو انّا نے اس کی آنکھوں کی زبان سمجھنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

اسی دن شام کی گاڑی سے اس کی انّا کو آگرے واپس بھیج دیا گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ یتیم ہو گئی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ کئی دن اور کئی رات روتی رہی۔ سارا گھر اس کے چاروں طرف جمع ہو گیا مگر اُسے چین نہ پڑا۔ وہ گرم گرم انّا جس کے سینے سے چمٹ کر بالکل ماں کے پیٹ میں سونے کا مزہ آتا تھا بھلا وہ اب کہاں مل سکتی تھی۔ اُسے وہ بوتل دیکھ کر ہی صدمے کا دورہ پڑ جاتا تھا جس سے اُسے دودھ پلانے کی کوشش کی گئی۔ بھلا کہاں وہ سانولی سلونی گدگدی انّا اور کہاں شیشے کی ذلیل بوتل مگر پیٹ کی آگ نے اُسے سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور کر دیا۔ منجھو بی نے جب اُسے گود میں لے کر بوتل پلائی اور چند قطرے بھول سے اس کے حلق میں چلے گئے تو وہ خاموش ہو گئی۔ پھر بھی ایک دم سے وہ بوتل کو چھوڑ کر جلدی سے منجھو سے چمٹ جاتی اور پلّے کی طرح اُس کے کپڑوں میں اپنی انّا کو ڈھونڈنے لگتی

منجھو گھبرا کر اُسے دور لٹا دیتی اور بڑی آپا سے شکایت کرتی کہ وہ اس کے بے طرح گد گدیاں کرتی ہے۔

تجربے نے اُسے بہت کچھ سکھا دیا اور بالکل جیسے گائے بیل چارہ کھاتے ہیں دودھ زہر مار کر لیتی مگر اس کے ہاتھ جھٹکتے ہی رہتے۔ بوتل کی چکنی چکنی سطح پر وہ پیار سے اپنی ہتھیلیاں چپکا کر اُسے کلیجے سے بھینچ لیتی شروع شروع میں تو دودھ پیتے پیتے ایک دم اُسے اناکی آنکھیں اس کی ناک کی ننھی سی بالی اور کان کی لونگیں یاد آجاتیں اس کا دل بھر آتا اور وہ تھوڑی دیر کو چسنی چھوڑ کر دردناک آوازیں رونے لگتی مگر پیٹ کی پکار اُسے چوکنا کرتی اور وہ خاموش ہو جاتی۔

جب سے انا چھن گئی تھی منجھو نے اُسے لے لیا تھا پتہ نہیں منجھو کو اس پر کیوں پیار آ گیا۔ شاید جس دن اس نے اس کے کپڑوں میں انا کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی اسی دن سے منجھو کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔ بوتل سے دودھ پلا کر منجھو اُسے سینے سے چپکا لیتی۔ اور پلنگڑی پر لیٹ جاتی ورنہ اُسے نیند ہی نہ آتی۔ منجھو کے پہلو میں اُسے کچھ کچھ انا کی گرمی مل جاتی اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے منجھو کی گردن اور گال سہلایا کرتی جس کا منجھو بالکل بُرا نہ مانتی۔

پھر ایک دن جب منجھو نہا رہی تھی تو وہ اندر گھسی چلی گئی "ارے آپا اسے پکڑو" منجھو لرز کر چلائی۔

"اوئی وہ کیا سمجھے اتنی ذرا سی تو ہے" مگر اس نے منجھو کو ایسی بُری طرح سے گھورا کہ وہ شرما گئی وہ سکتے کے عالم میں اُسے گھورتی رہی۔ "چل یہاں سے" منجھو نے لوٹے کی آڑ لے کر اُسے ڈانٹا۔ مگر وہ تو جیسے مقناطیسی طاقت سے اس کی طرف کھنچنے لگی۔ منجھو نے خوف زدہ ہو کر اُسے پھر دھتکارا اور جب وہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے مسکرا مسکرا کر اُسے معنی خیز نظروں سے تاکتی بڑھے ہی چلی گئی تو اس نے چلو بھر پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹا مارا۔

پانی کی مار سے ٹھٹک کر زور سے رو پڑی اور سسکیاں بھرتی ہوئی باہر رینگ آئی اس دن اس نے نہ ہی جی بھر کے دودھ پیا اور نہ ہی ہنسی بولی وہ منجھو کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھتی گویا اس نے اس کے ساتھ کوئی زبردست بے ایمانی کی ہے۔ اور پھوٹ کر

رو پڑی۔

جب منجھو نے اُسے پہلو میں لٹا کر رضائی اوڑھا دی تو وہ خلافِ معمول خاموش اُسے گھورنے لگی۔

"کیا ہے؟" منجھو نے پیار سے پوچھا اور وہ حسرت سے مسکرا پڑی۔ آہستہ سے اُس نے اُس کی گردن پر اپنی انگلیوں سے کھجانا شروع کیا اور آنکھیں گڑوئے اُس کے تل کو دیکھتی رہی جو بائیں گال پر چمک رہا تھا۔

"نہیں بُری بات!" منجھو نے اس کا بھٹکتا ہوا ہاتھ اٹھا کر پہلو میں رکھ دیا۔ وہ بسورنے لگی اور ایسی التجا بھری نظروں سے دیکھا کہ منجھو پسیج گئی۔ اس کا ہاتھ اٹھا کر گردن میں ڈال لیا اور کلیجے سے لگا کر سو گئی۔

منجھو نے اُس کے لیے پھول جیسی فراکیں اور ٹوپیاں سیں۔ گھڑی گھڑی نہلایا جا رہا ہے۔ سُرمے، کاجل اور مسّی سے لیس وہ اپنی ساری گتیں خاموش بیٹھی ہوا کرتی مگر کیا مجال جو کوئی اُسے ہاتھ بھی لگا جائے منجھو سے تو آنکھوں میں صابن بھی لگ جاتا تب بھی وہ کچھ یونہی سا بسور کر چپ ہو جاتی۔ منجھو آخر کو منجھو ہی تھی۔

مگر جوں جوں بڑھتی گئی وہ منجھو کی صفائی سے عاجز آ گئی۔ وہ اُسے سجا بنا کر نادر شاہی حکم صادر کر دیتی کہ ایک بال بھی اِدھر سے اُدھر ہوا اور موت آئی۔ پر یہ اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ چلتی ہوئی ٹانگوں اور ہاتھوں کو روکنا اس کے قابو میں نہ تھا۔ تھوڑی دیر تو وہ کلیجے پر صبر کی سِل رکھے بیٹھی رہتی۔ مگر جونہی منجھو کی آنکھ بچتی وہ باہر کھسک جاتی اور پھر شام کو جو وہ قدم رکھتی تو یہ معلوم ہوتا کوئی دیوانی کتیا کیچڑ کی کونڈی میں لوٹ کر آئی ہے۔ غبارہ جیسی فراک، جانو سُٹے ہوئے چوہے کی کھال اور اس پر باریک باریک دھول کی افشاں چھڑکی ہوئی۔ سر، بال اور آنکھیں دھول میں اٹی ہوئی۔ دونوں نتھنے غلاظت سے لیپے تھپے ایسے جیسے سیمنٹ سے دروازے چُنے ہوئے ہوں۔ جامنوں، امرودوں، بیروں اور آموں کا بحسبِ موسم جو پھل موجود ہوتے اُن کا پلستر کیا ہوا اور رادیے سے طاعونی چوہے جیسی بو!

سب سے پہلا کام منجھو کی یہ کرتیں کہ گھونسوں، تھپڑوں اور چانٹوں سے جتنی دھول جھڑ سکتی

جھاڑ دیتیں۔ وہ زور سے بھینس کے پڈے کی طرح ڈکراتی ...... پلکوں کی ریت آنسوؤں سے دھل جاتی اور کھار کی وجہ سے دونوں نتھنے سٹ سے کھل جاتے جیسے اٹی ہوئی نالی میں تیزاب ڈال دیا ہو پھر گھونسوں اور گرجدار دھموکوں کے شادیانوں کے ساتھ غسل صحت شروع ہوتا پھر صاف ستھرا فراک پہن کر وہ اپنی غلطی کو بڑی تیزی سے محسوس کرتی اور پچھلے گناہوں سے تائب ہو کر آئندہ نیک چلنی کا ارادہ باندھتی۔ وہ پختہ فیصلہ کر لیتی کہ اب کیچڑ اور مٹی سے تو کوئی واسطہ نہ رکھے گی۔ دھول میں لوٹنا تو قطعی بند۔ اس وقت اس کے چہرے پر تارک الدنیا سادھو کا سا استقلال چھا جاتا جو اپنے جسم کے کسی عضو کو معطل کر لینے کا قصد کر چکا ہو چپل جیسی چولتی آنکھیں کبوتر کی طرح معصوم ہو کر انگھنے لگتیں۔

مگر زمانہ سازگار نہ تھا دوسرے دن جب عین اسی وقت اسی عبرت ناک حالت میں ایک بدمست شرابی کی طرح جھومتی دھول کی افشاں میں جگمگاتی نظر آتی تو دیکھنے والوں کو سخت عبرت ہوتی اور جب دھول جھڑتی تو زمین و آسمان کانپ اٹھتے۔

وہ پھر توبہ کرتی حلف اٹھاتی .... مگر سب بھول جانے کے لیے شیطان اسے پھر ورغلاتا۔ جونہی وہ سج دھج کر باہر نکلتی جملہ عناصر کو اس کے صاف کپڑوں سے بیر ہو جاتا۔ کھیتوں کی سانولی سانولی کیچ تال کے کنارے کی سرگوشیاں کرتی ہوئی ریت اسے پھسلاتی اصطبل کی بھیگی بھیگی مہکتی ہوئی گھاس آغوش پھیلا کر اس کے پیچھے دوڑتی۔ مرغیوں کا متعفن اور غلیظ ڈربا اسے پھولوں سے لدی سیج کی طرح اپنی طرف کھینچتا ...... وہ سب کچھ بھول جاتی اپنے ضمیر سے وہ قسم جو بار ہا کھائی تھی منجو سے وعدہ اور خود اس کی اپنی خودداری جسے روز روز کی دھول جھڑائی چکنا چور کیے دیتی تھی ......

...... وہ ان بے پناہ شیطانی رعنائیوں سے بچنے کے لیے بہت مضمحل ہو جاتی مگر پھر وہ پکار پکار کر بلاتیں تو وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اس ابدی گناہ کے غار میں جا گرتی جس کی پاداش میں وہ روز دکھ جھیلا کرتی تھی۔

تھوڑی سی دیر میں وہ لہو و لعب میں غرق نظر آتی۔ کیچڑ کے ریشمی لڈو، بھوری

بھوری بھنی ہوئی سوجی جیسی ریت کی ننھی ننھی ڈھیریاں ..... گھوڑے کی گھاس سے بنائی ہوئی چھوٹی سی جھاڑو، مرغی کے دُم کے جھڑے ہوئے پر اور بنیا اس کی عزیز ترین سہیلی، بھنگن کی لڑکی، منجھو کے بعد دنیا میں یہی بنیا تھی۔ وہ دونوں بھینس کے تھان کے پیچھے جا کر ایک دوسرے کے گلوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلا کرتیں پھر ریت میں بیلنوں کی طرح گول گول ڈھیں لگاتیں، مٹھیاں بھر بھر کے ریت پانی کے چلوؤں کی طرح اچھالتیں یہاں تک کہ وہ بالکل مٹی کی بدہیئت مورتیاں معلوم ہونے لگتیں ان کی رگ رگ میں ریت رینگنے لگتی پھر بھی اُن کے جی مٹی سے نہ بھرتے اور وہ سوکھے ہوئے پتوں کے چمچے بنا کر ریت پھانکنا شروع کر دیتیں جس سے بھر بھری ریت وہ مزیدار پنجیری کی طرح کھا جاتیں پیٹ والیوں کی طرح انھیں سوندھی سوندھی مٹی بہت ہی بھاتی تھی نہ جانے ان کے پھولے ہوئے کچرلیوں جیسے پیٹوں میں کون سے سپوت پروان چڑھ رہے تھے۔

ان کی حالت بھی کچھ حاملہ عورتوں جیسی تھی چکنی سرمئی رنگتیں پیلی پڑ گئی تھیں۔ ان کی زبانوں پر سفید پھپھوندی لگ گئی تھی آنکھوں میں بھورے بھورے ڈورے پڑ گئے تھے۔ بنیا کا ازار بند اتنا چھوٹا ہو گیا تھا کہ اس کی گھگریا میں آگے طاقچہ کھلا رہتا تھا اور روز بروز سستی بڑھتی جا رہی تھی منہ کا مزا خراب رہتا تھا۔ لڑائی میں انھوں نے دانتوں اور ناخونوں کا استعمال ضرورت سے زیادہ کر دیا تھا چھن چھن وہ ہر وقت تنتناتی ہی رہتیں جیسے کسی نے بھتنی کو ڈبے میں قید کر دیا ہو۔ اس لیے سب نے اس کا نام بھتنی رکھ دیا۔

جب سب اُسے چھیڑنے کے لیے "بھتنی بھتنی" کہتے تو وہ واقعی چڑیلوں کی طرح آنکھیں نکال کر غراتی۔ بلی کی طرح وہ دشمن پر جھپٹا مارتی اور جہاں جہاں اس کا ناخون لگتا کھال ہی اتری چلی آتی جب وہ دانتوں سے کسی کی بوٹی چباتی تو اوپر نیچے کے دانت گوشت میں آر پار ہو کر آپس میں بج اٹھتے۔

وہ سپوت جو اس کے پیٹ میں پل رہا تھا اس کی سوندھی مٹی کے شوق کو بڑھاتا ہی گیا اس کی زبان پر نمک مرچ چھڑکا گیا پھر کونین لگائی گئی مگر کسی سزا سے بھی مٹی کی چاٹ نہ گئی کسی نے رائے دی "چڑیل کی زبان جلا دو" کسی نے ترکیب بتائی "سوئیاں چبھو دو

کمبخت کہے" مگر کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ جب وہ مٹی کھاتی پکڑی جاتی تو منجھو اس کے منہ ہی منہ پر طمانچے مارتی کہ ہونٹ کٹ کر خون نکل آتا مگر وہ کچھ نہیں تو کوئلے ہی چبا جاتی، دیوار پر سے چونا ہی ناخنوں سے کھرچ کر کھا لیتی۔

ایک دن جب وہ اور پینیا رفع حاجت کی غرض سے پاس پاس بیٹھی گئیں ہانک پیدا ہی کہ وہ سیوت وارد ہو گیا......... ایک دل دوز چیخ کے ساتھ وہ منجھو کے پاس رہی۔

"سانپ" اس نے منجھو کی ٹانگوں میں اپنا منہ چھپایا۔ منجھو نے اُسے پرے دھکیل دیا۔ تحقیقات کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کے پیٹ میں کیچوے پڑ گئے ہیں لیکن اُسے یقین نہ آیا اور رات بھر وہ "سانپ۔ سانپ" چلاتی رہی۔ پورے وقت اُسے پیٹ میں سانپ لہراتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے، سانپوں کے گچھے کے گچھے جیسے سپیرے کی ٹوکری میں کلبلاتے ہیں، اس کے پیٹ میں اودھم مچا رہے تھے۔ ایک کے پیچھے دوسرا اور دوسرے کے پیچھے تیسرا ہزاروں سانپ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

اس دن سے اس نے پینیا کے ساتھ سوکھے ہوئے پتوں کے چمچوں میں بھر بھر کر مٹی کھانا چھوڑ دی۔ للچائی ہوئی نظروں سے وہ ریت کے ذروں کو گھورتی اور ایک دم وہ تڑپ تڑپ کر سانپوں کے پھن بن جاتے جو لپ لپ اپنی زبانیں نکال کر آنکھیں مٹکانے لگتے۔ مٹھی میں لے کر وہ ریت کو پیار سے سہلاتی۔ جی چاہتا بھر بھر مٹھیاں کھانا شروع کر دے اور ساری دنیا کی مٹی کو اپنی زبان کے نیچے تھوک میں رول ڈالے اور پھر پلپلا دلدلیا سا اس کے حلق کے نیچے پھسلتا چلا جائے۔ مگر فوراً ہی اس کے پیٹ میں سانپ انگڑائیاں لینے لگتے۔ ایک دم دیوانوں کی طرح وہ ریت اچھالنا شروع کر دیتی، زمین پر لوٹ جاتی اور ٹھنڈی ٹھنڈی مٹی پر اپنے گال رگڑتی۔ اس کے جسم کی رگیں ایک جنبش کی طرح تن جاتیں اور وہ چاہتی کہ زمین کے کلیجے میں گھس جائے۔ جب ذرا جوش ٹھنڈا ہو جاتا تو آہستہ آہستہ وہ اپنا ماتھا زمین سے کھٹ کھٹ ٹکراتی۔

"دروازہ کھولو!" اس کا ماتھا التجا کرتا مگر زمین اسی طرح ڈھیٹ بنی پڑی رہتی۔ اُسے زمین سے کیوں اتنا پیار تھا وہ اس میں سما جانا چاہتی۔ پھر اگر کوئی دیکھ لیتا تو وہ ساری

ریت جھاڑ دی جاتی۔ مگر جہاں موقع ملتا وہ مٹی میں جذب ہونے کی کوشش کرتی۔
"خاک میں ملے کمبخت، جتنی دفعہ نہلاؤ اتنی دفعہ گندی!" منجھو کہتی اور وہ سوچتی کاش کوئی جانتا کہ خاک میں ملنا اس کے لیے کوسنا نہیں بلکہ دعا تھی۔ یہی تو اس کی آرزو تھی۔

۲

لوگوں کو شادی بیاہ کا ارمان ہوتا ہے مگر شمی کو کچھ دن سے کسی کو مارنے کا ارمان ہو گیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس کا جی پھڑ پھڑانے لگتا کہ وہ کسی کو مارے۔ اپنے موٹے سے گھونسے سے گھما کر کسی کو پیچک کر رکھ دے۔ بارہا ایسا ہوا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے۔ ویسے اس کی آنکھیں دانہ کھاتی ہوئی مرغی کی دُم پر جمی ہوئی ہیں۔ جہاں سوکھی ہوئی بیٹ کا ننھا سا قمقمہ اس کی ہر جنبش پر لرزنے لگتا ہے یا اس ننھی سی چوہیا کی طرف جو صبح سے تین بار سہمی ہوئی نظروں سے صندوق کے پیچھے سے جھانک چکی ہے یا وہ کسی اور چیز کو گھور رہی ہے کہ ایک دم سے اُسے مارنے کا شوق چرّا آتا۔ گھر میں ایسا دیا لو کون تھا جو اس سے پٹ لیتا۔ منجھو کیا مزے سے جب چاہتی دھم سے اس کی کمر پر گھونسا جما دیتی۔ اس کا بھی جی چاہتا کہ ایک دن وہ بھی منجھو بی کی ٹھوس سی کمر پر ایک تگڑا سا گھونسا جمائے ...... پھر مجبوراً ہی وہ منجھو ڈا کو پیٹنے لگتی۔ دو تھپڑ گال پر مار کر اس کے کپڑے اتار لیتی اور نہلانے لگتی۔ اس وقت اُسے بہت سے بچپن کی بی بی اتا کا دھندلا سا خاکہ یاد آجاتا اور اس کا جی بھر آتا اور غصہ چڑھتا اور منجھو کے سر پر سینگ اُگ آتے، خوب ہنستے زور زور سے چھانوے سے اس کی کھیلیاں اور نٹ پٹ تولیے کو اتنا رگڑتی کہ گڑیا کی گال ترچھا اور ناک لال چقندر ہو جاتی۔ ایک کان کی لو ٹوٹ کر تولیے ہی میں الجھ آتی۔ پھر وہ اسے ایک عمدہ سی فراک پہنا کر کہتی۔

"خبردار جو ملی، ٹانگیں توڑ ڈالوں گی"

مگر جب وہ تخیل کی دنیا سے جاگ کر واپس آتی تو دیکھتی کہ کچھ بھی نہیں اس کے دونوں ہاتھ چھپکلی کی طرح گود میں اکڑے ہوئے ہیں یا گردن کی رگیں تنے تنے دُکھ گئی ہیں......

وہ ایک انتہائی گہرا لمبا سانس کھینچ کر جسم کو اور تان لیتی اور ایک دم پاگلوں کی طرح زور زور سے بستر پر گھونسوں کی بارش کر دیتی۔ جب وہ جی بھر کر کوٹ چکتی تو تھک جاتی، جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتی اور بڑا ہی سکون ملتا۔

ایک دن اُسے بیٹھے بیٹھے اپنی گڑیا کو مارنے کا دورہ پڑا پہلے تو اس نے اس کے ہونٹے ہونٹے دو تین پی طمانچے مارے پھر ایک دم اس پر بھوت سوار ہو گیا۔ دھڑا دھڑ اس نے گھونسوں اور لاتوں کی بوچھاڑ کر دی۔ دانتوں اور ناخونوں سے اس کے پُرزے کر دیے گویا وہ اپنے کسی خوفناک دشمن سے لڑ رہی ہو۔

گڑیا کا چُورا چُورا ہو گیا۔ اس کے جسم میں بھرا ہوا بُرادہ بکھر گیا اور کچھ شمن کی زبان پر چپک گیا۔ اس کے بعد اس کا پیٹ بھر گیا اور وہ اطمینان کا سانس لے کر تھکتی ہوئی چت پڑ گئی۔ بُرادے کا مزہ بڑی دیر تک اس کی زبان پر باسی خون کی طرح جما رہا۔

پھر ایک دم اُس پر خوف طاری ہو گیا جیسے اس نے سچ مچ کسی کو قتل کر ڈالا ہو ڈر کر وہ گھگیانے لگی اور جلدی جلدی گڑیا کے پُرزے صندوق کے نیچے چھپا دیے۔ وہ منجھو بی کی طرف پناہ لینے کے لیے بھاگی۔ منجھو بے خبر بیٹھی اپنا کُرتا سی رہی تھی اس کی ران سے لگ کر لیٹ گئی اور اس کی گردن پر اپنی سہمی ہوئی انگلیاں پھیرنے لگی۔

منجھو بی فراکیں سینا ہی نہیں جانتی تھی بلکہ ایک دن اس نے ایک الف ب کا قاعدہ منگا کر مشین سے سی ڈالا شمن اس منجھی مشین کے دانتوں کو کٹ کٹ کا غذ چباتے دیکھتی رہی دانتوں میں ہلکی سی لطیف کھجلی ہونے لگی۔ ان دانتوں پر انگلی پھیر کر عجیب سی لہر اپنے جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس کی قاعدہ سی کر منجھو نے اُسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔

"آج سے تم پڑھنا شروع کرو گی، اچھا!"

"اچھا!" شمن نے مان لیا اور قاعدہ دیکھنے کے لیے اُچکنے لگی یہ پہلی یا دوسری کتاب اس کی زندگی میں داخل ہو رہی تھی ایک تو وہ جسے پڑھتے میں پریشان کرنے پر منجھو بی اُسے مار دیا کرتی تھی۔ ویسے گھر میں پڑھنے لکھنے کا سارا دل چسپ سامان اس کی پہنچ سے دور رکھا جاتا تھا۔ مارنے کے کام کا تو تھا نہیں یہ قاعدہ اس سے بہتر تو وہ اخبار ہوتا تھا جس سے ابا لفافہ سا بنا کر بیاز میں ابا کے سر پر مارا کرتے تھے۔

"دیکھیں۔ دیکھیں منجھو بی" اس نے کتاب لے کر دیکھنا شروع کی۔ پھر ذرا سی دیر میں اس کی پھکنی سی بنا کر منجھو کے سینے پر ماری۔

"اسے لگ ہی تمام موڑ کر رکھ دی" منجھو نے اس سے قاعدہ لے لیا۔
"دیکھو یہ الف ہے۔ الف"
"کالی؟" اسے بالکل یقین نہ آیا۔
"یہ ...... یہ الف سے انار۔"
"اہا ہاں، الف سے انار کالا ہوتا ہے۔ انار تو آتش بازی میں چھوٹتا ہے، ذرا ذرا ہلیا تا؟"
"ہٹ، یہ دیکھ، یہ الف ہے الف سے انار ...... کہو الف سے انار"
"کہو الف"
"بولا کہو ...... الف!"
"نہیں ہم نہیں کہتے، پہلے یہ بتاؤ یہ کیا ہے ...... یہ، یہ"
"یہ جیم ہے"
"اور یہ؟"
"یہ ص ض"
"اونہوں ص ض نہیں ہیں یہ تو چائے دانیاں ہیں"
"چل پگلی یہ دیکھو الف سے انار ۔۔۔ کہو"
"کہو؟" وہ بے وقوفوں کی طرح منجھو کا منہ تکنے لگی۔
"ارے میں کہتی ہوں الف کہو" صبر کا پیمانہ چھلکا
"الف کہو"
"اونہہ چڑیل" منجھو نے دھکا دے کر اسے اپنی گود سے انڈیل دیا اور اٹھ کر برآمدے میں چلی گئی شمن نے قاعدہ اٹھا لیا۔ بالکل سوڑ کمبخت سوڑ تھا قاعدہ، کالی کالی ٹیڑھی تصویریں سوائے لوٹے کی شکل کے "ص ض" کے اسے کچھ نہ بھایا اور جیم کو تو وہ دیکھ کر جل ہی گئی کس قدر اترائی ہوئی بہتراتی کی شکل کی تھی! توبہ! ......
الف سے انار! ...... ہُنھ بھلا کیسے؟ پٹکے کی شکل کا انار نہ لال لال چنگاریاں نہ کچھ...

.... بالکل ردّی۔ خیر الف تو وہ پڑھ لے گی مگر "جیم" تو وہ مر جائے جب بھی نہیں پڑھے گی بہت ہوگا منجھو گھونسے مارے گی مگر ہرج ہی کیا ہے مار نے دو۔ اپنا کیا جاتا ہے۔ قلم سے جیسے محرّم میں ڈھول بجا اُس پر پھر کسی کو محرّم کے ڈھول کی طرح پیٹ ڈالنے کا جنون سوار ہوا۔ مگر وہ ضبط کر گئی۔ اس نے دھیان بٹانے کے لیے قاعدہ اٹھالیا کٹ کٹ مشین کے دانتوں کے نشان دیکھ کر اس کے اپنے مسوڑھوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں یوں ہی جو سرے پر لٹکتا ہوا ڈورا پکڑ کر کھینچا تو کچے زخم کی طرح ٹانکے ٹوٹتے چلے آئے۔ بڑا مزہ آیا جیسے وہ جلدی جلدی چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں سے اتر رہی ہو۔ قاعدے کے ورق بکھر گئے۔

ارے! منجھو شرطیہ بُرا مانے گی اور کیا عجب جو مار بھی بیٹھے اس لئے جلدی سے قاعدے کے ورق سمیٹ کر مشین کے دانتوں کے نیچے رکھ دیئے اور ہینڈل گھماتی رہی کٹ کٹ کٹ کٹ وہ اِدھر سے اُدھر بڑی مشّاقی سے چلایا کی یہاں تک کہ قاعدہ سوزنی کی طرح ٹانکوں سے بھر گیا خیر اچھا ہوا "ص ض" کمبخت جائے دانی کی شکل کے غارت ہو گئے اور جیم بھی مٹ گیا۔

مگر جب منجھو نے قاعدے کی صورت دیکھی تو تمام گزشتہ گھونسوں سے زیادہ وزنی گھونسا جمایا اس کے بعد پھپڑا اور چانٹے۔ وہ دیر تک بیٹھی بے آنسوؤں کی سوکھی سوکھی سسکیاں بھرتی رہی۔ اگر ہر بار پٹنے پر آنسو گرانا لازمی ہوتا تو یقیناً مصیبت ہو جاتی اور اس کی آنکھوں کے ڈھیلے کبھی کے بہہ گئے ہوتے۔ اِدھر منجھو کے تھپڑوں کا خزانہ کم ہوتا نظر آتا اور جو وہ ہر تھپڑ پر ایک آنسو بھی بہاتی تو سات سمندر کا پانی ہوتا سو بھی خشک ہو جاتا اس لیے وہ اب بس گلے سے رویا کرتی تھی۔ دماغ بالکل پُر سکون اور غیر متاثر رہتا۔

یہ دوسری کتاب تھی جس سے اُسے للّٰہی بغض ہو گیا۔ ایک تو وہ ناول ہی کیا کم تھی جسے پڑھتے وقت منجھو بی اس کی کسی آہ و زاری پر کان نہیں دھرتی تھی اب دوسری یہ جس کی آمد ہی منحوس ثابت ہوئی۔

مگر یہ کتاب تو اس کی جان کو چمٹ گئی ایسی کہ چھٹنا دشوار ہو گیا۔ الف تو خیر دل پہ پتھر رکھ کر پڑھ لیا گیا مگر جیم حتیٰ کہ ص ض کمبخت بھی پڑھنا پڑے۔ حیرت تو اُسے جب

ہوئی جب اُسے معلوم ہوا کہ ......

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا ؟
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا ؟

بات یوں ہوئی اُس نے ایک دن منجھو سے پوچھا۔
"منجھو بی جب قاعدہ ختم ہو جائے گا تو مٹھائی بٹے گی نا ؟"
"ہاں! اور پھر دوسری کتاب شروع ہو گی"
"دوسری! ...... پھر ؟"
"پھر بڑے بھائی جیسی موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرنا ......" منجھو نے نہایت معصومیت سے بتایا کس سادگی سے وہ اُسے آنے والی بلاؤں سے دوچار کر رہی تھی۔ خاموش اپنی گود میں ہاتھ سمیٹے وہ بیٹھی رہی اور ایسا محسوس ہوا کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک موٹی سی بھیانک کتاب اس کے سر پر پتھر کی سل کی طرح گر تی ہے جس میں "حں حں" اور "جیم" سے بھی زیادہ کمینے اور غیر دلچسپ الفاظ موجود ہیں۔

بہت سے بہن بھائیوں اور بھرے پُرے خاندان میں زندگی کے دن ماضی کی تاریکی میں ڈوبتے چلے گئے جیسے کوئی بہت سے کنکروں کو سوپ میں ڈال کر پھٹک رہا ہے۔ اور ہر کنکر سوپ کے دندانوں میں پیچھے گھاٹے سے جا ہوا ہے۔ سائیں سائیں لمبے لمبے پینگوں کی طرح زندگی گزرنے لگی۔

۳

منجھو بی مارتی تھی تو کیا تھا؟ دلار بھی تو کرتی تھی۔ پیٹ کوٹ کر جب اُسے خوب لپٹاتی تو سینے کی گرمی سے اس کے سارے زخم سینک دیتی پر اب اس کی زبان چل نکلی تھی جب منجھو مارتی تو وہ اُسے کوسنے دینے لگتی جو اس نے نوکرانیوں سے سیکھ لیے تھے۔

"مرجائے، اللہ کرے منجھو بی مرجائے" اماں اپنی لاڈلی کو کوسنے دیکھ کر خوب بگڑیں۔

"کھود کے گاڑ دوں گی جو میری بچی کو کوسا، کلموہی کہیں کی" وہ خود تو اماں کی بچی تھی نہیں، اس کی بدمعاش اتا کے چلنے کے بعد سے منجھو بی اس کی ماں تھی۔

"یوں کہو کہ اللہ میاں منجھو کا بیاہ ہو جائے" اماں نے سکھایا اور اس نے یونہی کہنا شروع کیا۔

"اللہ میاں منجھو کا بیاہ ہو جائے، منجھو بی کا بیاہ ہو جائے" اس کوسنے کا کافی اثر ہوتا۔ پہلے تو منجھو بی بگڑتی اور زور سے دھموکے مارتی مگر پھر اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ جاتے اور وہ مسکرا مسکرا کر شرمانے لگتی۔

دعا نہ جانے کیسے بُرے وقت سے نکلی تھی کہ جھٹ قبول ہو گئی۔ کچھ ایسی گڑبڑ مچی کہ اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ گھر اتھل پتھل ہو گیا۔ منجھو کو گھار کر ایک کمرے میں بٹھا دی گئی اور خوب غل مچایا گیا۔ الٹی سیدھی مٹھائیاں اور زرق برق کپڑے چاروں طرف پھیل گئے۔ اچھا خاصا گھر ہاٹ بن گیا۔ دنیا بھر کی عورتیں لال ہرے کپڑوں میں لپٹ کر دوڑ پڑیں۔ دھواں دھوں باجے بجنے لگے جب عورتیں منجھو کا دولہا دیکھنے دوڑیں تو وہ بھی بلک گئی۔ کسی نے اُسے گود میں لے کر دولہا دکھانا چاہا، مگر وہ نہ دیکھ سکی۔ "یہ تو آدمی ہے، دولہا" وہ چلائی اور مچل گئی، پھر کسی نے اُسے دولہا دکھانا ضروری نہ سمجھا وہ بھی اکتا کر اُبٹنے میں لسی ہوئی منجھو سے لپٹ کر سو گئی۔

رسموں کے وقت لوگوں نے چاہا وہ دولہا کے مہندی لگا دے مگر وہ اس بری بگڑ کھڑی ہوئی کہ اول تو وہ دولہا نہیں بیدھا سادھا آدمی ہے اور آدمی مہندی نہیں لگاتے۔ انہوں نے اُسے دیوانی کہہ کر دور دھکیل دیا گیا۔

منجھو تو دلہن بنی بیٹھی تھی پاگل لیے وہ بے نتھے بیل کی طرح گھومتی رہی۔ پہلے تو اس نے بری کی شکر لے جا کر خوب غسل خانے کے مٹکوں میں گھولی جس سے بیویاں استنجہ کر کے بدحواس ہو گئیں۔ اس کے بعد باورچی خانے کی طرف متوجہ ہوئی اور وہاں خوب ہانڈیوں میں نمک کونڈا اور راکھ جھونکی۔ باورچی کسی دوسری طرف لگے ہوئے تھے وہ پھر پیالے گننے لگی۔ چاندی کے ورق اور پستوں کی ہوائیاں لگے ہوئے پیالے کا مداتی سطرنجی کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ بڑے چرکیلے معلوم ہوئے۔ بے اختیار اس کا جی چاہا اُن کے بیچوں بیچ میں جو خالی جگہ ہے وہاں پیر رکھ رکھ کر چلے۔ وہ تول تول کر قدم اٹھانے لگی ایک...... دو...... تین کسی نے دیکھ لیا اور وہ گڑبڑا کر جو بھاگی تو دھڑام سے کھیر کی کیچڑ میں سر سے پیر تک لت پت۔

نہ جانے کس نے اُسے نہلانے کی کوشش کی مگر وہ تو منجھو کے نہلانے کی عادی ہو چکی تھی۔ یوں رساں رساں نہلانے سے وہ چڑھ گئی اور خوب ضد میں گئی پانی کے چھینٹے اڑائے وہ عورت تو کمر بند کی لکڑی ڈھونڈنے لگی ادھر اس نے تولیہ باندھ کر ٹہلنا شروع کیا...... منجھو بی کے بھاری بھاری جہیز کے جوڑے دکھانے کے لیے ایک کمرے میں سجا دیے گئے تھے۔ اس نے ستارے نوچ نوچ کر تھوک سے ماتھے پر چپکائے۔ سلمے کے تار کھینچ کر اُن کے چھلے بنائے، دوپٹوں کی تہیں کھول کر خوب پھیلا دیے۔ اتنے میں اس کی نظر گوٹہ لگی ہوئی چولیوں پر پڑی جھلمل کرتی زرکار ڈوریاں اُسے انھیں پہننے کا کتنا ارمان تھا۔ مگر اُسے تو دیکھنے کو بھی نہیں ملتی تھیں۔ امّاں تو غسل خانے میں ایسے چھپ کر پہنتیں جیسے موٹی سی گالی ہو۔ اور میلے کپڑوں کے ڈبے میں اس کا ہاتھ بھی تو نہ جاتا تھا۔ جلدی جلدی اس نے چاروں طرف دیکھ کر الٹے سیدھے سوراخوں میں ہاتھ ڈال کر ڈوریاں گلے میں کس لیں۔ پھر اس نے بھاری کریپ کا دوپٹہ نکال کر اوڑھا اور اطلس کا پاجامہ دیکھ کر

تو اس کے دل میں ہُوکیں سی اُٹھنے لگیں۔ جانگیے پہنتے پہنتے اُس کا جی متلا گیا تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ پھولوں کا ڈھیر اس نے گھسیٹ کر ٹانگوں میں پھنسا لیا۔ پھر کریپ کے دوپٹے کا گھونگھٹ نکال کر وہ چاروں طرف فرضی مہمانوں کو جھک جھک کر سلام کرنے لگی۔

"جیتی رہو بیٹی، دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو" اس نے انھیں کہتے سُنا اور پھر ٹھوڑی اپنی ہتھیلی پر ٹکا کر گھر والیوں کی طرح ہو بیٹھی۔

"اری رسولن، او رسولن کہاں مر گئی نالزادی! جا علی بخش سے کہہ کہ سودا ابھی لائے۔ ہاں جلدی سے لائیں، مونگ کی دال اور...... اور بھنی ہوئی گرم گرم مونگ پھلیاں، ہاں شمن بی کے لیے اور شکر کی گولیاں بھی" وہ خیالی ماما کو ڈانٹنے لگی۔ یکایک کرتے کرتے اُسے یاد آیا کہ ارے! منا تو گھٹنے پر سو رہا ہے! جاگ گیا اس نے پھرتی سے گھٹنا ہلانا شروع کیا۔ جیسے بچے کو ہلکورے دے رہی ہے۔

"نا نا میرا چاند، میرا کلیجے کا ٹکڑا...... لے بھیّو کا ہے دودھ پیے گا۔ اوا اوا...... کرتا مرکا کر وہ نقل میں گھٹنے کو دبوچنے لگی...... مگر فوراً ہی کسی آوارہ مچھر کے کاٹے ہوئے نشان نے اُس کی ساری توجہ کھینچ لی۔ بچہ وچہ بھول کر وہ ہونٹ لٹکا کر ددوڑا دیکھنے لگی۔

"کاٹ کھایا مری پیٹے نے!" وہ اپنے گھٹنے پر چپتیں لگانے لگی...... اور پھر اُسے کسی کو مارنے کا دورہ پڑ گیا۔ دھما دھم اس نے جہیز کی چیزوں کو دونوں ہاتھوں سے کوٹنا شروع کیا۔ ذرا سی دیر میں کھیت کا کھلیان کر کے رکھ دیا۔ لوگ آ گئے اور اُسے یونہی گھسیٹ کر باہر نکال دیا گیا۔ اتنی فرصت کسے تھی جو اُس کا پاجامہ ڈھونڈھ کر پہناتا، لہٰذا شام تک وہ تولیہ لپیٹے اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔

مگر اُسے ایک تجربہ ضرور ہوا کہ تولیہ پاجامے سے کہیں زیادہ آرام دہ اور مفید ہوتا ہے۔ ایک تو گھڑی گھڑی ڈھیلا کمربند تنگ کرانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دوسرے اس عجیب و غریب ہیئت میں دیکھ کر بہت سے بچے تو آتشِ رشک سے بھُنے جا رہے تھے۔ دو چار اس تاک میں لگے تھے کہ تولیہ ہٹ جائے تو اُسے

ننگا دیکھ لیں۔ مگر وہ انھیں جوتیوں سے مار مار کر بھگا رہی تھی اُسے اس کھیل میں بڑا مزہ آرہا تھا۔

"ہم سو رہے ہیں ہمیں جگا نا متی!" وہ بن کر سو جاتی اور بدذات بچے اس کا تولیہ چھینے لگتے۔ پھر وہ جاگ جاتی اور خوب ناخنوں اور دانتوں سے ان کی تواضع کرتی۔

جدھر وہ نکل جاتی سب اُسے ڈانٹتے بہنیں چپتیں لگا کر دھتکار دیتیں۔ مگر کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ تالا کھول کر اس کا پجامہ نکال لے۔ خدا خدا کر کے شام کو جب دولہا کے آنچل یا کسی دوسری ضروری رسم کا وقت آیا تو اس کی تلاش ہوئی اور وہ پچھلے دالان میں عجیب و غریب کھیل کھیلتی ہوئی پکڑ کر ماری گئی۔

دولہا آیا، غل مچا، کسی نے اُسے جوتا چھپانے کو دیا۔ بڑی دیر تک تو وہ اس جوتے سے کھیلتی رہی۔ پھر سو گئی۔ رات کو جب دولہا جانے لگا تو جوتے کی ڈھنڈیا پڑی۔ لوگوں نے اُسے جگایا تو وہ بوکھلا کر اُن سے لپٹ گئی۔ کوئی خواب دیکھ رہی تھی بے تحاشا چلائی۔

"دولی...... ارے میری دولی!"

کہتے ہیں دولہا لنگوٹا لنگ پہر گیا۔ صبح کو جوتا پینے کے پانی میں لاش کی طرح پھولا ہوا ملا خوب سمدھنوں نے اس کا شربت پیا لاکھ لوگوں نے چاہا کہ وہ بتا دے کہ اس نے جوتا مٹکے میں کس غرض سے ڈالا تھا مگر وہ کچھ بھی نہ بتا سکی۔

"جوتا؟...... مٹکا؟" وہ یہی پوچھتی رہی مگر پھولا ہوا جوتا دیکھ کر اس کے دل میں گدگدی ہونے لگی اور وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

۴

جب منجھو بیاہ کر جانے لگی تو شمن ذرا بھی نہ روئی بلکہ چپکے سے پالکی میں جا کر بیٹھ گئی منجھو جانے سے پہلے اُسے یاد کرتی رہی مگر وہ نہ ملی جب دلہن اور اس کے ساتھ والیاں پالکی میں بیٹھیں تو ان میں سے سب سے موٹی عورت شمن کی گود میں چڑھ بیٹھی۔ وہ زور سے چلائی مگر موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ضبط کر گئی اور موٹی عورت کے کولھوں میں کچکچا کر دانت گاڑ دیے۔ ایک غدر مچ گیا، پالکی لوٹتے لوٹتے بچی مگر شمن پکڑی گئی۔ لوگوں نے اُسے گھسیٹ کر اتار لیا۔ ہزار اللہ میں چلائیں، کہا سنا، گالیاں بکیں مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

منجھو بی چلی گئی، گھر میں جیسے موت ہو گئی! سارا گھر سو گیا مگر شمن کے حصے کی نیند غائب تھی۔ کئی دفعہ وہ منجھو کو پکار پکار کر رو دی۔ ہچکیاں لیتے لیتے حلق دُکھ گیا، آواز پڑ گئی مگر کون سنتا؟

"منجھو بی....... منجھو بی....... ہائے منجھو بی" وہ رات بھر سسکیوں سے پکارتی رہی۔ شادی کے تھکے ہارے مہمان اور میزبان دنیا سے بے خبر سو رہے تھے اور وہ اکیلی اِدھر سے اُدھر بھٹکتی پھر رہی تھی۔

منجھو کے جاتے ہی اس کی گت بن گئی۔ کئی دن تک تو کسی کو یاد ہی نہیں آیا کہ وہ بھی گھر میں ہے یا نہیں، نہلانے یا کنگھی کرنے کی ضرورت بھی ہے۔ جب بہت ہی اس میں سے بساند چھوٹنے لگی تو سڑتی ہوئی نالی کی طرح لوگ اس سے دُور دُور رہنے لگے۔ میل اور کھجلی سے بے قرار ہو کر وہ راتوں کو چلاتی اور دن بھر کونوں کھدروں میں بھٹکتی پھرتی۔ تب اماں کو نہلانے کا خیال آیا۔

سر کے بال چیک کر جٹائیں بن گئے تھے۔ اور بدن پر میل کی پپڑیاں بندھ بندھ کر اکھڑ رہی تھیں۔ نائن کے بس کی کہاں تھی۔ جب اس نے نہلانا چاہا تو اُسے مارنے لگی،

بال نُچے تو اُسے پچھاڑ کر ننگی بوچی بھاگی۔ دونوں میں بڑی دیر تک برآمدے میں ریس ہوتی رہی شمن آگے آگے اور نائن پیچھے پیچھے۔ آخر کو موری کے پاس پھسل کر گر پڑی۔ نائن نے پکڑ دھکڑ کر نہلا تو دیا مگر کیسا یہ وہ خود ہی جانتی تھی۔ اُلجھے بال ویسے ہی میل اور چیکٹ کا جونا بنے رہے میل ذرا پانی ڈالنے سے پھول گیا۔ اور میلے کپڑے کی رگڑ سے کہنی دور ہو گئی۔ پلستر ویسا ہی چیار رہا اور اس نے کپڑے پہن لیے۔ پھر تو یہ حال ہو گیا کہ جس دن وہ نہاتی اماں موٹی سی قمچی لے کر بیٹھ جاتیں اور سچ مچ کی لاش نہلائی جاتی کیونکہ ایسی ویسی مار کو وہ خاطر ہی میں کب لاتی تھی۔

دن بھر وہ منجھو کو بھولے رہتی مگر رات کو وہی منجھو بی کی رٹ لگاتی۔ تنگ آ کر اماں نے بوڑھی دادا سے کہا "بوا ہم ہی سلا لو اللہ ماری کو" مگر شمن نے سوتے میں انھیں اپنے پاس لیٹا دیکھ کر ان کے بال کھسوٹ ڈالے اور دھکیل دیا۔ اکیلی پڑی اپنی ہتھیلیوں کو چبایا کی۔ جب سب سو جاتے، وہ جاگا کرتی، اس کے ہاتھ منجھو کی گردن کی تلاش میں کھری پٹیوں پر رینگا کرتے۔ اس کا جی چاہتا بس ایک دفعہ وہ نرم نرم گردن اس کی گرفت میں آجائے پھر تو وہ مر جائے گی پر نہیں چھوڑے گی۔ پڑی پڑی وہ منجھو کے کمینے دولہا کو کوسا کرتی جو اُسے چیل کی طرح جھپٹا مار کر چھین لے گیا۔ اور منجھو کے اُس نابکار دولہا کو کوسنا بھی شاید خدا نے سُن لیا اور ایک دن تار آیا اور گھر میں ماتم ہونے لگا

"تمہارے دولہا بھائی مر گئے، تم روتی نہیں؟" تحصیلدارنی کے لڑکے نے اس سے کہا

"کون منجھو بی کا دولہا؟" وہ خوشی سے چونکی۔

"نہیں بڑی آپا کے دولہا" خاک پڑے بڑی آپا کے دولہا کے مرنے کا کیسا رمان تھا۔ بدمزاج کہیں کے پچھلی دفعہ گنے لائے تو سارے اماں کو بھجوا دیے ایک پوری بھی نہ چھونے دی۔ اُسے سخت ناامیدی ہوئی اور وہ رو پڑی۔ سب سمجھے وہ غم میں شریک ہو رہی ہے اس لیے اور بچوں کے ساتھ بہلانے کو اُسے تحصیلدارنی کے یہاں بھجوا دیا گیا جہاں اُسے بھنے ہوئے میٹھے انڈے کھلائے گئے۔

جب منجھو بی کا دولہا مرے گا تو اس سے بھی مزے دار انڈے ملیں گے! وہ انڈوں کا

مزہ دیر تک مُنہ میں قائم کرنے کی کوشش کرکے سوچتی رہی۔

بڑی آپا بیوہ ہو کر میکے میں آن رہی۔ اُس کے دونوں بچے بھی آ گئے جنھیں چھونے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ کبوتری کے گھونسلے میں ہاتھ ڈالو تو کس زور کی ٹھونگ مارتی ہے! ایسے ہی جب بڑی آپا کے بچوں کو کوئی چھوتا تو چنگھاڑتی ہوئی لپکتی۔

جب خدا خدا کرکے منجھو سسرال سے آئی تو شمن کا مارے غصے کے بُرا حال ہو گیا۔ وہ تو سمجھتی تھی جیسے وہ اس کے بغیر دیوانی کتیا بن گئی ہے۔ منجھو بھی میلی کچیلی چوہیا روتی بسورتی اُترے گی مگر اُسے پہلے سے بھی موٹا اور زیادہ لال دیکھ کر اُسے اپنی سخت ہتک محسوس ہوئی۔ جھوٹی کہیں کی! اماں کو لکھا کرتی تھی، "مجھے اپنی شمن بہت یاد آتی ہے" ذرا کبھی یاد آتی ہوتی تو یوں طباق سا چہرہ نہ رہتا۔ سر سے پیر تک ریشمی کپڑوں میں غرق، بجتے زیور، کانوں میں لمبے لمبے جھمکے جنھیں بات کرتے میں قصداً جھلاتی اور ناک میں چمکتی ہوئی کیل، شرما کر بات کرتے میں وہ ہمیشہ اس کیل کو نزاکت سے آنکھ نیچی کرکے دیکھنے کا انداز اور وہ باریک ریشم کی جالی کا کرتا جس کے اندر سے گوٹے کی چولی بادلوں میں چھپے چاند کی طرح جھلملا اٹھتی۔

آتے ہی وہ پاگلوں کی طرح سب کے گلے سے لٹکنے لگی مگر اس نے شمن کو دیکھا بھی نہیں۔ وہ بدلی بھی تو بہت گئی تھی۔ ساری پھول جیسی فراکیں مرجھا گئی تھیں۔ اور جانگیوں کے بجائے ادھنگے، بدوضع پاجامے پہننے لگی تھی۔ بڑی دیر بعد نہ جانے کیسے وہ اُسے یاد آ ہی گئی۔

"شمن کہاں ہے؟" اُس نے پوچھا۔ اور اس کے دل کو بُری طرح ٹھیس لگی۔ ادھر تو اب بی منجھو اُسے پہچانے گی بھی نہیں یہ گھنٹہ بھر سے دروازے سے لگا کون ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھے جا رہا ہے؟ کس نے کئی بار اس کا ریشمی دوپٹہ چھو کر متوجہ کرنے کی ناکام کوششیں کیں؟ اور یہ کون صبر کیے دیوار سے خاموش لگا کھڑا ہے۔ شمن نہیں تو پھر اور کون ہو سکتا ہے؟ مگر اُسے ماں بہنوں کے گلے لگنے سے فرصت ملے تو کسی اور کا بھی دھڑکتا ہوا دل ذرا سکون پائے۔ آپا کی لڑکی نوری کو تو آتے ہی کلیجے سے

لگا لیا اور شمن جیسے بھس بھری چڑیل تھی کہ لوگوں کو نظر بھی نہ آئی۔

مگر پھر بھی جب منجھو نے اُسے اپنے مہکتے ہوئے سینے سے لگایا تو اس کے دل میں ہزاروں سوتے پھوٹ نکلے اور سوکھی سوکھی ہچکیاں لیتی وہ اس کے شانے سے ٹک گئی۔

"جوئیں، جوئیں، اے ہے منجھو، موئی کے ہزاروں جوئیں بھری پڑی ہیں" آپا اور اماں چلائیں اور منجھو نے ڈر کر اُسے دور دھکیل دیا۔

"گندی ہے، یہ بھنگن کی لونڈیا" نوری اترائی اور منجھو کی گود میں چڑھ بیٹھی۔ منجھو پھر باتوں کے ریلے میں بہہ گئی اور کسی نے نہ دیکھا کہ شمن دھکا کھا کر باہر چلی دی اور چپکے سے سرک کر میلے کپڑوں کے گٹھڑ میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج وہ دل اور دماغ دونوں سے رو رہی تھی، کھارے کھارے آنسو میلے بدبودار کپڑوں میں جذب ہو رہے تھے۔ نہ جانے کب تک وہ پڑی روتی رہی کسی کو یاد بھی نہ آئی، بچے دوڑ دوڑ کر منجھو کی لائی ہوئی مٹھائی کھا رہے تھے، نوری اب بھی اس کی گود میں ڈٹی اس کی چمپا کلی سے کھیل رہی تھی۔ منجھو نے گڑیا نکال کر اُسے دی اور دوسری نکال کر شمن کو پکارا۔

"نہیں ہم دونوں لیں گے!" نوری مچل گئی، ویسے شمن اتنی ذلیل نہ تھی جو منجھو کی گڑیا پر اس کی نیت بھٹکتی مگر جب دونوں گڑیاں نوری دابے بیٹھی تو وہ ضبط نہ کر سکی۔ اس نے منہ پھیر لیا اور چھت میں لٹکے ہوئے جالوں کو دیکھتی رہی جس میں نیم مردہ مکھیاں جھول رہی تھیں۔ اس پر پھر دورہ سا پڑ گیا۔ وہ دانتوں سے میلے کپڑے کھسوٹنے لگی۔ یہ بدبودار پائجامے، سڑی ہوئی بنیانیں اور لسانڈے کرتے وہ غصے میں ان سب کو نگل جانا چاہتی تھی۔

تھک کر وہ باہر برآمدے میں آ کر کونے میں بیٹھ گئی آج اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نظروں سے غائب ہو جانے والی ٹوپی پہنے ہے آزمانے کے لیے وہ کئی بار سامنے سے گزری مگر نہ منجھو نے اُسے دیکھا اور نہ نوری نے جو دونوں گڑیاں سمیٹے منجھو کے پلنگ پر بیٹھی اکڑ رہی تھی۔

منجھو کے پلنگ میں ابھی تک دلہن کے دھندلے سے نشانات موجود تھے۔ تکیے وہی سُرخ ساٹن کے جن پر جھاگ جیسے کڑھے ہوئے غلاف چڑھے تھے اور وہی کارچوبی گوٹ کی رضائی۔ نوری اس کے تکیوں پر سر اوندھائے قلابازیاں کھا رہی تھی۔ شمن کا کتنا جی چاہا کہ جاکر نوری کو اتنی زور سے دھکیلے کہ وہ اندھے کنوئیں میں جا گرے اور پھر دونوں گڑیاں چھپ رہے۔

دیر تک شمن منجھو کے مہندی لگے پیروں کو پلنگ کے نیچے سے جھانک کر دیکھتی رہی لال لال پیر جس میں گھنگرو دار پازیب۔ اس کا کتنا جی چاہا کہ وہ سب کی آنکھ بچا کر کسی طرح پلنگ کے نیچے رینگ کر پہونچ جاتی اور ان گھنگرؤں کو آہستہ سے انگلی سے بجا کر دیکھتی جو اس کی حنا آلود ایڑی پر ہلکی ہلکی جنبشوں سے ناچ اٹھتے تھے۔ اتنے میں اُسے نوری نے دیکھ لیا۔

"خالہ جان شمن بہت برائی کی لڑکی ہیں یہ انہیں نانی نے بھنگن سے دو پیسے کو لیا تھا"
وہ تتلا کر بولی اور بڑی آپا نے پیار سے اُس کے چھٹا لگایا۔ منجھو نے مڑ کر اُسے دیکھ لیا۔ مگر وہ وہاں سے بھاگ آئی پھر منجھو کا دولہا بھی گھر میں آگیا۔ منجھو کچھ شرمائی کچھ اترائی باتیں کرتی رہی دولہا کی آنکھیں شاید تیز تھیں اس نے شمن کا بھوت دیکھ لیا۔

"ارے بھئی یہ تمہاری بہن شمن کیوں الگ کھڑی ہے۔"

"ان کے جوئیں ہیں" نوری نے جلدی سے اطلاع دی۔

"ائے ہے جوئیں! یہ تو بُری بات ہے۔ چھ چھ" شمن اور جل گئی۔ بدبخت کون ہوتا ہے چھ چھ کرنے والا۔

"بھئی یہاں آؤ" اُس نے پھر بلایا۔

"انھیں مت بلائیے۔ یہ بُری ہیں ان سے کوئی بھی نہیں بولتا۔ نوری دولہا کی گود میں بکوا چڑھ گئی اور پھر دولہا نے منجھو سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا۔ اُس نے چونک کر شمن کی طرف دیکھا۔ شمن سمجھ گئی اور پھر گرتی پڑتی بھاگی کہ اب اُس کے ساتھ ہمدردی جتانے کی سازش ہو رہی ہے۔

پھر اندھیری کوٹھری میں جا کر اس نے "منجھو بی منجھو بی" پکارنا شروع کیا مگر بے کار جیسے وہ کسی مردے کو قبر سے کھینچ بلانے کی ناکام کوشش کر رہی ہو، مُنہ اوندھائے وہ پڑی تھی کہ کسی نے زور سے ہاتھ جھٹک کر اُسے چونکا دیا۔

"خبردار جو یوں میلی کچیلی منجھو کے کمرے میں گھسی، مردار کہیں کی" بڑی آپا نے بے رحمی سے اُسے جھنجوڑیاں دیں۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو وہ بچھا کر لپٹ ہی جاتی اور اُن کی بوٹیاں اڑا دیتی مگر اس وقت تو کسی نے اس کے سارے احساسات پر چوٹیں مار مار کر سُن کر دیا تھا۔ وہ سہم کر دوسری طرف جانے لگی۔ اتنے میں منجھو باہر نکل آئی۔

"شمن" اُس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ شمن کو بڑی بہادری سے کام لینا پڑا ورنہ اس کے جسم کا رواں رواں کھینچ کر منجھو میں جذب ہو جانے کے لیے تڑپ اٹھا۔

"چل ادھر کمبخت، کیا گت بنائی ہے" ذرا سے دنوں میں منجھو نے کس کس کے دو گھونسے جمائے، شمن چھوٹے پڑی دُکھ سے نہیں، اُن تو جیر بھرے گھونسوں کی لذت سے اُس کا جی دُکھ اٹھا گھسیٹتی ہوئی اُسے غسل خانے میں لے گئی۔ شمن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آنسو بے تاب ہو کر بہ نکلے گھٹتے ہوئے بجائے اُمڈ پڑے منجھو کے گھونسے کی شیرینی جس کے لیے وہ ترس گئی تھی۔ اُس کی رگ رگ میں تیر گئی۔ اور پھر گھونسوں تھپڑوں اور چانٹوں نے نہ صرف اس کے جسم پر سے بلکہ روح پر سے بھی میل کا غلاف اُتار دیا۔ اور اُس لاش کو دوبارہ جگا دیا جو بالکل اُس کے اندر سڑ گل چلی تھی۔ خون سرعت سے دوڑنے لگا مچھلیاں پھڑکنے لگیں اور ذرا سی دیر میں وہ پرانی شمن کی طرح واویلا مچانے لگی۔

منجھو کو بھی جیسے بہت دن کی چھوٹی شراب ہاتھ آ گئی بس ٹوٹ ہی تو پڑی۔ پھر بال نوچ نوچ کر کنگھی کی اور سارا دن کھانا پینا چھوڑ کر اس کی جوئیں نکالیں۔ سب نے بہتیرا منع کیا مگر اُسے تو جیسے کرتے ہوئے مکان کی مرمت کرنا تھی، وہ بھی برسات سے پہلے پہلے۔ شام کو شمن کے سر زمین پر نہ پڑتے تھے۔ بدن تو ہلکا ہوا ہی تھا، جی ایسا ہلکا ہو گیا کہ وہ دھما دھم منجھو کے پلنگ پر قلابازیاں کھانے لگی، دھواں دھول تکیوں کو پیٹ ڈالا

اور رضائی کا تنبو تان کر لائنیں چلانے لگی۔

"ہیں! ہیں! پھٹ جائے گی رضائی!" آپا چلائیں۔ "بس ذرا ڈھیل دی، اور اترانے لگیں کمبخت باتیں کرنے کے لائق نہیں۔ نوری بھی تو ہے مگر یہ دیوانی حرکتیں نہیں کرتی۔"

شمن نے دیکھا نوری منجھو کے دولہا کی گود میں بیٹھی مینا کی طرح چہک رہی تھی۔ اس کا جی سلگ اٹھا۔ بس چلتا تو وہ نوری کی بوٹی بوٹی کر کے پھینک دیتی۔ کمینی کہیں کی ہر بات میں اماں بیٹیاں ذلیل کرنے آن مرتی ہیں۔ نوری گوری ہے وہ کالی، نوری نازک، وہ بھدی۔ نوری ہنس مکھ شرمیلی، باتمیز اور پڑھنے میں تیز۔ وہ بدمزاج، بدتمیز اور پھوہڑ، پڑھنے سے دم چراتی۔ نوری روز کا سبق قرآن شریف کا جھٹ پٹ یاد کر کے سنا دیتی۔ شمن پر اس بات پر ہزاروں پھٹکاریں پڑتیں۔ وہ اپنا پچھلا سبق بھی بھول جاتی۔ نوری ننھی سی بدھنی سے چوکی پر بیٹھ کر وضو کرتی اور جائے نماز پر ماں کے برابر کھڑی ہو کر نماز پڑھتی لوگ واہ واہ کرتے مگر شمن خوب جانتی تھی کہ اُسے نماز خاک بھی نہیں آتی کھڑی بُدبُد ہونٹ ہلایا کرتی ہے۔ اُسے نماز کچھ زیادہ اچھی نہ لگتی تھی۔ ویسے گھر میں پڑھتا بھی کوئی نہ تھا، بڑی آپا نے تو بیوہ ہونے کے بعد زوروں شوروں سے نماز پکڑی دوسرے وہ عموماً نجس رہا کرتی تھی اس لیے کوئی نماز سکھاتا بھی تو نہ تھا۔

اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا اس واپس آئی ہوئی منجھو کا کیا کرے اس سے لپٹتے لپٹتے تو وہ تھک گئی تھی پھپھو نے چھوتے دل اکتا گیا تھا۔ مگر پھر بھی بھوک باقی تھی۔ رات کو کھانے پر وہ ٹھنک ٹھنک کر منجھو ہی سے سب کچھ مانگتی رہی۔

"ہنک، بوٹی .... سالن .... گردہ .... مونگ کی بڑی لیں گے، انہیں مٹھائی، ہمارے مرچیں لگ رہی ہیں .... چمچے سے کھائیں گے۔" منجھو باتوں میں مشغول اس کی فرمائشیں ٹھیک طرح پوری نہیں کر رہی تھی۔ اور جب شمن نے سالن کا ڈونگا اُچھلتے دستر خوان پر اوندھا دیا تو اماں اور آپا میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ باتیں ہوئیں۔

"چلو اٹھو" منجھو روکتی ہی رہی مگر بڑی آپا اُسے گھسیٹ کر برآمدے میں لے آئیں "آواز نکالی تو دم گھونٹ دوں گی" اگر کوئی اور ہوتا تو شمن اس سے لپٹ کر گھونٹنے

لگتی، مگر آپا سے وہ ڈرتی تھی کیونکہ اُنھوں نے ایک دن ایسی بے دردی سے مارا تھا کہ اماں تک کے آنسو نکل آئے تھے۔ اس بے رحمی میں شمن کو ایسی کریہہ نفرت پوشیدہ نظر آئی تھی کہ وہ سہم گئی تھی۔ اُس دن سے بڑی آپا کو بڑا فخر تھا کہ گھر بھر میں کسی کی نہیں سنتی مگر اُن کی گھُرکی سے شمن کانپ اٹھتی ہے۔ اور فوراً کہنا مان لیتی ہے مگر انھوں نے یہ کبھی نہ دیکھا کہ یوں کہنا مانتے وقت شمن کی آنکھیں کسی خوفناک نفرت سے دہک اٹھتی ہیں، ایسے ہی جیسے پنجرے میں بند شیر سدھانے والے کے چابک سے ڈرتا ہے لیکن اُس کی آنکھوں میں جو خونی نفرت نظر آتی ہے اُسے کچھ سدھانے والے کا جی ہی جانتا ہے۔ ایک ذرا دیر کو جو یہ ہنٹر ہاتھ سے چھوٹ پڑے تو کیا ہو۔ جب وہ اُسے ڈانٹتی تو شمن خاموشی سے انھیں ایسے دیکھتی کہ اُن کا غصہ جوں کا توں ہو جاتا اور وہ اُسے چبا ڈالنا چاہتیں۔

شمن کھانے پر سے تو ہٹا دی گئی تھی مگر منجھو کے پلنگ پر لیٹنے کا تو پورا پورا حق رکھتی تھی۔ وہ خاموش ضبط کیے لیٹی رہی کہ کہیں آپا کوئی بہانا بنا کر اس کی جگہ نوری کو منجھو کے پلنگ پر نہ سُلا دے، اس کی یہ عادت تھی کہ ہر جگہ اپنی بیٹی کو ٹھونسے جاتی تھی لیکن جب اُس سے کہا گیا کہ جا کر اپنے پلنگ پر سوئے تو وہ بگھر گئی۔ "نہیں، ہم تو منجھو کے پاس سوئیں گے۔"

"رہنے دو آپا، یہیں سو رہنے دو، کیا ہے۔" منجھو شرما کر اپنی کیل دیکھنے لگی۔ شمن نے سوچا کوئی اٹھا نہ دے وہ جلدی سے سوتی بن گئی مگر اُسے واقعی نیند آگئی۔ نہ منجھو کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے سوتی رہی۔

رات کو جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے جلدی جلدی منجھو کی گردن ٹٹولنے کے لیے ہاتھ پھیلائے مگر ایک دم وہ رنج و ہیبت سے رو پڑی کیونکہ اس کا ہاتھ بجائے منجھو کی گرم گرم گردن کے بیچ پر بے کسی سے پڑا ہوا تھا۔ یہ تو اُس کا اپنا پلنگ تھا جس سے اُسے قبر سے زیادہ نفرت تھی۔ وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھی اور گھٹی گھٹی آواز میں منجھو کو پکارنے لگی۔

"چُپ چڑیل! خبردار جو آواز نکالی" پاس کے پلنگ سے بڑی آپا غرّائی۔

اوہ اب وہ سمجھ گئی! سوتے میں ظالموں نے اُسے منجھو کے پاس سے اٹھا کر یہاں پھینک دیا وہ جلدی سے منجھو کے کمرے کے پاس گئی، دروازے بند تھے اور اندھیرا گھپ تھا۔ مگر منجھو کے ہنسنے اور دولھا کے کھسر پھسر کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"منجھو، منجھو بی یہ میں ہوں، تمہاری شمن........ دروازہ کھولو" منجھو بی کی ہنسی ایک دم رک گئی، مگر دروازہ نہ کھلا۔"

"منجھو بی، شمن ہوں...... دروازہ کھولو" وہ التجائیں کرنے لگی۔

"اے ہے چڑیل جان کو آ گئی ہے اُس کی، ادھر چل۔ اگر اب کے پلنگ سے اٹھی تو لیس کالی کوٹھری میں بند کر دوں گی" بڑی آپا نے گھسیٹ کر اس کی بانہہ پکڑی اور بھگاتی ہوئی لا کر پلنگ پر پٹخ گئیں۔

شمن کا کلیجہ پھٹنے لگا، خوف کی وجہ سے وہ دم گھوٹے سسکیوں سے روتی رہی سب سو رہے تھے مگر اُسے نیند نہ آئی۔ بڑی دیر تک رونے کے بعد چپ ہو گئی مگر سسکیاں نہ رکیں۔ اُسے پلنگ پر لیٹنا دوبھر ہو گیا اور اٹھ کر صحن میں چلی آئی۔ جاڑے اچھے خاصے تھے مگر اُسے بالکل سردی نہ لگی۔ آنگن میں نیم کا درخت بھوت کی طرح پر پھیلائے کھڑا تھا وہ تھوڑی دیر اس کے کھردرے تنے سے لگی اپنی ہتھیلیاں رگڑتی رہی پھر بغیر کسی ارادے کے مرغیوں کے ڈربے پر بیٹھ گئی۔ یہاں پھر آنسوؤں نے حملہ کر دیا اور گہری گہری سانسوں سے نہ جانے کتنی دیر تک روتی رہی۔ سنسان رات میں جب ہر چیز سوئی پڑی تھی اور سوائے مرغیوں کی کڑ کڑ کے بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنا کیا کرے۔ اتنے میں ایک بلی دیوار پر سے کودی، ڈربے میں مرغیاں چونکتی ہو کر کڑکڑائیں، وہ اٹھ کر برآمدے میں واپس بھاگی راستے میں ایک دم اس کی نظر کیاریوں پر پڑی جہاں دھنیا اور ساگ بو یا ہوا تھا اندھیرے میں بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کالا کالا اُون الجھا ہوا پڑا ہے" بڑی آپا کی کیاریاں!"

آناً فاناً میں وہ بجو کی شیرنی کی طرح ہری بھری کیاریوں پر پل پڑی۔ دونوں

ہاتھوں سے اُس نے گھسوٹنا شروع کیا جیسے وہ اپنے کسی دشمن کی آنتیں نکال رہی ہو اور پھر مٹھیوں میں لے کر اُس نے زمین پر رگڑ ڈالا۔ مرچوں کے پیڑ، لوکی کی بیل، چمبیلی اور موگرے کے پودے جس میں سے روز پھول توڑ کر آپا جوڑے میں لگایا کرتی تھیں توڑ موڑ کر پیروں سے مسل ڈالے۔ اب اُسے ہنسی آنے لگی، جیسے کسی نے پچکاریوں سے تازہ تازہ خون اس کے جسم میں بھر دیا، آنسو بھری پھٹی پھٹی آنکھیں وحشت سے بھینگی ہو گئیں۔ گھنے بال ہوا میں سنپولیوں کی طرح لہرا رہے تھے اور وہ بالکل ایک چھوٹی سی مرگھٹ کی ڈائن معلوم ہوتی تھی جو قبر کھود کر مردے کے کلیجے میں ناخون گڑ کر اُسے دانتوں سے چبانا شروع کر دیتی ہے۔ وہ تھک کر شل ہو گئی اور اس کا جی بھی بھر گیا اسے اب بھی بری طرح ہنسی آ رہی تھی۔ سوکھے سوکھے پاگل کتے کے سے بھیانک قہقہے لگا رہی تھی۔

"بس بس، اب ٹھیک ہو گئیں" اُس نے تخیل میں کسی پر دانت پیسے اور پھر وہ وہیں زمین پر لوٹ گئی۔ منجھو نے آج اُسے نہلایا تھا، بال سنوارے تھے، تو بس اب اس کی یہی سزا ہے! اس نے پھر پھر مٹھیاں ریت کی اپنے بالوں میں ڈالیں، خوب کیاری کی کیچڑ میں قلابازیاں لگائیں، زمین پر تھوک کر ہتھیلیوں سے رگڑا اور پھر وہی ہتھیلیاں اپنے منہ، اور گردن پر پھیر لیں۔ اس کا بس نہ تھا جو اپنے جسم کو آگ لگا کر بھسم کر دیتی تب تو منجھو کو پتہ چلتا۔ تھوڑی دیر میں اس کا جی ٹھہر گیا تو تھکن اور غصے کا آیا ہوا پسینہ خشک ہو رہا تھا اور ہوا اس کے جسم میں سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی۔

صبح جب نوکروں نے اُسے کیچڑ میں لتھڑا ہوا کیاریوں کے پاس بے ہوش پایا۔ تو خوف سے اُن کی چیخ نکل گئی۔ ماما سمجھی اُسے کسی نے قتل کر دیا، کیونکہ اُس کے سارے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور ناک سے نکسیر پھوٹ کر ساری ٹھوڑی اور گردن پر خون جما ہوا تھا۔

چار پانچ روز تک اُسے بخار کی وجہ سے ہوش نہ آیا۔ جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو اس کے سینے پر پلاسٹر چپکا ہوا تھا۔ اور منجھو بڑی پریشان بیٹھی تھی۔ اس کا جی خوش ہو گیا بڑی آپا تک فکرمند نظر آ رہی تھی اور رات، رات بھر اس کے سرہانے بیٹھی رہتی تھی۔

پھر تو اُسے ایسا معلوم ہوا دوبارہ کسی کے یہاں اکلوتی پیدا ہو گئی۔ خوب خوب

ضدیں کرتی اور منجھو تو اُسے اچھا ہونے پر اپنے ساتھ سُلانے کا پکا قول دے چکی تھی۔ اس کا دولہا چلا گیا تھا، اور وہ اس کے قریب ہی سوتی تھی۔ بیماری میں خوب لاڈ ہوئے مگر وائے قسمت وہ بڑی تیزی سے اچھی ہونے لگی۔ بخار بالکل غائب اور کمزوری نام کو نہیں، بڑی آپا نے پھر نظر ٹیڑھی کر لی، انار اور انگور ملنے بند اور ساگو دانہ بھی ختم۔ مگر اُسے تندرست ہو کر سخت غصّہ آیا۔ پڑوس میں چُلّا کی ماں رہتی تھی، کیا مزے سے ہمیشہ بیمار رہتی تھی۔ کیا اللہ میاں کو اُسے مرض دیتے کبھی کنجوسی سوجھتی تھی! اُسے اچھا ہونا پڑا۔

۵

جب منجو سسرال جانے لگی تو شمن کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس وقت نوری کا خوب برا حال تھا۔ بری طرح بلکی اور پچھاڑیں کھائیں۔ سب نے اسے مرتے دم تک دھوکا دے دیا۔ پہلے تو سب نے کہا کہ ہاں ہاں نوری بھی جائے گی۔ پھر منجو نے چپکے سے اسے بتایا کہ نوری کو پھسلا رہے ہیں۔ شمن کو بڑا ہی مزا آیا۔ منجو جانے لگی تو نوری پہلے ہی اس سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ ڈری کہ بہلانے کے بجائے سچ مچ لیے جا رہے ہیں۔ مگر گاڑی چلنے سے ذرا پہلے بڑے چچا نے نوری سے کہا۔

"آؤ بیٹی نوری، تمہیں مٹھائی دلائیں۔"

"نہیں نہیں، ہم مٹھائی نہیں لینے،" نوری ایسے بہت چکمے سہہ چکی تھی۔

"بیٹی ہمارے لیے لے آؤ۔ سنگ سنگ چلیں گے،" منجو بی بولی۔

"ٹوکری میں لے چلو گی خالہ جان؟" نوری چہکی اور شمن مسکرائی کہ آئی اب کمبختی بیچاری کی۔ جونہیں نوری چچا کی گود میں گئی گاڑی نے سیٹی دے دی، نوری دھاڑیں مارتی رہ گئی، شمن کا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا، مگر تھوڑی دیر بعد اسے بے اختیار نوری یاد آنے لگی بیچاری نوری، دونوں چلتیں تو مزہ آتا۔

منجو کا گھر اسے بالکل پسند نہ آیا۔ دو تین چھوٹے چھوٹے کمرے اور چھوٹا سا صحن منجو کا دولہا اور منجو کی ساس جسے دیکھتے ہی شمن نے بھانپ لیا کہ یہ دشمن کا مورچہ۔ بڑھیا اسے شروع ہی سے بری لگی۔ اس کے علاوہ منجو کی ساس کا پوتا کلن بھی اسے قطعی پسند نہ آیا۔ لال چقندر رنگ اور نیلی نیلی بلے جیسی آنکھیں، کیا مجال! ایک کمرے میں منجو اور اس کا دولہا، دوسرے میں منجو کی ساس اور کلن سوتے تھے۔ وہیں شمن کا پلنگ بچھا دیا گیا۔ وہ اب کچھ کچھ سمجھ چلی تھی کہ منجو کے دولہا کی موجودگی میں تو وہ کمرے میں سو نہیں سکتی۔ کبھی کبھی اسے تشویش ہوتی، کہ آخر کیوں؟ مگر کبھی کسی نے اسے اطمینان بخش جواب نہ دیا۔

"نہیں منجھو کے پاس نہیں سوتے!"

"کیوں؟" وہ پوچھتی

"بس بک بک نہ کرو" جواب ملتا، اور وہ بک بک نہ کرتی۔

منجھو سے پوچھنے کی کبھی ہمت نہ پڑی، وہ کچھ بدلی سی گئی تھی۔ اگر پاس بھی لٹاتی تو پہلے ہی اسے کہدیتی۔

"دیکھو شمن ہٹ کے لیٹیو، ہاں بھئی مجھے گرمی لگتی ہے" وہ دیسے یوں ہی کبھی دکھاوے کو چمٹا بھی دیتی مگر وہاں اب اُسے گرمی نہ ملتی تھی جس کی کبھی وہ عادی تھی، اس لیے منجھو سے کبھی لاڈ نہ کرتی، کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی مگر منجھو نے کبھی دھیان نہ دیا۔

منجھو کو نادر عرف کدن سے بڑی اس لیے نفرت تھی کہ اس سے بڑا ہو کر بیٹ لیتا تھا۔ کیونکہ اُسے لڑائی جھگڑے سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ کبھی مذاق ہی میں شمن اس سے کشتی لڑنے کہتی تو دبک جاتا۔ بس ہر وقت دادی بیوی کے پاس بیٹھا پان چبایا کرتا۔ کبھی سروتے سے کھیل لیتا۔ اور دوڑ دوڑ کر کام کرتا۔

بڑھیا کو تو شمن نے شروع ہی سے ڈھیل نہ دی، باوجود منجھو کی دھمکیوں کے اُس نے انہیں دادی بی نہ کہا۔ بلکہ ہمیشہ "منجھو کی ساس" ہی کہتی رہی جس پر بڑھیا جل اٹھتی اور منجھو سے اس پر ڈانٹ پڑ جاتی، پھر تو وہ اور ضد باندھنے لگی اور سوائے "اے" یا "وہ" کے کچھ نہ کہہ کر مخاطب کرتی۔

کدن دادی کے ساتھ ساتھ چولھے کے پاس بھی گھستا۔ یہاں تک کہ وہ رفع حاجت کو جاتی تو باہر کھڑا جلدی نکلنے کے تقاضے کرتا رہتا۔ شمن سے تو وہ پہلے ہی دن ڈر گیا تھا جب اُس نے اُس کی چھوٹی سی صراحی چھوئی تو وہ خونخوار بلی کی طرح جھپٹی اور گھونسوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی وہ ایک دم جھجک کر بھاگ گیا تھا اور دادی جی کے کندھے سے لگ کر خوب رویا تھا۔

کدن کی بھی ایک کیاری تھی جس میں اُس نے پودینہ اور کپاس بو رکھی تھی اور شمن کی کیاری میں سیمیں بوئی ہوئی تھیں، کدن کی کیاری پر بڑھیا دولت کا سانپ بن کر پہرا دیتی

کیا مجال جو کوئی چھو بھی جائے۔ ایک دن بڑھیا نے جان بوجھ کر شمن کی کیاری سے دھنیا توڑ لینا چاہا۔

"کدن کی کیاری میں سے توڑو ہماری کیاری میں سے نہیں" وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر کیاری کے آگے کھڑی ہو گئی۔

"اے بیٹی ذرا سا اوں گی کدن تو روٹے گا؟"

"کدن تو روٹے گا!" شمن کے آگ ہی تو لگ گئی۔

"نہیں،" اس نے کچھ ایسے زور سے بڑھیا کو ڈانٹا کہ وہ ڈر کے بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی، کچھ ہی دن میں وہ منجھو کے گھر سے تھک گئی۔ اسے رہ رہ کے اپنا گھر یاد آتا۔ نوری، بڑے بھائی اور منجھلے بھائی ــــ وہ تو اسے اتنا مارتے بھی نہ تھے، پر اس کے موٹے موٹے گال خوب نوچتے تھے۔ بڑی آپا البتہ ٹیڑھی کھیر تھیں، لیکن ان سے ناتا رکھنے کی ایسی ضرورت ہی کیا تھی، مگر یہاں تو بڑھیا اور کدن دو جانیں جن سے اسے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔

منجھو تو دوپہر کو کمرہ بند کر کے سو جاتی اور اس کی ساس والان میں بیٹھی دالیں وغیرہ چنا کرتی، شمن پاگلوں کی طرح کیاریوں کے پاس ٹہلتی یا مرغیوں کو آنگن میں دوڑاتی کبھی باورچی خانے میں جا کر آلو بھوننے لگتی۔ پھر ان سب باتوں سے بھی دل گھبرا جاتا تو وہ خاموش منڈیر پر پیر لٹکا کر بیٹھ جاتی اور سنسان سڑک پر سوکھے ہوئے پتوں کو ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑتے دیکھا کرتی، پاس ہی درختوں پر بندر اچھل کود میں مشغول ہوتے۔ اس ڈال سے پینگ لے کر اس ڈال پر جیسے سرکس میں نٹ جھولتے ہیں ایک دم سے کسی بندر کا ہاتھ چوک جاتا اور وہ بھد سے دیوار پر آن گرتا، تو شمن ہنستے ہنستے دوہری ہو جاتی، کاش وہ بھی بندر ہوتی، ان میں منجھو کی ساس اور کدن سے تو زیادہ اُنس ہو گی، یہ نہیں کہ ہر وقت بس دال بین رہے ہیں یا گیہوں پھٹک رہے ہیں اور وقت ملا تو لال پیلے چیتھڑوں کو جوڑ کر جھاڑ جھنکاڑ بلائیں سی جا رہی ہیں۔

ایک دن کدن نے اپنی رنگین شیشے کی گولیوں کا ڈبہ نکالا اور بولا۔

"آؤ شمن کھیلیں؟"

شمن اُسے منہ تو نہ لگاتی مگر لال ہری گولیوں کو دیکھ کر اتر آئی بڑی دیر تک ایک ایک گولی آنکھ سے لگا کر اس میں دوڑتے ہوئے رنگ دیکھتی رہی جیسے قوس قزح کی چھاتی سے ان کے اندر کسی نے دائرے کھینچ دیئے ہوں! ایک تو بالکل ایسی تھی جیسے ریشم کا پھندنا شیشے میں بند کر دیا ہو اور دیکھتے دیکھتے وہ پھندنا زندہ کیڑے کی طرح رینگنے لگتا۔

"کدن آؤ ان گولیوں کو کیاری میں بو دیں۔"

"کیاری میں؟!"

"ہاں پھر پیڑ اگیں گے تو ہزاروں گولیاں بیروں کی طرح لگیں گی او جب بس پھر اپن توڑ توڑ کر جمع کر لیں گے 'ہاں'۔"

"پر دادی بی ماریں گی جو!"

"ہونہہ دادی بی کو کیا پتہ چلے گا مگر ہاں جب پیڑ اگیں گے تو بس خوشی کے مارے وہ مر جائیں گی، دیکھ لینا، ہاں،"

"تو چلو——" کدن آج بنا دادی بی کے ہی کچھ کرنے کو تیار ہو گیا شمن کو اس پر کچھ یونہی سا پیار آنے لگا گولیاں بو کر انھوں نے خوب سا پانی ڈالا اور گھٹنوں پر کہنیاں رکھ کر انتظار میں بیٹھ گئے۔

شمن کو گولیاں اُگتے دیکھنے کا بہت شوق تھا جب اُس نے دھنیا بویا تھا تو صبح ہی صبح کیاریوں کو دیکھنے گئی تھی مگر کلا بھی نہ پھوٹا تھا اُسے ڈر لگا کہیں دھنیا خراب تو نہیں تھا لیکن تیسرے چوتھے دن اس نے دیکھا باریک باریک کپاسی رنگ کے ٹانکے زمین پر اٹھے ہوئے تھے ننھے ننھے کنڈے زمین کا سینہ چیر کر باہر نکل آئے تھے ان میں سے دو چار تو بالکل ہی جھکے ہوئے تھے جیسے کوئی اُن کی گردنیں پھنسائے ہوئے کھینچ رہا ہو اُن کی کمر دن پر پیلا زرد زرد رہا تھا شمن نے چاہا تنکے سے انھیں سہارا دے کر اُن کے سر چھڑا دے مگر وہ کٹ سے بیچ میں سے ٹوٹ گئے، اس کا دل اُس روز کسی کام میں نہ لگا اور وہ کیاریوں کے پاس بیٹھی ان کنولوں کے زمین سے ابھرنے کی کشمکش دیکھتی رہی کچھ تو جب وہ شستہ کرنے کی نکل آئے اور کچھ ابھی کشتی لڑ رہے تھے، ان میں سے ایک تو بالکل زندہ کیڑے کی طرح باہر کو اپنا نازک جسم کھینچ رہا تھا اور دیکھتے دیکھتے بل کھا کے سپولیے کی طرح نکل آیا شمن نے ٹھنڈی سانس لی جیسے گلے کا سارا زور دی لگا رہی تھی گلے لی ناک میں۔ جنینے کے چھلکے کا بلاؤ اٹکا ہوا تھا جو تھوڑی دیر میں اس نے

جھٹک کر پھینک دیا اور وہ پھر تن کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ تنومند سپاہی کی طرح پھیلا دیے۔

آج وہ گولیوں کے کلّوں کا پھوٹنا دیکھے گی، چکنے چکنے کاہی کے رنگ کے حلقے جیسے چوڑی موڑ کر کنڈا بنا دیا ہو۔ وہ ان کنڈوں کو پرو کر ہار بنائے گی، نہیں نہیں پھر پیڑ کیسے بڑھیں گے اور پھر جامنوں کی طرح رنگ برنگی گولیوں کے گچھے اُس کی آنکھوں کے سامنے جھومنے لگے

تیسرے پہر تک تو کلّے پھوٹے نہیں، پھر اسے نیند آ گئی، جب شام کو وہ اٹھی تو اس کا کلیجہ پھٹ گیا۔ منجھو کی ساس مصالحہ پیسنے کے پیالے میں بیٹھی گولیاں دھو رہی تھی۔ ہیں! شاید چڑیل انھیں گوشت میں بگھارنے جا رہی ہے۔ شمّو اس پر پل پڑی۔

اس کے بعد نہایت ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ اُس نے منجھو کی ساس کی کلائی چبا ڈالی اور منجھو نے اُس کا مُنہ چانٹوں سے توڑ کر رکھ دیا۔

آج اس کا دل و دماغ سب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ہونہہ، گولیاں نہیں بوئی جاتیں، اس کا بس چلے تو منجھو کی ساس کو اٹھا کر بو دے، اور پھر وہ سوچنے لگی ـــــ اُس نے گڑھا کھود کر منجھو کی ساس کو بو دیا ہے...... دوسرے دن کلّا پھوٹ رہا ہے...... بھورا بھورا چھینٹوں دار ـــــ سپیرے ٹوکری میں اژدہا لیے پھرتے ہیں نا ـــــ بالکل ویسا' ـــــ شمّو خوشی سے دیوانی، دیکھ دیکھ کر مری جا رہی ہے، پھر وہ بڑھتا بڑھتا نیم کے پیڑ سے بھی اونچا ہو گیا اور نبولیوں کی طرح گچھے کے گچھے مرگھلی سڑی ہوئی کبڑی بڑھیوں کے لٹکنے لگے۔ ایک لمبا سا بانس لے کر وہ انھیں جھاڑنے لگی جیسے پکّی پکّی املیاں۔ سارا آنگن بڑھیوں سے پٹ گیا، ہزاروں، لاکھوں کھانستی چھینکتی بڑھیاں۔ کوئی پاندان کھولے جلدی جلدی پان لگا رہی ہے، کوئی چوکی پہ بیٹھی چھالیا کتر رہی ہے، آٹھ دس باورچی خانے میں گھسی ہنڈیوں کا ناس مار رہی ہیں، دو چار اچار کی مٹکیوں کے پاس پھدک رہی ہیں، مُٹھی مُٹھی مکڑیوں کے برابر بڑھیاں سارے گھر میں اُدھم جوت رہی ہیں اور وہ ایک دم اُن بڑھیوں سے گھبرا اٹھی اور دونوں ہاتھوں سے انھیں دور دور کرنے لگی۔

شکر ہے جو اُس نے بڑھیا کو بونے کا خیال جلدی پرے کر دیا۔ ورنہ غضب ہو گیا تھا۔ ایک ہی بڑھیا نے اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ اُسے کدّن پر بھی بہت غصہ آیا کہ اس نے اپنی بھتیجی کو بتا کیوں دیا۔ جی چاہا ناخونوں سے اس کی کنجے بلوٹے جیسی آنکھیں نکال کر گولیوں کی جگہ بو دے۔

۶

اُسے آہستہ آہستہ منجھو سے اور نفرت ہونی شروع ہوئی یہاں تک کہ اس کا کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سب اُسے قابلِ اعتراض لگنے لگا۔ وہ روز بروز موٹی اور کاہل ہوتی جاتی بڑھیا ساس ماما کی طرح اس کے آگے پیچھے لگی رہتی مگر اس کا منہ کسی وقت سیدھا نہ ہوتا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ منجھو پیلی پیلی مٹی کا ٹکڑا چبا رہی ہے۔ شمن کا دل ہل گیا، اُسے یاد تھا کہ جب وہ خود مٹی کھایا کرتی تھی تو سانپ پیدا ہو گیا تھا۔ اور اب منجھو مٹی کھا رہی تھی۔

"منجھو بی مٹی کھاتی ہے" اس نے چپکے سے کدن سے کہا۔

"کون، میری بچی؟"

"ہاں، اور جبھی تو اس کا پیٹ پھول گیا ہے، دیکھ لینا اس کے پیٹ میں سے ایک دن یہ بڑا سارا سانپ نکلے گا۔" کدن نے دادی بی سے جڑ دیا۔

"دادی بی شمن کہتی ہے بچی کے پیٹ میں سے سانپ نکلے گا۔"

"خاک پڑے شمن کے منہ پر، کیوں رے، منع کیا کہ اس دیوانی سے مت بولا کر رے مگر سنتا نہیں تو لونے، ـــــ دیکھلا بہن کے لیے مردار ایسی باتیں منہ سے نکالتی ہے۔"

بڑھیا گھنٹوں بیٹھی بڑبڑاتی رہی۔ مگر شمن کی فکر نہ گئی وہ چھپ چھپ کر منجھو کا پیلا اترا ہوا چہرہ اور مریل جسم دیکھا کرتی، اُسے اس کے پیٹ میں موٹے موٹے پھنکاریں مارتے ہوئے سانپ بل کھاتے نظر آتے پھر اُسے منجھو سے اور نفرت ہو گئی مگر کسی کو اس کے متعلق فکر نہ تھی بلکہ بڑھیا تو اور خوش نظر آتی تھی کہ مزے سے سارے گھر میں اسی کا راج ہے وہ جان بوجھ کر اس کے لیے سڑی سڑی مرچوں دار نقصان دہ چیزیں پکاتی اور خود بھی تو چرا کر کھاتی ہوگی۔

اُس کی اماں آئیں اور منجھو ایک دن بہت زور سے بیمار پڑی۔

"کہ دن آج دیکھ لینا، تمہاری دادی بی سچ کہتی تھیں یا ہم ——— اتنا بڑا سانپ ہے کہ کیا بتائیے جبھی تو منجھو بی رُو رہی ہے بچاری!"

"چچا تو دورے پر گئے ہیں، کون مارے گا سانپ کو؟"

"تھانے میں سپاہی جو موجود ہیں جناب" اس نے نہایت اطمینان سے کہا اور وہ سپاہیوں سے نہایت رازدارانہ انداز میں بولی۔

"تم اپنی بندوقیں لے چلنا، اچھا"

"کیوں، داروغہ جی نے اس سے پوچھا۔

"سانپ مارنے کے لیے ہماری بہن جو ہیں نا، منجھو بی، ان کے پیٹ میں سانپ ہے، باہر نکلنے والا ہے۔"

داروغہ جی نے سُوّر کی طرح تھوتھنی اٹھا کر کھوں کھوں ہنسنا شروع کردیا دوچار سپاہی بھی ہنسنے لگے۔

رات کو ایک دم جو شمن کی آنکھ کھلی تو گھنٹیوں کے بجنے کی آواز آرہی تھی۔ اور منجھو کے کمرے میں غدر مچا ہوا تھا وہ چیخیں مارتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف بھاگی، دوچار عورتوں نے اسے پکڑ کر دبوچ لیا، مگر وہ "منجھو بی، ہائے میری منجھو بی" کی رٹ لگائے رہی معلوم ہوتا تھا باہر بھی سارے سپاہی ایک دم جاگ اٹھے اور ٹھائیں ٹھائیں بندوقیں چلنے لگیں۔ وہ سہم کر چپ ہوگئی۔

"کیا مرگیا؟" اس نے ایک عورت سے پوچھا۔

"کیا؟ کون؟"

"سانپ" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اری بیٹی، اس سے کیا سر مار رہی ہے، یہ دُلہن کی بہن ہے رموئی دیوانی" منجھو کی ساس نے کہا اور بھاگی کسی کام کو۔ آج وہ بڑی اترائی ہوئی پھر رہی تھی، اتنے میں اس کی اماں باہر نکلیں، وہ بھی شپٹائی ہوئی تھیں "اماں، منجھو بی" اس نے سُبکی روک کر پوچھا۔

"اچھی ہے منجھو بی! چل منّا سا بھانجا تو دیکھ۔" آج امّاں خوشی سے پھُولی نہ سماتی تھیں وہ اُسے ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئیں۔

"اُف!" حیرت سے اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ننھا مُنّا سا چینی جیسا ہوا ایک عورت کی گود میں رکھا تھا! منجھو چپکی پڑی تھی۔

"اور سانپ" اُس نے ڈرتے ڈرتے امّاں سے پوچھا۔

"چل بگّی۔"

"یہ منّا کہاں سے آیا؟" اس نے دوسرے دن پُوچھا۔

"یہ وہ جو میم صاحب تھیں نا وہ منجھو بی کے لیے لائی تھیں ___"

"اچھا ___ تو امّاں ایک ہمیں بھی منگا دو ___ منجھو کی ساس تو اُسے چھُونے نہیں دیتی ___"

"اچھا منگا دوں گی ___" امّاں نے کہا اور دو چار عورتیں ہنس پڑیں۔

"تو پھر سانپ یقیناً سپاہیوں نے مار ڈالا جبھی ٹھائیں ٹھائیں بندوقیں چلی تھیں۔ اچھا" مگر یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اتنی کلوٹی میم صاحب اتنا سفید بچّہ کہاں سے اڑا لائیں۔ دوسرے منجھو بی تو بالکل پچک کر رہ گئی تھی۔

"دو اور دو چار" اُس نے حساب لگا لیا۔ مگر ہے ضرور کچھ گڑبڑ! اب منجھو بی کے یہاں اس کا قطعی دل نہ لگا اور وہ امّاں کے ساتھ گھر چلی آئی۔

۷

منجھو بی کے یہاں سے واپس لوٹی تو ایسا محسوس ہوا گویا اُسے ہمیشہ کے لیے دفن کر آئی
مگر تعجب ہے اُسے ذرا بھی افسوس نہ تھا ع

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

اتنا چھینا کہ بالکل ہی کنگال کر دیا۔ اچھا ہی ہوا۔ ایک روگ سا دور ہو گیا۔ یہ تو اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اب منجھو اُسے نہیں مل سکتی، اس کے حصول کے لیے جان کھپانی ہی فضول ہے جیسے پتھر میں جونک لگانے کی کوشش۔

بیوہ ہو کر بڑی آپا مستقل طور پہ میکے آن رہی تھیں، وہ شمن کی نگراں بن گئیں امّاں کو تو دنیا کا بس ایک کام آتا تھا اور وہ بچے پیدا کرنا۔ اس کے آگے نہ انھیں کچھ معلوم اور نہ ہی کسی نے بتانے کی ضرورت محسوس کی۔ ابّا جان کو بچوں سے زیادہ بیوی کی ضرورت لاحق۔

شمن کو بڑی آپا پر کبھی بھروسا نہ ہوا۔ ویسے تو برابر یہی جتاتیں کہ انھیں شمن کی بہتری مقصود ہے اور اس کی عاقبت سدھارنا چاہتی ہیں لیکن اصل میں اسے نوری کے لیے درسِ عبرت دینے کا بہترین آلہ بنا رکھا تھا۔

"کہنا نہیں مانوگی تو شمن کی طرح پھٹکاریں گے سب۔"

"نہاؤ گی نہیں تو شمن کی طرح جوئیں پڑ جائیں گی۔"

"پڑھو گی نہیں تو شمن کی طرح جاہل رہ جاؤ گی۔"

"پھر تم نے شمن کی طرح ضد کی۔"

"شمن کی طرح جھوٹ بولنا خوب آتا ہے ـــــ" اور

"یہ شمن ہی تمہیں بگاڑتی ہے خبردار جو اس کے ساتھ کھیلیں۔"

یہی نہیں وہ اور آگے بھی نہ چوکتیں، اماں جان پر طعنے کسے جاتے۔

"بھئی میں امّاں تو ہوں نہیں جو تمہیں بھی ــــ"

"مجھے امّاں جیسے چونچلے تو آتے نہیں، وہ کہتیں حالانکہ دونوں بچّوں کو تخمی آم کی طرح ہر وقت چوپا چاٹا کرتیں۔

اس پر شمن کی امّاں شرمندہ اور کھسیانی ہو کر اس کی موت کی دعائیں مانگتیں حیران کی زندگی کا سہارا یہ فخر تو تھا کہ اتنی الابلا کے ساتھ انھوں نے بڑی آپا جیسی ہیرا سی بیٹی بھی تو جنی۔

مگر یہ ہیرا سی بیٹی اٹھتی جوانی میں رانڈ ہو گئی، دو بچے مرحوم نے اپنی نشانی چھوڑے جنھیں وہ چیل کی طرح نگہبانی کر کے پال رہی تھی۔ بچے کیا تھے تہذیب اور فرماں برداری کے دو چرخے تھے، سوت پر سوت کات لو کیا مجال جو تکلا ٹیڑھا ہو جائے، روز صبح اٹھ کر کھٹا کھٹ سب کو سلام کرنا، کوئی مہمان آئے تو فوراً اُسے خالہ، ممانی، چچی، دادی حسب حیثیت و عمر خطاب دینا جھٹ پٹ ــــ "آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ" ــــ اور "لب پہ آتی ہے دعا" سنانا اور پھر

"نوزی ناک کو کیا کہتے ہیں؟"

"نوز"

"کان کو"

"ایر"

"دانت کو؟"

"چیک"

"نہیں بھئی چیک تو گال کو کہتے ہیں، دانت کو ــــ؟"

"ٹیتھ" منّو جلدی سے بولتا۔

"شاباش بھئی واہ، بھئی واہ ــــ" مہمان مست ہو کر جھوم اُٹھتے۔

"اچھا چلو اب ٹوئنکل ٹوئنکل سناؤ ــــ کرسی پر کھڑے ہو کر اور بھئی اشارے کرتی جانا ــــ"

پھر نوری کرسی پر بندریا کی طرح پھدک پھدک کر انگریزی گانے سناتی اور منہ، جسم کے مختلف حصوں کی انگریزی بتاتا۔ حالانکہ اس وقت اس کی تمام تر توجہ ان لڈوؤں پر ہوتی جو مہمان کے سامنے رکھے ہوتے اور اس کا ہاتھ کمربند سے کھیلتا ہوتا۔

لیکن عموماً مہمانوں کے آنے کے وقت شمن کہیں کھو جاتی۔ اور میلی کچیلی گھومتی ہوئی اگر آ بھی نکلتی تو کوئی اس کا تعارف ہی نہ کراتا، بہت سی بڑی آپا کی سہیلیاں اُسے پڑوسن کی لڑکی سمجھ کر کبھی بسکٹ وغیرہ دے دیتیں تو فوراً بڑی آپا یاد دلا دیتیں۔

"بس جاؤ اب کھیلو" اور وہ کھیلنے چلی جاتی۔

بڑی آپا غریب کی زندگی کا سہارا یہ دو ننھی ننھی جانیں ہی تو تھیں اور ان کی زندگی میں رہ ہی کیا گیا تھا سوائے آہوں اور سسکیوں کے یہ عمر اور رنڈاپا؟ مگر وہ اب پہلے سے بھی زیادہ بدمزاج ہو گئی تھی، گویا بیوہ ہو کر وہ بڑا تیر مار کر آئی تھی، چوڑیاں اور رنگین دوپٹہ نہیں اوڑھتی تو یہ سب لوگوں کے اوپر احسان نہیں تھا تو کیا تھا۔ رنڈاپے میں زندگی کے دن گزار کر وہ مرے ہوئے میاں کے ساتھ ساتھ جیتے جاگتے ساس سسر اور ماں باپ کا بھی سوگ کر رہی تھی، جب کوئی خوشی کا تہوار آتا وہ اپنا ناٹک شروع کر دیتی ایک کونے میں منہ لپیٹ کر پڑ جاتی اور بین شروع کر دیتی۔ جلدی سے گھلی ہوئی مہندی پھنکوا دی جاتی، چوڑی والی کو ہش ہش کر کے ٹال دیا جاتا، سویوں کا زردہ پکنا ملتوی ہو جاتا، عید کی جوتی ایسے مل جاتی گویا اماں پہ قرض آئی تھی یا وہ اپنی جان کا صدقہ دینے پر مجبور رہیں۔

مگر بن باپ کی معصوم بچی نوری کے خوب لاڈ ہوتے اس کے بہلانے کو خوب مہندی گھلتی اور اس کے ہاتھوں پر بیل بوٹے بنائے جاتے مگر شمن کے مہندی لگانے کے خیال کو اس قدر فضول اور حقیر سمجھا جاتا کہ وہ خود لگوانے سے انکار کر دیتی۔

"بری لگتی ہے ہمیں کیچڑ جیسی مہندی" وہ نفرت سے کہتی۔

"واہ! کبھی جب ہاتھ دھو ڈالو تو کیسے پیارے لگتے ہیں" نوری اپنے لال ہاتھوں کو دیکھ کر کہتی

"ہونہہ، گنواریوں جیسے لال ہاتھ، جیسے پان کی پیک تھیچڑ دی ہو ہی — ہمارے

"تو میموں جیسے صفا ہاتھ" گو وہ خوب جانتی تھی کہ میموں کے ہاتھ قطعی اتنے گندے اور کالے

نہیں ہوتے لیکن جب وہ ایسی باتیں کرتی تو بیچاری نوری کی مہندی کا مزہ بھی کرکرا ہو جاتا اور یوں اس کا بھی کچھ ٹھنڈا ہو جاتا۔

کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ بڑی آپا رنگین دوپٹہ نہیں اوڑھتی تھی تو اس نے بالکل سنیاس ہی لے لیا تھا، اس کے سفید کپڑوں میں بھی وہ رنگینیاں ہوتیں وہ کھل اٹھتی ورنہ ایک دفعہ تو نئی دلہن کا سہاگ کا جوڑا بھی ماند پڑ جاتا، سفید کریپ یا شفان کا دوپٹہ جس پر بیچاری بیوہ نازک سی مبئی کی بیل چپکا لیتی، سفید چکن کا ریشے کا کرتا، سارا گلا مہین مہین بیلوں اور ریشمی ڈوریوں سے آراستہ، قدم قدم پر ستاروں کے جال اور موتیوں کے...... پھندنے ـــــ ہاں پاجامے پر رنڈاپا اتارنے کی ضرورت نہیں، سبز کاہی یا آسمانی پوت کا جھول دار پاجامہ، ہاتھوں میں وہی رنڈاپا اتارتے وقت جو ماموں نے دو دو نازک سی بانکیں ڈال دی تھیں، پڑی ہوئی تھیں اور مرنے والے کی نشانی زمرد کی انگشتری اور بس۔

ہاں سنجھلی بوا اگر کبھی زبردستی آویزے پہنا دیتی تو خیر ورنہ وہی اپنی موتیوں کی لونگیں پڑی رہتیں، سیاہ گرگابی اور سفید پھول دار موزے، ریشمی ہوئے تو ریشمی ورنہ سوتی ہی سہی، مانگ کی تو بیچاری کو اجازت نہ تھی، ویسے کون روکتا تھا۔ پر اس کا اپنا ہی جی دل مردہ ہو گیا تھا، اس لیے بال اوپر چڑھا کر چھوٹے چھوٹے گچھے کانوں پر چھوڑ دیتی بس اتنے نیچے کہ کانوں کی لوئیں جھانکتی رہیں، روتے روتے آنکھیں خراب ہو گئی تھیں۔ اس لیے کہیں آنے جانے وقت سنہری زنجیر والی عینک لگا لیتی تھی۔

پر جب بڑی آپا رنڈاپے میں یوں سج دھج کر نکلتی تو لوگ دانتوں تلے انگلی دبا لیتے، "ارے وہ تو سادے چیتھڑوں میں پھوٹی نکلے ہے۔" ایک دفعہ سنجھلی بوا کا پیغام لائیں تو بیویاں بڑی آپا کو دیکھ کر اس پر پھسل پڑیں۔

"اماں نے کہا تو اور سنو، وہ نگوڑی تو بیوہ ہے۔" بڑی آپا فخریہ اس غلط فہمی کا ذکر کیا کرتی کہ لوگ اسے دو بچوں کی ماں کو کنواری سمجھ لیتے تھے اس کا منہ تھا بھی تو کچا کچا کنواریوں جیسا۔

جو ہی کوئی آپ کے دولھا کا ذکر کرتا اماں ٹھنڈی آہیں بھرنے لگتیں اور الٹی سیدھی

مرنے والے کی تعریفیں شروع کر دیتیں۔

"زبان تو گز بھر کی ہے ۔ کیسا ہی چاہیں اور سینہ پہ چوڑا مُنہ پہ طباق سا"

اماں سدا کی گپی تھیں۔ اور ہمیشہ بات میں کئی پھندنے لگا دیتیں دو انگل کی چیز کو گز بھر کی بنا دینا تو ان کے لیے کوئی بات ہی نہ تھی۔

"فلانی ــــ جیسے الٹا توا ــــ اُلٹی جیسے میدہ شہاب" حالانکہ نہ فلانی بیچاری اُلٹے توے جیسی اور نہ اُلٹی میدہ شہاب، مگر پھر بھی لوگ اُن کی باتوں کا یقین کر لیتے تھے اور وہ شریف بزرگوں میں گنی جاتی تھیں۔

کپڑوں کے معاملے میں تو اماں نے کبھی سچ بول کر ہی نہیں دیا۔

"یہ تین روپے گز ہے، دلی سے منگایا ہے" حالانکہ سب جانتے تھے کہ کٹ پیس بیچنے والی چُندھی بڑھیا چار روپے سیر کے حساب سے دے گئی ہو گی۔ اماں کا ایک جھوٹ ہوتا تو بنایا جاتا۔

آپا بڑی تو جبر میاں کے فراق میں گھُل گھُل کر بدمزاج ہو گئی تھی، مگر یہ نوری اور منوّر کو لسارنٹلا پالو ٹا تھا جو دو چنگیز دوراں بن کے سینوں پر کھڑے مونگ دلتے تھے، جس کی چیز جب جی چاہتا مچل کر مانگ لیتے اور وہ مل جاتی، بات یہ تھی ان کا باپ جو مر گیا تھا، پر یہ مردہ باپ سو بابوں پر بھاری تھا۔ سارا گھر بلکہ سارا کنبہ مرنے والے کے بھوت سے لرزتا تھا، اور کبھی تو شمن بلبلا کر دعا مانگتی کہ کاش وہ بھی بیوہ ہو جائے یا کم از کم ماں باپ ہی مر جائیں، پھر ذرا وہ خبر لے لوگوں کی۔

بڑی آپا ماں باپ کی عزت سمیٹے بیٹھی جیسے سارے گھر کی جان پر احسان کر رہی تھی نفس کو مار کر اس میں حکومت کرنے کی طاقت بڑھتی جا رہی تھی یوں وہ باپ کی عزت کی خاطر اپنی نسوانیت کا خون کر رہی تھی مگر شمن اس کی ذرا بھی احسان مند نہ تھی شوق سے وہ کوٹھے پر جا بیٹھتی تو بھی شمن کو پروا نہ ہوتی۔ اس کی بلا سے اور پھر بڑی آپا کے بچوں سے زیادہ خوش نصیب شاید ہی کوئی ہو گا ــــ آہ ــــ بیوہ اور یتیم!

۸

اس کی قسمت سے جو چیز زندگی میں آئی تھی طوفان کی طرح آئی، یکایک لوگوں کو اس کی تعلیم کا خیال آیا اور بس طاعون کی طرح سب کے دماغوں کو جکڑ لیا، ابھی تو اس کے پیچھے "پڑھو" کا ڈنڈا لے کر پل پڑے، بڑی آپا تو پڑھا پڑھا کر نوری سے مقابلہ کر کے ذلیل و حقیر زیادہ کرتیں، مولوی اور ماسٹر بھی آ کر اپنے دانت اس پر تیز کرتے۔

"چل پرجا" کیوں؟ وہ معلوم کرنا چاہتی۔

"یہ اس کا دیور ہے" ہوا کرے۔ شمن لو کیا۔ اس کا دیور تو نہیں۔ وہ جل جاتی اسے کسی کے دیور سے کیا ناتا جوڑنا تھا جو وہ یاد کرتی۔

"دس تک گن" بس اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا اور اس کا جی چاہتا، ایک ہتھوڑی لے کر کھٹاک کھٹاک ماسٹر صاحب کی کھوپڑی پر سو تک گن دے ——— اور پھر پانچ چھکے تیس۔ یہ لیجیے یہ کیوں؟ پانچ چھکے سو کیوں نہیں؟ ——— پھر جوڑنا، گھٹانا، ضرب، تقسیم۔ کاش اُسے معلوم ہوتا کہ وہ کس کی بوٹیاں بانٹ رہی ہے اور کس کا خون گھٹا رہی ہے تو شاید اس کو رحم آ جاتا اور وہ کچھ دلچسپی لینے لگتی مگر دلچسپی نہ لینا ماسٹر صاحب کی موجودگی میں ممکن نہ تھا۔ جو نہ آتا تو وہ کسی کا سوال آنکھ ٹیڑھی کر کے نقل کر لیتی اور سب کے بعد میں جا کر اپنی سلیٹ دکھاتی مگر بعض وقت ماسٹر صاحب کچھ تاڑ جاتے اور اس کی ہی سلیٹ کے پیچھے پڑ جاتے، اس وقت بڑی مصیبت آتی اور وہ گھبرا گھبرا کر ہتھیلیوں میں تھوک لے کر سلیٹ پر تھوپنے لگتی، ایسے موقعوں پر عموماً اس کا حلق سوکھ جاتا جس پر جھلا کر پیٹ میں درد یا اور کوئی حاجت محسوس کرنے لگتی لیکن ماسٹر صاحب کے چانٹوں کا جادو مسیحائی کا کام کرتا اور دم بھر میں تکلیف چھو منتر ہو جاتی۔ ایک نوکر کے لڑکے کا نام لوٹا تھا جو دق کی طرح ہر وقت اپنی ماں کے کلیجے پر ماتم کیا کرتا تھا، بس عبارتی سوال تو اس کی جان کو لوٹا بن کر چپک گئے تھے اور بے طرح اس کی روح کو جھنجھوڑیاں دیتے۔

کم کا ضرب، زیادہ کی تقسیم۔
مگر یہ اُس کی سمجھ میں کبھی نہ آیا کہ کم اور زیادہ میں فرق کتنا ہے۔
"ایک پیسے کی دو نارنگیاں تو ڈیڑھ روپے کی کتنی؟"
اوّل تو سرے سے یہ جھگڑے ہی اس کی قسمت میں نہیں لکھے کہ وہ ایک پیسے کی دو نارنگیاں خرید سکے دوسرے زیادہ سے زیادہ دو پیسے کی نارنگیاں کافی ہوتیں بھلا ڈیڑھ روپے کی کون بھر گاڑی نارنگیاں خریدنے کا۔ سڑ نہیں جائیں گی ساری کی ساری.....
پچھلی گرمیوں میں آگرے والی خالہ نے دو ٹوکرے خربوزے بھیجے سارے سڑ سڑ کر ہی تو پھکے۔ مگر تو دو آہی آسے آگرے والی خالہ کا چودھری داڑھی والا میاں یاد آ جاتا جس کی تیمم کی ہنسی کی اُس نے اور نوری نے کلیاں بنا ڈالی تھیں اور شاید اسی دن سے اُنھوں نے خربوزے بھیجنے بند کر دیے۔ اچھے ہوتے تھے بیچارے خربوزے بیچ زمین پر پیس پیس کر چھلیوں میں دھوئے جاتے تھے اور پھر......
ترٹ سے ایک چانٹا پڑتا اور وہ خربوزے کے بیجوں پر سے پھسلتی ہوئی جاگ پڑتی اور اس موقع پر سلیٹ کی نوک جو ناک میں نشانہ باندھے ہوئے کھچی ہوتی اس کی ناک میں آ لگتی۔"
"سُن ..... اگر تجھے ایک پیسہ دیا جائے تو تو کتنی نارنگیاں خریدے گی" اگر خدا کی قدرت جوش مارتی اور واقعی اُسے پیسہ دیا جاتا تو وہ بھلا پاگل ہوئی تھی جو کھٹی چپٹی نارنگیاں لیتی۔ اور کیا سچ تو ہے، بھلا پیسے کی دو والی نارنگیاں کھٹی نہ ہوں گی تو اور کیسی ہوں گی، ماسٹر صاحب تو سدا کے سڑی تھے۔ خواہ مخواہ کھٹی نارنگیاں خریدوائے دیتے تھے۔ پیسہ ملتا تو کبھی سے فیصلہ کیے بیٹھی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے تتا ہوئی پسنے لگی گزک خریدے گی اور چھپنے کے بہانے ایک ریوڑی بھی مانگ لے گی۔
"ارے بول ..... کتنی نارنگیاں آئیں گی؟"
"نارنگیاں؟......ہاں ..... وہ" ابھی وہ فیصلہ بھی نہ کر چکتی کہ نارنگیاں لے ہی ڈالے یا گزک کہ لیے پیسہ اٹھا رکھے کہ ماسٹر صاحب بے صبر ہو جاتے۔

١١٠٨٦

"کوڑ سنز کہیں کی ـــ ارے ہاں نارنگیاں ـــ ایک پیسے کی دو تو ڈیڑھ روپے کی؟"

"ڈیڑھ؟ ـــ ڈیڑھ روپے کی! ذرا سوچیے۔

"ہاں ڈیڑھ روپے کی' اتنے پیسے کے آنے بنالے آتے ہیں؟"

ماسٹر صاحب کے سامنے "نہیں" میں سر ہلانے کی اجازت نہ تھی۔ لہٰذا "ہاں"

"تو پھر بتا!"

اور وہ آنے بنانا شروع کرتی ـــ کافی تو ہوں گے ڈیڑھ روپے کے آنے۔ خاصے ڈھیر سے' اور کیا! ـــ عید پر کوئی گیارہ آنے ہو گئے تھے تو داسکٹ کی جیب لٹک گئی تھی' اماں نے نہ جانے کس کام کے لیے تین آنے قرض مانگے تھے تو اس کی جان نکل گئی تھی' اماں بھیں بھی چھٹی ہوئی نادہند۔ جہاں کسی کے پاس چار پیسے دیکھے اور اُن پر غریبی چھا گئی۔ پھر واپس دینے کی نوبت کبھی نہ آتی۔ کون تھا جو تقاضا کر سکتا

"اری بول ڈیڑھ روپے کے کتنے پیسے ہوئے؟"

"ڈیڑھ روپے کے پیسے؟"

"ہاں کم بخت"

"سولہ" وہ اُٹھتے ہوئے تھپڑ سے بچ کر کہہ دیتی۔

"سولہ' سولہ پیسے ہیں؟!" اور ماسٹر صاحب پر بھوت سوار ہو جاتا جیسے سولہ پیسے دے کر کوئی انھیں ٹھگے لے رہا تھا۔ وہ جی بھر کر مار چکنے کے بعد خود ہی پیسے بنالیتے۔

"چھیانوے منحوس! اچھا اب بتا تیرے پاس اتنے پیسے ہیں' وہ پیسے میں دائی کا چانٹا وصول کر لیتے۔

"ہاں"

"اب تو بازار جاتی ہے"

"ہاں" گو اُسے یقین تھا کہ کوئی اُسے بازار نہ جانے دے گا اور نہ ہی اتنی کٹائی کے بعد اتنی ہمت رہ جاتی۔ دوسرے یہ سب بہانے بنائے جا رہے ہیں اُسے الّو بنانے

کے لیے۔ مگر اُسے فرض کرنا ہی پڑتا کیونکہ فضا میں چیانٹا منڈلاتا نظر آتا۔

"اب تو دہاں ایک پیسے کی دو کے حساب سے نارنگیاں خریدی ہے"

جا! پھر وہی گھٹی نارنگیاں! خیر وہ مجبوراً خریدی۔

"کتنی ہوئیں؟"

"ایں؟" وہ ایسی شکل بناتی گویا بس کوئی دم میں سوچ کر بتا ہی تو دے گی۔

"نارنگیاں؟"

"ارے بتا، کتنی ہوئیں تین نارنگیوں کے حساب سے؟ بولائے ماسٹر صاحب۔

"تین؟" وہ ہچکچا کر سوچتی "تین نارنگیاں ہاں" وہ ڈرتے ڈرتے کہتی۔

"تین! ڈیڑھ روپے کی تین نارنگیاں؟"

"نہیں ــــ نہیں" وہ گڑگڑا کر ماسٹر صاحب کے دار کھینوں پر رکھتی۔

"تو پھر ــــ بتا بتا ــــ فوراً"

اسی طرح شام ہو جاتی، ماسٹر صاحب پسینے میں ڈوب کر نڈھال ہو جاتے جیسے کسی نے کٹھن چکر میں باندھ کر گھما ڈالا ہو۔ اُن کے اعصاب بے قابو ہو کر لٹے سے ملنے لگتے، معلوم ہوتا اتنی دیر وہ بچّوں کو پڑھا نہیں رہے تھے بلکہ اپنا نوشتۂ تقدیر پڑھ رہے تھے پست ہو کر وہ دوسرے دن نارنگیاں جبراً خریدوانے کا پختہ وعدہ کر کے چلے جاتے۔

جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج، ــــ جہلم، چناب، راوی، ــــ ایک کے بعد دوسرا۔ دوسرے کے بعد تیسرا جیسے تسبیح کے گول گول دانے۔ جہلم، جہلم کے بعد چناب۔ گول دائرے میں ایک دوسرے کے کُرتے کا پچھلا دامن پکڑے جیسے بچے ریل ریل کھیلتے ہیں جہلم، پھر چناب، پھر اس کے پیچھے راوی چلی جا رہی ہے۔ پھر ــــ

"یاد ہو گیا؟" ماسٹر صاحب ایک دم حملہ آور ہوتے

"جی، جہلم، چناب......."

"ٹھیک سے بیٹھ بے مُنّو کے بچے" ہاں آگے۔

"جہلم، چناب، را ــــ"

"نہیں مانے گا رے اچھو ــــ اے، کیا ہوئی تیری سلیٹ۔ نکال کہ لیتے ہیں کیا انڈے دے رہا ہے؟"

ماسٹر صاحب نہایت چالاکی سے جو کچھ چاہتے بانٹتے جاتے، کیا مجال جو کوئی کونا ڈھیلا پڑ جائے

"ہاں ہاں جہلم کہاں سے نکلتا ہے ــــ نکال پنسل ــــ ہاں ــــ ارے بول تو کیوں چپکی بیٹھی ہے؟"

"جہلم ــــ ام" وہ بھولنے لگتی

"ارے آگے بتا کو بڑھ، ایک جگہ کیوں مر کے رہ گئی ــــ ہاں بتا"

"جناب" قریب قریب بالکل بھول کر وہ کہتی۔

"ہاں، ہاں، ہاں، کہاں سے نکلتا ہے؟ دیکھ رہا ہوں، سنتی، بد ذات ــــ ارے ہاں بتا" ایسا معلوم ہوتا ماسٹر صاحب مچھلی مچھلی کھیل رہے ہیں۔ اِدھر اُدھر وہ چاروں طرف بھونک بھونک کر بڑھ جاتے اور کسی کو بھی زیر پڑھا لیتے۔

"بول مردار کہاں بہتی ہے؟"

"جی زمین پر"

"ایں زمین پر" ماسٹر صاحب مجرا مان جاتے۔ گویا دریا کو زمین پر گھسیٹ کر کسی نے اُن کی ہتک کر ڈالی، پر کچھ لاجواب سے ہو جاتے۔

"مگر یہ تو بتا، کہاں، کس جگہ سے نکلتا ہے اور کون سے خطے کو سیراب کرتا ہے؟"

"جی خطے ؟"

"ارے ہاں، نہیں تو کیا تیرے سر کو سیراب کرے گا"

"جی سیراب تو ......" وہ یاد کرنے کی کوشش کرتی۔

"ہاں، نہیں یاد ــــ اچھا اور اس کے ساتھ کون کون سے دریا بہتے ہیں ــــ اسی خطے میں یہ"

"خطے میں تو ــــ دریا بہتے ہیں"

"نام بتا سب دریاؤں کے، چناب اور ؟"

"جی چناب ؟"

"ارے بھئی ہاں، منحوس اور؟"

"اور۔۔۔ جی۔۔۔ ر، ام۔۔۔۔ آں اور چناب" وہ دماغ کو خوب کھینچ کر زور لگاتی "پھر بھول گئی دریاؤں کے نام۔ ایں ؟"

"جی، وہ جمنا، گوداوری، کرشنا، وہ جلدی جلدی بتاتی جاتی اور کہنی کی کون بنا کر سر پر کھڑی کر لیتی۔ مگر ماسٹر صاحب پر تو جنون سوار ہو چکا ہوتا۔ اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی، کتنی کوڑ مغز تھی وہ، ماسٹر صاحب سچ کہتے تھے اس کے دماغ میں بھوسا بھرا تھا۔ کاش اس کے جسم میں بھی کوئی اس قسم کا مادہ ٹھسا ہوتا جو مار سے ایسی ٹیسیں تو نہ اٹھتیں۔ اس نے کتنے کتنے قلم کے خول میں سے نکلے ہوئے لہریے دار ننگے کھائے۔ بدمزہ اور پھیکے مگر دماغ ویسا ہی کند رہا اور ماسٹر صاحب تو کہہ چکے تھے کہ وہ بالکل نہیں پڑھ سکتی بھیجا ہے ہی نہیں سر میں۔ اور یہ تو وہی چناب تھا، جہلم چناب، راوی بیاس ستلج والا چناب خدا غارت کرے ایسے یاد ہی نہ آیا پھر اس کے دماغ میں گول گول تسبیح کے دانوں کی طرح جہلم چناب، راوی چکروں میں رقص کرنے لگے۔۔۔۔ مگر ماسٹر صاحب تو کہتے ہیں دریا بہتے ہیں، اچھا تو بہتے ہیں، مگر یہ کم بخت کہاں الٹے سیدھے بہا کرتے ہیں، کاش وہ گھر کے پاس آ کر بہہ رہے ہوتے تو یوں اس کی زندگی میں کچھ تو نیا پن آ جاتا۔ ان کم بخت دریاؤں سے تو بڑا ہی اچھا وہ نالا تھا جو کھیت کے بیچوں بیچ ٹیڑھا ہو کر سانپ کی طرح لہرایا کرتا تھا، اس کے کنارے بالکل نیچی نیچی ہری ہری گھاس میں سے ننھے ننھے کیڑے نکلتے اور جب کاغذ کی ناؤ میں وہ ان ننھے مینڈکوں کو مسافر بنا کر نالے کے دھارے پر چھوڑ دیتی تو کشتی کس شان سے سینہ تانے بہتی چلی جاتی وہ تالیاں بجاتی اس کے ساتھ ساتھ دوڑتی اور جب کوئی تنکا یا لکڑی ناؤ میں پھنس کر اسے جھٹکا پھیر دیتی تو اس کے چوڑھے جاتے اور ننھے مینڈک بہادر تیراکوں کی طرح پانی میں چھلانگ مار کر کنارے پر آن لگتے۔ اس نالے میں کبھی کبھی کہیں سے مچھلیاں بھی بہہ آتیں تب تو کنارے پر سینکڑوں جانور دعوت اڑانے آن ڈٹتے۔ بڑا مزہ آتا۔۔۔۔

مگر جہلم چناب راوی، بیاس، ستلج، انہیں بھی تو یاد کرنا تھا۔

۹

نوری تھی تو بڑی آپا کی لاڈلی۔ سانپ کا بچہ سینولیا۔ شمن نے اس سے دوستی بڑے سوچ بچار کے بعد کی تھی کیونکہ گھر میں وہ تھی یا نوری۔ باقی سارے لڑکے جن سے ان کی ایک منٹ بھی نہ بنتی، اس لیے نہیں کہ وہ لوگ اسے مارتے تھے۔ مارنے میں وہ خود کچھ کم نہ تھی، سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ وہ موقع بے موقع اس کی گڑیاں بھی چھیڑ ڈالا کرتے تھے، اور نوری کے پاس تو گڑیاں بھی تھیں جن کی وہ دونوں مل کر روز شادیاں کیا کرتیں۔ گھنٹوں اماں کے کمرے میں کھڑکی پر چڑھی سر جوڑے گڈے سے کھیلا کرتیں۔ جی گھبراتا تو گلی میں کھیلتے ہوئے لڑکوں کو دیکھا کرتیں۔ گلی کیا تھی تھیٹر کی اسٹیج تھی۔ وہ گنجی چندھی بڑھیا کی نوجوان بہو — کھڑکی میں سے صدیق نے پکار لگائی — دو لڑکے ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے گالیاں دیتے گذر گئے — "بیر لو بیر میٹھے بیر" — "گڑ دے کلیجی" — "بیل منڈا موتی" — اور پھر چھجے پر بیٹھی سگھڑ بندریاں جو اپنے بچوں کی جوئیں بین بین کر کھایا کرتی تھیں۔ پرانی مسجد کے ملا جی جن کے آتے ہی ڈر کر دونوں کھڑکی سے نیچے دبک جاتیں، دل دھڑکنے لگتے اور ناکوں پر پسینے آجاتے مگر پھر ان کے دلوں میں گدگد ہوتی۔ رہ رہ کر جھانکنے کو جی چاہتا۔ وہ ڈری ہوئی چوہیوں کی طرح آہستہ سے اوپر ابھرتیں، ملا جی دیوار سے ناک لگائے گھنٹوں کھڑے عجیب بھیانک حرکتیں کیا کرتے، پہلے دن جب وہ بالکل بے خبر انھیں غور سے دیکھ رہی تھیں تو وہ ان سے نہ جانے کیا کہنے لگے، پہلے تو ان کو سنائی نہ دیا کہ وہ کیا اشد ضروری بات کہنا چاہتے ہیں، مگر جب وہ ذرا آگے جھکیں تو مارے خوف کے وہ وہیں جم کر رہ گئیں۔ جیسے اژدہے کو دیکھ کر بندر مسحور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سانسیں روکے، مٹھیوں سے جنگلہ پکڑے وہ تکی گھورا کیں۔ پھر نہ جانے کیسے وہ ایک برقی تاثر سے جھٹکا کھا کر زخمی چڑیوں کی طرح پیچھے گریں اور اٹھ کر ایسی بے تحاشا بھاگیں جیسے ملا جی چھلانگ مار کر جنگلے میں سے ان کی گردنیں پکڑ ہی تو لیتے۔ بڑی دیر تک ان کے حواس غائب

رہے حلق خشک اور ہاتھ پیر بے قابو۔

پانی پی کر ذرا دم میں دم آیا تو ڈرتے ڈرتے انھیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی ہمت ہوئی گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھتی ہیں۔

"کہو بھئی مزاج تو اچھے ہیں؟"

اس کے بعد ایک دم سے کھوکھلے قہقہے لگا کر بے دم ہو لے لگیں اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسی دباتی رہیں گویا اُن کے سینوں میں بڑے ہی اہم راز دفن خاموش اودھم مچا رہے ہیں' انھوں نے آپس میں کوئی تبادلۂ خیالات نہ کیا جیسے وہ بڑی جہاں دیدہ ہیں حالانکہ اُن کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے اور ایسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں کہ بات بھول بھول جاتی تھیں۔

کھانے کے وقت شمن کا جی متلانے لگا بار بار ہا بھیانک زخم کے غار کی طرح اس کے ذہن میں کوئی چیز پھیلنے لگتی۔ اگر وہ گاڑی کے پہیوں میں کسی انسان کو پستا ہوا دیکھتی تب بھی ایسی دہشت اُس کے جی پر نہ بیٹھتی۔ اس کے تمام احساسات پر جیسے کسی نے اونچائی سے بھاری پتھر پٹخ دیا ہو۔ جس کے نیچے وہ زخمی کیڑوں کی طرح دبے ہوئے تلملا رہے تھے۔

کئی دن تک وہ اس دل چسپ کھڑکی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکیں' جیسے وہاں وہ کوئی قتل کر کے بھاگ آئی تھیں اور لاش اب بھی پڑی سڑ رہی تھی' پھر دور ہی دور سے وہ معنی خیز نظریں ڈالتی گذر جاتیں' اُن کا تخیل کھڑکی سے باہر کود جاتا اور پھر وہاں سے دہشت زدہ ہو کر بھاگتا۔ مگر رفتہ رفتہ اُن کی ہیبت کم ہو گئی اور وہ صرف ان اوقات میں بھاگ آتیں جب ظہر کی نماز سے لوگ فارغ ہونے اور گلی قبرستان کی طرح سنسان ہو جاتی پھر تو وہ اور دلیر ہو تی گئیں اور اب یہ حال تھا کہ جان بوجھ کر ملا جی کو آتے دیکھ کر دبک جاتیں اور جھک جھک کر جھانکا کرتیں' ہر بار اُن کے جی متلانے' سوکھی سوکھی قے کے جھٹکے لگتے اور طبیعتیں مکدر ہو جاتیں' مجروح دماغ ہل ہل جاتے۔

نوری کی گڑیا شمن کا گڈا ابلا ناغہ بیاہے جانے اور پرانے جوتے کے ڈبے کی پالکی میں' دلہن لا بٹھائی جاتی' موتیوں کے کنگن سے آراستہ ہاتھ سے دلہن سب کو سلام

رہتی اور مسہری پر سو جاتی، پھر گڈا دونوں ٹانگوں پر کودتا ہوا آتا اور کرسی پر کھڑا ہو جاتا ــــ کھیل ختم!

پڑوس میں صدیقہ کی خالہ کی شادی ہوئی تو علاوہ منڈیر پر سے گھما گھمی دیکھنے کے انھوں نے بہت سی رسمیں سیکھ لیں، دلہن کی گود میں آئینہ رکھا گیا۔ اور دولھا نے اس کا مُنہ دیکھا۔

" بیوی میں تیرا غلام ــــ مُنہ کھولو، کھسیانے دولھا کو کہنا پڑا تھا، اور پھر کھیر چٹائی گئی تھی، دولھا نے کیا ہنس ہنس کے دلہن کے بہنوں کی لگی شرمائے ہوئے ہاتھ پر سے کھیر چاٹ لی تھی کہ سب کھِل کھلا کر ہنس پڑے تھے جیسے کسی نے اُن کی بغلوں میں گدگدیاں کر دی ہوں، دولھا دلہن کی ہر پیاری سی لگاوٹ والی رسم پر بیویاں چہک چہک کر قہقہے لگاتی تھیں، شمن کو بھی ارمان بھری گدگدی محسوس ہوتی تھی اور نوری تو بعد تھی کہ چلو اندھیری کوٹھری میں دُولہن دُلہن کھیلیں۔ یہی نہیں بلکہ شادی کے بعد عورتیں نہ دولھا کو چھیڑ چھیڑ کر مزے لے رہی تھیں، گویا وہ کوئی میٹھا سالڈو تھا جسے چکھ چکھ کر چٹخارے بھر رہی تھیں، پھر رات کو خوب دولھا کو کھسیانا کیا گیا جس میں چند نوجوان شوقین بیویاں حصّہ لے رہی تھیں اور کنواری لڑکیوں کو ڈانٹ ڈانٹ کر بھگایا جا رہا تھا۔ نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ دروازوں کی درزوں اور روشن دانوں پر بیویاں مکھیوں کی طرح چپکی پڑی تھیں جب کہ اُن کے بچے اور خاوند گھروں میں پڑے واویلا مچا رہے تھے۔

گڈے گڑیا کی شادی اب کی دفعہ اور دھوم سے ہوئی، نکاح کے چھوہاروں کے بجائے مُرمُرے اچھالے گئے اور دولھا نے دلہن کی ہتھیلی پر سے کھیر چاٹی۔ نوری اندھیا نے سارا گڑیا کا دوپٹہ کھیر میں لتھیڑ دیا۔ اس لیے شمن نے اٹھا کر بہو کو دہلیز پر پٹخ دیا، جس پر نوری اور وہ خوب گتھم گتھا ہوئیں۔ اور ایک دوسرے کے بال بھر بھر کھینچے نوچ پھینکے۔

گڑیا ویسے بھی میلی ہو گئی تھی، گھوڑے کا سا مُنہ، اس لیے جب نئی گڑیا بڑی آپا

سے بنا کر دی تو انھوں نے اس کی ناک ڈورے کے بجائے کپڑے کی بنوائی اور چٹیا بھی
کالا موزہ ادھیڑ کر لگائی۔ لمبا سا موباف ڈالا، پھر بھی انھیں اطمینان نہ ہوا تو ہاتھوں
میں ڈورے کی انگلیاں لگوا لیں۔ پھر ایک دن بڑی ہمت کے بعد انھوں نے نہایت
ہی پوشیدہ جگہ جا کر اس کی واسکٹ میں روئی کی دو گولیاں رکھ دیں، مگر اس سے
انھیں اتنی شرم آئی کہ آنکھ بھر کر گڑیا کو نہ دیکھ سکتی تھیں۔ جہین کریپ کا ڈوپٹہ
اوڑھ کر کپڑے کی ناک اور ڈورے کی انگلیوں والی گڑیا بالکل جیتی جاگتی عورت
لگنے لگی۔ توبہ! ان کا دل کسی کام میں نہ لگتا۔ اور وہ دن بھر اس کا بیاہ کرتی رہیں۔
لیکن ایک دن گوڈر کی تلاش میں جو بڑی آپا نے گڑیوں کا جائزہ لیا تو ان کی چوری
پکڑی گئی، اس کی اور نوری کی وہ گت بنائی گئی کہ دونوں موت کی دعائیں مانگنے
لگیں۔ انھوں نے ایک سرے سے گڑیا کی صدری ہی چھین لی اور کرتے میں کمر پر
ٹانکے لگا دیے۔ اس دن سے ان کا جی گڑیوں کی طرف سے بالکل کھٹا ہو گیا وہ
انھیں بالکل کپڑے کا چیتھڑا نظر آنے لگیں جن کی ناک کی جگہ تکونی کلی لگی تھی
اور انگلیوں کی جگہ ڈورے لٹک رہے تھے۔

۱۰

اماں شمن سے عاجز تھیں، سارے دن بھائیوں کو کوسنا پیٹنا، نوکروں سے لڑنا۔ اُن کے کام کاج میں حارج ہونا۔ بھاوجوں کی زندگی اجیرن اور بھتیجوں کے لیے قہر کا سامان۔ ماسٹر صاحب نے توبہ کرلی اور قرآن پڑھانے والی ملانی جی نے کان امیٹھ لیے کہ توبہ، نہ کسی کی اولادیوں ہاتھ سے نکل جائے۔

اور سب سے زیادہ تو وہ نوری کو خراب کیے دیتی تھی۔ وہی ہوا جس کا ڈر آپا کو دھڑکا لگا ہوا تھا۔ شمن کو نوری کو کوئی کام کا نہ رکھا اور وہ روز بروز نکمی گنواری ہوتی جاتی تھی۔ اس وقت اُسے مرنے والا اور بھی یاد آرہا تھا کیونکہ ایک تو نوری ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی، دوسرے اس کی اپنی صحت رفتہ رفتہ گر رہی تھی۔ کھانا تو کسی دن ہی ہضم ہو جاتا ہوگا۔ اور نیند تو اس کے حصے کی اللہ میاں کے یہاں ختم ہی ہو گئی تھی۔ اس کا ایک رشتے کا دیور حال ہی میں ڈاکٹری پاس کرکے آیا تھا۔ وہی بچارا بھابی جان میں جان ڈالے ہوئے تھا۔ اس کے دوروں کا علاج دُنیا جہان کے حکیم ڈاکٹر ہار گئے نہ ہو سکا۔ اگر تھوڑا بہت کیا تو رشید ہی نے کیا۔

ویسے دوروں کا کیا ٹھیک کہ سن کر تھوڑی پڑنے میں، بس اتنا اتفاق یا خدا کی مہربانی کہو کہ دورے کے وقت رشید کہیں آس پاس ضرور ہی مل جاتا ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ بزاروں دوائیں پی ڈالیں مگر دوروں سے پیچھا نہ چھوٹا لوگوں نے بہت چاہا کہ وہ سنجھلی کے حواسوں کا علاج کردے مگر وہ ٹالتا ہی گیا آخر کو بچاری سنجھو کی شادی ایک وکیل صاحب سے ہو ہی گئی۔ سنجھو بچاری اُن جانوں میں سے تھی جو نہایت سلیقے سے پیدا ہوتی ہیں۔ شریفوں کی طرح گھر میں

رہتی ہیں۔ پھر کوئی اللہ کا نیک بندہ بیاہ لے گیا۔ وہاں جب تک جی میں طاقت رہی بچے پیدا کیے۔ پالے پوسے، پھر کسی ذاتی مرض میں مبتلا ہو کر دکھ سہتی رہیں اور ایک دن اللہ نے مٹی عزیز کر لی۔ سب کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا: "واہ کیا جنتی بیوی تھی۔

پر سنجو ابھی مری نہیں تھی۔ اس کی تو اب زندگی شروع ہو رہی تھی۔ ادھر وہ بیاہ کر گئی، اور اُدھر بڑی کو دوروں نے آدبوچا اور ایسی بُری طرح کہ تو بہ بھلی، طبیعت نڈھال اور جی کچھ کھویا کھویا سا رہتا۔ دل بہلانے کو اس نے ہارمونیم بھی سیکھنا شروع کیا "اپنا مریض ہوا کرے کوئی"، گھنٹوں لیے تال سُر ہارمونیم کی ہیں ہیں کے ساتھ چلتا مگر دل اور بھی لیتا ہو تا گیا۔ رشید آ کر گھنٹوں بیٹھتا۔ اُسے مرض کے متعلق ہدایتیں دیتا۔ کبھی ایک آدھ سوئی بھی اس کے بازو میں لگا دیتا۔ بازو میں سوئی لگواتے وقت اُس کے بڑی گُد گُدی ہوتی اور وہ لوٹ پوٹ ہو جاتی پر دو چار دن کو دورے ختم ہو جاتے۔

مگر بڑے بھیا کو رشید سے خواہ مخواہ کا بَیر ہو گیا۔ بات یہ ہوئی کہ اُن کی دلہن جو سدا کی بہانے باز تھی، ہجیش کا نسخہ لکھوانے کا تقاضا کیے جاتی تھی اور رشید بیچارا بھول بھول جاتا تھا۔ پر اُن کا کہنا تھا وہ جان بوجھ کر کسی کے بہکانے کی وجہ سے ٹال مٹول کرتا تھا۔ اور بڑی آپا اپنے دونوں بچوں کی قسم کھا کر کہتی تھی کہ بڑے بھیا کا نوکر ہی ایسا مکر فریا تھا کہ نسخہ لکھنے کو رشید میاں نے کئی دفعہ کاغذ مانگا، شی ان سنی کر گیا۔

"وہ بچارے تو سبھی کو بھگتنے کو تیار ہیں" وہ کہتی، پھر بھیا نے جو شکایت کی تو بڑی آپا بگڑ کھڑی ہوئی کہ "وہ کسی کے نوکر نہیں ہیں، میری وجہ سے آجاتے ہیں تو سارے گھر کو مرض اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

اور بات بھی سچ تھی، بڑی کی سسرال والوں پر اُسی کا حق تھا۔ میاں مر گیا تھا تو کیا تھا اُس کا کنبہ تو موجود تھا۔ وہ آج چلی جاتی تو کون اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ یہ تو اُس کا ہی جی تھا جیسے مارے بیٹھی تھی۔

کہتے ہیں کہ بڑے بھیا کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ اُن بچارے کے دل میں کہاں سے بیٹھتی، یہ اُن کی لاڈلی بیگم ہی کے کرتوت تھے۔ سو بس وہ پیچھے لگ گئے۔ جہاں رشید آتا وہ

دن بیٹھتے اور وہ بچارا علیک سے چلا جاتا۔ اسے کہیں یوں لشٹم پشٹم بھی دورے ٹھیک ہوتے میں
غضب تو جب ہوا جب انھوں نے اس کے خط پکڑ لیے اور صاف بڑی اماں سے کہلوا دیا
کہ اگر یہ پیچ بازی بند نہ ہوئی تو لونڈے کی جان تک نوبت پہونچ جائے گی۔ اگر ایسا ہی ہے تو نکاح
کر دو شرافت سے۔ بڑی آپا کی ساس کے کان میں بھی بھنک پہونچی اور بڑھیا علو پیا سنا تی
دہائی دیتی چڑھ دوڑی۔ وہ سمجھے بیٹھی کہ رشید بچارے کا آنا بند۔ اس دن سے دورے بھی
پھیکے پڑ گئے۔ کس کے بوتے پر پڑتے۔ مگر بڑی آپا کا غصہ تین تا دکھا گیا اور بس اسے تو پھر اپنے بچوں
کی ماں نانے سے چھین کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس سے نوری کی بربادی انھیں کے ہاتھوں نہ
دیکھی گئی۔ مجبوراً اسے اسکول بھیج دیا گیا۔

۱۱

شمن نے جب اسکول میں قدم رکھا تو پہلے اس نے چاروں طرف سے اطمینان کر لیا کہ کدھر کدھر سے دشمن کے حملے کا خطرہ ہے۔ سب سے پہلے تو اس نے بیٹرن کو سمجھا دیا کہ مہربانی کر کے نہ تو اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرے جائیں اور نہ اُسے گھر کی یاد نہ آنے کے لیے پیار کرنے کی کوشش کی جائے۔ وہ اس قسم کے دکھاوے سے بخوبی واقف تھی اور تجربوں کو پڑھ چکنے کے بعد اُسے یقین ہو گیا تھا کہ کسی سے محبت کرنا یا کروانا حد سے زیادہ مکاری ہے۔ پیار سے وہ ایسے بھاگتی جیسے بکری چیتا کے جھپٹنے سے۔ وہ ان باتوں کی عادی ہی نہ رہی تھی۔ نہ جانے کتنے دن ہوئے نرم اور اخلاق بھرے الفاظ اُس کے کانوں کے پاس بھی نہ پھٹکے تھے۔ ہر بات کے جواب میں گھرکی سننے کی عادت پڑ چکی تھی۔ لہٰذا وہ کوئی کام شاباشی سننے کے لیے کرتا ہی نہ جانتی تھی بلکہ جب تک ہر قدم پر اُسے ڈانٹ نہ ملتی وہ کچھ نا امید سی ہو جاتی۔

جماعت میں جب وہ داخل ہوئی تو اس نے ایک بے اعتنائی کی نگاہ سب چہروں پر ڈالی۔ اُسے اُن کا گھورنا اور مسکرا کر آپس میں کانا پھوسی کرنا بہت ناگوار ہوا۔ جب ٹیچر کمرے میں آئیں تو سب کھڑی ہو گئیں۔ مگر وہ الو ؤں کی طرح بیٹھی رہی۔ اس پر لڑکیوں کے قہقہے نکل گئے اور وہ ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کر اس بے عنوانی پر رائے زنی کرنے لگیں۔

"کیا آپ کی پیٹھ میں درد ہے' جو آپ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا؟" رعب دار مس ممتاز نے گھٹتے ہوئے لہجے میں معلوم کرنا چاہا۔

"ایں!؟" اُس نے مُنہ پھاڑ دیا۔

لڑکیاں ہنسی سے لوٹ گئیں اور خفت کی وجہ سے شمن کے کان لال ہو گئے۔ اُسے مس ممتاز شروع ہی سے "قابلِ نفرت" لگیں۔ وہ اُس سے آپ کر کے بول رہی تھیں جس میں علاوہ انتہائی تکلف کے دو طنز کی چاشنی بھی موجود تھی۔ مس ممتاز نے کوئی اور بات نہیں کی۔ اُس

دن کیا پڑھایا گیا اور کیا پڑھا گیا۔ یہ اس کی خاک سمجھ میں نہ آیا، کیونکہ گھبراہٹ اور پریشانی پر قابو پانے میں اُسے اس قدر کشمکش سے سامنا کرنا پڑ رہا تھا کہ وہ کچھ نہ سن سکی۔

تین چار دن وہ جماعت میں خاموش بیٹھی رہی اور اب اس میں اتنی سمجھ آ گئی تھی کہ سب لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہو جاتی، بیٹھ جاتی، اندر باہر آتی جاتی اور حاضری کے وقت بجائے "کیا ہے ہ" کے اب وہ "مدیجا حاضر" بولنے لگی تھی۔ مگر بولنے کے بعد بڑی دیر تک اُس کے کان تمتمایا کرتے، کیونکہ جب پہلے روز اس نے حاضری دی تھی تو لڑکیوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا تھا، یہاں تک کہ مس ممتاز کے رعب دار چہرے پر بھی دیر تک مسکراہٹ منڈلاتی رہی تھی۔

ہفتے بھر بعد اُسے نچی جماعت میں اتار دیا گیا اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر لڑکیوں نے اس معاملے کو سانحہ بنا دیا۔ جدھر وہ جاتی اشارے ہونے لگتے۔ لڑکیاں اس کی بے وقوفی کے چرچے کر کے ٹھٹھے لگاتیں اور اب ہر ایک زبان پر یہ تھا کہ وہ اُتار دی گئی۔ مس ممتاز نے رپورٹ دی کہ وہ بہت کمزور ہے اور اُس درجے میں کام نہیں چلا سکتی۔

اس نئی چھوٹی جماعت میں چھوٹی لڑکیوں کے درمیان وہ اُن سب کی اماں معلوم ہوتی۔ کیونکہ یہ لڑکیاں ذرا اُس سے ڈرتی تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ اُن سب سے عقل، عمر اور علم میں بہت آگے ہے اس کو سبق وغیرہ کچھ یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ اُس نے تیزی سے لڑکیوں پر رعب گانٹھ لیا۔ دو مہینے بعد جب وہ گھر واپس گئی تو پہلے سے چوگنی بدزبان، خودسر اور ڈھیٹ ہو گئی تھی۔ اب اُسے مار لینا بھی آسان نہ تھا۔ وہ نہایت گستاخ نگاہوں سے گھور کر تڑسے جواب دے دیتی۔ اس کے علاوہ اُسے کھانے کی چیزیں چُرانے کی بڑی جسارت ہو گئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ جھٹ نعمت خانے میں سے کچھ نکال کر مُنہ میں رکھ لیتی اور ایسے مزے سے تھوڑا سا چُرا کر بغل میں دبا لیتی کہ خوب ہاتھ ہلا ہلا کر چلتی جب بھی کسی کو پتہ نہ لگتا اور مُنہ میں لقمہ لے کر وہ گُن گُناتی ہوئی نکل چلی جاتی تاکہ کوئی سوچے اس کا مُنہ خالی ہے۔ اس کے علاوہ پیسے اور روپے تک کے اڑا لیتی مگر کسی کو اس کی طرف شبہ کرنے کا خیال بھی نہ آتا چوری

کی چیز وہ نہایت تندہی کے ساتھ سب کے ساتھ مل کر ڈھونڈتی۔ یہ طریقہ اس کی بے گناہی کو اور مضبوط بنا دیتا۔ لڑکیوں سے اس نے اور بھی غلط سلط باتیں سیکھی تھیں جو وہ نہایت فخر سے نوری کو سکھاتی۔

پھر جو وہ اسکول آئی تو اُسے ایک نئے تجربے سے پالا پڑا۔ یہ تجربہ بہت کم عمر سی معلوم ہوتی تھیں۔ لہٰذا آتے ہی اس نے انھیں دق کرنا شروع کیا۔ کچھ دن اس کی شرارت بھری جنگ جاری رہی لیکن جلد ہی اُسے محسوس ہوا کہ وہ ہار رہی ہے انھوں نے اس کی شرارتوں پر کونے میں یا بنچ پر کھڑا کر دینے کے بجائے بالکل توجہ نہ دی اور جیسے ہر بات کو ٹال جاتیں کونے میں کھڑے ہو کر تو وہ منہ سے لڑکیوں کا منہ چڑا چڑا کر ہنسایا کرتی تھی جس پر استانی جل کر اُسے بنچ پر کھڑا کر دیتیں بنچ پر کھڑے ہو کر وہ لڑکیوں پر بن بن کر گرتی اور خوب ہنسی اُڑاتی۔

مگر چند ہی دنوں میں اس نے اپنے آپ کو ہزاروں ذمہ داریوں میں جکڑا پایا کلاس کی مانیٹر وہ، بورڈ وہ صاف کرے، چاک کی فکر بھی اُسے، نقشہ ٹانگنے کی کیل مضبوط ہے کہ نہیں، لڑکیاں غل مچائیں تو اس کی مصیبت۔ اس کے علاوہ مس چرن یعنی اس کی ٹیچر کی کتابیں اور چھتری وہ اپنے ڈیسک میں وقتاً فوقتاً رکھے اور کبھی کبھی اُن کے کمرے پر امتحان کی کاپیاں پہونچانے جائے۔ کمرے میں مس چرن بالکل استانی نہیں لگتی تھیں بلکہ بڑے بے تکلفی سے اُس سے کرسی پر بیٹھنے کو کہتیں۔

"اچھا بھئی! چائے پیوگی یا نیبو کا شربت؟" وہ پوچھتیں اور اُسے شرم آنے لگتی۔ کبھی کسی نے اُس سے ایسی عجیب باتیں نہ کی تھیں۔ تھوڑی سی دیر میں وہ دونوں سہیلیوں کی طرح ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگتیں۔ اس نے انھیں تمام گھر کے قصے سنائے۔ بڑی آپا سے وہ بڑی خفا تھی اور شانو اور ستو کی شرارتوں پر تو اُن کے چھکے لگ گئے نوری انھیں کچھ کچھ پسند تھی

مس چرن نے اُسے گھر کا کام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں بلانا شروع کیا۔ شمن کو اس قدر فخر محسوس ہوتا کہ کام ختم ہو جاتا تو اُسے بڑا رنج ہوتا۔ مس چرن نے

اُسے گھر کا کام کرنے کے لیے اپنا کمرہ مل گیا تو اُس نے پڑھنا شروع کیا۔ شمن کو اس قدر فخر محسوس ہوتا کہ کام ختم ہو جاتا تو اُسے بڑا رنج ہوتا۔ مس چرن نے اُسے اسکول کے علاوہ کام دینا شروع کیا اور دوسرے امتحان پر اُسے ڈبل درجہ چڑھا دیا گیا۔ خوشی تو اُسے اس بات کی ہوئی کہ مس ممتاز جس درجے کو پڑھاتی تھیں وہ اس سے بھی آگے ہو گئی۔

مس چرن اب بھی اُسے اپنے کمرے پر پڑھاتی رہیں اور منجھو کے بعد اُسے پہلے انسان نے متاثر کر کے قابو میں کر لیا۔ اگر مس چرن کہتیں تو وہ مشکل سے مشکل کام انجام دے لیتی اُن کے لیے اُسے کسی کو قتل کرنے میں بھی دریغ نہ ہوتا۔

اُس کی زبان پر ہر وقت مس چرن کا نام رہنے لگا۔ لڑکیوں نے اُسے چھیڑنے کی کوشش کی جس سے بجائے برہم ہونے کے اُن کا خیال ایک رومانی چیز بن کر اُس کے دماغ پر چھانے لگا۔ مس چرن کو دیکھ کر آپ ہی آپ اس کا دل اُن کی طرف کھنچنے لگتا۔ وہ کہیں بھی ہوتیں اُسے اُن کے وجود کا احساس نبض کی طرح دھڑکتا، اپنی رگ رگ اور پسینے میں سرایت کرتا ہوا معلوم ہوتا۔ وہ اگر سامنے سے گزر جاتیں تو شمن جو کام کرتی ہوتی اُسے گڑبڑا دیتی۔ بات کرتی ہوتی تو زبان لڑکھڑا جاتی۔ اگر وہ کسی اور درجے کو کوئی کھیل کھلاتی ہوتیں تو اس کے لیے پڑھنا دشوار ہو جاتا۔ رہ رہ کر اُن کے قہقہے اُسے سر سے پیر تک لرزا دیتے۔ سب کا خیال تھا مس چرن سیاہ فام اور بہت ہی کم رو تھیں لیکن شمن کی آنکھیں کچھ اور ہی دیکھا کرتیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ مس چرن سے بھی حسین کوئی اور شے ہو سکتی ہے۔ اُسے اپنے رشتہ داروں سے لگاؤ تھا، کچھ یونہی سا خدا سے ڈرتی تھی۔ مگر اس کے خیال میں غرق کبھی نہ ہو سکی لیکن مس چرن اس کے لیے اپنے خون اور ایمان سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ وہ عموماً ان کی تخیلی صورت کو عقیدت اور انتہائی جوشیلے محبت بھرے جذبات میں ڈوب کر پوجا کرتی ——— وہ آئیں مس چرن ——— وہ گئیں ——— وہ ان کی ساڑی ہلی اور بلاؤز چمکا ———

اس کا پڑھنے میں بھی زیادہ دل نہ لگتا۔ مارے باندھے سے صرف مس چرن کی خاطر پڑھ لیتی تھی۔ گویا گھر کا کام مستعدی سے کر کے وہ مس چرن کے قدموں میں عقیدت کے پھول چڑھا دیتی تھی اور تخیل کے ساتھ اُسے محسوس ہوا کہ اس کا جسم بھی مس چرن کے قرب میں رہنے لگا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے آپ کو اُن کے پاس محسوس کرتی ——— وہ کھڑی ہے

مس جرن کا خیالی ہیولیٰ پاس سے گزر گیا ہے وہ خود سو رہی ہے، مس جرن اسے تھپک رہی ہیں، وہ پیاسی ہے، حلق کھنچا جا رہا ہے اور مس جرن اس کے منہ میں ٹھنڈے ٹھنڈے خوشبودار عرق ٹپکا رہی ہیں۔ ان کا ہاتھ اس کے ماتھے پر ہے، وہ برف کی بنی ہوئی ہیں اور اس احساس سے وہ بغیر نیند کے اونگھنے لگتی۔ وہ دیکھتی رات کو اندھیرے میں وہ دوڑی ہوئی بھٹکتی پھر رہی ہے ٹھنڈی گھاس پر پڑی سردی سے کانپ رہا ہے، مس جرن اسے اپنے پروں بھرے پھول دار تکیے پر لٹائے ہوئے ہیں۔ وہاں وہ ڈر کے مارے مکر سادھے پڑی ہے کہ اگر ہوش میں آ گئی تو سارا خواب بکھر جائے گا۔

مس جرن کا خیال اس کی جان کو مرض کی طرح لگ گیا۔ کچھ ان دنوں بورڈنگ میں آلو کھاتے کھاتے لڑکیوں کے ہاضمے بھی بگڑ چلے تھے اور شمن تو ہر الا بلا اوٹ کر کھا جاتی تھی۔ اس کی نیند بہت خراب ہو گئی تھی۔ راتوں کو اٹھ کر بڑبڑاتی اور جیسے ہی آنکھ کھلتی اسے محسوس ہوتا کہ مس جرن کھڑی ہیں اگر وہ ہلی تو غائب ہو جائیں گی اندھیرے میں ان کے وجود کو گھور گھور کر وہ سونے کی کوشش کرتی۔

ایک رات کو اس نے اپنے آپ کو برآمدے میں مس جرن کے کمرے کے آگے کچھ ٹٹولتے ہوئے پایا۔ وہ ایک دم ڈر گئی۔ وہ کیسے اتنی دور تک سوتی ہوئی چلی آئی۔ جلدی جلدی کمرے میں آ کر بچھونے میں دبک گئی۔ یہ کیا ہو گیا تھا اسے؟ وہ خود تھی یا اس کا بھوت تھا؟ جو راتوں کو اسے گھسیٹے پھرتا تھا۔

دو تین دن بعد پھر اس نے مس جرن کے کمرے کے آگے خود کو ہچکیوں سے روتے ہوئے پایا خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ کیوں رو رہی تھی؟ یہ اسے نہیں معلوم ہوا۔ اسے واپس اپنے کمرے تک آنے میں بہت ڈر لگا۔ برآمدے میں اندھیرا اور جاڑوں کی وجہ سے سب کمرے بند تھے۔ ڈر لوک نہ تھی اور بلی وغیرہ سے اسے خوف نہ آتا تھا مگر لوٹتے وقت وہ تیز تیز چلنے لگی تو جیسے بہت سی غیر مرئی چیزیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ جب وہ میٹرن کے کمرے کے پاس پہنچی تو ہلکی سی لالٹین جل رہی تھی موڑ پر ایک بھیانک سایہ زور سے اس کے آگے جھپٹا چلا گیا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ اور آنکھیں ہیبت سے

پھٹ گئیں۔

میٹرن جاگ گئی اور نکل کر اس نے آواز دی "کون ہے" شمن دوڑ کر اس سے چمٹ گئی۔ میٹرن نے بھی دیکھا تھی کہ یہ کیا بلا ہے۔ اور اس نے زور سے اسے پرے دھکیل دیا۔

"میں ہوں شمشاد، شمن" اس نے جلدی جلدی زمین سے اٹھتے ہوئے کہا "یہاں بھوت دوڑا میرے پیچھے" ابھی وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔

"بھوت! کہاں ہے بھوت؟ چلو اپنے کمرے میں" میٹرن اسے کمرے کی طرف دھکیلنے لگی۔ وہ خود ڈری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

"رات کو بھی دنگا مچاتی ہیں" وہ بڑبڑائی۔ اس کے کمرے میں آ کر میٹرن نے بجلی جلائی، تو وہی بھوت بالکل شمن کے پاس کھڑا تھا۔ وہ پھر چیخی "بھوت!"

"کہاں ہے! ارے یہ تو تمہاری اپنی پرچھائیں ہے۔ پگلی لڑکی" شمن کو بہت شرم آئی اور وہ چپکے سے پلنگ پر لیٹ گئی، میٹرن بجلی بجھا کر بڑبڑاتی چلی گئی۔ مگر اسے بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ اس کا دل برابر دھڑک رہا تھا۔ اور تمام جسم تنا ہوا تھا۔

اس نے رات کی بات کسی سے نہ کہی۔ تو یہ اگر مس چرن کو معلوم ہو جاتا کہ وہ رات کو بھوت بن کر ان کے دروازے پر رویا کرتی ہے تو وہ ضرور اس سے نفرت کرنے لگتیں۔ وہ تو انہیں اتنا بھی نہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس کے دماغ پر اس بُری طرح چھائی ہوئی ہیں۔ مگر یہ بات اوروں سے زیادہ دن نہ چھپی رہی اور پرنسپل صاحبہ نے ایک دن مس چرن سے کہہ دیا کہ وہ لڑکیوں کی اخلاقی حالت کو خراب کر رہی ہیں۔ بات یہ تھی کہ مس ممتاز ان کی چھوٹی بہن تھیں اور جب سے مس چرن آئی تھیں ان کی قیمت بہت گر گئی تھی۔ علاوہ شمن جیسی دیوانی لڑکیوں کے اور قریب قریب ساری لڑکیاں انہیں بہت پسند کرتی تھیں۔

مس ممتاز بیڈمنٹن کھلاتی تھیں اور مس چرن باسکٹ بال۔ زیادہ تر لڑکیوں کو باسکٹ بال پسند تھی اور مس ممتاز کا کہنا تھا کہ مس چرن لڑکیوں سے ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہو کر ٹیچروں کا رعب کم کیے دیتی تھیں۔ انہیں کے بھڑکانے سے لڑکیاں بیڈمنٹن کے بجائے باسکٹ بال کھیلنے لگی تھیں۔ یہ مس ممتاز کی ہتک تھی اور ساتھ ساتھ ان کی بہن

پرنسپل کی شمن کو بیڈمنٹن سے نفرت تھی، کیونکہ مس ممتاز اُن لڑکیوں کو بہت ذلیل کرتی تھیں جو ذرا کمزور تھیں۔ انھوں نے ٹیم بنائی تھیں سب سے اچھی کھیلنے والی لڑکیاں ایک طرف، اور پھر سب سے بُرا کھیلنے والی جن میں شمن بھی تھی۔ دوسری طرف۔ روز اچھی کھیلنے والی لڑکیاں جیتتیں اور یہ ہارتیں۔ لہٰذا اِس ذلت سے بچنے کے لیے جس دن بیڈمنٹن کی باری ہوتی شمن دردِ سر یا کوئی اور بہانہ کرکے مس جرن کو کھیلتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ اُن کی ہر حرکت کا عکس وہ اپنے دل و دماغ میں محفوظ کرلینا چاہتی۔ یوں انھوں نے گیند اچھالی۔ یوں اپنے پتلے سے ہاتھ کو ٹیڑھا کرکے جنبش دی ——— وہ گئی گیند ——— لڑکیاں کہتی تھیں کہ اُن کے ہاتھ سوکھے اور کالے ہیں مگر شمن کو وہ سنگِ مرمر کے سے نظر آتے تھے۔

راتوں کو وہ اب بھی برآمدوں میں سسکیاں بھرتی بھٹکا کرتی تھی۔ ایک دفعہ جو رات کو اس کی آنکھ کھلی تو ہکا بکا رہ گئی۔ پرنسپل ٹارچ لیے مس جرن کے کمرے میں لمبا سا چوغہ پہنے کھڑی تھیں اور مس جرن پریشان شمن کو سیدھا بٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اُسے معلوم بھی نہ تھا کہ وہ چیخ چیخ کر رو رہی ہے۔ پھر ایک دم سے وہ چپ ہو گئی اور منہ پھاڑے مس جرن کو تکتی رہی۔ وہ مس جرن کے پلنگ پر بیٹھی تھی! سچ مچ کا پلنگ! وہ خواب والا واہمہ نہیں تھا۔ سبز پھول کڑھا ہوا تکیہ، بھورا کمبل جس میں کشمشی گوٹ لگی تھی۔

اُسے گھسیٹ کر اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

صبح پرنسپل نے اس سے بہت سے سوال کیے۔ مگر اس نے منہ پھلا لیا اور کسی بات کا جواب نہ دیا۔ بھلا وہ کیسے اتنی بہت سی باتیں بتا دیتی جو وہ سوچا، دیکھا اور محسوس کیا کرتی تھی۔

تیسرے دن مس جرن اسکول چھوڑ کر چلی گئیں۔ وہ کسی لڑکی سے ملنے بھی نہ آئیں بس ایک دم چوکیدار اُن کا سامان لے گیا۔ اور اس کے بعد وہ پرس ہاتھ میں لیے نکلیں۔ اور سیدھی پھاٹک سے باہر چلی گئیں۔ اسکول میں کھلبلی پڑ گئی۔ لڑکیاں ایک دوسرے سے سوال کرنے لگیں۔ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بس اتنا پتہ چلا کہ کچھ شمن پر بات اٹھی تھی جس پر پرنسپل اور مس جرن میں کھٹ پٹ ہو گئی۔ لڑکیوں نے شمن کو چاروں طرف

سنگھر کر سوالوں کی بارش کر دی مگر وہ کچھ نہ بتا سکی۔ جب مس جون کے جانے کی خبر پکی ہو گئی تو اُن کی ساری چاہنے والیوں نے رونا شروع کیا، آخر پرنسپل صاحبہ اور مس ممتاز نے آکر سب کو خوب ڈانٹا، لڑکیاں بڑی بار چپ ہو گئیں۔

مگر شمن نے ایک آنسو بھی نہ بہایا، وہ خاموش چور سی سب سے الگ الگ پھرتی رہی۔ مگر سارے وقت تول تول کر قدم اٹھاتی تھی جیسے کوئی چھنکتی ہوئی چیز اٹھائے پھر رہی ہے جس میں ٹھیس لگ گئی تو چکنا چور ہو کر بکھر جائے گی۔

مس جون کے جانے کے بعد وہ بہت سخت دل ہو گئی۔ اُسے اتنا تو تجربہ ہو گیا کہ منحوسی کا کوئی تعلق نہ تھا۔ قصور خود اس میں ہی کہیں چھپا ہوا تھا۔ اور یہ ماننے کے لیے وہ قطعی تیار تھی۔ اُسے اپنے دماغ کے اُس حصّے سے سخت نفرت تھی جو ہمیشہ سارا الزام اُسی پر تھوپ دیا کرتا تھا، اُس نے مس جون کے متعلق سوچنا بہت کم کر دیا، اُن کا خیال اس کے دماغ میں چھپے ہوئے زخم پر ٹھوکے لگاتا جس سے اُسے روحانی اذیت ہوتی۔

وہ اُس سال فیل ہو گئی لہٰذا اُسے مقامی مشن اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں نوری بھی اس کے ساتھ جاتی۔ مشن میں مس جون سے بھی زیادہ سیاہ فام ٹیچر تھیں۔ مگر شمن کو ان میں سے ایک بھی پسند نہ تھی۔ نوری بڑی تیز تھی اور پڑھتی آیا بھی اُسے برابر مار مار کر پڑھاتی رہتی تھیں۔ اس لیے وہ بہت جلد اسکول میں جم گئی۔ مگر شمن جیسے نہ جانے لوگوں کو کیا اس کا بیر تھا کہ وہ مستعدی سے کام کر کے بھی لے جاتی، تو وہ اس سے اور بہتر کام کی توقع رکھتے۔ اُسے کامل یقین تھا کہ وہ کند ذہن تھی اور یاد داشت تو اُس کی بہت خراب تھی، سب کہتے تھے کہ وہ بہت جلد سب بھول جایا کرتی تھی۔ مس جون کو وہ آخر بھول ہی گئی اور اسے غور کرنے پر بھی ان کا ناک نقشہ، لباس، ہنسی، ان کا باسکٹ بال کھلانا یاد نہ آتا۔ جب شمن ان کے کمرے میں پڑھتی تھی تو وہ ان کا ہلکے سے گنگناتے جانا، ایسے کہ شمن کو بجائے خلل کے ایک طرح کی ہمدردی ملتی جاتی تھی، فضا کو کچھ اور چکنا اور ہموار سا کر جاتا۔ بہت دفعہ ایسا ہوتا کہ وہ کسی مشکل سوال پر اٹک گئی

ہے کہ مس جرن کے گنگنانے کی چھوٹی چھوٹی لہریں اس کے سوال کی گتھی سے ٹکرائیں اور وہ ڈھیلی ہو کر کھل جاتی، مگر نہیں وہ یہ سب کچھ بھول چکی تھی۔

دو برس اس نے مشن میں پڑھا، اُسے ایک دفعہ تیرا درجہ ملا اور دو چار انعام بھی ملے۔ مگر اُس نے وہ سب لاپرواہی سے پھینک دیئے، اُسے کسی چیز کی قدر کرتے ہوئے ڈر لگتا معلوم ہوتا، وہی زخم سا اُس کے دماغ میں ٹیسیں مارنے لگتا جو مس جرن کے خیال سے دکھا کرتا تھا۔ دو برس اس نے بائبل پڑھی اور یسوع مسیح کی تعریف میں بہت سی نعتیں سیکھ لیں مگر اُسے یہ بات بالکل پسند نہ تھی کہ گرجے میں گھٹنے ٹیکنے کے لیے موٹے موٹے گدّے تھے جن میں سوئیاں سی لگی تھیں جو بہت چبھتی تھیں۔

کئی دفعہ اس کا ارادہ ہوا کہ وہ بھی چپکے سے یسوع مسیح کی بھیڑ بن جائے مگر امّاں کے ڈر کے مارے ہمت نہ پڑی، اُسے یہ بات معلوم کر کے بہت حیرت ہوئی کہ یسوع خدا کے بیٹے تھے۔ مگر پھر بھی لوگوں نے ان کو چین سے نہ چھوڑا، آخر یہ دنیا اس قدر گناہ گار کیوں ہے؟ لوگ جھٹ پٹ اچھی باتیں سیکھ کر مزے سے جنت میں کیوں نہیں چلے جاتے۔

مقدس ماں کنواری تھی! یہ سوچ کر ذرا اُسے ہنسی آتی، اور وہ خود بھی تو کنواری تھی اگر خدا نہ کرے بیٹھے بٹھائے خدا باپ اُس کے یہاں بھی ایسا ہی بھولا بھالا ننّھا سا یسوع پیدا کر دے تو وہ کیا کرے، یقیناً امّاں تو اُس کے لیے دودھ دیں گی نہیں، اور کپڑے تو خیر وہ پرانے کرتوں کے بنا لے گی۔ مگر پھر اُسے یاد آتا کہ جب اس کے دھوبی کی لڑکی کے ایسا ہی مُنّا پیدا ہو گیا تھا تو سب نے کیسی تھڑی تھڑی کی تھی۔ شمن نے اس کو بہت سمجھایا کہ وہ بیوہ ہے تو کیا "خدا باپ" کی قدرت میں کسی کو کیا دخل ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے مگر وہ یہی کہتی تھی کہ "نہیں بی بی! میں نے تو پاپ کیا ہے۔"

اور باوجود گھنٹوں سوچنے کے اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ پاپ ہوتا کیا ہے۔ اور لوگ کیوں کرتے ہیں۔ گھر آ کر اُس نے امّاں وغیرہ کو جب

یسوع کی تعریف میں نعتیں سنائیں تو انھوں نے اپنا سر پیٹ لیا اور اسے بہت ڈانٹا کہ کیا اب وہ عیسائی ہونے کا ارادہ رکھتی ہے، لہٰذا مجبوراً اسے واپس اسی پرانی درسگاہ میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں پہنچ کر مس جرن کا دماغ پھر ہرا ہوگیا اور مس ممتاز سے نفرت چوگنی بڑھ گئی۔

۱۲

اس بار اسکول کی نئی زندگی نئی بلاؤں سے شروع ہوئی جو اس پر یکایک ٹوٹ پڑیں نہایت گندی، شرم ناک اور نفرت انگیز مصیبتیں کئی دن تو وہ خودکشی کے منصوبے باندھتی رہی کیونکہ یوں رجھ رجھ کر مرنے سے تو ایک دفعہ زہر نگل لینا ہزار درجہ آسان تھا مگر گھر میں کسی قسم کا زہر دستیاب ہونا بھی تو مشکل تھا۔ جسمانی تبدیلیوں سے تو وہ اور بھی بدحواس ہونے لگی اور گھنٹوں تنہائی میں آنسو بہایا کرتی۔ اُسے پہلی جماعت کی وہ بھیانک استانی یاد آجاتیں جو بالکل گوشت کا بے ہنگم لوتھڑا تھیں، ویسے ہاتھ پیر تو اُن کے سوکھے مارے تھے مگر پیٹ اور سینے پر گوشت کے پلندے لدے ہوئے تھے، لڑکیاں ان کا مذاق اڑایا کرتی تھیں اور عجیب عجیب بے ہودہ لطیفے اُن سے وابستہ کر لیے تھے۔ اُن کی نفرت محض نفرت ہی نہ تھی بلکہ اس میں ایک طرح کا خوف اور کراہت پوشیدہ تھی۔ اصلی گھن تو شمن کو اُن سے اُس دن سے ہو گئی تھی جس دن وہ بھولے سے اُن کے غسل خانے میں گھسی چلی گئی تھی۔ وہ ہمیشہ نہاتے وقت دروازے میں کنڈی چڑھانا بھول جایا کرتی تھیں۔ ملاجی کے بعد یہ دوسری ہستی تھی جسے دیکھ کر اس پر فالج کی سی حالت طاری ہو گئی تھی۔ وہ خاموش تنہائیوں میں پڑی نہ جانے کیا کیا سوچا کرتی، مستقبل بھیانک خوابوں کے نئے نئے چولے بدل کر اس کے سامنے ناچا کرتا، کاش کوئی ایسی دوا ہوتی جسے کھا کر وہ چوہیا برابر ہو جاتی، وہ بہت ہی تیزی سے بڑھ رہی تھی، جسم کے مختلف حصے مختلف اوقات میں بڑھ رہے تھے پہلے تو جیسے اس کی ٹانگوں کو جسم سے نفرت ہو گئی اور وہ بے طرح لمبی ہونے لگیں، رات کو وہ محسوس کرتی اُس کی ٹانگیں بڑھ رہی ہیں، لمبی لکیروں کی طرح لہراتی، پلنگ پر سے اُتر کر دیوار پر سے رینگتی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف بہ رہی ہیں۔ وہ جلدی سے کہنی کا سہارا لے کر ٹانگوں کو دیکھتی تو وہ جھٹ سے کینچوے کی طرح سکڑ جاتیں گویا اُس نے انہیں عین وقت پر پکڑ لیا ورنہ بھاگ ہی گئی ہوتیں۔ وہ کنکھیوں سے لیٹ کر دیکھتی کہ اب کیا کر رہی ہیں۔

اُس کی ٹانگیں، مگر وہ ہوشیار سانپوں کی طرح مکر کیے پڑی رہتیں۔ یہی نہیں اُس کے جسم کا ہر حصہ غبارہ سا ہو چلا تھا۔ ناک ایک دم چہرے سے ادھڑ کر اپنے راستے پر چلنے لگی، اُس نے ایک کہانی پڑھی تھی جس میں ایک شہزادے کی ناک تین فٹ لمبی ہو گئی تھی، بےچارہ شہزادہ! کوئی اُس سے بات بھی نہ کرتا، اُس کی چوٹی بھی کچھ عجیب بے تکی سی ہو گئی تھی جیسے چلنے دانی کا کنڈا۔ اینٹھی ہوئی چھوٹی سی دم سو اُس کی لمبوتری گردن پر کسی طرح نہ جمتی، ایک مرض کا علاج تو اتفاق سے اُس کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے اُن کی بیماری کو بھانپ لیا تھا۔ گو اُس سے چھپائی گئی تھی۔ مگر اس کی تیز نگاہوں نے اُس کی شیشی کو دیکھ لیا تھا جس نے اُن کی جان بچائی تھی۔ موقع پا کر اُس نے وہ دوا چڑھا لی۔ اثر فوری ہوا اور وہ قطعی اچھی ہو گئی۔ بھلا اگر وہ کسی کو اپنا مرض بتا دیتی تو اتنی جلدی کوئی دوا تھوڑی کر دیتا۔ اس کی تو ہر بات کو ٹالا جاتا تھا۔ دوسرے منجھلی بہن نے اُسے ایک دفعہ اس قسم کی بات کہنے پر بہت بے شرم کہہ کر ڈانٹ دیا تھا، اور غضب تو یہ تھا کہ نوری اُس کے تمام شرمناک رازوں کی ٹوہ میں لگی رہتی۔ مگر وہ ہمیشہ اُس سے دور رہتی، وہ جانتی تھی کہ نوری حقارت سے مسکرائے گی۔ اور سب سے جا کر شکایت کر دے گی۔ اپنے دکھوں میں وہ آپ ہی گھلا کرتی، مگر خاک گھلا کرتی تھی! گوشت تو جگہ بے جگہ تھپا چلا جا رہا تھا۔

اُس نے بھاگنا دوڑنا کم کر دیا تھا، جیسے ہوا سے بھی ٹیسیں جھپٹتی تھیں، جسم پکا پھوڑا ہو گیا تھا۔ اور پنڈلیوں میں اینٹھن ہوتی تھی، بڑی جماعت کی لڑکیوں سے اُسے بہت نفرت تھی اور وہ اُن کا ہمیشہ مذاق اڑایا کرتی تھی دھپا دھپ جب وہ رسی کودتے وقت زمین پر پیر پٹختیں تو ان کے کرتوں میں بلیاں سی لڑتی معلوم ہوتیں، مگر شمن کسی نہ کسی طرح کھیل میں شرکت کرنے سے بچ جاتی۔ اُسے ہر روز سزائیں ملیں لیکن وہ سب برداشت کرتی۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے کوئی معقول بہانہ نہ پایا تو بچ سے بلیڈ سے اپنا پیر کاٹ لیا اور بڑی دیر تک اپنی کامیابی پر مسکراتی رہی۔

ایک دم اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ اٹھتے بیٹھتے چکر آ جاتے، ہاضمہ خراب رہتا، منہ پر کالے اور سفید سفید چکتے پڑ گئے، ماتھا پھنسیوں سے لد گیا اور سارے جسم

میں کھلبلی مچتی رہتی۔ خون جیسے کھولتے ہوئے تیل کی طرح بھاری بھاری سے جسم میں لہراتا ہوا محسوس ہوتا۔

اُسے سُست دیکھ کر کسی نے بے پرواہ کی بس سزائیں بڑھتی گئیں یہاں تک کہ اماں ابا کے پاس بھی بہت بُری شکایت گئی۔

اُنہی زمانے میں سالانہ ڈاکٹری معائنے کا وقت آیا تو اُسے ہزاروں فکروں نے گھیر لیا وہ کئی دن پہلے سے سہمی ہوئی رہنے لگی۔ یہ اسکول میں اس کا پہلا معائنہ تھا، وہ ہزاروں بہانے تلاش کرنے لگی، مگر جب جلاد تلوار اٹھا لیتا ہے تو پھر بچاؤ مشکل ہو جاتا ہے۔

جب میٹرن نے اُس سے کپڑے اُتارنے کو کہا تو اس نے اُسے "گدھی" کہہ دیا۔ جس پر میٹرن کو روتے روتے دورہ پڑ گیا سو بھی ماری بڑھیا میٹرن بھلا اس کے دکھوں کو کیا سمجھ سکتی۔

لیڈی ڈاکٹر نے اس کے دو طمانچے لگائے مگر وہ اس سے بھی کشتی لڑتی رہی ڈاکٹرنی نے اس سے بہت سے بے ہودہ سوال کیے جن کا اس نے "نہیں" میں ہی جواب دیا۔ جان بوجھ کر وہ اس کے پیچھے ہی پڑ گئی۔

اس کے بعد اس کا دوبارہ جو معائنہ ہوا تو اس نے بہت ہی قبل مچائے۔ اُس مردار ڈاکٹرنی کو لوگوں کو ٹٹولنے کا وہ شوق تھا کہ حد نہیں، بلا کی طرح چمٹ گئی۔

اُسے زبردستی دوا پلائی گئی اور چند ہی دن میں اس کا خوفناک مرض پھر سے پھوٹ نکلا اور غضب یہ کہ سارے اسکول میں دھوم مچ گئی۔ لڑکیاں مارے تجسس کے نہ جانے کیا سوچنے لگیں۔ نوری اُسے دیکھنے کے بہانے بھید لینے کئی دفعہ آئی مگر شمن نے اُسے ڈانٹ ہی بتائی۔

"سچ بتاؤ شمن" وہ بولی۔

"کیا؟"

"یہی ــــ کہ ــــ کہ نرجیس کہتی ہے کہ تمہارے بچہ پیدا ہوا ہے۔"

ہیبت کے مارے وہ چیخیں مارنے لگی، اچھا تو یہ بات تھی، مگر ڈاکٹرنی نے تو

کچھ نہ بتایا، حد ہو گئی زیادتی کی کسی نے اگر ابا کو لکھ دیا تو موت سمجھو۔ گیندا کی جو گت بنی تھی وہ یاد تھی مگر پھر اس کا ننھا منا بچہ اُسے بے طرح یاد آنے لگا۔

"تو پھر گیا کہاں؟" اس نے دل ہی دل میں سوچنا شروع کیا۔ شاید چھپا دیا گیا ہو، لیکن وہ پالتی بھی کیسے، اسکول کا کام، امتحان سر پہ، بھلا بچے کو کون پالتا لیکن یہ اُن لوگوں کی زیادتی تھی کہ اُسے دکھایا بھی نہیں گیا۔ وہ دیکھتی شکل صورت کس کی سی ہو گی، بہت ہی ذرا سا ہو گا اور پریشانی دور ہو کر اُسے ایک طرح کی فکر سی لگ گئی۔

اُس کا بخار اُترا اور وہ اپنے کمرے میں آ گئی، جب بھی کسی نے بچہ دیتے نہیں دکھایا ایک دن اُس نے باتوں باتوں میں سعادت سے ذکر بھی کیا، سعادت آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

"مگر تمہاری شادی تو ہوئی نہیں۔"

"ہیں؟ ——— شادی نہیں ہوئی تو پھر سعادت ———؟" وہ چُپ رہ گئی، اِس نے جو تخیل میں ننھا منا جو بے بچہ بنا رکھا تھا آہستہ آہستہ دھندلا ہونے لگا

"مگر نوری جو کہتی تھی؟"

"نوری کو کیا معلوم" سعادت نے بزرگانہ انداز سے بولی "کسی سے کہنا بھی مت، پگلی کہیں کی۔"

پھر سعادت نے اُسے بہت سی باتیں بتائیں اور وہ ہنستے ہنستے بیدم ہو گئی شمن کو بھی ہنسی آ گئی۔

جب وہ تنہا پلنگ پر لیٹی تو اُسے اس خیالی بچے کے کھو جانے کا بہت دُکھ ہوا، نوری کی اطلاع کے بعد وہ سچ مچ کا ایک ننھا منا سا کلبلاتا ہوا بچہ کہیں اپنے سے قریب ہی محسوس کرنے لگی تھی، بعض وقت تو اُسے یہ بھی شبہ ہونے لگتا کہ وہ اُس کے پہلو میں پڑا سو رہا ہے، اور اگر ذرا بھی ہلی تو جاگ جائے گا، اس احساس کے ساتھ ہی اُس کے اعضا اکڑ دیے جاتے اور وہ سانس روکے دیر تک پلنگ پر ہلے جلے بغیر پڑی رہتی، اکثر سوتے سوتے اُسے بچے کے رونے کی آواز آتی اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رات کے

اندھیرے میں اُس ہوا جسے کو تلاش کرتی رہتی حتیٰ کہ پھر اُس کی آنکھ لگ جاتی، وہ اُس ننھی سی جان کے ساتھ نہ جانے کب تک اسی طرح آنکھ مچولی کھیلتی رہتی۔ اگر سعادت ہی پر حقیقت کا انکشاف نہ کر دیتی اور اب؟ اب نہ جانے کیوں بچے کے خیال سے ہی اُسے شرم آنے لگتی تو یہ کیسی بُری بات تھی۔

زندگی جیسے دھندلکوں میں سے نکل کر روشنی میں آتی جا رہی تھی، آہستہ آہستہ اُس کے سب دُکھ دور ہونے لگے، گو اس کی سانس گھٹتی، مگر وہ سب باتوں کی عادی ہو گئی۔ زندگی نے دُکھ دکھا خود ہی سکھا دیا۔

۱۳

بات ختم ہوگئی تھی مگر اس واقعے کی نوری نے وہ تھرڈی لیگی کہ ایک دن پکڑ کر اسے ٹھوک دیا، گھر میں وہ نوری کو بڑی آپا سے چھپا کر چار چوٹ کی مار دیا کرتی تھی مگر مجال تھی جو وہ شکایت کر جاتی۔ بڑی آپا تو خیر اُسے مار بیٹھتیں مگر پھر وہ نوری کو زندگی کا مزہ چکھا دیتی یہاں آکر تو نوری بڑی مہذب بننے لگی تھی۔ چڑیا کی بیٹ تک کو وہ ہاتھ روم کہنے لگی تھی اور بڑی اترا کر "دیکھیے دیکھیے" کہہ کر بولتی تھی۔ پھر اُسے شمن نے اس کی سہیلیوں کے سامنے مارا، نوری جوان عورتوں کی طرح ماتم کر کے رونے لگی اور شام تک اپنا بستر بوریا اٹھا کر اپنی سہیلی جلیس کے یہاں جا رہی، بڑی آپا کو ایک نہایت ہی درد ناک خط لکھا۔ جس پر وہ اُس کے مرحوم باپ کو یاد کر کے خوب روئیں اور پرنسپل کو ایک منت بھرا خط لکھا کہ یتیم بچی نوری کو شمن کے پنجے سے نجات دلائیں، نوری ہنسی خوشی جلیس کے کمرے میں رہنے لگی اور شمن کے کمرے میں بڑی بڑی آنکھوں والی رسول فاطمہ آگئی۔

رسول فاطمہ سے شمن کو جو نفرت تھی وہ جنون کی حدوں سے بھی آگے بڑھی ہوئی تھی، اُس کی باہر کو اُبلی ہوئی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی اور بے رونق تھیں جیسے چینی تھالی میں دو مینڈک رکھے ہوں باریک سیدھی سیدھی تنکوں جیسی پلکیں اور کُھردرے بھورے رنگ کے بپوٹے ہر وقت اُن میں بے کسی غربت اور بے وقوفی جھلکتی رہتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے شمن کو ایک دم اُن آنکھوں پر غصہ آنے لگتا۔ اور جی چاہتا اُن میں گرم لوہے کی کیلیں ٹھونک دے۔

وہ بات بے بات اُسے جھڑک دیتی۔ اگر بھولے سے اس کا میلا دوپٹہ یا کوئی کتاب شمن کی میز یا بستر پر رکھی رہ جاتی تو اس کا دماغ تو ازن بگڑ جاتا اور وہ جھلا کر اُسے دور پھینک دیتی، یہ نفرت اور بھی بڑھتی گئی جب اس کے ہر ظلم کے جواب میں رسول فاطمہ نہایت خندہ پیشانی سے اپنے سکڑے ہوئے ہونٹوں میں سے بڑھے میٹھے

دانت نکال کر کھکھیلانے لگتی اور کبھی تو وہ چیزوں کو بے رحمی سے ایسے پھینکتی کہ وہ اس کے منہ پر جا لگتیں۔

"اوں، بھئی ہمیں یہ مذاق نہیں اچھا لگتا" وہ اسے مذاق سمجھتی تھی۔ گویا شمن اتنی گری پڑی تھی کہ رسول فاطمہ سے مذاق کرے گی، وہ پھن کچلے ہوئے سانپ کی طرح بھنا جاتی۔ مگر رسول فاطمہ اس کی طرف پیار سے دیکھ کر اپنی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں مٹھاس پیدا کرنے کی کوشش کرتی۔

اسکول میں ساتھ سونے کی سخت ممانعت تھی، مگر رسول فاطمہ کو اس قدر ڈر لگتا تھا کہ وہ آخری گھنٹی بج جانے کے بعد شمن کے پلنگ کے قریب پلنگ لے آتی شمن نے کئی دفعہ حقارت سے اُسے دھتکارا بھی لیکن وہ سچ مچ اُس کے سر چڑھنے لگی اُس نے بتایا کہ جب سے اُس کی ماں طاعون میں مری ہوئی دو دن تک گھر میں پڑی رہی تھی تب سے اُسے مُردوں سے بہت ڈر لگنے لگا ہے۔ اور اندھیرا ہوتے ہی اسے چاروں طرف سے روحیں گھورنا شروع کر دیتیں۔

"اچھا چپ رہو" نفرت سے شمن اس کی ہر بات پر ڈانٹتی اور وہ خاموش ہو کر ہونے ہولے قرآن شریف کی آیتیں پڑھ کر چاروں طرف پھونکتی مگر جب اُس نے اُن مقدس آیتوں کی برکت شمن پر پھونکنا چاہی تو اُس نے ایک چانٹا اس کے مُنہ پر دیا۔

"سو رہا ہے ہمارے مُنہ پر تھوک دیا" اُس نے دانت پیس کر رسول فاطمہ کو اس کے پلنگ پر گرا دیا۔ رسول فاطمہ بہت ہی سوکھی ماری تھی ذرا سے ٹھوکے سے بیدم ہو جاتی۔

ایک دفعہ رات کو شمن کو اپنی گردن پر چوہا سا چھدکتا معلوم ہوا، اندھیرے میں وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی، چوہا رسول فاطمہ کے پلنگ پر بھاگ گیا —— وہ پھر لیٹ گئی نیم غنودگی کی حالت میں اُسے پھر چوہا چھاتی پر رینگتا معلوم ہوا، دھندلکے میں بڑے غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ چوہا نہیں بلکہ سوتے میں رسول فاطمہ کا ہاتھ ہل رہا تھا، وہ کروٹ بدل کر سو گئی۔

جیسے اُس نے خواب میں دیکھا کہ چوہا پھر رینگا۔ اور قبل اس کے کہ وہ اُسے

جھٹک سکے وہ اُسے پچھاڑ کر اُس پر پوری طرح قابض ہو گیا، اس کے جسم کی ساری رگیں اکڑ کر تانت کی طرح تن گئیں، ساری توانائی جیسے [illegible] سے اس کے جسم سے نکل گئی، اب وہ کبھی جنبش نہ کر سکے گی، رسول فاطمہ کی سوکھی ہوئی انگلیاں کیلوں کی طرح چبھ رہی تھیں مگر وہ اُسے نہ روک سکی، جیسے شیر اپنے شکار کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نگلتا ہے۔ بالکل اسی طرح ...... وہ سہمی ہوئی خاموش لیٹی رہی، اور چوہے دوڑتے رہے، پھر آہستہ آہستہ اس کی ڈوبی ہوئی طاقت ابھرنے لگی، ایک ہی دفعہ اس کا سارا جسم بغاوت پر تن گیا اور اس نے چاہا ایک ہی جست میں وہ رسول فاطمہ کو پچھاڑ کر اٹھ بھاگے، مگر وہ ہلی بھی نہیں احساس ذلت نے اس کی ساری طاقت سلب کر لی۔ اُف۔ اُس کی یہ گت اور وہ بھی رسول فاطمہ کے ہاتھوں، اگر وہ اپنے جاگنے کا اعلان کرتی ہے تو پھر تو اُسے رسول فاطمہ کو مار ڈالنا چاہیئے۔ اُس نے سوچا وہ ایسے ہے گویا سو رہی ہے۔ مگر کچھ دیر میں جاگ جائے گی تو شاید رسول فاطمہ ڈر کر اُسے چھوڑ دے گی ــــ مگر بھلا وہ ایک بھتنی تھی اور فیصلہ جلدی چاہتا تھا لہٰذا ایک دم اُس نے جھلا کر اتنی زور سے کروٹ لی کہ اس کی کہنی رسول فاطمہ کی اُبلی ہوئی آنکھ میں لگی مگر ذرا اوچھی، کروٹ لے کر اُس نے اپنے جاگنے کا اعلان کر دیا۔

"کون ہے؟"

"میں ــــ میں ہوں تمہاری رسول فاطمہ۔"

کیا؟ اس کی رسول فاطمہ؟ اگر وہ اتنی ڈری ہوئی نہ ہوتی تو اُسے اس گستاخی کا اُسی دم مزا چکھاتی مگر موقع نہ تھا۔ اُس نے بڑبڑاتے ہوئے زور سے اپنی چارپائی دور دھکیلی ایسے کہ رسول فاطمہ کا پُرانا پچکا ہوا صندوق چورا ہو گیا۔

صبح اُٹھ کر رسول فاطمہ سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مگر وہ بھری بیٹھی تھی کہ وہ بولے تو بس اس کی جان کو ہی آجائے لیکن رسول فاطمہ بھیگی بلی بنی شمن کا تازہ رنگا ہوا دوپٹہ چُن رہی تھی، یہ دیکھ کر وہ جل گئی اور ایسے زور سے جھٹکا دے کر دوپٹہ چھینا کہ رسول فاطمہ گر پڑی ہوتی، ساری چُنٹ اس کی ہاتھوں کی انگلیاں چھل گئیں مگر وہ بُرا نہ مانی بلکہ رحم طلب نظر سے اُسے دیکھنے لگی، جیسے یہ چنگیزی مظالم اُسے بہت ہی بھلے لگتے ہیں

شمن نے سمجھا کہ جو دوپٹے کی جنت کھوئی تو کوئی شب کھایا ہوا دوپٹہ مسک گیا، اَب تو اُس نے واقعی اسے ایسے دھکیلا کہ بچاری کی نئی تین پیسے کی صراحی چکنا چور ہو گئی، اُس کی بڑی بڑی بے جان آنکھیں زخمی مینڈکوں کی طرح پھول کر ذرا ابھر آئیں اور اُن میں غلیظ نمی جھلکنے لگی۔

ذرا ذرا سی بات پر شمن اُسے دھتکارتی رہی لیکن وہ یا تو چپکی سہمی رہی یا ہیں ہیں کرکے بے جان ہنسی ہنسنے لگی، گویا اس کی ٹھوکروں میں جفا کی چاشنی بھری تھی۔

"کبھی ایسا بھی مذاق کس کام کا ہے کے ساری چوڑیاں توڑ دیں' ظالم کہیں کی!" وہ اُسے اس قدر بے زار سے دیکھنے لگی کہ شکتن گھبرا کے کمرے سے بھاگی، اس کا جی چاہا سب کچھ جا کر میٹرن سے کہہ دے مگر اُس کے پیر ڈل گئے ۔۔۔۔ کیا کہے گی وہ اُس سے جا کر؟ ابھی گذشتہ مہینے چھوٹی کلاسوں کی بچیوں کو بیہودہ کھیل کھیلنے پر سزا ملی تھی، وہ لحافوں میں دُبکی ہوئی زیک دوسرے کو بچے جنوا رہی تھیں! توبہ!!

رسول فاطمہ کی صورت دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی، شام کو وہ سعادت کے ساتھ بیٹھی گھر کا کام کر رہی تھی کہ ایک چھوٹی بچی نے دروازے کی آڑ سے اُسے بلایا

"یہاں آیئے شمن باجی ۔۔۔۔" یہ چھوٹی بچیاں بورڈنگ میں بڑی لڑکیوں کی لونڈیوں کی طرح ہوتی ہیں چھوٹے موٹے کام' رقعہ پیغام لے جانا' چمن میں سے پھول چرا کر لانا۔ کتابیں لاد کر اُدھر سے اُدھر لیے جانا اور اس کے بدلے میں کبھی کبھی بڑی لڑکیوں کے سر یا پیر دبانے کی عزت حاصل کرنا، جتنی زیادہ ہر دل عزیز لڑکی ہوگی اتنی ہی زیادہ چھوٹی لڑکیاں اُس کی خدمت میں حاضر رہیں گی۔ شمن اُن چھوٹی لڑکیوں میں زیادہ عزیز نہ تھی۔ کیونکہ ابھی وہ خود نہایت چھوٹی سی تھی۔

"کیا ہے؟" اُس نے رکھائی سے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

"یہ رسول فاطمہ آپا نے دیا ہے ۔۔۔۔" ایک پرچہ دے کر وہ لڑکی شرماتی ہوئی بھاگ گئی۔ رسول فاطمہ نے نہ جانے کن خوشامدوں اور رشوت دہی کے بعد لڑکی کو پیغام بری کے لیے راضی کیا ہوگا۔ کیونکہ عام لڑکیاں خصوصاً چھوٹی لڑکیاں

اُس سے بہت نفرت کرتی تھیں۔

پرچہ لے کر شمن کے ہاتھ کانپنے لگے اُس نے سعادت کی نظر بچا کر جلدی سے سوبٹر کے گریبان میں چھپا لیا اور واپس پڑھنے آبیٹھی لیکن پریشانی کی وجہ سے اس سے خاک بھی نہ پڑھا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اُسے اغوا کرنے کا خط لکھا ہے اور وہ واقعی خطرے میں ہے۔

اُس نے چاہا کوئی بہانہ کر کے باہر چلی جائے، خط پڑھنے کے لیے وہ بے چین ہونے لگی۔ لہٰذا وہ غسل خانے جانے کا بہانہ کر کے اُٹھی، خط میں لکھا تھا۔

میرے من مندر کی دیوی
آہ اپنے عاشق سے کیوں ناراض ہو، کب تک خفا رہو گی، اگر ابھی بھی مجھ سے نفرت ہے تو اپنے پیارے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دو ——— یہ تم نے کیا جادو کر دیا ہے ——— ایک دفعہ اپنے پیروں پر سر رکھ کر معافی مانگ لینے دو ———
تمہارے حسن کی پروانہ رسول فاطمہ

ہیبت کے مارے وہ شل ہو گئی، کس قدر بدمعاشی کا خط لکھا گیا تھا۔ اب ؟ کمرے میں واپس جانے کے خیال سے اس کا دم نکلنے لگا، وہ کوئی ایسا بہانہ کرے کہ سعادت اُسے اپنے کمرے میں پناہ دے دے، سونے کی گھنٹی بج گئی اور وہ کوئی عذر نہ تراش سکی۔ گھنٹی کی ضربوں کے ساتھ اس کا دل بھی اونچی آواز سے دھڑکنے لگا اور وہ ڈری کہ سعادت نہ سُن لے۔

غیر ارادی طور پر قدم رکھتی ہوئی وہ کمرے میں آئی اُس نے رات کے کپڑے نہیں بدلے، پیر لٹکائے پلنگ پر بیٹھی رہی، نیم وحشی خیالات اُسے پریشان کرنے لگے، ایک لمبی آہ کمرے میں سرسرائی اور رسول فاطمہ نے کروٹ لی، شمن آہستہ سے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اب اندھیرے میں اس نے محسوس کیا کہ رسول فاطمہ کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے جسم میں چبھ رہی ہیں۔ اس پر ایک دم سے نامعلوم خوف طاری ہو گیا اور جی چاہا کہ کسی کی آغوش میں یوں چھپ جائے جیسے چیل جھپٹا مارتی ہے تو چوزے دوڑ کر مرغی کے پروں کے نیچے چھپ جاتے

ہیں پھر اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ باہر نکل آئی اور برآمدے میں کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"یہاں کیوں کھڑی ہو، سردی لگ جائے گی" رسول فاطمہ اس کے ساتھ ساتھ رینگ آئی تھی، مگر اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور غسل خانوں کی طرف چل دی۔ جب وہ وہاں سے نکلی تو رسول فاطمہ سکڑی کھڑی تھی، وہ کچھ نہیں اوڑھے تھی اور اس کے بدوضع رات کے کپڑوں میں سے اس کا حقیر سا جسم ظاہر ہو رہا تھا، وہ اُسے دھکا دیتی ہوئی ہاتھ دھونے کے نل کے پاس جا کھڑی ہوئی اور غیر ارادی طور پر پانی کی دھار اپنی انگلیوں میں سے چھاننے لگی۔

"میلو کی نہیں ثمین —— ؟" رسول فاطمہ منمنائی۔ ثمین نے کچھ جواب نہ دیا۔ نل بند کر کے وہ اپنے حلق میں گیلی انگلیاں ڈالنے لگی۔ حلق میں گدگدی ہوئی، کوا اینٹھا۔ "اُو —— اُوق" وہ قے کرنے لگی۔ باوجود دھکیلنے کے رسول فاطمہ اس پر چڑھی چلی آئی اور گھبرا گھبرا کر اس کی پیٹھ سہلانے لگی، واقعی اُسے قے ہونے لگی ہر جھٹکے پر اس کے گلے کی نسیں کھنچنے لگتیں اور معلوم ہوتا زبان ٹوٹ آئے گی۔ جب ذرا جی ٹھہرا تو رسول فاطمہ دیوانوں کی طرح دوڑتی ہوئی میٹرن کو بلا کر لائی میٹرن نے باورچی کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا اور اُسے الائچی چبانے کو دی۔

"مجھے مریضوں کے کمرے میں پہنچا دیجئے —— نہ جانے جو کیوں قے ہوئی ہو" رسول فاطمہ بورڈنگ کے اصولوں سے واقف ہو کر بھی اُس کے ساتھ جانے کو ضد کرنے لگی۔ مگر میٹرن نے اُسے ڈانٹ بتائی۔ کیا عجب کوئی چھوت کی بیماری ہو!

دیر تک وہ بدبودار رضائی اوڑھے بیمار سی مسکراتی رہی —— اُس کا حلق بُری طرح جکڑ رہا تھا اور کنپٹیاں دُکھ رہی تھیں۔ مگر اُسے معلوم ہوتا تھا کہ چیل سے بچ کر وہ مرغی کے پروں میں دُبکی ہوئی ہے۔

ایک تو رات کو کھانا نکل گیا دوسرے صبح جو بدبودار بسکٹ ملتے تھے وہ بھی بند کر دیے گئے، تو مجبوراً اُسے دوپہر تک تندرست ہونا پڑا، کھانے پر وہ

حسبِ معمول رسول فاطمہ کے پاس نہیں بیٹھی، چونکہ دعا ہو گئی تھی اس لیے رسول فاطمہ اُٹھ کر اُسے بلانے نہ آسکی۔ کھانا کھاتے میں جو ایک دفعہ اُس کی نظر میز کے دوسرے سرے پر گئی تو اس نے دیکھا کہ وہ کچھ کھا نہیں رہی ہے اور اُس کے لیے حسبِ معمول کھانا نکال کر لگا دیا ہے۔ اُس کی مسکین صورت اور پھیلی ہوئی آنکھیں دیکھ کر شمن کا دل بھر آنے کو چاہنے لگا۔ اُس نے اُسی دن میٹرن سے کہہ دیا کہ وہ کھانے پر اپنی جگہ بدلنا چاہتی ہے، سعادت کے پاس ایک جگہ تھی وہاں وہ بیٹھنے لگی۔

نماز کے وقت وہ کچھ نہ بول سکی جب رسول فاطمہ اس کے قریب نیت باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ تو پورے وقت وہ یہ کوشش کرتی رہی کہ سجدہ کرتے وقت اُس کی کہنی رسول فاطمہ سے نہ چھو جائے اس لیے وہ بار بار آیت بھول جاتی۔

رات پھر مصیبت بن کر چھانے لگی اور اس پر پریشانی نے حملہ کر دیا۔ آج وہ بالکل بےبس ہو گئی تھی۔ کوئی اچھی دُکھی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ بڑی دیر تک وہ نفلیں پڑھتی رہی۔ پھر اُس نے یا حافظ کا ورد کیا۔ آج اُسے خدا بے طرح یاد آ رہا تھا اور وہ گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہی تھی، مگر کیا دعا اُس نے مانگی؟ اُس کے منہ سے تو ایک لفظ بھی نہ نکلا، اور پاس ہی رسول فاطمہ دو زانو بیٹھی ہاتھوں کا چلّو اوپر اٹھائے ہل ہل کر دعا مانگ رہی تھی۔ شمن کا جی اور پریشان ہو گیا، اُس کو ایسا معلوم ہوا رسول فاطمہ کے چلّو میں ڈھیر سی دُعا جمع ہو گئی ہے اور جی چاہا ایک ہاتھ ایسا مارے کہ ساری دعا باجرے کے دانوں کی طرح بکھر جائے اور جب رسول فاطمہ اُسے بٹورنے جھکے تو ——— مگر اس خیال کے ساتھ ہی اُسے ترکیب سوجھی ——— رات ہو چکی تھی اور میٹرن اپنا چکر ختم کر کے اپنے کمرے میں جا چکی تھی، اُن دونوں کو عبادت میں مشغول دیکھ کر وہ کچھ نہ بولی کیونکہ یہ مذہبی معاملہ تھا، ایک دفعہ اُس نے لڑکیوں کو میدان میں شب قدر منانے سے روکا تھا تو غل مچ گیا تھا، دوسرے دن مقامی اخباروں کی سرخیاں عیسائی میٹرن کے خلاف زہر اُگل رہی تھیں۔

وہ چپکے سے اٹھی اور آہستہ سے نمانہ کے کمرے کی کُنڈی چڑھا دی اور اپنے

کمرے میں ــــ رسول فاطمہ نے چونک کر اُسے پکارا "شمیتی!" مگر وہ تیز تیز قدم چل پڑی ــــ کمرے میں پہنچ کر اُس کا دل آزاد چڑیا کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا ــــ پلنگ پر لیٹ کر وہ خاموش دبے قہقہوں میں ڈوب گئی۔

نماز کا کمرہ دور تھا، اتنی دور کہ اگر رسول فاطمہ چیختی تب کہیں اُس کی آواز سنائی دیتی، خاموش رہ جائے وہ اس کی آواز کا انتظار کرتی رہی لیکن سوائے جھینگروں کی چیں چیں کے وہ اور کچھ نہ سن سکی ــــ صبح رسول فاطمہ اس کی شکایت کر دے گی پھر ــــ پھر؟ ــــ وہ طرح طرح کے بہانے سوچنے لگی، اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک خوفناک سانپ پر پتھر پٹخ کر بھاگ آئی ہے اور اب وہ وہاں پڑا دم توڑ رہا تھا۔ کہتے ہیں سانپ کو مار ڈالو تو ناگن بدلہ لینے آتی ہے ــــ لیکن رسول فاطمہ کے بعد تو اُسے کسی ناگن کا خوف نہ تھا۔ رسول فاطمہ دنیا میں تنہا آئی تھی، تنہا ہی رہتی تھی اور تنہا ہی چلی جائے گی ــــ کل سے وہ اپنا کمرہ بھی بدل لے گی ــــ مگر یہ رسول فاطمہ غل کیوں نہیں مچاتی ــــ؟

صبح نماز کے کمرے کے آگے لڑکیاں ایسے جمع تھیں گویا رات کوئی چوری ہو گئی ہے اور تالا کو ماٹوٹا پڑا ہے، وہ بھی بے غرض ہی ادھر سے گذری، رسول فاطمہ جانماز میں لپٹی ہوئی پڑی تھی، دو چار لڑکیاں اُسے سہارا دے رہی تھیں، وہ بھاگ کر میٹرن کو بلانے گئی تھیں ــــ رسول فاطمہ بخار میں جل رہی تھی اور اس کی مُردہ آنکھیں انگاروں کی طرح جاندار ہو رہی تھیں۔

میٹرن نے اُسے بیماروں کے کمرے میں لے جا کر لٹایا اور بہت پوچھا کہ کون اُسے وہاں بند کر گیا۔ مگر وہ یہی کہتی رہی کہ کوئی نہیں وہ خود نماز پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی۔

"پھر دروازہ کس نے بند کیا؟"

"کسی نے بھی نہیں!" وہ برابر ٹالتی رہی۔

شمیتی کے دل پر رسول فاطمہ کی ایسی دہشت بیٹھی کہ اُس نے میٹرن سے

خوشامد کر کے اپنا کمرہ بدلوا لیا۔ سعادت اکیلے کمرے میں رہتی تھی اس لیے اُس کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی۔ شمیم کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ پڑھیں گی ساتھ رہیں گی، سعادت سے اس کی بہت بنتی تھی۔

۱۴

جب اُس نے دوڑ کر سعادت کو اُس کے کمرے میں آنے کی خبر سنائی تو بجائے خوشی سے اچھل پڑنے کے وہ خاموش ہو گئی۔ ایک دم سے اُٹھ کر وہ میٹرن کے پاس گئی جہاں دیر تک بڑبڑاتی رہی جب وہ باہر نکلی تو میٹرن چلا رہی تھی، اُس نے زور سے دروازہ بھیڑ دیا۔ اور منہ پھلائے لوٹ آئی۔

شمتن کی ساری خوشی خاک میں مل گئی، وہ تو سمجھتی تھی کہ سعادت اس کے کمرے میں آنے سے خوش ہو گی، اُسے بڑی ذلت محسوس ہوئی، مگر اس نے جی کو سمجھا لیا کہ چونکہ سعادت ہمیشہ سے بورڈنگ میں بہترین کمرے میں رہتی آئی ہے۔ اس لیے وہ اس کے آنے کو اپنی حق تلفی سمجھ رہی ہے۔ سعادت اُسے خاموش دیکھ کر اسکول کا کام کرنے بیٹھ گئی۔ اور وہ تاریخ و جغرافیہ کے چکر میں پڑ کر سب کچھ بھول گئی۔

دو دفعہ رسول فاطمہ نے چپکے سے اُسے بلایا مگر وہ نہ گئی ــــــ رسول فاطمہ کے پاس جانے کی ممانعت بھی ہو گئی تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر نے اُسے دق بتا دی تھی، یہ بھی سنا تھا کہ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد اُسے واپس نہ آنے دیا جائے گا۔

سعادت ویسے تو اب خوش رہنے لگی تھی لیکن پھر بھی بعض وقت شمتن کو محسوس ہوتا کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے، جیسے اس کی موجودگی سے کمرہ گھٹا جا رہا ہو، کیونکہ اس نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ پڑھنے کے بعد فوراً اُٹھ کر اپنی ایک سہیلی کے کمرے میں چلی جاتی تھی۔

اس کی یہ سہیلی نجمہ ہی اسکول کے زمانے میں اس کے ساتھ رہتی تھی پھر جب ٹائیفائڈ کی وجہ سے سعادت فیل ہو گئی تو وہ اس سے ایک درجہ

آگے ہو گئی تھی، وہ ایف اے میں تھی اور ہائی اسکول کی لڑکیوں سے بہت بزرگانہ برتاؤ کرتی تھی، جب وہ سعادت کے کمرے میں آتی تو شمن کو دیکھ کر ذرا دیر کو ٹھٹک جاتی۔ بیٹھتی تو بالکل خاموش ورنہ جلدی سے بہانہ کر کے چلی جاتی۔ نجمہ سے شمن بالکل بے تکلف نہ تھی اور عموماً اُسے دیکھ کر ذرا پریشان ہو جاتی تھی، کبھی شمن اپنے کمرے میں آتی تو نجمہ بھی جو ہنس ہنس کر سعادت سے باتیں کرتی ہوتی ایک دم خاموش ہو جاتی اور دوسرے لمحے اُسے کوئی نہایت ضروری کام نکل آتا اور وہ چلی جاتی، نجمہ کو دیکھ کر شمن کچھ عجیب طرح بے چین ہو جاتی۔ جتنی دیر کھڑی وہ باتیں کرتی رہتی۔ شمن کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا کرتا وہ جلدی سے اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر بے کار کے کام کرنے لگتی، مگر جب وہ چلی جاتی تو شمن کو بہت افسوس ہوتا کہ آخر اس نے اُسے اچھی طرح دیکھا کیوں نہیں۔ وہ اس کی اودی پھول دار شلوار کی تڑپتی ہوئی سلوٹیں، سفید چکن کا کرتہ جس کا گریبان ذرا نیچے کو کھنچا ہوا تھا اور کمر پر چست کرنے کے لیے متوازی پلیٹیں پڑی تھیں۔ شانوں پر پھولا پھولا جھول جس کی کمر کو اور بھی پتلا پتلا دیتا اور اس کا کاسنی چنا ہوا دوپٹہ جو شانوں پر سے ہوتا ہوا بغل میں گھوم جاتا تھا۔ اور آنچل تازہ پھولوں کے گچھے کی طرح سمٹ کر بازو پر جھولا کرتا، جب وہ مڑ کر جانے لگتی تو اس کی چوٹی کا پھندنا اس کے کولھوں پر ٹھمکیاں لیتا، اور اودی شلوار کے پائنچوں میں سے اُس کی سانولی ایڑیاں خاصی گودی معلوم ہوتیں جیسے مور کے بھورے رنگ کے انڈے۔

نجمہ بڑی نازک تھی، معلوم ہوتا تھا اس کے جسم میں ایک بھی ہڈی نہیں شمن کا دل اُسے چھونے کے خیال سے گھبرانے لگتا۔ گرم اور نرم ایسی کہ اگر ہاتھوں میں لے کر زور سے دباؤ تو اُبلے ہوئے انڈے کی طرح پھسل جائے۔

ایک دن یونہی وہ شمن کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ شمن پریشان ہو گئی اور جب اُس نے اپنے دوپٹے کا آنچل جھٹکا تو وہ شمن کے بازو پر آن گرا، شمن کو

ایسا معلوم ہوا جیسے چھت پر سے اُس کے اوپر سانپ ٹپک پڑا۔ وہ سُن بیٹھی رہی، پھر آہستہ سے کھسک کر آنچل گرا دیا ___ لیکن فوراً ہی اُسے افسوس ہونے لگا جیسے اُس نے کوئی میں سے کوئی بڑی پیاری چیز پھینک دی، وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی کہ کاش پھر نجمہ اسی انداز سے آنچل پھینکے اور وہ اس کے بازو سے آن اُلجھے ___ مگر نجمہ چلی بھی گئی۔

بعض وقت جب نجمہ، سعادت سے باتیں کرتی ہوتی تو شمن اُسے نگل جانے والی نگاہوں سے گھورنے لگتی۔ وہ اس کے ہونٹوں کی خفیف سی جنبش، وہ سر موڑ کر ذرا اپنے شانے پر دیکھنا جیسے وہاں کسی کی پیار بھری نظروں کا جواب دے رہی ہے، یا جب وہ اپنی انگلی میں انگوٹھی گھما کر معصومیت سے چھت کی طرف دیکھتی، تو شمن پاگلوں کی طرح اس ننھے سے ڈرامے کو دیکھا کرتی۔ نجمہ اُسے محسوس کرتے ہی ایک دم خاموش ہو کر ہونٹ بھینچ لیتی گویا پوچھ رہی ہے۔

"کیا کہتی ہو؟ ___ کبھی چکو نا ___" مگر شمن کھسیا جاتی اور ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں رینگنے لگتا۔ زور سے پیٹ میں جیسے ایک دم بھوک کھیچتی اور پھر پیاس لگنے لگتی۔ مگر وہ بے توجہی سے کوئی اوٹ پٹانگ کام کیا کرتی۔

پھر اُسے اور کچھ ہونے لگا۔ بیٹھے بیٹھے اُسے نجمہ کے ہونٹوں کی جنبش، آنچل کا گچھا اور کمر پر لگی ہوئی پلیٹیں یاد آجاتیں، وہ تھوڑی دیر تو اُن سے لطف لیتی مگر پھر جھنجھلا کر انھیں دور دھکیل دیتی۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سعادت نجمہ کے کمرے میں سے اس کی ساٹن کی صدری پہن آئی۔ کلاس میں جب شمن نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس نے کوئی گرم رکابی پکڑ لی ہو۔ اُس نے جلدی سے گھبرا کر ہاتھ ہٹا لیا مگر دوسرے لمحے وہ سعادت کی پیٹھ پر ہاتھ رکھنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈنے لگی، اُسے ایسا معلوم ہوا گویا چکنے چکنے سانپ اس کی ہتھیلی میں سرک رہے ہیں۔ دوپہر

کے وقت گرمی کی وجہ سے سعادت نے صدری اتار کر کرسی پر لٹکا دی اور کھانا کھانے چلی گئی۔ شمن نے کھانے کے بعد آ کر جو صدری کو دیکھا تو زور زور سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ دوبارہ اسکول شروع ہونے کی گھنٹی بج گئی۔ مگر شمن بہانے بنا رہی تھی۔

"چلتی ہو کہ نہیں ——— مس جرمی کا گھنٹہ ہے! دیر ہو گئی تو کلاس لیں گی؟"

"تم چلو ——— میں ذرا ———" وہ لوٹا اٹھا کر غسل خانے جانے کی تیاری کرنے لگی۔

جب سب لڑکیاں بورڈنگ سے چلی گئیں تو ڈرتے ڈرتے زمین پر لوٹا رکھ کر اس نے صدری کی طرف دیکھا۔ پھر بھی اس کو اطمینان نہ ہوا۔ اور وہ جا کر دروازہ بند کر آئی۔ آہستہ آہستہ دبے پیر وہ بڑھی۔ دھڑکن ایکا ایکی اتنی تیز ہو گئی کہ معلوم ہوا سینہ ہی پھٹ جائے گا۔ ایک مست کن بھبکا اس کی ناک میں پہنچا۔ اور اسے چکر آنے لگا ——— باہر کسی نے کوڑے کے ٹین کو ٹھوکر ماری اور جلدی سے اس نے صدری پلنگ پر پھینکی ——— گر دروازے سے وہ لوٹ آئی ——— جلدی میں اس نے صدری بجائے کرسی کے پلنگ پر ڈال دی! اور جو سعادت دیکھ لیتی تو؟ غضب ہو جاتا۔ وہ ضرور بھانپ جاتی کہ صدری جگہ سے بے جگہ کی گئی ہے۔

کلاس میں مس جرمی نے کیسا ڈانٹا مگر اسے کچھ سنائی نہ دیا، وہ سر جھکا کر خاموش بیٹھ گئی ——— مگر بڑی دیر تک اس کی انگلیاں صدری کے مس سے جھنجھناتی رہیں جیسے ان میں میٹھی میٹھی مرچیں لگ گئی ہوں۔

اسکول ختم ہوا تو وہ ذہین کیاریوں کے پاس منڈیر پر بیٹھ گئی پنسل کو اینٹ سے گھستے ہوئے اس نے سوچنا شروع کیا ——— آج اسے معلوم ہو رہا تھا۔ گویا اس نے کوئی حسین چوری کی ہے۔ ایک دفعہ اسکول میں پارٹی ہوئی تھی تو اس نے چپکے سے ایک رس گلا اٹھا لیا تھا۔ مگر کسی کے پیر کی چاپ سن کر وہ جلدی سے اسے نگل گئی اور ہاتھ دھونے کے نل میں سے پانی پینے لگی۔ اس رس گلے کا ذائقہ مشکل سے چند سکنڈ اس کی زبان پر ٹھہرا ہوگا۔ مگر اب تک وہ جب چاہتی تخیل کی مدد سے

اس کی مٹھاس منہ میں پہنچ جاتی اور اس کا سارا منہ لذت سے بھر جاتا۔ آج بھی وہ صندل کی خوشبو کو اپنے نتھنوں میں کھینچنے لگی عطر تو نہ تھا مگر تھا ضرور کچھ، سعادت میں تو وہ ہمیشہ سے جانتی تھی کہ مرغی کے بچے جیسے بو آتی تھی۔ مگر اس خوشبو میں تو کچھ لونگوں کے بگھار کی سی مہک تھی۔ بالکل نئی اور آسانی سے کھینچ کر نتھنوں میں گھسنے لگتی تھی۔

اب تو اُسے نجمہ کی طرف آنکھ اٹھاتے بھی شرم آتی تھی مگر قوتِ احساس اُسے سب کچھ بتا دیتی تھی —— کہ اب نجمہ کدھر دیکھ رہی ہے —— اس کے بکھرے ہوئے بال کدھر کو زیادہ جھک گئے ہیں۔ آج اس نے صندلی سنگھاڑے کے ریشم کا کرتا پہنا تو وہ ایسا جسم پر چپک گیا ہے۔ جیسے جسم پر صندلی وارنش چڑھا دی گئی ہو —— آج اس کے ہموار چمکیلے دانت دنداسہ لگانے سے ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے شراب کے گلاس میں موتی تیر رہے ہوں۔ سفید سفید چمکیلے دھاردار موتی۔ نجمہ کے دانت دور سے دیکھنے میں بہت تیز معلوم ہوتے تھے جیسے چوہے کے نوکیلے دانت، شمن آہستہ آہستہ اپنے دانتوں پر زبان پھیرتی تو بڑی گدگدی معلوم ہوتی۔

شمن جب کمرے میں پہونچی تو نجمہ کے بیچھے نے اس کے پیر پکڑ لیے، سعادت اور نجمہ پچھلا اسباب کے کمرے میں ہنس بول رہی تھیں۔ اب کچھ دن سے نجمہ جب آتی سعادت سے کوئی ایسی چیز مانگتی جسے نکالنے کے لیے اُسے صندوق کھولنا پڑتا۔ وہ اٹھ کر اندر جاتی اور پیچھے پیچھے نجمہ بھی چلی جاتی، پھر وہ گھنٹوں وہاں بیٹھی ہلکے ہلکے بولا کرتیں، شمن کا دل کسی کام میں نہ لگتا اور وہ سانس روکے نجمہ کی آواز پر کان لگائے بیٹھی رہتی۔ اس کی اتنی ہمت نہ ہوتی کہ وہ بھی اُٹھ کر اندر جا بیٹھے، مگر اُسے سعادت سے نفرت ہونے لگی کہ وہ جان بوجھ کر اُسے نجمہ سے دور رکھتی ہے۔

اسکول میں فینسی ڈریس ہوا تو انھوں نے کالج کی لڑکیوں کی بھی دعوت کی ویسے بورڈنگ دور نہ تھا اور لڑکیوں کو ملنے کی بھی ممانعت نہ تھی، مگر عموماً ان کے جلسے اور تہوار جدا ہوتے تھے۔ عید کا موقع تھا اور ڈنر قرار شاندار ہونے والا تھا ہر لڑکی کا دل مردانہ لباس پہننے کو چاہتا تھا۔ لہٰذا ڈے اسکالر لڑکیاں حسبِ فرمائش

اپنے اپنے گھروں سے لے آئیں شمن نے بھی ایک سوٹ منگوا لیا۔

مردانے کپڑے پہن کر لڑکیاں شرم کے مارے گر گر پڑ رہی تھیں۔ خصوصاً وہ تو بے حال ہو گئیں جنھوں نے داڑھی مونچھیں لگائی تھیں کچھ تو کمروں میں گھسی بیٹھی تھیں شرم کے مارے چادریں اوڑھے ہوئے اور زیادہ بہادر لڑکیاں انھیں گھسیٹ گھسیٹ کر نکال رہی تھیں۔ اختر موٹی نے مولانا شوکت علی کی وضع کی داڑھی اور ٹوپی پہن رکھی تھی جسے دیکھ کر لڑکیوں کی چیخیں نکلی جا رہی تھیں۔ مگر وہ مزے سے ٹہل رہی تھی۔ ایک لڑکی نے عرب نوجوان کا لباس پہن لیا تھا جس میں وہ بالکل زنانی معلوم ہو رہی تھی، اس کے پاس نوری ریشمی ساڑھی پہنے پھدک رہی تھی، بچاری نوری نے ساڑھی بھی تو نئی پہننا شروع کی تھی۔ اس لیے اس کے لیے وہی عجیب و غریب چیز تھی ـــــ مگر وہ عرب نوجوان خورشید کے پیچھے لگی تھی جو مصری لباس میں بالکل ہیجڑا بن لگ رہی تھی۔

شمن اپنا سیاہ سوٹ پہنے تین دفعہ دروازے میں سے نکلی مگر پھر ڈر کر بھاگ گئی۔ دو چار لڑکیوں نے اُسے گھسیٹا مگر پھر چھوڑ دیا، سوٹ پہنے تو کئی لڑکیاں گھوم رہی تھیں، مگر شمن کا بُرا حال تھا گویا ننگی مادر زاد ہو۔ سب مہمان ہال میں جمع تھے اور برابر کالج کی لڑکیاں گزر رہی تھیں۔ اس نے دیکھا سعادت دھوبی بنی ہوئی ہے سفید پگڑی اور لمبی لمبی مونچھیں اور کپڑوں کی گٹھری شانے پر اور اس کے ساتھ اس کے ساتھ نجمہ دھوبن بنی ہوئی ـــــ نام کو دھوبن تھی مگر وہ تو پوری پدمنی بنی ہوئی تھی۔ گھوم گھیر کا جھلمل کرتا لہنگا اور شوخ گوکھے سے ٹکا ہوا باریک دوپٹہ ـــــ اور وہی صدری اور وہی لونگوں کے بگھار کی مہک میں بسی ہوئی ساٹن کی صدری آج اس نے دنداسہ بھی لگایا تھا۔ اور لپ اسٹک بھی اور گال بھی ہلکے رنگ دار تھے۔ اور پیر؟ اُس کے پیر دیکھ کر شمن کا دم نکل گیا۔ مور کے انڈوں جیسی ایڑیوں میں لال لال مہندی ـــــ وہ ننگے پیر تھی اور چاندی کی پازیب زمین پر گھسٹ رہی تھی۔ ماتھے پر اس نے ٹیکہ لگا رکھا تھا جو بالکل ہیرے کی طرح دمک رہا تھا۔ شمن شرمانا ورمانا سب بھول کر

مبہوت، اُسے دیکھتی رہ گئی۔

"ارے شمشاد کو دیکھنا!" نجمہ زور سے ہنسی اور سب لڑکیاں اُسے دیکھ کر قہقہے لگانے لگیں۔

"ہائے اللہ بالکل لڑکا لگ رہی ہے ـــــ" نجمہ کا مُنہ لال ہو گیا۔

"تم کیوں نہیں چلتیں ـــــ چلو نا ـــــ" سعادت نے رکھائی سے کہا

"آؤ ـــــ بھئی دھوبی تم تو ہو جاہل ـــــ اور یہ صاحب بہادر ـــــ ہمیں تو یہ پسند ہیں" نجمہ مذاق میں شمن کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگی اور شمن کو ایسا معلوم ہوا وہ سو رہی ہے ـــــ یہ سب خواب میں ہو رہا ہے۔

شمن کے لباس سے کوئی متاثر نہ ہوا۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ جب بھی نجمہ اس کی طرف دیکھتی اس کا مُنہ تمتما اٹھتا اور وہ قہقہے مارنے لگتی۔ شمن بھی اُسے برابر دیکھ رہی تھی۔ آج وہ اس کے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ ایسے کئی دفعہ نجمہ کا جالی دار دوپٹہ اس کے ہاتھوں پر آن گرا۔

مگر سعادت کچھ ملکدّ سی بیٹھی تھی، اُسے نجمہ کا ہنسنا اور بات بے بات شمن سے بے تکلف ہونا ذرا بھی اچھا نہ لگا۔ کھانے پر مارے گھبراہٹ اور جوش کے شمن سے کچھ نہ کھایا گیا، کئی مرتبہ نجمہ کی پازیب کھل گئی تو اُسے باندھنی پڑی۔ پھر بھاری جھمکوں سے اس کے کان دُکھ رہے تھے، بار بار اُن کی خبر لینا پڑتی تھی، گو زبان سے وہ نجمہ کی بہت کم باتوں کا جواب دیتی تھی لیکن اس کا بھولا بھالا چہرہ اس پر بدمعاشوں جیسی مونچھیں بال جو بار بار ہیٹ سے باہر نکل آتے تھے، ہر بات پر شرما کر گھبرا جاتا اور پھر خاموشی سے کھسیا کر مسکرا دینا ـــــ ایسی باتیں تھیں کہ نجمہ کو شمن سے بے تکلف ہوئے بغیر نہ رہا گیا اور وہ اُسے شمن کہنے لگی۔

جب شمن نے کچھ کہا تو اس پر بھی نجمہ کو بہت ہنسی آئی، سعادت نہایت سنجیدہ بنی ایک اُستانی سے آنے والے امتحان پر گفتگو کر رہی تھی، اُس نے مونچھیں اُتار دی تھیں اور صافے کو دوپٹے کی طرح اوڑھے ہوئے تھی، بلکہ دھوبی کے

وہ بڑی بی معلوم ہو رہی تھی۔

جب انعام دیے جانے کا وقت آیا تو نجمہ گھبرا گھبرا کر سعادت کو ڈھونڈنے لگی لیکن سعادت اپنے کمرے میں تھی ـــــ نجمہ بھاگی ہوئی گئی شمن کا دل بیٹھنے لگا۔ نجمہ سعادت پر مری جا رہی تھی، اس کا جی نہ مانا تو وہ بھی کمرے میں گئی ـــــ وہاں اُن نے دیکھا سعادت بُری طرح پلنگ پر پڑی رو رہی ہے۔ نجمہ اُسے منا رہی ہے۔ مگر سعادت کے غصّے کی انتہا نہیں ـــــ اُسے دیکھ کر وہ چُپ ہو گئیں۔ اتنے میں چند لڑکیاں بھاگتی ہوئی آئیں اور کہا "نجمہ باجی مس جرمی بلا رہی ہیں" نجمہ مجبوراً اٹھ کر چلدی۔ شمن بھیگی بلی کی طرح ساتھ ساتھ ہال میں تمام فینسی ڈریس والیاں دو دو کے جوڑوں میں گذر رہی تھیں، جب کوئی عجیب جوڑا گذرتا تھا تو خوب تالیاں بجتی تھیں۔

"ارے دھوبن کہاں ہے ـــــ نجمہ" مس جرمی پکار رہی تھیں۔

"ہیں تمہارا دھوبی کہاں ہے ـــــ؟"

"سعادت کی طبیعت خراب ہو گئی ـــــ" نجمہ نے مردہ آواز سے کہا۔

"یہ تو بُرا ہوا ـــــ اچھا تو تم کسی اور کے ساتھ چلی جاؤ ـــــ جلدی کرو اب تمہاری باری ہے ـــــ"

بغیر کچھ کہے سُنے نجمہ نے شمن کا ہاتھ پکڑ لیا اور آگے بڑھ گئی، نہ جانے شمن کہاں پیر رکھتی تھی اور کہاں پڑتا تھا، اُسے تو بس اتنا احساس تھا کہ نجمہ کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ ہے اور وہ ہوا میں معلّق ہے۔ نجمہ کو انعام ملا ـــــ انعام تو تین تھے۔ مگر پھر لڑکیوں نے ایک دوسرے کو دینا شروع کیے یہاں تک کہ ہر لڑکی کے لیے انعام کا اعلان ہو گیا۔

نوری کو اس کی سڑی ہوئی دوست پرجبیں نے دیا اور پرجبیں کو افسر نے پھر تینوں انعاموں پر فخر کرنے لگیں۔

نجمہ نے شمن سے اور کوئی بات نہیں کی ـــــ انعام لینے کے بعد وہ واپس سعادت کے پاس آ گئی اور جب جلسہ ختم ہونے کا آخری گیت گایا جا رہا تھا تو شمن

کی آواز گلے ہی میں گھٹ گئی، سعادت بالکل خاموش کھڑی تھی اور نجمہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے سر سے سر ملائے آخری گیت گا رہی تھی ——— وہ دونوں ایک دوسرے میں غرق دنیا سے بہت دور تھیں، رات کو جب شمن پلنگ پر لیٹی تو بڑی دیر تک ہچکیوں کے ملنے اس کا بُرا حال رہا ——— خاموش وہ اپنی ہتھیلیوں پر دانت گڑھوئے اپنی آواز کو گھونٹتی رہی سعادت آج کمرے میں نہیں تھی، آج چونکہ چھٹی تھی اس لیے لڑکیوں کو ایک دوسرے کے کمرے میں جانے کی اجازت تھی۔ وا... پانچ بجے ... ہو گیا تھا۔ خوف سے اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں، بالکل ... رسول فاطمہ کی طرح۔ اوہ آج اُسے رسول فاطمہ یاد آنے لگی اور ... معلوم ہوا کہ ... اس کی قاتل تھی۔ اس نے ہی تو رات بھر اُسے سردی میں اکڑنے کو ... دیا تھا۔

اور اب وہ بھی رسول فاطمہ کی طرح ——— اُف شدید ... سے اُسے پسینہ آ گیا ——— ٹھنڈی ٹھنڈی آگ سے اُس کا سینہ دہک رہا تھا نجمہ، نجمہ، اس کی روح پکار رہی تھی۔

رسول فاطمہ! اس کی سوکھی کلائیاں اور چوہے کی شکل کے ہاتھ، خراب صحت اور بدوضع جسم ——— ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ اوہ، وہ اس کی قاتل تھی ——— وہ اس کی آخری التجا بھری سانسیں ——— وہ گھٹی ہوئی آہیں۔ شمن کو معلوم ہوا جیسے مکڑیوں کی طرح اس کے جسم پر رینگ رہی ہیں۔

مگر وہ تو مری نہیں تھی ——— میٹرن نے کہا تھا وہ پہاڑ پر چلی جائے تو اچھی ہو جائے گی ——— کاش کاش وہ پہاڑ پر چلی جائے، شمن دعائیں مانگنے لگی۔

مگر نجمہ؟ رسول فاطمہ کے متعلق پشیمان ہو کر اُسے نجمہ کے خیال میں غرق ہونے کا تھوڑا سا حق محسوس ہونے لگا۔

نیند نہ آئی، بے چینی سے وہ پلنگ پر لوٹتی رہی مگر نجمہ ایک خوفناک بے رحم خواب کی طرح اس کے دماغ میں بھری ہوئی تھی، جس وقت اُس نے رسول فاطمہ سے نجات پائی تھی تو اُسے خیال ہوا تھا کہ سانپ کو مار ڈالو تو ناگن آ کر بدلہ لیتی

تھے ـــــ تو ـــــ وہ مجھ سے اس کا بدلہ لے رہی تھی۔

خوف سے اُسے پھر رونا آنے لگا۔ اپنے پلنگ کے چاروں طرف ناگنوں کی پھنکار سُن سُن کر وہ نیم جاں ہو گئی، تڑپ تڑپ کر وہ نہ جانے کب سو گئی!

۱۵

وہ ہر ممکن کروٹ سے لیٹی مگر نیند نہ آئی۔ نجمہ ایک بھیانک خواب کی طرح اُس کے دماغ میں بھری ہوئی تھی جب اس نے رسول فاطمہ سے رہائی پائی تھی تو اسے ایسا معلوم ہوا تھا جیسے اُس نے سانپ کچل ڈالا۔ مگر جبھی اس کے دل میں دبا چھپا خوف بھی سمایا ہوا تھا کہ اگر ناگ کو مار ڈالو تو ناگن بدلہ لینے آتی ہے۔ وہ اپنے ناگ کی مردہ آنکھوں میں دشمن کی تصویر دیکھ کر اُسے ڈسنے پر تُل جاتی ہے۔ تو یہ نجمہ [illegible] رسول فاطمہ کے زخموں کا بدلہ لے رہی تھی دُکھ اور خوف سے وہ تڑپ کر رو دی۔ ساری رات پلنگ کے چاروں طرف ناگنوں کی پھنکاریں سرسراتی رہیں جنھیں سُن سُن کر نیم جاں ہو گئی۔

صبح اُٹھ کر اُس نے سعادت سے بات نہ کی ——— وہ خود کچھ کھنچی کھنچی نظر آ رہی تھی۔ شمیم خاموش لائبریری میں بیٹھ کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگی، چھٹیوں کے تین دن پہاڑ بن بن کر اس کے تنہا اور مجروح جسم کو پیستے رہے۔ سعادت روز رات کو غائب ہو جاتی۔ اور بکھرے بورڈنگ میں شمیم کو قبرستان کا سا سناٹا چھایا نظر آتا لائبریری میں وہ نہ جانے کتنی دیر بیٹھی موٹی موٹی ڈکشنریوں کو بے معنی نظروں سے گھورتی رہی۔ اُن میں سے ایک میں بھی تو اُس کے مرض کا علاج نہ تھا۔ کسی خوفناک انجام کی آمد کے خوف سے وہ سہمی جا رہی تھی۔ یہ اس کے دل کا غبار جو آہستہ آہستہ سُلگ رہا تھا کب پھوٹ چکے گا۔

جیسے کسی نے اُس کی خاموش دعاؤں کی آہٹ سُن لی اس کا دل غبارے کی طرح پھولنا شروع ہوا اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر تھوڑی دیر اور نجمہ اسی طرح مذبذب دروازے میں کھڑی رہی تو یہ غبارہ پھوٹ ہی جائے گا۔ مگر نجمہ آہستہ سے بڑھ کر الماریوں میں کتابیں دیکھنے لگی۔ وہ شمیم کی پیٹھ کے پیچھے کھڑی تھی اور ایسا معلوم ہوتا

تھا جیسے اس کی پیٹھ پر کوئی انگیٹھی دہک رہی ہے بہارے جسم پر گرم گرم نکتے سے پھدکتے محسوس ہو رہے تھے وہ سانس روکے کتاب کے صفحے پڑھتی رہی عبارہ آہستہ آہستہ بچکنے لگا۔ "ارے تمہارے پاس ہے یہ کتاب، میں کہہ رہی تھی کون لے گیا اٹھا کر" نجمہ نے اس کے پاس کی کرسی گھسیٹی۔ شمن نے جلدی جلدی کتاب کے ورق تن رہی سے لوٹنے شروع کر دیے۔

تھوڑی دیر نجمہ میٹھی باتیں کرتی رہی۔ ادھر ادھر کی فضول بکواس۔ اتنی دیر شمن چور بنا چھپے اس کی ساٹن کی صدری جس کے دو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور بغل میں دبا ہوا کانوری دوپٹے کا گچھا دیکھتی رہی۔ نجمہ بے چینی سے ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ اس کی کاہی اطلس کی مچلتی ہوئی شلوار آہستہ آہستہ لہرا رہی تھی۔ پھر وہ ایک دم چپ ہو گئی اور بڑے غور سے شمن کے خوف زدہ اور مسرت بھرے دہکتے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگی۔

"شمی!" نجمہ نے اتنے آہستہ کہا جیسے کسی نے دو باریک بالوں کو آپس میں الجھا دیا ہو۔ شمن کی آنکھیں لرزتی ہوئی اٹھیں اور فوراً جھک گئیں۔ نجمہ نے اپنی دو انگلیاں آہستہ سے شمن کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔ ایک دم اس کی ہتھیلی میں تشنج ہوا۔ اور وہ سمٹ کر نجمہ کی انگلیوں کو نگلنے لگی۔ دروازے میں سعادت کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نجمہ نے تیزی سے اپنی انگلیاں چھین لیں۔ اور عجب تھکی ہوئی سی ہنسی اس کے ہونٹوں پر مچلنے لگی۔

"سعادت آپا!" اس نے ہمت کر کے کہا۔ "آؤ نا۔ کہاں چلی گئی تھیں۔ میں بیٹھیں......" مگر سعادت نے ایک تلخ جنبش سے اس کی بات ٹال دی۔ اور بڑی مشغولیت سے کتابیں دیکھنے لگی۔

نجمہ سعادت کے پیچھے پیچھے گئی۔ شمن نے دیکھا وہ کسی اہم مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے گیلری کے آخری کونے پہ رک گئیں۔ نجمہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ جسے سعادت ٹال کر جانا چاہتی تھی۔ مگر نجمہ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

جلد ہی یہ بات بورڈنگ میں پھیل گئی کہ سعادت اور نجمہ کی جنگ ہو گئی۔ نیز شمن پر بھی مشتبہ نظریں پڑنے لگیں۔ گو یقین تو نہیں پھر بھی اہل نظر کا خیال تھا کہ کچھ اس کا بھی دخل ہے۔ سعادت کا پرانا دردِ سر کا مرض عود کر آیا اور نجمہ کو گوشت کی بو سے قے ہونے لگی۔ لہٰذا دونوں نے کھانا نہ کھایا لڑکیوں کے گروہ کھسر پھسر کرنے اور قہقہے لگانے لگے۔ سعادت کی علالت تو طویل ہو گئی۔ مگر نجمہ بدستور کھانے کے کمرے میں آنے لگی۔ وہ ایک دم سے بہت ملنسار ہو گئی۔ جن لڑکیوں سے وہ کبھی بات بھی نہ کرتی ان سے ہنس ہنس کر مذاق کرنے لگی لیکن بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں میں ایک پوشیدہ فکر جھلکنے لگتی۔ اس کا ہر مذاقیہ جملہ زبردستی ڈھالا ہوا معلوم ہوتا۔ ویسے تو لڑکیاں اس کی بات کا جواب بڑی خندہ پیشانی سے دیتیں لیکن اس کے جاتے ہی چلی کٹی کہنے لگتیں۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ اس کی ظاہرہ خوش مزاجی کی اصل وجہ کیا تھی۔ اسے صرف سعادت کا غم مٹانے کے لیے ان کی مدد کی ضرورت تھی مگر کسی کو اسے رکھائی سے جواب دینے کی ہمت نہ تھی۔ کیونکہ وہ استانیوں میں کافی پسند کی جاتی تھی اور اپنی جماعت میں ہمیشہ اول رہتی تھی۔

موقع کی مناسبت کو دیکھتے ہوئے شمن آہستہ آہستہ کسی نہ کسی طور سے اس کے قرب میں رہنے کی کوشش کرنے لگی کچھ نہیں تو وہ اس کی ڈاک ہی پکڑنے کی فکر میں رہتی تاکہ اسے دینے کے بہانے ہی اس کے کمرے میں جا سکے یا دو بار کسی جملے کے معنی پوچھنے یا مفید کتاب کا پتہ معلوم کرنے اس کے پاس چلی جاتی۔ نجمہ کا رویہ بڑا سلجھا ہوا ہوتا۔ اگر غلطی سے وہ ذرا بے تکلف ہو جاتی تو فوراً واپس کھنچ جاتی۔ اور جلدی سے اُسے کمرے میں سے ٹال دیتی۔ یہاں تک کہ بعض وقت تو شمن کو اس کی رکھائی سے بڑی چوٹ لگتی تین دن ہو گئے۔ سعادت اور نجمہ کے درمیان پرچہ بازی ہوتی رہی لیکن ملاپ کی کوئی صورت نہ نظر آئی۔ اس عرصے میں نجمہ کئی دفعہ شمن کے کمرے میں بھی آئی۔ ہنس ہنس کر باتیں بھی کیں۔ مگر کچھ خشک سی ہو کر فوراً چل دیتی۔ کئی بار دونوں باغ میں بھی ملیں۔ مگر عموماً خاموشی نے انھیں جلد ہی بھاگ جانے پر مجبور کیا۔

امتحان شروع ہونے والے تھے۔ یہ امتحان بھی بورڈنگ میں شاندار تہوار کی طرح آتے ہیں۔ کئی دن پہلے سے لڑکیاں ایک دوسرے کو وش (Wish) کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ پھول پھول کا تبادلہ شروع ہو جاتا اور بہت سی تو دوپٹے ساڑھیاں چوڑیاں وغیرہ دے لیتی ہیں۔ آپس کے لین دین سے زیادہ یک طرفہ دین ہوتا ہے۔ یعنی وہ لڑکیاں جو دوسروں پر مرتی ہیں وہ بڑے دل کھول کر دیتی ہیں۔ وہ خواہ کتنی غریب ہیں یا وظیفے پر گذارہ کر رہی ہیں۔ خیرات میں کتابیں اور بدیے ملتے ہیں۔ مگر جس پر مرتی ہیں۔ اس کے لیے چوری کریں گی، ڈاکے ڈالیں گی۔ بھیک مانگیں گی مگر اپنی چہیتیوں کو دس دس روپے کی چوڑیاں یا پانچ چھ روپے کے ہار پھول اور گجرے ضرور پہنا دیں گی۔

جس لڑکی کی زیادہ مرنے والیاں ہونگی۔ اتنی ہی زیادہ اُسے چیزیں ملیں گی۔ اس کے علاوہ عین امتحان کی صبح ہار اور گجروں سے لاد دیں گی اور بعض چہیتیاں تو ایسی پھولوں میں چھپ جاتی ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے لیڈر کا جلوس نکل رہا ہے۔ بعض مرنے والیاں پھولوں اور گوٹے کے گہنے پہنا کر بالکل دلہن بنا دیتی تھیں اور پھر یہ دلہنیں شرماتی لجاتی امتحان کے کمرے میں چلی جاتیں۔ ہر مرنے والی کا ہار پہننا لازمی تھا۔ بعض حاسدوں کا خیال تھا کہ اپنے ہار مرنے والیوں کے نہیں ہوتے تھے بلکہ دکھانے کو یہ لڑکیاں خود منگا کر پہن لیا کرتی تھیں تاکہ لوگ سمجھیں ان کی اتنی مرنے والیاں ہیں۔

شام ہی سے شمن نے بھی نجمہ کے لیے سوا روپے کا موٹا سا گجرا منگوایا۔ رات کو جب تک وہ جاگتی رہی اس پر پانی چھڑکتی رہی۔ بار بار اُس نے ان خوش نصیب پتیوں کو چھوا جو کل نجمہ سے معانقہ کرنے والی تھیں۔ اگر اُس کا بس چلتا تو وہ اُن پتیوں کی آڑ میں چھپ رہتی

صبح اُس نے گھبراہٹ میں ناشتہ بھی نہ کیا۔ گجرے کو کبھی اس ہاتھ میں لیتی کبھی اس میں وہ کس طرح نجمہ کے گلے میں ہار ڈالے گی۔ شاید سیتا جی کو رام چندر جی کے گلے میں ورمالا

ڈالتے وقت بھی اتنی الجھن نہ ہوئی ہوگی۔ بلا سے انھیں مذاق اڑانے والی لڑکیوں نہ میٹرن کی تیز نگاہ کا ڈر تو نہ تھا۔ اور یہ اجڈ غیر شاعرانہ دماغ کی لڑکیاں، تو بس انسان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی تھیں وہ برآمدوں میں کھڑی ہو جاتیں اور چونکہ خود کسی پر نہ مرتی تھیں اس لیے ہر مرنے والی کی گھبراہٹ اور گجروں کا مذاق اڑاتیں جس سے بعض وقت پھبتیاں بھی مجروح ہو جاتیں اور عام سیانہ پن اور بدمزگی پھیل جاتی مرنے والیاں بگڑ جاتیں تو یہ دوسری لڑکیاں جو انھیں بازاروالیوں کی طرح نیچ سمجھتی تھیں کٹتے ہوئے طعنوں سے اُن کے کلیجے چھلنی کر دیتیں۔ اُن کی کمزوریوں کو شارع عام پہ کھول کر بکھیر دیتیں۔ مگر یہ مرنے والیاں بھی بڑے پتھر کے کلیجے والی ہوتی ہیں کوئی طعنہ، کوئی ملامت انھیں ان کے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔ وہ ضرورت سے زیادہ بے حس اور بے حیا ہو جاتی ہیں۔ بعض تو ایسی مرنے والیاں تھیں جن سے گھر والے تک ان کے اس جنون سے عاجز تھے۔ اگر ان پہ ذرا بھی سختی کی جاتی تو وہ پاگل سی ہو جاتیں اور پھر مجبوراً اُن کے ساتھ رعایت کرنا پڑتی۔

جب پھولوں میں لدی پھندی نجمہ اپنے کمرے سے نکلی تو شمن کے ہاتھ پیر لرزنے لگے۔ جیسے تیسے کر کے اُس نے ہار نجمہ کے گلے میں ڈال دیا۔ نجمہ نے ہلکی سی مسکراہٹ سے اس کی قیمت ادا کر دی لیکن بجائے امتحان کے کمرے میں جانے کے وہ سعادت کے پاس بیماروں کے کمروں میں چلی گئی۔ نہ جانے کیوں شمن کے پیر بھی اس کے پیچھے پیچھے اٹھ گئے۔

اُلٹے پیروں وہ واپس ہوئی اور بوجھل پیروں کو گھسیٹتی ہوئی کھوئی کھوئی جماعت میں چلی گئی وہاں تو اس کے دل پر جیسے منوں مٹی پڑ گئی۔ سعادت بالکل تندرست اور خوش بیٹھی تھی۔ اس کا گجرا جو اس نے اتنے ارمانوں سے نجمہ کو دیا تھا جوڑے میں لپیٹے ہوئے تھی۔

سعادت اور نجمہ پھر ایسے ہی ملنے لگیں۔ گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی نجمہ کے امتحان ختم ہو گئے اور اب سعادت اور شمن کے امتحان شروع ہوئے شمن نے

نجمہ کو سوا روپے کا گجرا پہنایا تھا۔ اس نے سعادت کے لیے تو کروڑوں ہار پھول منگائے مگر شمن کے لیے شاید ہار منگانا بھول گئی۔ اُسے کسی نے بھی ہار نہ پہنائے اگر اُسے معلوم ہوتا تو وہ چوری چھپے خود ہی منگا کر پہن لیتی پھولوں میں لدی ہوئی لڑکیوں کی قطار کے آخر میں سر جھکائے وہ امتحان کے کمرے کی طرف جانے لگی۔

شمن .... بھئی مجھے گجرے نہیں اچھے لگتے۔ یہ پھول میں گھر سے لائی ہوں۔ اچھے ہیں نا — بلقیس نے اُسے مڑ کے شگفتہ پھولوں کا گچھا دیا بلقیس ڈسے اسکالر تھی اور آٹھویں میں پڑھتی تھی۔ شمن کو معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کا ننگا تن ڈھانک دیا اور اُسے باغ کے باغ بخش دیے پرچہ کرنے میں اس کا دل نہ لگا اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے رعایتی ترقی ملی۔

امتحان کا نتیجہ معلوم ہوتے ہی چھٹیاں ہو گئیں اور دو مہینے کے لیے لڑکیاں اپنے گھروں کو چل دیں۔ بسیرا لینے کے لیے پھُر سے چڑیاں اُڑ گئیں۔ دو مہینوں کا بسیرا!

دوسری منزل

۱۶

دوبارہ جو وہ اسکول میں آئی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ بلقیس کی بڑی بہن جو حال ہی میں انگلینڈ سے آئی تھیں۔ پرنسپل ہو گئی تھیں۔ اور بلقیس اور اس کی چھوٹی بہن جلیس مع لمبے چوڑے خاندان کے پرنسپل صاحبہ ہی کے ساتھ اسکول کے احاطے میں آن رہی تھیں۔ سعادت کو ڈاکٹروں نے ایک سال کے لیے پڑھنے کو منع کر دیا تھا۔ اس کی صحت میں گھن سا لگ گیا تھا۔ نجمہ پاس ہو کر کسی اور کالج میں لاہور چلی گئی تھی۔ شمن کو دنیا سنسان اور اجاڑ معلوم ہوتی۔ دل میں تنہائی کی ہوکیں سی اٹھتیں۔ نجمہ کا خیال پھوڑا بن کر ٹیسیں مارتا۔ اس میں کس قدر دکھ بھرا ہوا تھا مگر زندگی کی چاشنی بھی تو تھی۔ نجمہ نے اسے اپنی ایک تصویر بھی دی تھی جسے اس نے اپنا بہترین مونس و غم خوار پایا۔ سعادت بھی اسے اب بہتر رنگ میں یاد آتی۔ ویسے جہاں نجمہ کا سوال نہ تھا وہ اس کی بہترین دوست تھی کاش اس نے نجمہ کو کبھی دیکھا ہی نہ ہوتا اور اگر دیکھا تھا تو؟ تو؟ وہ آگے کچھ نہ جانتی تھی مگر اسے سعادت سے دوستی ٹوٹ جانے کا صدمہ تھا۔ نجمہ تو ایک شعلہ تھی کہ دفعتاً تو قریباً ہاتھ تاپنے کی حالت ہو۔ مگر سعادت ایک میٹھا چشمہ تھی جس سے کلاس میں، کلاس کے باہر کھیل کود میں بھی بے پناہ یکجہتیاں اور ہمدردیاں وابستہ تھیں۔ سعادت کو ملنے کا مرض نہ تھا وہ الجھن ذرا ذرا سی بے ضرر باتوں پر گھنٹوں چمن کے سبزے پر لوٹیں لگائیں۔ سعادت ہنس مکھ تھی اور وہ ایک معلم جیسی مدد بھی دیتی۔ یہی نہیں وہ اگر شمن کو بد دل یا مست دیکھتی تو بڑی سختی سے ڈانٹتی۔ شمن کو اس کی ڈانٹ میں مادرانہ پیار اور فکر کی جھلک نظر آتی اور بعض وقت وہ اترانے کے لیے نخرے دکھاتی۔ "یہ تمہاری بلا سے ہمیں فیل ہو جانے دو۔" وہ اکثر کہتی۔

"بس جی بس، زیادہ بکواس نہ کرو ——— ورنہ" سعادت ڈانٹتی۔

"ورنہ ــــــــ ورنہ کیا؟"

"ورنہ یہ ــــ کہ...... کچھ نہیں ــــ میری پیاری بہن کیسی ــــ آؤ" اور وہ شمن کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی........ مگر جب نجمہ آئی تو؟........ تو سارا شیرازہ بکھر گیا۔ اور شمن سعادت کی موت کی دعائیں مانگنے لگی اس کے سفلی جذبات بالکل شیطانی اعمال بن گئے تو بہ!

بلقیس سے شمن کی دوستی بھی عجیب و غریب طریقے پر ہوئی ایک دن بلقیس اور وہ بیڈمنٹن کھیل کر پسینہ سکھانے کے لیے چمن کی بنچ پر بیٹھی تھیں کہ ایک دم سے بلقیس نے پوچھا۔

"تم نجمہ پر مرتی تھیں نا؟"

"نہیں ــــ نہیں تو ــــ واہ" شمن گھبرا گئی اور قسمیں کھانے لگی

"ارے ہم سے جھوٹ بولتی ہو ــــ ہونہہ ــــ جیسے ہم جانتے نہیں اور سعادت تمہاری جلتی تھی ــــ کیوں؟"

"جی ہاں کبھی بھی نہیں۔"

"تو اس میں بات ہی کیا ہے میں خود پہلے نجمہ پر مرتی تھی مگر آپا نے مجھے بتایا کہ لڑکیوں کو ہمیشہ لڑکوں پر مرنا چاہیئے۔

"توبہ!" شمن نے بدک کر کہا۔

"ہاں اور کیا۔ اُن سے تو شادی کر کے ہمیشہ ساتھ بھی رہ سکتے ہیں۔ کیوں ہے نا بھئی"

"مگر...... یہ تو...... ہائے اللہ بری باتیں نہ کرو بلقیس۔"

"اس میں بُری بات کیا ہے جیسی نواب تجھے کوڑیالے اچھے لگتے ہیں۔ میں بڑی بھی تو ہوں تم سے" بلقیس روش پر سے کنکریاں چن کر ہوا میں اچھالنے لگی

"کوڑیالے۔"

"ہاں ــــ ارے؟ کوڑیالے! تم نہیں جانتیں کیا ہوتے ہیں ــــ چہ ہٹو بھی

اتو ہو تم یہ بلقیس قہقہہ لگا کر گھاس پر لوٹ گئی ۔" ارے کوڑیالے ہگی ـــــ کالے اور سفید، اس نے ٹھنڈی گھاس پر گال رگڑ کر ہلکی سی پھریری لی ـــــ" زہریلے نف .... " نماز کی گھنٹی بج گئی اور دونوں بات ختم نہ کر پائیں۔

دو تین دن بلقیس کھیلنے ہی بورڈنگ میں نہ آئی جو شمن کی الجھن دور ہوتی۔ اس کے جی میں کھد بد ہو رہی تھی۔ اس کا جی نہ مانا اور اس نے لغت میں دیکھا مگر اس میں لکھا تھا "کوڑیالے ...... چتی دار سانپ سیاہ اور سفید سخت زہریلے ...... جن کے کاٹے ......" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کوڑیالے سانپ بلقیس کو کیوں پسند ہیں

"بلّی بتاؤ نا کوڑیالے کون ہوتے ہیں ۔" اس نے موقع پا کر پوچھا۔

"کوڑیالے دل کے ٹکڑے ہیں! جان ہوتے ہیں۔ اور کون ہوتے ۔"

"اونہہ تو بتاؤ نا"

کئی دن شمن پوچھتی رہی اور بلقیس ہنس ہنس کر ٹالتی رہی۔ مگر ایک دن اس نے شمن کو ایک تصویر دکھائی یہ ایک وجیہہ نوجوان کی تھی جو سیاہ شیروانی اور سفید پاجامہ پہنے تھا۔ ایک دم سے وہ دونوں قہقہے لگا کر ہنسنے لگیں۔ اچھا تو یہ تھے کوڑیالے! کالی شیروانی یونیورسٹی کا یونیفارم تھا اور یہ تصویر رشید کی تھی

ویسے بلقیس اور جلیس بورڈنگ میں نہیں رہتی تھیں پر جب کبھی اُن کا دل چاہتا وہ سارے قوانین بالائے طاق رکھ کر بورڈنگ میں آن دھمکتیں۔ پرنسپل کی بہنیں تھیں بھلا کس کی مجال تھی جو چوں بھی کر جائے۔ پھر اُن کا دل لگنے لگا اور بلقیس شمن کے کمرے میں مستقل رہنے لگتی۔ پر جب جی چاہتا بغیر اجازت بھاگ جاتیں جلیس بدمزاج تھی اور نوری کی جماعت میں تھی وہ دونوں ایک کمرے میں رہتیں مگر روز جوتا چلتا شمن اور بلقیس نہایت بزرگانہ طریقے پر انہیں سمجھانے جاتیں اور میلاپ ہو جاتا اور پھر دونوں ایک دوسرے کا دوپٹہ اوڑھے گلے میں ڈالے چمن میں گھومنے لگتیں۔

پہلے پہل تو نوری نے بلقیس پر مرنے کی کوشش کی اور جلیس نے شمن پر مگر بلقیس نے نہایت جنگلی پن سے دونوں کو کھسیانہ کر دیا اور اور پھر کچھ سوچ بچار کے

بعد نویں جماعت کی ایک لڑکی کو دونوں نے چاہنا شروع کیا۔ مگر بلقیس نے وہاں بھی ان کا ناک میں دم کر دیا جہاں کوئی چیز گم ہو جاتی وہ فوراً اچھل اچھل کر جلیس اور نوری پر الزام لگاتی کہ وہ اپنی چہیتی کو دے آئی ہوں گی۔ بات یہ تھی کہ ایک دفعہ بیچاریاں بلقیس اور شمیم کے منگائے ہوئے پھلوں میں سے دو نارنگیاں چرا کر دے آئی تھیں۔ مگر اب بلقیس کی سڑی ہوئی چپل بھی گم جاتی تو وہ یہی کہتی کہ نوری اور جلیس اپنی دوست کو کھلا آئیں۔ اس پر نوری اور جلیس خوب روتیں اور خوشامدیں کرتیں کہ ہولے ہولے بولو کہیں وہ سُن نہ لے۔ شاہ جہاں ان دونوں سے دو کہی بڑی تھی اور زیادہ مُنہ نہ لگاتی تھی۔ پر جب اُس نے بلقیس کا ذکر انا سُنا تو دونوں کو کمرے سے نکال دیا۔ دونوں روتی ہوئی بچھونوں میں جا پڑیں۔ اوپر سے بلقیس اور ساتھ ساتھ شمیم نے بھی چھیڑنا شروع کیا خوب گیت جوڑ جوڑ کر ٹہل ٹہل کر گائے۔ نوری اور جلیس قسمیں کھا کر کہتی تھیں کہ شاہ جہاں آپا نے ہمیں نکالا تھوڑی یہ کہا مہربانی سے چلی جائیے ــــــ" مگر بلقیس کہتی تھی کہ شاہ جہاں نے پہلے تو دھکا دیا اوپر سے چپلیں لگائیں۔ بے چاریوں کے دل ٹوٹ گئے۔ اور اُس دن سے شاہ جہاں کی جانی دشمن ہو گئیں۔ جلیس دلیسے ہی دل جلی تھی۔ بیچاری کا ناطقہ بند کر دیا۔ اس تلخ تجربے کے بعد دونوں نے مرنے کی مزید کوشش نہ کی۔ اور زیادہ تر وقت بدذاتی کرنے، کچے آم توڑنے اور سونے والیوں کو دق کرنے میں صرف کرتیں۔

بلقیس کی پانچ بہنیں تھیں ان میں سے سب سے بڑی پرنسپل تھیں۔ بڑی حسین نازک اور شرمیلی سی کسی طرح پرنسپل نہ لگتیں۔ ساری کی ساری لڑکیاں اُن پر لٹو ہو گئی تھیں۔ شمیم تو خود لٹو ہو جاتی اگر اُس نے بلقیس سے ان کا کچا چٹھا نہ معلوم کر لیا ہوتا۔ تھا۔ بہت ڈرپوک تھیں۔ بیڈمنٹن کھیلتے میں ہار جاتیں تو رونے لگتیں اور کم از کم گیارہ ... سے بیک وقت عشق لڑا رہی تھیں جن میں سے دو تو پروفیسر تھے اور باقی کو ڈیپٹی! پرنسپل کی بہن ہونے کی وجہ سے بلقیس بورڈنگ میں الٹے سیدھے حکم چلایا کرتی

تھی۔ کھانے تھے کمرے سے۔ سوائے بیمار لڑکیوں کے اور کسی کو کھانا کمرے پر منگوانے کی اجازت نہ تھی۔ اور اگر ایک گلاس بھی ادھر سے اُدھر ہو جاتا تو آفت آجاتی مگر بلقیس کے کمرے میں چھوٹی رکابیوں کے ڈھیر سڑا کرتے میٹرن دیکھتی اور خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ کیونکہ اس سے پہلے میٹرن صرف اس لیے نکال دی گئی تھی۔ کہ وہ نئے دن لڑکیوں کی رپورٹ دفتر میں لے جاتی تھی اور لڑکیوں میں بلقیس جلیس اور ان کی چند لاڈلیاں تھیں اور لڑکیاں بھی بلقیس جلیس کی خوشامدوں میں لگی رہتیں۔ خصوصاً وہ بدنصیب بچیاں جنھیں بورڈنگ سے کھانا مفت ملتا تھا یا فیس معاف تھی وہ اپنی دانست میں پرنسپل صاحبہ کی خیرات پر پلتی تھیں۔

بلقیس کو ڈبالوں کے نت نئے قصے آکر سناتی۔ وہ اور جلیس کافی چھوٹی تھیں جبھی سے ان کے کوڑیالوں کی تعداد اطمینان بخش تھی۔ پانچوں بہنوں کے سارے عاشق اگر جمع کیے جاتے تو خاصی پلٹن ہو جاتی۔ آہستہ آہستہ بورڈنگ میں کوڑیالوں کا ذکر عام ہونے لگا۔ ڈے اسکالر لڑکیوں کے بھائی بند چٹکلوں اور تعلقات کے ذریعے بورڈنگ کی نیم مردہ زندگی میں رس رچانے آنے لگے چھوٹی موٹی خرید فروخت پرانی کتابوں کی ردو بدل، اسکی کے سلسلے سے زندگیاں آگے چلنے لگیں فلم دھلوانے یا پرنٹ بنوانے کے بہانے عشق لڑنے لگے بالکل جیسے ہزار سال پہلے کی دنیا میں لوگ تصویروں پر عاشق ہو جاتے تھے اسی طرح یہ نادیدہ عشق بھی چلتے ابھرتے اور بگڑتے تے۔

اور یہ کوڑیالے تھے بھی غضب کے۔ اور کچھ نہیں تو لڑکیوں کے نام عید کارڈ ہی چلے آرہے ہیں۔ بگڑ رہی ہیں یا کوس ہی رہی ہیں۔ لیکن سارے بورڈ میں گھمائے جا رہے ہیں ہر ایک کو فخر یہ دکھائے جا رہے ہیں۔ جیسے گویا کچھ پرواہ ہی نہیں دیکھ دیکھ کر لڑکیاں ــــ اُڑتی اور ہائے تو بہ چلا رہی ہیں۔ ایک عورت اور مرد ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں۔ نیچے ٹیڑھے ٹیڑھے شعر لکھے ہیں۔

آہستہ آہستہ یہ مرض اور پھیلا ہر لڑکی نے اپنے چچیرے ممیرے خلیرے بھائی

کا رومان جوڑ جاڑ کر سُنانا شروع کیا۔ بلقیس کے عاشقوں کی تعداد کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ اس کے بھائی کے جتنے دوست تھے وہ سب تو جبراً عاشق تھے۔ اور بھی جسے پینگ بڑھانا ہوتے وہ بھائی رشید سے دوستی کرلیتا اور اس بہانے مزے سے امیدواروں میں نام ڈال کر روز آن موجود ہوتا۔ جتنے بھی کالج میں روشن خیال انقلابی لڑکے تھے وہاں مختلف سماجی اور سیاسی مشکلات پر بحث کرنے اور آئندہ پود کو روشن خیال بنانے کی تجویزیں سوچنے آجایا کرتے۔ سب بہنیں نہایت روشن خیال عموماً لباس شب خوابی ہی میں ان سب سے ملتی جلتیں۔ تاش کیرم کا زور بندھا۔ نغمہ سرائیاں ہوتیں۔ باغیانہ بحثیں ہوتیں کونوں کھدروں میں انہیں سب کے سامنے عشق چلتے پرنسپل صاحبہ کا بنگلہ روشنی سے معمور رہتا جس میں پانچوں بہنیں ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جگمگایا کرتیں۔

رات کو گھر گھر بلقیس اُن کے قصے بتاتی۔ بارہ بج جاتے مگر ختم نہ ہو پاتے ایک دو ہوں تو کوئی بھگتے یہ ان عاشقوں کی فوج سے کون نہ اکتا جائے گا۔ باقر مرزا تھے تو آپا بی کے عاشق مگر گدگدیاں بلقیس کے بھی کیا کرتے۔ حیدر صاحب تو ابا کی طرح تھے مگر اس پر دیوانے تھے۔ وہ تین قلم اُن سے چھین چکی تھی جس میں سے ایک اس نے شمن کو دے دیا تھا۔ وہ تو ان کی انگوٹھی بھی چھین لیتی مگر انھوں نے ہنس کر کہا تھا کہ وہ دہلی سے ننھی منی انگوٹھی منگوا رہے ہیں۔

"یہ انگوٹھی تو تمہاری کمر میں آجائے گی ___" انھوں نے اس کو دونوں ٹانگوں میں کھینچ کر اس کی کمر کو اپنی انگلیوں کے چھلّے میں لینے کی کوشش کی جس سے اس کے بڑی گدگدی ہوئی تھی۔ شمن یہ قصے سنتے سنتے نڈھال پڑ جاتی۔

"تو کیا تم اُن سے؟"

"تو کیا تم اُن سے شادی کرو گی؟"

"بھئی کیا پتہ، دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"اگر تم حیدر صاحب سے شادی کرلو گی تو بیچارے عباس کا کیا ہوگا۔ انصار تو

اللہ تسم مرجائے گا۔ اور عشرت یہ ڈیڑھ بالشت کا عشرت بھی تم سے محبت کرتا ہے۔ چہ توبہ!" شمن کو ان سب پر ترس آنے لگا۔ ہا! بچارے عاشق!" ابھی تو میں کیا کروں۔ آخر یہ سب بلقیس پر...... اس بے چاری کا ایک کالیا ہے اور ایک بجارا ادھا بلقیس —— چہ نفرت میں تو تھک گئی۔" وہ عاجز ہو کر کہتی اور سچی بات بھی ان انقلابیوں میں زیادہ تر غریب جسمانی طور پر کھڑے چیچک مارے اور دو سیاہ ہی تھے جو اپنی روح کو تسلی دینے کی خاطر حسن کی جلا چاہتے تھے اور یہ داتوں کی طرح شمعوں کے تلاشی تھے بلقیس سب سے چھوٹی تھی پھر بھی آثار کہتے تھے کہ اپنے زمانے کی نادر شاہ نکلے گی۔ ٹوٹے پھوٹے زنگروٹ ابھی سے قطاریں باندھ رہے تھے کاش بلقیس اپنے عاشقوں میں سے ردّی ردّی چھانٹ کر بورڈنگ کی لڑکیوں کو دے دیتی جو بے چاریاں خیالی پلاؤ سونگھا کرتی تھیں۔

"تم بھی اپنی باتیں بتاؤ۔" بلقیس کہتی۔

"واہ۔ ہماری کوئی بھی بات نہیں۔"

"چہ کیسی ہو تم۔ تمہیں کوئی نہیں چاہتا؟"

شمن کا دل بجھ جاتا شرم اور احساس کمتری سے اس کے گال تمتما جاتے۔ لہٰذا ایک دن —— اس نے سوچ بچار کے بعد نام لے ہی دیا۔ حالانکہ اُسے اپنے سارے سگے سوتیلے اور رشتے کے بھائیوں سے نفرت تھی اور وہ بھی تو ہمیشہ اُسے دق ہی کیا کرتے تھے۔ اُن میں سے کسی نے بھی تو ویسی بھائیوں جیسی حرکت نہ کی تھی جس کا دوسری لڑکیاں مزے لے لے کر ذکر کرتی تھیں۔ مجبوراً ہی اس نے اسحاق بھائی کا نام لے دیا تھا لیکن اُسے خوب معلوم تھا کہ اگر اُن کے یا اُن کی بیوی کے کان میں اس بات کی بھنک بھی پہنچ جاتی کہ شمن اُن کے عشق کے قصے گھڑ گھڑ کر سناتی ہے تو آفت آجاتی۔ وہ اماں سے جوتے لگوائے جاتے کر سنا رانشہ ہرن ہو جاتا۔ اسے ویسے سوائے اسحاق بھائی کے اور سب ناپسند تھے۔ ان کی بڑی لڑکی سے اس کی دوستی بھی رہ چکی تھی۔

"تو وہ تمہیں پیار کرتے ہیں؟"

پیار سے شمن کو نفرت تھی۔ دوسرے اسحاق بھائی سے پیار کروانے کے خیال سے اس کا دم لوٹنے لگا تھا۔ جیسی بلی کہ جب وہ دودھ کے جھاگ مونچھوں میں سے چوس لیتے تو اُسے اُبکائی آجاتی تھی۔

"واہ پیار نہیں کرتے تو تمہیں کیا چاہتے ہیں!" بلقیس کو اس پر رحم آنے لگا۔ تو شمن نے جی کڑا کر کے سوچا کہ اگر آپی دور سے وہ اسحاق بھائی سے پیار کروالے تو اس کا جی کیسے جلا سکتی ہے۔ لہٰذا اُسے شرماتے ہوئے اقبال کرہی لیا کہ اس نے پیار کیا تھا۔ اسحاق بھائی سے ایک فلم چھیننے کا ذکر بھی اُس نے خوب مزے لے لے کر بیان کیا۔ حالانکہ وہ خوب جانتی تھی کہ اسحاق بھائی کے پاس صرف سڑے ہوئے ٹیب اور گھر چے ہوئے ہولڈر تھے جو کوئی بے وقوف بھی چھیننے کا ارمان نہ کرے گا۔ پر بلقیس کو کیا خبر؟

بلقیس اور شمن کی دوستی ایسی بڑھی کہ دن رات ساتھ رہتیں ساتھ اٹھتی بیٹھتیں اور ساتھ ہی پڑھتیں۔ بلقیس اُسے بہت پسند تھی سعادت سے بھی زیادہ پتہ نہیں۔ نجمہ سے کم یا زیادہ! نجمہ اور چیز تھی دہکتی ہوئی شراب اور بلقیس صاف نتھرا ہوا میٹھا پانی۔ گو وہ بڑی بے شرم تھی اور بغیر کسی جھجک کے کپڑے اتار دیتی تھی نہانے جانے سے پہلے وہ کپڑے اتار کر چونٹیوں اور کھٹملوں کے کاٹنے کے نشان اپنے جسم پر ڈھونڈا کرتی تھی۔ اگر کوئی آجاتا تو وہ خود جھینپ کر لوٹ جاتا۔ بلقیس کو ذرا بھی احساس نہ ہوتا۔

"واہ بھلا لڑکیوں سے کیا شرم؟" وہ ڈھٹائی سے کہتی۔ ایک دفعہ میٹرن نے ڈانٹا تو بلقیس نے اس سے کہہ دیا کہ "چونکہ تمہارا جسم چھکڑے جیسا ہے اس لیے مجھ سے جلتی ہو۔" اس پر میٹرن روتی پیٹتی اور بلقیس کو بھی ڈانٹ پڑی مگر وہ کہیں سننے والی تھی اس کا جسم بڑا خوبصورت اور سڈول تھا جسے دیکھ دیکھ کر وہ آئینے میں آپ ہی آپ مسکرایا کرتی۔ کبھی اس کے ہونٹ جھوٹ موٹ روٹھنے کے انداز میں آپ ہی آپ ابھر آتے اور کبھی خود بخود جھینپ کر وہ آئینے کے پاس سے بھاگ آتی۔ نہانے کا ارادہ کر کے وہ کپڑے کبھی نہ نکالتی بلکہ نہا کر یونہی لحاف میں دُبک جاتی جب خوب گرم ہو جاتی اور سارے جسم کے رونگٹے سونے کے تاروں کی طرح چمک اٹھتے تو وہ

کپڑے نکالتی لیکن وہ گھنٹوں فیصلہ نہ کرپاتی کہ اودی شلوار پر کیا سی دوپٹہ اوڑھے یا کاسنی! وہ اس بارے میں شمن کی رائے لیتی۔ شمن بے چاری گردن موڑے موڑے بتادیتی اسے کچھ ڈر سا لگتا تھا بلقیس سے کیونکہ کئی دفعہ باتیں کرتے میں اس کا دل بے اختیار اس کی گردن پر انگلیاں پھیرنے کو چاہنے لگتا۔ وہ نرم نرم سڈول سی گردن جسے وہ بڑے پیارے انداز سے ایک طرف موڑے رہتی۔

بھائی رشید کو پہلے تو بلقیس کا ایک عاشق ہی تھی کیونکہ ان کی ایک تصویر جو اس نے کوڑیالوں کی تشریح کے سلسلے میں دکھائی تھی میز پر اب بھی رکھی تھی۔ جب بلقیس نے بتایا کہ وہ اس کے سگے بھائی ہیں تب وہ بھی۔ یہ بھی اتنی خاندانی خوبی کے حامل تھے جس کالج یا یونیورسٹی میں پڑھا، تین چار زخمی چڑیاں تڑپتی چھوڑ دیں۔ کالج کی بہت سی لڑکیاں ان کی دیوانی تھیں۔ کئی امیر لڑکیاں تو ان سے ٹیوشن بھی لیتی تھیں۔ وہ خود تو چاہے فیل ہو جاتے ہوں مگر جن لڑکیوں نے ان سے دو چار سبق لے لیے وہ شرطیہ کامیاب ہو گئیں۔

"خدا قسم تم فوراً مر جاؤ گی رشید پر؟" بلقیس شمن سے کہا کرتی۔ مگر شمن کو بورڈنگ سے باہر قدم رکھنے کی تو اجازت نہیں تو پھر بھلا مرنے کا موقع کیسے ملتا۔

مگر قسمت نے ایک عجیب طریقے سے اسے رشید سے ملایا۔ سالانہ پکنک کے موقع پر پرنسپل صاحبہ اپنے بھائی اور چند نوجوانوں کو بھی ساتھ لے گئیں۔ وہ سب دوسری موٹر میں گئے اور پیڑوں کی آڑ میں نہانے دھوتے رہے۔ وہ تو لڑکوں کو اس خیال سے لے گئی تھیں کہ کوئی لڑکی ڈوب ڈاب جائے تو وہ لوگ نکال لیں۔

وہ سب دور ہی دور تھے لہٰذا پردہ ہی پردہ تھا۔ پر لڑکیوں کے دل ادھر ہی ادھر لگے ہوئے تھے لہٰذا پردہ سا تھا۔ وہ بھول بھول کر ادھر جا نکلتیں چیخ چیخ کر ہنس رہی تھیں اور ایک دوسرے کو "دھکے" دے رہی تھیں۔

"شمن رشید سے ملو گی؟ وہ ادھر ہے پیڑ کے پیچھے۔" بلقیس نے الگ لے جا کر کہا۔

"دوا بھئی میرا پردہ ہے۔" شمن گھبرا گئی۔

"اور کہ تم چلو تو میں اُس کی آنکھیں بند کر لوں گی"۔

بڑی مشکل سے یہ طے ہوا کہ بلقیس اپنے دوپٹے سے اس کی آنکھیں بند کر دے گی پھر بھی شمن جھجکتی ہوئی گئی۔ رشید کا قد لمبا سا تھا اور جسم چھریرا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی جس سے ناک بھی چھپ گئی۔ صرف ہونٹ کھلے تھے اور آہستہ آہستہ پھڑک رہے تھے۔ جیسے اُسے سخت ہنسی آ رہی ہو۔ گھنے بالوں کا ایک جنگل سر پر لہرا رہا تھا مچل مچل کر دوپٹے کے بیچوں میں سے بال نکل رہے تھے۔ گریبان کا ایک بٹن کھلا تھا۔ جس میں سے اس کی بھوری گردن کی نسیں ہنسی روکنے کی وجہ سے پھڑکتی نظر آ رہی تھیں۔

"ہی ہی ہی" وہ ایک دم سے ہنس پڑا۔ شمن اور بلقیس بھی ہنسنے لگیں۔ رشید ٹٹولنے لگا۔

"ارے بھئی! کہاں ہیں یہ تمہاری دوست شم شم۔ ان سے کہو ہم سے ہاتھ تو ملائیں"۔ بلقیس نے اُسے بہت گھسیٹا مگر وہ نہ مانی۔

"دیکھو بھئی۔ پھر ہم زبردستی پکڑ لیں گے ہاں پھر برا نہ مانے کوئی، ہم آنکھیں کھولتے ہیں"۔ رشید نے دھمکی دی۔

مجبوراً شمن نے اپنا ڈرا ہوا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں رینگا دیا۔ پھر فوراً چھڑانے لگی کیونکہ رشید نے تو مضبوط پکڑ لیا۔

"ارے یہ تمہاری شم شم کا ہاتھ ہے؟ نہیں جی یہ تو چوہیا کا پنجہ ہے"۔ شمن نے ہنسی روکنے کے لیے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا۔

"تو کیا ایک ہی ہاتھ ہے لیس؟ اور باقی کا جسم؟ ارے بلی ان کے پیر بھی ہیں یا نہیں؟"

"ہیں!" بلقیس ہنسی دبا کر بولی۔

"کتنے؟"

"دو .... کھی کھی ...."

"اچھا! اور-اور بلّی ان کے کان؟ ــــ کان ہیں؟"

"ہاں ہاں بھئی۔"

"اور ناک؟" شمن ہاتھ چھڑانے کے لیے دوہری ہو ہو گئی۔ مگر بے کار
"بھئی، ایسی باتیں کروگے تو ہم بولیں گے بھی نہیں۔" بلقیس نے کہا۔

"اچھا جانے دو ــــ یہ بتاؤ ناک کہاں ہے، ان کی ناک؟" رشید نے پھر ٹٹولنا شروع کیا۔ اندھوں کی طرح اس کی انگلیاں ٹھٹکتی ہوئی شمن کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔ بھویں، پلکیں۔ ننھے ہونٹ۔ یہاں تھوڑی دیر کو ٹھٹک گئیں۔ پھر گالوں پر سے ہوتی ہوئی بالوں پر۔

"ارے بلّو! ان کے چٹیا تو ہے ہی نہیں، کیسی ہے چٹیا!" وہ اس کا کان ٹٹولنے لگا۔ ہنسی کے مارے دونوں کا برا حال ہو گیا۔ اور شمن جھٹکا مار کر بھاگی

"ارے بے ایمانی ــــ بے ایمانی ــــ ارے پکڑ بلّی" رشید نے دوپٹہ نوچ کر شمن کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگ نکلی۔

لیکن اب اس کی جھجک ٹوٹ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بہانہ کر کے بلقیس اور وہ رشید کے ساتھ کھیتوں میں خربوزے چرانے گئیں۔ وہاں اس نے دونوں کو کیچڑ میں گھٹنوں تک پھنسا دیا۔ وہاں سے نکل کر جامنوں کی تاک میں لگ گئے۔ دونوں نے اپنے دوپٹے بچھا دیئے اور بھاگ بھاگ کر کچی پکی جامنیں بیننے لگیں۔ رشید کو لڑکیوں کے دوپٹوں کا استعمال بہت اچھا آتا تھا۔ وہ بجائے انہیں لڑکی کے کندھوں کے اپنے سر پر باندھنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ اور پھر دوپٹوں کی گیندیں کیا عمدہ بنتی تھیں۔ وہ زور کی چوٹ لگتی تھی کہ بس۔

جب پکنک سے لوٹ کر آئی تو شمن کو معلوم ہوا وہ یادوں میں جھول کر آئی ہے۔ پلنگ پر لیٹ کر سونے سے پہلے اس نے پوری پکنک کو شروع سے لفظ بلفظ دہرایا۔ بلقیس کے دوپٹے میں سے رشید کے مچلتے ہوئے بالوں کے گچھے، وہ اس کے بے چین ہونٹ اور گردن کی کپکپاتی ہوئی نبض اور پھر ایسا معلوم ہوا رشید کا ہاتھ

رینگ رہا ہے۔ اس کے ماتھے پر، بالوں پر، ہتھیلیوں پر، ہونٹوں پر آ کر رک گیا۔ جلدی سے اس نے گردن دیوار کی طرف موڑ لی اور سو گئی۔

صبح ہی بلقیس نے بتایا کہ رشید اس پر بے طرح عاشق ہو گیا ہے۔

"ہٹو! تمہیں کیسے معلوم؟" شمن کا دل دھڑکنے لگا۔

"میں پہچان لیتی ہوں جیسے ہی تمہارا نام لو سرخ ہو جاتا ہے اور کیا؟"

شمن خود رشید کے نام سے لال سرخ ہو گئیں۔ لہذا کھل مل کر دونوں رشید کی باتیں کرتی رہیں مگر کسی بہانے سے بھی وہ رشید سے نہ مل سکی نہ ہی اس کا دل ایسا بے قرار تھا۔ ابھی بھاری خوراک مل چکی، ابھی وہی ہضم نہیں ہوئی تھی۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے پکنک کی بہاریں آنکھوں میں سمائی رہتیں۔

لیکن خدا شکر خورے کو شکر دے ہی دیتا ہے۔ بلقیس کی سالگرہ نے دنیا ہی بدل دی۔ اس کی جماعت کی ساری لڑکیاں اور کئی سہیلیاں جن میں شمن بھی شامل تھی مدعو کی گئیں۔ شمن کے پاس کوئی تحفہ بھی نہ تھا صرف ایک سر پر باندھنے کا ریشمی رومال تھا وہی اس نے کاغذ میں لپیٹ کر چپکے سے بلقیس کو دے دیا۔ مگر بلقیس مارے شرارت کے سارے ہال میں اسے نچاتی پھری۔ شمن نے دروازے کی آڑ میں سے دیکھا کہ وہ اسے اپنے سر پر باندھ رہی تھی کہ رشید نے آ کر چھین لیا اور دوپٹے کی طرح اوڑھ کر منہ چڑانے لگے۔

"اوئی ——— شمن، دیکھو یہ رشید نہیں مانتے ——— بھئی ہمارا رومال!" مگر رشید رومال لے کر باہر بھاگ گیا۔

"دیکھو بھئی منع کر لو رشید کو، ہمارا رومال چھین لیا۔" اس نے شمن سے شکایت کی۔ پھر وہ کھڑکی میں سے رومال کا حشر دیکھنے لگیں رشید اسے گلے میں ڈالے ہاکی کھیل رہے تھے۔

شام کو سب لڑکیاں وغیرہ تو چلی گئیں مگر شمن کو پرنسپل صاحبہ کی خوشامد کر کے بلقیس نے روک لیا وہ دونوں اور جلیس مل کر کیرم کھیل رہی تھیں کہ رشید

ڈراتے چلے آئے۔

"رشید رشید ارے پردہ ہے پردہ!" بلقیس اور جلیس چلائیں اور شمن کو دوپٹوں میں چھپانے لگیں۔

"کس کا پردہ ہے؟ لڑکیاں تو گئیں!"

"نہیں بھئی شمن نہیں گئی۔ ارے بھئی رشید۔ آپا بی رشید نہیں مانتے۔"

"دیکھو جو اگر آپا بی سے شکایت کی تو ہاں بہن" رشید نے دھمکی دی۔ "پردہ ہو یا نہ ہو ہم کیرم ضرور کھیلیں گے۔" وہ گھس ہی آئے۔

تھوڑی سی چیل و حجت کے بعد یہ طے ہوا کہ رشید اپنا منہ ڈھانک کر کھیلیں بلقیس اور شمن ایک طرف اور جلیس اور رشید دوسری طرف

"بھئی کچھ بد کر کھیلو ورنہ کیسے مزہ نہیں آئے گا۔"

"اکنی اکنی،" جلیس بولی

"نہیں بھئی رشید اوٹ کر رکھ دے گا۔ نہیں دو دو پیسے" بلقیس چلائی۔

"اچھا بھئی میں ہاروں تو اکنی دوں گا اور تم ہارو گی تو چنٹی۔"

"نہیں نہیں جناب چنٹی کی نہیں ہے۔ ایسی زور سے مارے گا کہ کیا بتاؤں۔" بلقیس نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

بڑی مشکل سے یہ طے ہوا کہ رشید کی اکنی اور ان دونوں کی چنٹی۔ مگر ملکے کی زور سے مارنے کی نہیں۔ پردے کی وجہ سے رشید وہی رشمی رومال کا گھونگھٹ کاڑھ کر بیٹھ گئے۔ اور اب کھیل شروع ہوا۔

چھیڑنے کے لیے انھیں سب دلہن دلہن کہہ رہے تھے۔ رومال باریک تھا اور اس میں سے ان کی آنکھیں صاف جھلک رہی تھیں۔

"بلقیس یہ تو سب دیکھ رہے ہیں!" شمن نے چپکے سے شکایت کی۔

"خبردار رشید جو تم نے شرارت کی۔ خدا قسم مار ڈالوں گی۔" بلقیس نے ڈانٹا۔ کھیل پورے شباب پر آگیا تو پردہ ورده سب غائب۔ رشید نے بے ایمانی

کی۔ لہٰذا بلقیس نے ہر بار اس کا ہاتھ ہلا دیا اس لیے رہ ہار گیا۔ دوسرے کھیل میں رشید نے ذرا سنجیدگی سے کھیلنا شروع کیا۔ اور بلقیس اور شمن کا دم نکلا۔ وہ چیخ کر اس کا ہاتھ ہلا دیتیں تاکہ وہ گڑبڑا جائے۔ مگر قسمت میں ہار رہی تھی کھیل جیت کر رشید نے بڑی احتیاط سے رومال کا گھونگٹ سا کاڑھ لیا اور آستینیں چڑھا لیں۔

"چلیے دلوائیے چنٹی! اس نے شمن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور دو انگلیاں جوڑ کر ہتھیار تیار کیا۔

"بھئی زور زور سے مارنے کی نہیں ہے" بلقیس اس کے اوپر چڑھ بیٹھی

"خوب میری انگلی نکل گئی تو کچھ نہیں اور اپنی باری پہ چلیں رو دینے کو۔ خدا قسم آج ہڈی نہ توڑ دوں تو بات نہیں"۔ اس نے پھر انگلیاں تولیں جیسے ہی اس نے مارنے کا ارادہ کیا شمن نے ہائے کر کے ہاتھ چھڑا لیا۔

"دیکھا تم نے؟ تمہاری دوست حد سے زیادہ مکار ہیں۔ یعنی میں نے مارا نہیں اور "ہائے"۔ ان سے کہو سیدھی بیٹھیں جگہ بے جگہ لگ جائے تو ہم ذمے دار نہیں"۔

بڑی دیر تک وہ چنٹی مارے بغیر ڈراتا رہا۔ مار چکتا تو چنٹی ہوتی۔ بھئی ایک ہی تو بے چاری چنٹی ہے۔ مزے لے لے کر ماریں گے ہم تو"۔ اتنے میں پرنسپل صاحب کے نوکر نے آ کر حکم دیا کہ بورڈنگ کی سب لڑکیاں جائیں۔ سب کو ـــــ وہ کون گیا تھا سوائے شمن کے!

"اچھا تو یہ چنٹی ادھار رہی"۔ رشید نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"اچھے رشید ہمیں بورڈنگ تک پہنچا آؤ"۔ بلقیس گڑگڑائی۔

"بہشت ہم سونے جا رہے ہیں"۔ رشید اترائے

"اچھی ہمارا بھیا کیسا"۔ بلقیس ان کی گردن میں جھول گئی۔

پانچ منٹ کا راستہ ہنس ہنس کر آدھ گھنٹے میں طے کیا۔ دیر تک پھاٹک پر کھڑے ہو کر بحث ہوتی رہی۔ رشید کہتے تھے شمن کو ہاتھ ملا کر مہذب لوگوں کی

طرح خدا حافظ کہنا چاہیئے۔ اور شمن کھسیانی کھڑی پھاٹک کی وارنش ناخونوں سے کھرچ رہی تھی۔ جب بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی تو جل کر بلقیس نے شمن کو اس پر دھکا دے دیا۔ بہت سمٹی پھر بھی اُسے دونوں ہتیلیاں اس کے سینے پر ٹکانی پڑیں۔ گھبرا کر رشید اسے کر کے ہٹ گیا اور شمن اندر بھاگ گئی۔

بہت دیر تک وہ ہاتھوں سے ہتھیلیاں نوچتی اور کوستی رہی۔

۱۷

نمائش آئی اور بلقیس کی وجہ سے شمن کو کئی دفعہ جانے کی اجازت مل گئی نمائش بھی ایک عظیم الشان تہوار ہے۔ سال کے سال میدان حشر بپا ہو جاتا ہے سال بھر کے سوئے ہوئے مردے صور کی پکار پر جاگ اٹھتے ہیں اور پندرہ دن کے لیے ارمانوں کی دنیا میں بسنت کھِل اٹھتی ہے۔ خرید و فروخت کے لیے ٹکے کس کے پاس ہوتے ہیں دوسرے نمائش میں کون بے وقوف خرید و فروخت میں وقت گنوائے۔ ایک آفت برپا ہوتی ہے جس دکان پر جاؤ کالی شیروانیوں اور کالے برقعوں کا جمگھٹ۔ برقعوں کی مجال نہیں جو ایک دم کے لیے ان شیروانیوں کے سائے سے دور رہ سکیں۔ بُندے خریدو وہاں موجود چوڑیاں چھانٹو ہاتھ گھسائے دیتے ہیں۔ ساڑھیوں کی دکان پر کھڑے آوازے کس رہے ہیں۔ کھلونوں والے کی دکان پہ پِلی پڑی ہے۔ غرض جہاں دیکھو بس کوڑیالے پھنکار رہے ہیں۔ لڑکیاں ہیں کہ بدحواس ہوئی جاتی ہیں اگر شکایت کرتی ہیں تو الٹا اپنا آنا بند! غرض سولی پہ جان ٹنگی ہے ویسے بے کوڑیالوں کے بھی دنیا تلخ اور اجڑی ہوئی، ذرا ڈانٹ ڈپٹ کر دور ہٹا دیا تو باقی کیا رہ گیا نمائش میں؟ یہ جگمگاتے جواہرات؟ وہ زریں ملبوسات؟ جی نہیں یہ اوروں کی دولت ہیں۔ مفلس طالب علم کو تو یہی زندہ دلی ہی سدا ہزاروں نمائشیں مل جائیں گی۔

بلقیس بہت دن سے شمن سے تصویر کے لیے کہہ رہی تھی۔ رشید اپنے دوست کو انگلینڈ بھیج کر انلارج کرانے کو کہتے تھے۔ میٹرن کی آنکھ بچا کر دونوں کھسک گئیں اور روپے کی آٹھ والی تصویریں کھنچوانے لگیں۔

"جلدی سے کھینچیے" انھوں نے وہاں کھڑے ہوئے فوٹوگرافر سے کہا جو میوزیم کے لڑکوں کی طرح وہ بھی سیاہ اور سفید تھا۔

"آپ تصویر کھنچوائیں گی؟" وہ خندہ پیشانی سے مسکرایا۔
"اور کیا بھئی جلدی کیجیے"
"جلدی ہی لیجیے۔ تو آئیے یہاں بیٹھیے اسٹول پر" اس نے نیا سگرٹ سلگایا۔
شمن اور بلقیس کی رائے ہوئی ذرا سا پاؤڈر اور لپسٹک لگا لی جائے تو اچھا ہے تصویر میں کچھ تو آ ہی جائے گا۔
"آئینہ نہیں ہے آپ کی دوکان میں......... ذرا!" انھوں نے پوچھا۔
"آئینہ ہوگا کیوں نہیں......... ادھر آئیے" وہ اُن دونوں کو پچھلے کمرے میں آئینہ دکھانے لے گیا۔ وہ پاؤڈر لگاتی رہیں اور وہ کھڑا مسکراتا رہا۔
"عطر بھی تو لگائیے" شرارت سے بولا اور جیبیں ٹٹولنے لگا۔
"عطر؟ — عطر؟"
"ہاں ہاں صاحب۔ عطر کی خوشبو بھی تو آتی ہے تصویر میں، یہ دیکھیے میرے پاس ہے"
اُس نے انگلیوں میں عطر لے کر اُن کے کپڑوں میں لگانا شروع کیا اور بڑی بے تکلفی سے!
"رہنے دیجیے" شمن نے جھلّا کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
"اچھا اچھا صاحب......... بیٹھیے اسٹول پر۔ ذرا اچھی طرح بیٹھیے" اور وہ دونوں بیٹھ کر ادائیں لینے لگیں۔
"یوں بیٹھیے......... اور دوپٹہ کو سنبھالیے۔ میرے خیال میں دوپٹہ تو اتار ہی دیجیے" وہ کیمرے سے زیادہ ان کے دوپٹے وغیرہ پر توجہ دے رہا تھا۔
"ہائے اللہ کتنا بے ہودہ فوٹوگرافر ہے" شمن نے بلقیس کے کان میں کہا "آپ کو تصویر کھینچنا ہو تو کھینچیے، ورنہ" وہ ہمت کر کے ڈانٹنے لگی۔
"مگر یہ آپ کے گال پر پاؤڈر — " اُس نے شرارت سے مسکرا کر پیار سے بلقیس کا گال چھوا اور سگریٹ کا دھواں بالکل ان کے مُنہ پر چھوڑنے لگا۔

دونوں ایسی گھبرائیں کہ فوٹو گرافر کو شاید رحم آگیا، اور وہ ہٹ گیا۔

"اچھا صاحب ریڈی ——" دونوں ریڈی ہوگئیں۔ دو چار بار کپڑے میں سر ڈال کر پھر بولا "اوں ہوں۔ یہ آپ نے بال کیسے بنائے ہیں۔ لائیے میں ٹھیک کر دوں۔"

"آپ کو اس سے کیا؟ آپ تصویر کھینچ رہے ہیں یا —— چلو شمن چلیں۔"

"ارے ارے آپ تو خفا ہو گئیں۔ بیٹھیے بھی شمن ...... وہ معاف کیجیے گا۔ جی میں تو آپ کے فائدے کے لیے ہی کہہ رہا تھا۔ بالکل خراب آئے بال تو فوٹو گرافر کو الزام دیں گی آپ، کہ تصویر بگاڑ کر رکھ دی۔ اور کیا؟" وہ کچھ روٹھ سا گیا۔ پھر وہ دونوں راضی ہو گئیں اور اس نے اُن کی ٹھوڑیاں پکڑ پکڑ کر بال سنوارنا شروع کیے۔ بلقیس نے جھٹک کر اس کے سینے پر سے سر ہٹا لیا۔ جیسے وہ بُری طرح بھینچ کر بال بنا رہا تھا۔ وہ شرارت سے ہنسا اور شمن کی طرف چلا کہ اتنے میں کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز آئی اور تھوڑی سی دیر میں تین چار آدمی اندر آ گئے شمن اور بلقیس کو ڈر لگنے لگا۔

"ہم جانتے ہیں آپ تصویر کھینچتے ہیں نہ بات؟"

"تو ...... جائیے ..... خدا حافظ ——" وہ ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

"ایں؟ ...... یہ آپ؟" نو وارد بولا "تشریف لائیے۔"

"ہم —— تصویر کھنچوانے آئے تھے .... مگر .... اتنی دیر لگا دی۔"

"تو تشریف لائیے اندر —— معاف کیجیے گا۔ ذرا میں کھانا کھانے گیا تھا۔"

"اور —— اور ...... وہ — وہ فوٹو گرافر جو ابھی ابھی یہاں تھا؟"

"جی میں ہی ہوں فوٹو گرافر۔ تو آئیے" اُس نے فخریہ اپنی کالی شیروانی کو دیکھ کر کہا۔ "آئیے تشریف لائیے"

"تو وہ کون تھا؟" بلقیس ہکلائی۔

"کون؟"

"اوہ...... وہ حمید —— ارے صاحب وہ تو کالج کے ایک صاحب ہیں۔ پرنٹ لینے آئے تھے...... آئیے اندر آجائیے۔" اس نے بات ٹالنا چاہی
"نہیں؟" بے وقوفوں کی طرح وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔
"آئیے —— پھر۔" نوٹوگرافر نے اپنے انداز سے کھٹ پٹ کرنی شروع کی
"نہیں...... اب ہم کل کھنچوائیں گے...... آج دیر ہو گئی"
دونوں گھبرائی ہوئی بھاگیں۔ ہاں سے دل دھڑک رہے تھے، میٹرن ان کی تلاش میں سر گاڑی پیر پہیہ کیے پھر رہی تھی یہ دونوں ملیں تو بڑی ڈانٹ۔
"ارے اور ہم آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔" دونوں جھوٹ بولیں اُس دن بلقیس کی وجہ سے بات بن گئی اور میٹرن ان بہانوں کو خوب جانتی تھی۔ کتنی لڑکیاں روز اسی طرح کھو کر مل جایا کرتی تھیں۔ اور مزہ بھی بڑا آتا ہے یوں جان بوجھ کر کھو جانے میں جی بھی تو نہیں چاہتا واپس ملنے کو کاش کسی طرح ساری عمر کے لیے یونہی نمائشوں میں بھٹکتے پھریں اور میٹرنیں نہ پکڑ سکیں۔
دوسرے دن وہ تصویر کھنچوانے نہ جاسکیں مگر نمائش میں وہی کوڈیالہ حمید برابر آہیں بھرتا شعر پڑھتا ان کے پیچھے لگا رہا۔ اسے ان دونوں کے نام تو معلوم ہی ہو گئے تھے۔ شرارت میں وہ اپنے دوستوں کو شمن اور بلقیس کہتا تو وہ فوراً جھک کر جواب دیتے "ہاں فوٹوگرافر صاحب!"
"آؤ شمن غبارے خریدیں" ایک اتراتا اور لڑکیوں کی نقل کر کے اپنے دوست کو چھیڑتا۔
"ہاں بلقیس چلو تصویر کھنچوائیں" دوسرا اٹھلا کر جواب دیتا۔
شمن اور بلقیس چل جاتیں مگر انھیں ہنسی بھی آرہی تھی جب تک وہ ساتھ رہتے وہ جلتی رہتیں مگر جیسے ہی وہ بچھڑ جاتے، ان کی آنکھیں بے چینی سے تلاش کر کے انھیں ڈھونڈ لاتیں اور پھر ڈھکے چھپے جملے کسے جانے لگتے۔
نمائش کے پھاٹک کے پاس شمن اور بلقیس کو ایک چھوکرے نے ایک بنڈل لا کر

دیا کہ یہ دکان پر بھول آئیں تھیں۔

"تمہارا ہوگا بلقیس۔"

"نہیں تو میں نے کچھ خریدا ہی نہیں، کھولو تو دیکھیں کیا ہے اس میں؟"

کھول کر دیکھا تو ٹافیاں! چاکلیٹ!! اور مٹھائیاں!!! مارے خوشی کے چیخ نکل گئی اور دونوں بنڈل پر ٹوٹ پڑیں۔ فوراً اُن کی نگاہیں اٹھیں اور اُس کوڑیلے کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ بلکی سی اسرئی جنبش سے اس نے انھیں سلام کیا اور فوراً دونوں بگڑ گئیں۔ بلقیس نے رائے دی "پھینک دو" مگر بھوک کا تقاضہ ہوا یہ بے وقوفی ہوگی۔ بورڈنگ میں جیب خرچ ہی کتنا ملتا ہے دونوں وہاں سے چل دیں کچھ رد و کد کے بعد دونوں نے جیبوں میں مٹھائیاں بھر لیں۔

جب نمائش ختم ہوگئی تو شمن اور بلقیس کے نام عاشقانہ خط آئے۔ بڑے جوتے پڑتے۔ اگر بلقیس پرنسپل صاحبہ کو سب صاف صاف نہ بتا دیتی ہاں تصویریں کھنچوانے کا واقعہ گول کر گئیں۔ بات دب دبا گئی۔ بلقیس نے بتایا کہ غریب کوڑیالہ کتنے ہی خط بھیج چکا ہے مگر سب پرنسپل صاحبہ نے پھاڑ کر جلا دیے۔ جب بات بہت بڑھی تو اٹھا کر سارے خط انھوں نے ڈی، او، سی کو بھیج دیے۔ اس کے بعد یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ کوڑیلے کا زہر بھی پھیکا پڑ گیا۔ رشید کو بھی اس معاملے کی خبر مل گئی اور اس نے یہ بات اور لڑکوں میں پھیلا دی اور سارے لڑکوں نے مل کر نگوڑ مارے کوڑیلے کو ناکوں چنے چبوانے شروع کئے۔ بلقیس کی رائے تھی کہ خواہ مخواہ بیچارے کو پریشان نہ کیا جائے۔ آخر اس نے ایسا کیا جرم کیا تھا الٹا اسی کا تو ہر طرح کا نقصان ہوا تھا۔

سالانہ جلسے کا ڈراما ہوا تھا تو اُس کی تصویریں کھینچنے کے لیے رشید ہی کو بلا لیا گیا ویسے ڈرامے کی ساری لڑکیاں اُس کے سامنے آئی تھیں۔ باہر کا کوئی آدمی بلایا جاتا تو بے کار غل مچتا۔ جہیلا کو اعتراض ہوتا۔

شمن لڑکا بنی تھی۔ اور مونچھیں لگا کر تو شرم کے مارے اس کا دم نکلنے لگا

بلقیس اس کی محبوبہ روز اللہ بنی تھی۔

"ارے بلی یہ چھوکرا کون ہے؟" رشیدہ نے حیرت سے پوچھا اور شمن اپنی تلوار پھینک کر جھاڑیوں میں چھپ گئی اور تصویر کھنچوانے سے قطعی انکار کر دیا۔ مگر تصویر کھنچوانا ضروری تھی اور اسے محبوبہ روز اللہ کا ہاتھ چومنا تھا اور یہاں تو اُسے کھڑا ہونا ہی دبال معلوم ہو رہا تھا۔ ٹانگیں لرزی جاتی تھیں اور ہاتھ ٹھنڈے تھے۔

"ارے چھوکرے ذرا پرے ہٹ کر کھڑا ہو" رشیدہ نے کہا اور شمن چڑھ کر منمنانے لگی۔ بلقیس نے رشید کو ڈانٹا۔

"واہ شمن تو ڈیوک کا بیٹا ہے۔ چھوکرا چھوکرا کیسے جانتے ہو"

"اچھا تو ڈیوک کے بیٹے کمبخت کی منجھن کی مونچھیں تھیں خوب!"

"ہشت چھوٹے منجھن تھوڑی کا جل ہے" بلقیس نے پیار سے شمن کی مونچھ کو دیکھا۔

"ہائے بالکل تو اصلی لگ رہی ہیں"

اگر پرنسپل صاحبہ آکر نہ ڈانٹیں تو مذاق کبھی ختم نہ ہوتا اور نہ تصویریں کھنچتیں۔

"آپا جی اب کے ڈرامہ ہو تو ہمیں لڑکی بنائیے گا" رشیدہ نے پرنسپل صاحبہ سے کہا۔

"بھئی جب کالونچ لگا کر لڑکیاں مرد بن سکتی ہیں تو پھر میں کیوں نہیں لڑکی بن سکتا ——— بھئی واہ!"

جب سب جانے لگے تو رشیدہ نے چپکے سے شمن سے کہا۔

"ارے .... دیکھو جی میاں لڑکے ہماری سیمی اُدھار ہے کہیں ہضم نہ کر جانا" وہ ہنسی روکتی جھلاتی بھاگ آئی۔

۱۸

شمن اور رشید کا رومان پینگیں بڑھاتا رہا۔ روزانہ بلقیس اس کا ایک پرچہ شمن کو لا کر دیتی اس پرچے میں کچھ بھی نہ ہوتا۔ سوائے اس پرانی جنتی کے ارمان بھرے ذکر کے اُسے رشید شمن شمن یا میاں لڑکے لکھتا۔ سوائے رشید کے شمن کو کچھ بھی تو یاد نہ رہا ششماہی امتحان میں وہ بُری طرح فیل ہوئی اور گھنٹوں شرم سے روتی رہی۔ رعائتی درجہ مل گیا حساب میں وہ ہمیشہ سے کمزور تھی۔ پرنسپل صاحبہ نے اُسے ٹیوشن دلوادی کہ سن کر رشید ہی اسے ٹیوشن دینے پر مقرر کیا گیا۔ اور کوئی شریف و معقول آدمی ملتا ہی کہاں تھا۔

یہ طالب علم اور معلم کا رشتہ بھی کس قدر رومان انگیز ہوتا ہے بات بے بات عشق اُبل پڑتا ہے۔ پڑھائی تو خاک بھی نہ ہوتی۔ شمن اور رشید گھنٹوں آسانی سے باتیں کیا کرتے جب بہت دیر ہو جاتی تو دوسرے دن کی امید دل میں لے کر جدا ہو جاتے۔ پڑھنے کے لیے شمن کو پرنسپل صاحبہ کے بنگلے ہی پر جانا پڑتا۔ شام ہی سے بنگلہ اندر سبھا کا اکھاڑہ بننا شروع ہو جاتا۔ دوستوں کے جھمگٹ شروع ہو جاتے خاصا بے تکلف جماؤ جمتا جس میں بے تکلف زندگی پر مباحثے ہوتے انسانی حقوق پر لکچر دیے جاتے۔ پانچ چاند کے ٹکڑوں کے گرد ستاروں کے پرے جمتے۔ مہذب اور لطیف معاشقے چلتے اور بنگلہ قہقہوں سے گونج اٹھتا۔

ایک دن وہ اور بلقیس برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی رشید کی تازہ شرارتوں پر بات چیت کر رہی تھیں کہ پھاٹک کھلا اور کسی نئی لڑکی کا سامان آنا شروع ہوا۔ سامان بہت تھا معلوم ہوتا تھا کوئی بیگم آئی تھیں۔ مگر سامان کے ساتھ کوئی نہ آئی۔ اس دن چونکہ پرچہ تھا اور رشید گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا شمن بنگلہ پر نہیں گئی تھی۔

دوسرے دن پرنسپل صاحبہ دو لڑکیوں کو لیے ہوئے اپنے دفتر میں چلی

گئیں لڑکیاں خوبصورت ہی نہیں امیر بھی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک تو ان میں سے چھ سات سال کی تھی اور دوسری پندرہ سولہ کی۔ اُن کے ریشمی ملبوسات اور فیشن سے متاثر ہو کر لڑکیاں کلاسوں میں سے نکل نکل کر جھانکنے لگیں۔

کھانے پر پرنسپل صاحبہ نے بلقیس اور جلبیس کو بلا کر اُن دونوں لڑکیوں کو ان کے سپرد کر دیا۔ اور چاروں نہایت مہذب بنی بنگلے سے آیا ہوا کھانا میز کے صاف ترین کونے پر بیٹھی کھاتی رہیں۔ کھانے پر آج دلیسے بھی ضرورت سے زیادہ صفائی تھی ٹوٹے ہوئے ٹام چینی کے ڈونگے اور بے قلعی رکابیاں اس خاص میز پر نہ تھیں۔ بلکہ نئی پلیٹیں جو کبھی دعوتوں پر نکال لی جاتی تھیں لگی ہوئی تھیں۔ کھانا بھی بہت تھا۔ چونکہ جمعہ تھا اس لیے مکھن نکلے ہوئے دودھ کی پھیکی پھیکی کھیر بھی تھی اتنے میں پرنسپل صاحبہ اور ایک لحیم شحیم حسین بیگم نہایت زرّیں لباس پہنے داخل ہوئیں اور اُن نئی لڑکیوں کے پاس جا کر باتیں کرنے لگیں لڑکیوں کی کھسر پھسر سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی امّاں جان تھیں۔

نو وارد لڑکیوں کی امّاں نے بھی کھانا چکھا اور منتظمین کی تعریف کرتی رہیں۔ "ایسا مزے دار کھانا تو گھر پر بھی نہیں ملتا" مرغن کھانوں کا اشتہار چربی کی لوٹ نواب زادی بولیں یہ لذیذ اور صحت بخش! موٹاپے سے عاجز کباب پراٹھوں سے تھکی ہوئی بیگم کی زبان میں اتنا احساس ہی کب رہا ہو گا جو کھانے کی اچھائی بُرائی پرکھ سکیں کھانے کے درمیان ہی سے لڑکیاں اور بیگم پرنسپل کے ساتھ واپس جانے لگیں۔ تو بہ ضد بلقیس اور جلبیس کو بھی ساتھ لے لیا۔

شام کو بلقیس ان دونوں لڑکیوں کو لیے ہوئے واپس آئی۔ وہ اب تک بھڑکیلے لباس پہنے تھیں اور ساتھ ساتھ بلقیس بھی ایک خوبصورت سادہ بنہ اوڑھے ہوئے تھی سارے وقت وہ ان لڑکیوں کے ہمراہ رہی۔ بورڈنگ میں تو یہ لڑکیاں کیا آئیں عجائبات آگئیں۔ اپنا کام چھوڑ چھاڑ ساری لڑکیاں دیکھنے کو ٹوٹ پڑیں اتنی دیر میں ان کا کمرہ بھی سج کر تیار ہو گیا تھا علاوہ خوبصورت مسہریوں کے سنگھار میز

جو نہایت ہی عجیب چیز معلوم ہوتی تھی، اور میز پر لیمپ، قالین غالیچے، ریشمی پردے غرض معلوم ہوتا تھا کہ جنگل میں کسی نے پھولوں سے لدا ہرا بھرا گلدستہ کھڑا کر دیا شمن ان کے کمرے کے سامنے سے بھی نہ گذری۔ بورڈنگ میں جب سے اس کی بلقیس سے دوستی ہوئی تھی وہ دوسری لڑکیوں سے بہت دور ہٹ گئی تھی۔ پرنسپل صاحبہ کی منظور نظر ہو کر وہ سب کی نظروں سے گر چکی تھی وہ اُسے خوشامدی مغرور اور خود غرض سمجھنے لگی تھیں۔ آج جب بلقیس نئے مہمانوں کی آؤ بھگت میں غرق تھی وہ بے سہارا اور تنہا الو کی طرح اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ کھانے پر بلقیس لڑکیوں کے ساتھ بنگلے پر چلی گئی اور مسکراتی ہوئی طعن آمیز نظروں کے درمیان وہ خاموش اپنی جگہ بدبودار سالن اور خشک چاول نگلتی رہی۔

بلقیس کچھ چیزیں لینے کمرے میں آئی تو شمن نے منہ پھلا کر شکایت کرنا چاہی مگر بلقیس بڑی جلدی میں تھی۔

"ابھی نواب صاحب آج آئے ہوئے ہیں بے حد خوبصورت کپڑے میں لپٹا ہوا۔ انہوں نے مجھے زبردستی یہ دوپٹہ دے دیا۔ آپا بی کا حکم ہے کہ لڑکیوں کا دل نہ گھبرانا۔ کوئی بات بھی ہے کہتی ہیں پرسوں نواب صاحب کو پہونچانے دہلی تک چلو۔" وہ جلدی جلدی چیزیں سمیٹتی رہی۔

"اور کوکو تو غضب کی پیاری ہے رشید پر تو فدا ہے سارے دن کندھے پر چڑھی رہی۔" وہ ذرا جھینپی ہوئی سی جلدی سے چل دی۔

دو چار روز کی چھٹیاں آگئیں بلقیس جلیس اُن لڑکیوں کے ساتھ ان کے والدین کو خدا حافظ کہنے دہلی چلی گئیں۔ جب وہ آئیں تو بھی بلقیس سے کوئی بات نہ ہوئی۔ رشید کسی میچ میں گئے ہوئے تھے۔ اس لیے شمن پھر بنگلے سے دور ہی رہی۔ پھر وہ پڑھنے پہنچی تو اس نے کچھ فضا بدلی پائی حالانکہ رشید کو دس روپے ابا سے ہزاروں چالیں چل کر دلوائی تھی مگر دل میں آج اس طرح برتاؤ کیا جا رہا تھا۔ گویا وہ کوئی یتیم لڑکی ہے جس پر رحم کھا کر وہ پڑھا دیا کرتا تھا۔ رشید موجود نہ تھے۔ وہ

لڑکیاں زیادہ تر بنگلے پر ہی رہتیں اور ساتھ ساتھ بلقیس بھی آہستہ آہستہ بورڈنگ سے اپنی چیزیں بین بین کر گھر لے جا رہی تھی۔

رشید آئے تو اس دن بالکل پڑھائی نہ ہوئی اوّل تو لسیمہ کے ساتھ کیرم کھیلنا تھا دوسرے کوکو برابر کندھوں پر کود رہی تھی۔ علاوہ بلقیس اور جلیس کے قریب قریب ہر ایک زرد اُن لڑکیوں پر مکھیوں کی طرح چپکا ہوا تھا ان دونوں نے تو جس دن سے وہ آئی تھیں اپنے کپڑے چھوڑ کر ان کے ہی پہننے شروع کر دیے تھے۔ پرنسپل صاحبہ تک کو زبردستی کر کے لسیمہ نے اپنا شاندار کا ستاروں ٹکا دوپٹہ اڑھا رکھا تھا۔ لسیمہ پیچھے پڑ جاتی تھی اور اپنا زیور اور کپڑا انھیں پہنا کر ہی دم لیتی۔

لسیمہ کی سنگھار میز جیسے کیمسٹ کی دوکان۔ بلقیس جلیس تو ہر وقت منہ پر الابلا پوتا کرتیں۔ سارے بورڈنگ کی لڑکیاں اُن کے کمروں پر جمی اُن کی تعریفوں میں چہکا کرتیں۔ لسیمہ نے تھوڑے ہی دنوں میں میدان پر پورا قبضہ کر لیا قریب قریب ہر لڑکی پاؤڈر لپسٹک پر لسیمہ نے رشیمی جمپر دوپٹے یا چپل کے احسان کے نیچے دب گئی ان کے ساتھ ان کی بچپن کی کھلائی بھی تھی جسے سارا بورڈنگ اُن کی نقل میں بے بے کہتا تھا۔ موٹی چوڑی مردمار سی عورت خوشامدی لڑکیوں کو ہزار دھتکار دیتی تبائی پر وہ اُس کے قدم چومنے کو تیار رہتیں۔

لسیمہ اور کوکو پر بورڈنگ کی کوئی پابندی عائد نہ تھی نوکروں کے رہنے کی اجازت نہ تھی مگر اُن کے کیس میں مجبوراً پرنسپل صاحبہ نے دی۔ وہ لوگ کھانا اپنے کمرے میں کھاتیں۔ کھانا تو خیر ان کی بے بے خود اپنے ہاتھوں سے پکاتی تھی چینی کے برتن بھی اُن کے اپنے تھے انھیں دو کمرے مع دو غسل خانوں اور اسباب کے کمرے کے ملے ہوئے تھے۔ اچھا خاصا گھر تھا ان کے برآمدے کی طرف سے کسی کو گذرنے کی اجازت نہ تھی۔

جلد ہی سنگھار کا مرض پھیلنے لگا۔ غریب لڑکیوں نے لال رنگ کی روشنائی اور چار آنے والا کنبیوں پہ لگانے کا پوڈر ہی تھوپ لیا۔ جدھر دیکھو لال پیلے گال

اور مصنوعی گھونگر والے بال نظر آتے۔ بجلی کے آلے نہ ملے تو سلائیں گرم کر کے ہی بال الجھا لیے۔ سچے سنارے اور گوٹے نہ جڑے تو پنی اور جھوٹے ہیرے ہی چپکا لیے۔ ان لڑکیوں کی وجہ سے بورڈنگ میں بزاز چوڑی والے اور پھل والے کو بھی آنے کی اجازت مل گئی اور کچھ نہیں تو قرض پر ہی خرید و فروخت شروع ہو گئی۔ کمبختوں کے پاس نہ جانے کہاں سے قارون کا خزانہ آن ٹوٹا تھا کہ سارے بورڈنگ کو قرض دینے کے بعد روزانہ ٹوکریوں پھل اور منڈلوں بسکٹ آتے اور لنگر بٹتے۔ حلوے بنتے اور پارٹیاں ہوتیں۔ آج کوکو کی سالگرہ ہے۔ سارے بورڈنگ کی دعوت، پرنسپل صاحبہ کے خاندان بھر کی دعوت۔ آج نسیمہ کا جی گھبرا رہا ہے بلقیس کی سالگرہ کی دعوت وہ خود کر رہی ہے۔ مع سارے خرچے کے اوپر سے بلقیس اور جلیس کو جوڑا بھی مل رہا ہے۔ خیرات میں مرنے والیوں کا بھی بھلا ہو رہا ہے۔

شمن اب حساب میں اتنی کمزور نہ رہی تھی جتنی نسیمہ اردو میں۔ اس نے ساری عمر کانونٹ میں گذاری تھی۔ اب اس اسلامی اسکول کی عاقبت سدھارنے بھیجی گئی تھی۔ لہٰذا رشیدہ اُسے بچھنر دلیے پر اردو جغرافیہ اور حساب پڑھانے لگے تھے۔ نسیمہ نویں جماعت میں تھی۔ گو اس کی انگریزی کئی استانیوں سے اچھی تھی اور اردو میں دوسری جماعت کی بھی قابلیت نہ تھی۔ انگریزی کے گھنٹے میں وہ شمن کی کلاس میں بھی آجاتی۔ سوال سننے سے پہلے وہ جواب دے دیتی اور اتنا صحیح کہ استانیوں کی آنکھیں کھل جاتیں۔ نیز دوسری لڑکیوں پر اور جو تا باری ہوتی سارے وقت نسیمہ یا کچھ کچھ بلقیس بولا کرتیں اور استانیاں انھیں شاباشی دیا کرتیں۔ باقی کی لڑکیاں گھبرائی اور شرمندہ بیٹھی پھٹکاریں سنا کرتیں۔

یہی نہیں کھیل کے میدان میں نسیمہ نے سب کو چت کر دیا وہ کبھی اندھا دھند بھی کر جاتی۔ بازپرس پر نہایت تیز انگلش میں بولنے لگتی جس پر ساری لڑکیاں جھجک جاتیں اور انگریزی کی مداح استانی اس کی ساری گستاخیاں انگریزی کے پیارے سے

جملے سے معاف کر دیتیں۔ نہ جانے کیوں شمن نے پہلی نظر میں نسیمہ کو دشمن کا عہدہ دے دیا تھا۔ ہر موقع پر اس کی اور نسیمہ کی ٹکر ہو جاتی۔ دونوں کی گستاخ نظریں ٹکراتیں۔ مگر جھک جاتیں۔ اب بھی جب رشید ملتا اس سے دو چار میٹھی باتیں کہہ دیتا مگر وہ بات نہ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ کچھ بھولتا جا رہا ہے۔ پرنسپل کی نظروں سے بھی وہ اتر گئی تھی۔ اور بورڈنگ میں تو اس کی حیثیت بھی ایک غیر جیسی تو زری تو جلیس کے ساتھ کوکو کا دُم چھلا بن چکی تھی۔ غرض ایک بار پھر اُسے ایک ناقابلِ بیان سُنسان تنہائی کا احساس ہوا اور اس شدت سے کہ اس نے ہر چیز سے بغاوت کر دی۔

سب سے پہلے تو وہ کتابوں پر ٹوٹ پڑی۔ نسیمہ کی زبان تیز تھی مگر معلومات صفر کے برابر تھیں۔ تھوڑے ہی دن میں اس نے نسیمہ کی نیپنی کا جواب بگڑی ہوئی حفظ کی ہوئی انگریزی میں دینا شروع کیا۔ پورے پورے صفحے رٹ کر اس نے نسیمہ کو چت کر دیا اڑیل گھوڑے کی طرح وہ پیر جما کر کھڑی ہو جاتی اور ساری مسکراہٹوں اور قہقہوں کا جواب وہ اُکتی ہوئی زبان میں دیتی رہی۔ اسے کھیل سے نفرت تھی مگر جلتی دھوپ میں اس نے مشق کی یہاں تک کہ وہ کھیل میں بھی چوٹ کھائی شیرنی کی طرح سب پر حاوی ہو گئی۔

نسیمہ کے احسانات تو خیر تھے ہی جادو کے منتر شمن کی ضدیں ہٹ دھرمیاں اور گستاخیاں بھی بے کار نہ گئیں۔ رفتہ رفتہ ساری وہ لڑکیاں جو کسی طرح نسیمہ کی نظروں سے اتر گئی تھیں شمن کے جھنڈے تلے آ گئیں۔ نسیمہ کو اب بورڈنگ میں بہت کم وقت گذارنے کو ملتا تھا کیونکہ اسکول سے آکر فوراً وہ اردو کی کمزوری دور کرنے بنگلے پر چلی جاتی تھی۔ کوکو بھی اب وہ پھول جیسی گڑیا نہ رہی تھی۔ بے تبے کے تو بس کی نہ تھی بدتمیز بچیوں کے گروہ میں ملی خاک دھول میں لوٹا کرتی اور وہ کوکو جسے چومنے کے لیے لڑکیاں بے اختیار کلاسوں سے نکل پڑتی تھیں اب چٹیں کھا کر کمروں سے نکلتیں کھیل بھی کچھ کم آنے لگے تھے کیونکہ زیادہ تر تو بنگلے پر چلے جاتے۔ نسیمہ تو زیادہ تر کھانا بھی وہیں کھاتی۔

شمن کمرے میں خاموش بیٹھی تھی وہ اب اکیلی رہتی تھی بلقیس کے جانے کے بعد اُس نے کسی کو نہ آنے دیا تھا وہ ایک تقریر کو رٹنے میں مشغول تھی جو اُسے دوسرے دن کرنا تھی کہ اتنے میں بلقیس آئی۔ وہ کچھ شرمندہ اور پشیمان سی تھی کسی کتاب کے بہانے سے وہ دیر تک میز ٹٹولتی رہی پھر بیٹھ گئی شمن نے بات نہ کی تو خود ہی بولی۔

"پوئٹری بک میری کھو گئی ذرا اپنی دے دو" شمن نے کتاب اٹھا کر سامنے ڈال دی

"کل کے لیے تیاری کر لی؟"

"ہاں"

"لاؤ میں سن لوں" بلقیس نے قریب آ کر اسپیچ کی کاپی لے لی شمن کے گلے میں آنسو اٹکنے لگے جی چاہا سنا دے کھری کھری مگر بلقیس کی جھکی ہوئی نظریں دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔

"چہ خدا قسم نسیمہ مر بھی جائے تو نہیں بول سکتی۔ پتہ ہے اس نے ابھی تک نوٹ بھی تیار نہیں کیے ہیں"

"بھئی وہ تو بغیر نوٹ کے بول سکتی ہے"

"خاک بھی نہیں۔ رشید نے اتنی غضب کی تقریر تیار کر کے دی جناب نے پڑھی تک نہیں"

"میری اور عیسیٰ کی لڑائی ہو گئی" وہ تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی۔

"ہیں؟ —— ہٹو!"

"سچ!"

"مگر؟"

"کمینہ ہے! پتہ ہے تمہیں اتوار کو ——" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی شمن نے بالکل تجسس کا اظہار نہ کیا۔

"مجھے کہنے لگے کہ آٹھ بلیٹوں کا فلم ہے چار نسیمہ کی تصویریں کھینچ لینے دو پھر تمہاری اور جناب بعد میں معلوم ہوا صرف چھ تھیں جن میں سے ایک صاحب نیکر پہن کر کھنچوانے گئے

جی ہاں گویا میں مرتی ہوں اُن کے فلموں پر"
"ایک ہی فلم تھا"
"ہاں کہنے لگے دہلی سے لانا پڑے گا۔ اور خدا قسم اتنی بے ہودہ ہوتی ہیں۔ بعض لڑکیاں یعنی رشید بے چارے نے جناب کی سینکڑوں تصویریں کھینچیں..... اور اب...... حد ہے!" بلقیس روہانسی ہو گئی" ایک لفظ نہیں پڑھتیں۔ آپا بی نے کہا تو فوراً دو مہینے کی ٹیوشن کا چیک لا کر دے دیا۔ یہ آپا بی خدا قسم اتنی دہ ہیں — نہ جانے کیوں دیتی ہیں" آپا بی غریب پانچ بہنوں اور ایک لاڈلے بھائی کی اکیلی کفیل تھیں۔
"تم بھی تو دیتی تھیں —" شمیم نے کہہ ہی دیا۔
"جی ہاں۔ جو تی دیتی ہے چڑیل تت — ہنہ۔ وہی زبردستی کرتی تھیں۔ پتہ بھی ہے عیسے کو اب کے اپنے گھر مسوری لے چلنے کو کہتی ہیں"
بلقیس شمیم سے روٹھ کر چلی گئی سہ پہر کو میٹرن سے نسیمہ کے لڑنے کی آواز سن کر ساری لڑکیاں کھڑی ہو گئیں۔ بات یہ تھی کہ بزاز آیا تھا اور پرنسپل صاحبہ کے حکم سے لوٹا دیا گیا۔ میٹرن سے جو نسیمہ نے کہا تو وہ مجبوری ظاہر کرنے لگی جس پر نسیمہ خوب بگڑی مگر شکست ماننا پڑی وہ باہر نکل کر جو کچھ خریدنا تھا خرید لائی میٹرن چوں نہ کر سکی۔ شام کو ہال کے سامنے نوٹس ٹانگا گیا کہ بورڈنگ میں کسی سودے والے کو آنے کی اجازت نہیں خرید و فروخت صرف اتوار کو ہو گی اور بورڈنگ کے باہر کے کمرے میں ساری لڑکیوں نے یہ ظالمانہ نوٹس پڑھا اور بڑبڑائیں گویا بڑی آئیں خریداری کرتی تھی۔
تیسرے چوتھے دن شمیم جو کمرے میں گئی تو بلقیس کو خاموش پلنگ پر بیٹھے دیکھا۔ اُسے دیکھ کر وہ خاموش تکتی رہی۔ پھر مُنہ پھیر کر بستر پر اوندھی گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"ہائیں بلی کیا ہوا؟" آج بہت دن بعد شمیم نے اُسے پیار سے پکارا۔

"ہائے شمن!" بلقیس اس سے لپٹ کر پھوٹ پڑی۔ بڑی دیر تک وہ اسے عیسیٰ اور نسیمہ کے عشق کا حال بتاتی رہی۔ عیسیٰ آئی سی ایس کے مقابلے میں بیٹھ چکا تھا اور اس کے باپ کی سفارش سے یقین تھا کہ وہ کامیاب ہو جائے گا۔ اور آج بلقیس نے جب اس کی دی ہوئی البم اٹھا کر پھینک دی تو وہ الٹا بُرا مان گیا۔

"بلقیس تم میری البم لے لینا" نسیمہ نے اسے چھیڑا "میں اب دوسری منگوا رہی ہوں پیرس سے۔"

"ہُنہ، گویا بلقیس کسی کی بے کار چیزیں جمع کیا کرتی ہے اور پھر عیسیٰ نے معافی بھی تو نہیں مانگی خیر وہ آج ہی عباس اور انصار کو چائے پر بلائے گی۔ شمن کو بھی چلنا ہو گا۔

پرنسپل صاحبہ کے پرچے پر شمن کو چلنے کی اجازت مل گئی۔ آج خوب جھمگٹا تھا بلقیس بہت سجی ہوئی تھی مگر نسیمہ نے ضد میں کپڑے نہ بدلے تھے۔

"بلی! اس دوپٹے کے ساتھ کا جمپر بھی لے لیتیں ——— میرا تو جی کھٹا ہو گیا ہے چھپی ہوئی جارجٹ سے۔" نسیمہ نے پھوہڑپن سے سب کے سامنے یہ ظاہر کر دیا کہ بلقیس اسی کے دیے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ بلقیس خون کا سا گھونٹ پی گئی مگر اس کا پارہ چڑھ گیا جب اس نے عباس اور انصار دونوں سے انگریزی شاعری پر فاضلانہ بحث کر کے بلقیس کو بالکل پس پردہ ڈال دیا۔

رشید نے شمن سے کچھ نہ کہا۔ اس کی ہتھیلی میں کہیں سے ایسی باریک پھانس لگ گئی تھی کہ نکلتی ہی نہ تھی شمن دیر تک اس کی ٹائی پن کی مدد سے پھانس ڈھونڈتی رہی مگر نہ ملی کھانے پر پھر نسیمہ اور بلقیس میں تیز تیز جملے چلے جن پر سب نے بلقیس ہی کو ڈانٹا۔ یہاں تک انصار کمینہ بھی کہنے لگا کہ بلقیس بڑی کٹ حجتی کرتی ہے بلقیس کھانا چھوڑ کر چلی گئی جس پر نسیمہ کو ہنسی آ گئی۔

بورڈنگ جانے سے پہلے نسیمہ اور بلقیس میں پھر تُخ چل گئی۔ بیچ بچاؤ کروا دیا گیا مگر بلقیس کو پھر سب نے ڈانٹا نسیمہ کے ساتھ شمن کو اس نے جانے بھی نہ دیا

اور وہ اکیلی ہی چلی گئی عیسیٰ عباسؔ اور الفتاؔ ساتھ جانے کو بلبلاتے رہے۔ مگر پرنسپل صاحبہ نے کہا کہ بورڈنگ کی حدود میں لڑکوں کا جانا ٹھیک نہیں!

رو رو کر بلقیس نے شمنؔ کو رات کو اپنے کمرے میں رکھ لیا بڑی دیر تک وہ اس کا رونا روتی رہی۔ سونے سے پہلے رشیدؔ کسی کام سے کمرے میں آئے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

"اچھی بجلی بجھاتے جاؤ ——" بلقیس نے اٹھنے کی تکلیف سے بچنے کے لیے رشیدؔ کی خوشامد کی۔

وہ بجلی بجھا کر اندھیرے میں بلقیس کی ناک پکڑنے کی کوشش کرنے لگے اس کی ناک چھوڑ کر دوسرے ہاتھ سے انھوں نے شمنؔ کی چھنگلیا کو آہستہ سے دبا کر چھوڑ دیا اور جلدی سے باہر نکل گئے —— شمنؔ دیر تک سُن پڑی جاگتی رہی۔

دوسرے دن کھانے کی چھٹی میں ہال کے سامنے نوٹس ٹنگا تھا کہ بنگلے پر آنے کے لیے پہلے پرنسپل صاحبہ کی لکھی ہوئی اجازت کی ضرورت ہوگی معنی خیز نظریں نسیمہ پر پڑ رہی تھیں اور سر جوڑ جوڑ کر باتیں ہو رہی تھیں۔ شام کو ایک پوٹلی میں نسیمہ کی دی ہوئی ساری چیزیں اس کے کمرے پر بلقیس کا نوکر دے گیا نسیمہ نے جھاڑو دیتی ہوئی مہترانی کو بلا کر پوٹلی جوں کی توں اُٹھ دے دی۔ نہ جانے کتنے جھلاتے دوپٹے کرتے، جوتے، البم، پاؤڈر لپسٹک کے ڈبے بُندے انگوٹھیاں اور پنیں —— لڑکیوں کی حسرت بھری نگاہیں دیکھتی رہیں اور مہترانی سب کچھ سمیٹ لے گئی۔

امتحانوں سے پہلے ہی گرمی کی وجہ سے نسیمہ اور کوہ پہاڑ پر چلی گئیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اب نہ آئیں گی ان کا فرنیچر غریب لڑکیوں میں بانٹنے کے لیے چھوڑ دیا گیا مگر وہ فرنیچر بنگلے پر پہنچ گیا۔

چھٹیاں آئیں تو گھر جانا ہی پڑتا ہے۔ ویسے ہی گھر اُسے ناپسند تھا مگر اب کے چھٹیوں میں تو حد ہوگئی۔ نورٹی سیدھی اپنی ددھیال چلی گئی۔ اس کا دل بڑی طرح گھبراتا۔ گو وہ کئی مضامین میں کمزور تھی مگر کتاب الٹ کر دیکھنے کو تو جی نہ چاہتا گھر ویسے بھرا پڑا تھا اور غل غپاڑہ مچا رہتا تھا مگر شمن کا کوئی دوست نہ تھا اس کی ایک بھاوج کے بچّہ ہوا۔ اس ادھم میں تنہائی ذرا کم ہوگئی مگر پھر بھی اُسے ہر چیز بے تکی ادھوری اور بے ڈھنگی معلوم ہوتی کالج میں ہر چیز کتنے انتظام سے ہوتی تھی یہ تھوڑی کہ ہر چیز نشتم پشتم!

بلقیس کا خط آیا اور اس کے ساتھ رشید کا پرچہ بھی۔ بڑے بھیّا نے خط کھول کر دیکھ لیا اور بڑی لے دے مچی۔ مگر شمن ایک چالاک! اس نے کہہ دیا کہ یہ اس کی سہیلی کے چھوٹے بھائی نے لکھا ہے اور رشید لکھتا بھی تو بچوں جیسی باتیں تھا اس نے وہی اپنی پرانی ادھار کی چینٹی مانگی تھی بڑی تھکی ہوئی آواز میں ڈوبی ہوئی بھیک!

کچھ دن بعد بلقیس پہاڑ پر چلی گئی اور خط آنے بند ہو گئے۔ ایک خط سے اُسے معلوم ہوا کہ وہ اور جلیس مینی تال میں پڑھیں گی۔ اس کے بعد جب وہ کالج واپس گئی تو اسے معلوم ہوا کہ رشید انگلینڈ چلا گیا۔

شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے فلم کی ریل چلتے چلتے بیچ میں سے ٹوٹ گئی اور ہال کی بجلیاں بھک سے روشن ہو گئیں۔ ان کی کرخت روشنی کی نوکیلی شعاعوں سے اس کی آنکھیں چندھیا کر جھپک گئیں۔ خاموش اور خوف زدہ وہ سانس روک کے سمٹ گئی۔ بچہ شرارت کرنے میں انگلی کاٹ لیتا ہے تو جھٹ اُسے کرتے میں چھپائے سہما ہوا کونے میں دُبک جاتا ہے۔ شمن کے احساسات بھی دُکھ اور شرم سے خوف زدہ

ہو کر نہ جانے دل کے کس سنسان کونے میں اوندھے مُنہ جا گرے۔ شاید ہمیشہ کے لیے
بلقیس کا خط آیا بھی تو اس میں رشید کا کوئی ذکر نہ تھا وہ بھی شاید اس کی طرح آنکھیں چھپکا رہی تھی۔ جب کوئی اچانک کیچڑ میں پھسل پڑتا ہے تو رحم دل جلدی سے اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں تاکہ گرنے والا چوٹ تو جی کھول کر سہلا سکے۔ شمن زیادہ مرہم پٹی کی قائل نہ تھی۔ بڑی بے رحمی سے سب کچھ دور جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

اسے اب گھر پر بھی دلچسپی معلوم ہونے لگی تھی۔ اس نے چھپے چوری سائیکل سیکھ لی اور بھائیوں سے بھی پریم بڑھانا شروع کیا۔ نوری جب ددھیال سے آئی تو حد درجہ پکی ہو گئی تھی۔ پڑدس کی لڑکیوں کے ساتھ چھپ چھپ کر اس نے عجیب و غریب کپڑے سینا سیکھ لیے تھے۔ حالانکہ اُسے ابھی اُن کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ مگر بڑے پُراسرار طریقوں سے پہنے جاتے، میلے ہوتے اور دھو کر بند صندوقوں میں سکھائے جاتے، وہ اپنے ایک رشتہ دار کے بھائی سے محبت کرنا سیکھ آئی تھی جس کے نام کے پہلے حرف سے وہ بن بن کر شرمایا کرتی۔ شمن نے اُسے رشید کے متعلق کچھ بھی نہ بتایا اور اب بتانے کو رہا بھی کیا تھا۔ وہ جان جان کر اُسے بھائی رشید کہتی، لفظ بھائی پر غیر معمولی زور دے کر۔

بڑی آپا بالکل بدل گئی تھی۔ اس کی دوستی مونچھوں والی عزیز بیگم سے ہو گئی تھی، عزیز بیگم کے میاں انھیں قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے، مگر وہ تو بڑی آپا سے ددبدلے بدل رشتہ قائم کر چکی تھیں، وہ تو گھر ہی میں آن رہتیں مگر لوگوں نے ایسا غل مچایا کہ حد نہیں بے چاری آپا رو رو کر اپنے مرحوم میاں اور سُسر کو کوستی رہی عزیز بیگم سے سارے گھر کو نفرت تھی، بڑے لڑکے تو ان کا نام سُن کر ہی چڑھ جاتے۔ گو وہ پردہ کرنے کے قابل نہ تھے، پھر بھی وہ ان سے چھُپ چھپ کر انھیں یاد دلاتیں کہ وہ جوان ہو رہے ہیں لہٰذا خطرے کی حدود میں آ چکے ہیں اور چھوٹے اُن کی مونچھوں سے جھینپتے تھے جنھیں وہ کند چمٹی سے کچھ یوں ہی سا چھدرا کر لیتی تھیں۔ اُنھیں

دیکھ کر شمن کو بے اختیار بچہ یاد آجاتی، گو صورت میں بہت بل تھا، مگر نہ جانے کیا بات تھی جو دونوں میں موجود تھی وہ ہلکی سی مسکراہٹ جس میں غنودگی اور بیداری ایک ساتھ ڈبکیاں کھاتی نظر آتیں وہ نپی تلی چھوٹی سی چال...... گرم گرم سانسیں اور دہکا ہوا رنگ!

اسی زمانے میں شمن کی ایک خالہ کا لڑکا اعجاز ان کے گھر میں آکر رہنے لگا اعجاز کا باپ مر چکا تھا اور اماں نے دوسرا نکاح کر لیا تھا۔ سوتیلا باپ اس کے حق میں سوت سے بدتر تھا وہ اُسے اور خالہ دونوں کو بُری طرح کوٹتا تھا اس لیے اُسے یہاں بھیج دیا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اعجاز کو کوئی کس بات پہ مار سکتا تھا، وہ عموماً چُپ چاپ الّو کی طرح بیٹھا بولنے والوں کے ہونٹ تکا کرتا، شرارت تو وہ کرنا جانتا ہی نہ تھا، لوگ ارمان کرتے ہیں کہ اُن کے بچے شریر نہ ہوں مگر اعجاز کو دیکھ کر وہ بھی کانپ اٹھتے، وہ بالکل مار کھائے ہوئے بندر کی طرح ایک جگہ بندھا چاروں طرف آنکھیں دوڑایا کرتا، اس کی آنکھیں ایک ہی وقت میں بھوکی، ندیدی اور متحیر نظر آتیں۔ بغیر مانگے بھی اُس کی ہر ہلکی سی جنبش سے التجا اور بھکاری پن ٹپکتا۔ کھانے پر سب سے پہلے بغیر پکارے پہنچ کر دسترخوان کی سلوٹیں دور کرنے لگتا اور چمچوں کو قرینے سے سجاتا۔ جب تک کھانا شروع نہ ہو جاتا وہ صبر سے بیٹھا میٹھی میٹھی پیار بھری نظروں سے دیکھا کرتا۔ ایک ہی شوق کے ساتھ اچھی بُری ہر چیز نگل جاتا، نمک، مرچ، کھٹاس مٹھاس کے امتیاز سے بے نیاز نہ ہر کھانے کی چیز اُسے مزے دار معلوم ہوتی عموماً وہ سب کے بعد کھانا ختم کرتا اور بچی کھچی دال اور رکابی کی پونچھن کا بڑا سا لقمہ بنا کر مُنہ میں رکھ لیتا۔ یہ آخری لقمہ وہ بڑے انہماک سے دیر تک چباتا رہتا۔ ہاتھ مُنہ دھو لیتا لیکن کھانے کا مزہ قائم رکھنے کے لیے وہ کلّی ہرگز نہ کرتا، ویسے مُنہ ہاتھ دھونے پر بھی اُسے کچھ گھنے کی ضرورت نہ تھی، صبح ہی صبح برتن دھونے کے نل سے مُنہ دھو کر بڑی نفاست سے کرتے کے دامن سے مُنہ پونچھ ڈالتا، مگر دیکھنے میں پھر بھی نہایت غلیظ نظر آتا!

گدلی اور مردہ رنگ کی جلد اور مٹیلے بال اور میلے کپڑے۔

گھر کے کام کاج میں وہ بڑی مستعدی دکھاتا۔ عموماً اپنے سے چھوٹوں کا کام کر دیتا۔ اسے مرغیوں کو دانہ ڈالنے اور کتوں کو جھوٹے ٹکڑے کھلانے کا بہت شوق تھا۔ دسترخوان سے سارا کوڑا اسمیٹ کر وہ احاطے کے کسی سنسان کونے میں مرغیوں اور کتوں کو پکار کر ڈال دیتا لیکن جلد ہی لوگوں کو اس کے اس شوق کی اصلیت معلوم ہو گئی۔ کتوں کو دینے سے پہلے وہ سالن لگے ہوئے ٹکڑے، بچی بچائی ہڈی سے چپکی ہوئی بوٹی اور ایسی ہی دوسری کارآمد چیزیں منہ میں رکھ لیتا۔ اتنا کھانے پر بھی ایک طرح کی بے چین بھوک اس کی آنکھوں میں بلبلایا کرتی۔

اعجاز کا پیار کا نام اجو تھا نہ جانے کم بخت پر کس کو پیار آتا ہو گا۔ مگر لوگ بچوں کے نام رکھتے وقت دوسروں کے احساسات کا تھوڑے ہی خیال رکھتے ہیں۔ وہ بڑا فرماں بردار تھا۔ ابا کو انگریزی بالوں سے سخت نفرت تھی، اور لڑکے سر منڈواتے وقت غدر مچا دیتے تھے۔ مگر جیسے ہی نائی آتا اجو اپنا بے ہنگم سر لے بیٹھتا اور مسکرا مسکرا کر منڈوا لیتا۔ انعام کے دو پیسے لے کر وہ کمر بند میں بڑی سی گانٹھ باندھ لیتا مگر ابا گویا انعام دے کر بالکل خوش نہ ہوتے اپنے اصول پر قائم تھے مگر اجو کا گھٹا ہوا سر دیکھ کر نفرت کی ایک لہر ان کے دل میں بھی اٹھتی ــــــ سب کو اس کے سر سے نفرت تھی۔ بچپنے میں ایک ہی رخ لیٹے رہنے سے اس کا سر ایک طرف کیڑا لگے ہوئے خربوزے کی طرح پچکا ہوا تھا چپٹ تھا کہ وہ خوش مزاجی سے ہنس پڑتا جس پر رحم کا جذبہ ذرا سر اٹھاتا ــــــ لیکن فوراً ہی یہ رحم ایک غیر فانی نفرت میں تبدیل ہو جاتا۔

چھوٹے بڑے ہنستے اور اس کا مذاق اڑاتے، نوکر گھرکیاں دیتے اور برابر والے اس سے گھن کھاتے ــــــ اس پر طرہ یہ کہ جب شمن پیدا ہوئی تھی تو خالہ نے اجو کے نام کا ٹھیکرے میں روپیہ ڈال دیا تھا ــــــ ٹھیکرا تو تھا نہیں کیونکہ شمن کے پیدا ہونے پر مسیبم آئی تھی مگر زبانی بات ہو گئی تھی۔ اماں بھی چپ ہو گئی تھیں کہ خالہ کا دل نہ ٹوٹے، ماں غریب ہزار جان سے بیٹے پر قربان تھیں، جب کوئی تھوڑا

آتا وہ نئے کپڑوں کا جوڑا اور تل کے لڈو لے کر آجاتیں۔ اچھو اچھا بیٹا بن کر وہ لڈو پان دان کی تھالی میں لے کر ہر ایک کے سامنے پیش کرتا، مگر سب کے انکار کر دینے پر سارے لڈو اسی کو نیگ لگانے پڑتے۔

علاوہ غریب ہونے کے خالہ بد مذاق اور پرانے فیشن کی بھی تھیں اتنے بڑے گھوڑے کے لیے پھول دار کرتا اور لال تول کا رومال لاتیں۔ عید کے دن صبح تڑکے ماں بیٹے اٹھ کر باسی یخ پانی سے غسل فرماتے اور کورے کلف دار کپڑے پہن کر اچھو سب کو سلام کرنے ان کے بچھونوں پر پہنچ جاتا۔ ساتھ ساتھ دعاؤں کی پوٹلی بغل میں دبائے ہنستی مسکراتی خالہ ہوتیں۔ مگر سب ہی تو اس خلل اندازی پر بڑبڑاتے اور کوئی بھی جی سے دعا نہ دیتا۔ اچھو پڈ نگ ہو یا کیک سب کو بٹیں ہی کہتا۔ تاش کھیلنے میں جب وہ اسپیڈ اور ڈائمنڈ کے بجائے دہی حکم اور اینٹ کہتا تو منجھلے بھیّا کا خون کھول اٹھتا۔

"اچھو کے بچے سلام کر ـــــ ناک پکڑ کر ـــــ ادھر ـــــ اور ادھر بھی ـــــ"

اچھو ناک پکڑ کر چاروں طرف سلام کرتا۔ "اچھا اب ایک ٹانگ پر کھڑے ہو....... جلدی، جلدی" وہ اس کے گٹوں پر کھٹاک سے چھڑی مارتے۔ "نہ بھیّا! کیوں مارے ڈالے ہو نگوڑے کو؟" خالہ گھگیاتیں اور پھر اچھو سے خوشامد میں دوسرے بچوں کے بستر تہ کرداتیں، بکھرے ہوئے جوتے موزے رکھواتیں، ایک پیسہ، آدھی چوسی ہوئی آم کی گٹھلی، جھوٹے دودھ چاول کا لالچ دے کر اچھو سے ہر ممکن خدمت لی جا سکتی تھی، اور غریب ہزاروں گٹھلیوں اور جھوٹی ہڈیوں کے نیچے دبا ہوا کوڑیا غلام کی طرح کام کرتا۔

جب شمن اچھو کو دیکھتی تو وہ اسے موٹی سی گستاخ گالی نظر آتا۔ اس کے جذبات کھول کر بغاوت پر آمادہ ہو جاتے اور اس کا جی چاہتا کسی کی بوٹیاں دانتوں سے چبا کر تھوک دے۔ اوپر سے عاقبت نااندیش خالہ نے اچھو کی گت دیکھ کر سوچا اگر منگنی کا ذکر چھیڑ دیا جائے تو شاید آئندہ داماد سمجھ کر اس شدت سے آزار نہ پہنچایا جائے لہٰذا وہ بیچ صحن میں بیٹھ کر ارمان بھری باتیں کرنے لگیں۔ سب دم بخود رہ گئے اور شمن کے

تو تن بدن میں چنگاریاں چھٹنے لگیں۔ مارے نفرت کے وہ اس کے منہ پر تھوک بھی تو نہ سکی مگر اچو پر کچھ عجیب ہی اثر ہوا۔ وہ ہکا بکا تھوڑی دیر چاروں طرف دیکھتا رہا پھر ——— ایک دم اس کی تمرٹی پر نہ جانے جسم کی کن کن رگوں سے خون چھلک آیا، اٹھ کر وہ بے تحاشا باہر بھاگ گیا۔

اس دن سے شمن سے وہ بے طرح شرمایا اور جھینپا سا رہنے لگا۔ شمن کو دیکھ کر وہ مفلوج سا ہو جاتا۔ اور اگر وہ پاس سے جا گزر جاتی تو وہ شل ہو جاتا، اس کی غیر فانی بھوک کے بعد یہ پہلا جذبہ تھا جو اس شدت سے اچو پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ گھر میں قدم رکھتا تو شمن کے پتنگے لگنے لگتے۔ امیدوار داماد ول کی سی سنجیدہ شرم اور تکلف دیکھ کر اس کا جی چاہتا اس کے منہ پر جوتا مار دے ——— اور بدترین جملے اس کے شان میں دہرائے۔ ایک اور بھی زبردست انقلاب پیدا ہو گیا اس میں ——— وہ اسد کی چلبلی بے وقوفیاں جو وہ لوگوں کو خوش کرنے اور ہنسانے کو کیا کرتا تھا۔ یک لخت بند ہو گئیں گو وہ شمن سے شرمایا رہتا لیکن چھپ چھپ کر کنکھیوں اس کی ہر جنبش کا گھورا کرتا۔

رات کو سب بچوں کے پلنگ برابر برابر ڈال دیئے جاتے۔ اچو کسی نہ کسی بہانے سے اپنا پلنگ شمن کے قریب ڈالتا کسی کو خیال بھی نہ آتا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے، کیونکہ لوگ اسے حد درجہ کا بے وقوف سمجھتے تھے، لیکن شمن کا جی گھبراتا تھا، جب سب سو جاتے تو اچو آہستہ آہستہ اس کے پیروں میں اپنے پیر کا انگوٹھا اور انگلیاں ملا کر چٹکیاں لیا کرتا، وہ اسے ڈانٹ کر دور جھٹک دیتی۔ مگر وہ سوتا بن جاتا اور رات کو آنکھ کھلتی تو اسے اپنے پلنگ پر جو ہے سے کچھ کتے معلوم ہوتے، شاید وہ ساری رات جاگا کرتا تھا کیونکہ دم بھر کو شمن چین سے نہ سو پاتی اچو کا ہاتھ یا پیر اس کی پنڈلی یا ران کو سہلایا کرتا۔

"کیا ہے اچو ——— ہم مار دیں گے ———" اس نے کئی بار جوتا اٹھا کر مارا مگر سویا ہوا اچو آہستہ آہستہ اسے خوف زدہ کرنے لگا وہ اس سے بچنے کے لیے بوڑھی انا کی پٹی سے پٹی ملا کر سونے لگی اور دوسری طرف پلنگ دیوار سے اڑا لیتی اور ان سے

دہی بادشاہ اور بادشاہ زادی کی بوسیدہ اور بدمزہ کہانیاں سُنا کرتی۔ سُنتی کیا خاک کہانیاں اُسے رٹی پڑی تھیں۔ بڑی بوڑھی ہاں ہاں کیا کرتی۔ اس کے خیالات بہت دور کسی نہایت ہی دلچسپ ہلکی پھلکی کہانی کا تانا بانا جوڑنے میں مشغول ہوتے اس لطیف کہانی کی وہ ہیروئن ہوتی اور ہیرو؟ نہ جانے کون کون بھلا کس کی مجال تھی جو اس کی ان کہانیوں کا ہیرو بننے سے انکار کرے۔ اس نے ایک بار "ہیر رانجھا" فلم دیکھا تھا۔ ہیر نے کیا بھولے پن سے آنکھ مچولی کھیلنے میں رانجھے کو پکڑ لیا تھا کچھ ایسی ہی دل دھڑکانے والی معصوم سی ملاقات اس کی اور رشید کی ہوتی تھی...... پکنک میں جب...... وہ......

وہ سو جاتی سائیں سائیں خواب اسے لمبے لمبے پینگ دے کر جھلاتے۔ ایک بار ہی اوپر چڑھتی چلی جا رہی ہے، پھر چڑھتی ہے اور پھسل پڑتی ہے۔ چکنی چکنی زمین اس کے پیروں کے نیچے گدگدیاں کرتی مچل مچل کر بھاگ رہی ہے ـــــ وہی بلقیس کا کمرہ اور کیرم کا تختہ ـــــ رشید بلقیس کے دوپٹے کا گھونگٹ کاڑھے ہیں ـــــ وہ پردہ کرتی ہے نا رشید سے ـــــ رشید کی بے ایمان آنکھیں دوپٹے کی مہین جالی میں سے جھانک رہی ہیں ـــــ وہ ہار گئی ـــــ جیتا ہوا رشید اس کی کلائی پکڑے دو انگلیوں کو ملائے چٹکی مارنے کو تیار ہے ـــــ کہ ایک دم سے ٹھنڈی ٹھنڈی دم گھونٹنے والی خلا اُسے لپیٹ کر پھرکی کی طرح گھما ڈالتی ہے ـــــ گرم گرم پانی کی بے آواز دھاریں کندھوں اور کنپٹیوں پر سے پھسلتی رینگتی چلی جا رہی ہیں کہ ایک دم سے وہ جاگ پڑتی ـــــ اوہ! اچو کے بھوکے ہاتھ!!

دبی ہوئی خوف زدہ چیخ کے ساتھ وہ دیکھتی کہ اچو اس کے سرہانے سے بھاگ کر پانی پینے کے مٹکوں کے پاس بڑا مشغول نظر آرہا ہے وہ اس کی لرزتی ہوئی بھنکار کا کوئی جواب نہ دیتا اور پانی پی کر خاموش اپنے پلنگ پر جا گرتا گھنٹوں خوف سے سُن سُن کانپا کرتی۔ ہزاروں نہ جانے کیا کیا جگہ بے جگہ چھنچھنایا کرتیں۔

نفرت میں خوف کا اور اضافہ ہو گیا ـــــ اچو دن بھر تو بالکل معصوم

دکھائی دیتا لیکن ـــــ لیکن رات کو بھوت کی طرح ڈراؤ نا نظر آتا۔ اس کی صورت اور بھی مسخ ہو چلی تھی۔ دن رات سر اوندھائے پڑھنے میں جتا رہتا ـــــ تعجب تو یہ ہے کہ اس کی وہ غیر فانی بھوک ایک دم غائب ہو گئی تھی۔ کئی بار بلانے پر وہ دستر خوان پر آتا ـــــ دو چار لقمے بے توجہی سے کھا کر چل دیتا۔ اب اُسے دودھ میں لساندہ خربوزوں میں ہیک اور آموں میں کھٹاس بھی محسوس ہونے لگی تھی میٹرک میں رٹ رٹا کر وہ وظیفہ پانے لگا لیکن شاید ہی کوئی دن جاتا ہو گا جب کہ وہ رات کو شمن کے سرہانے یا پائنتی کھڑا نظر نہ آتا ہو۔ اب وہ ہاتھ نہیں لگاتا تھا بلکہ چھپی سے ٹہلتا ـــــ رک جاتا، جھکتا اور پھر جھجک جاتا۔ ایک دن شمن کا دوپٹہ پلنگ کے نیچے لٹک رہا تھا۔ اس نے جھک کر اٹھایا ـــــ پھر گھبرا کر اُس کے اوپر ڈال دیا۔ لیکن فوراً ہی وہ پچھتانے لگا کہ آخر اس نے جلدی کیوں پھینک دیا دوپٹہ ـــــ دوبارہ اٹھانے کی ساری کوشش اس کے لرزتے ہوئے ہاتھوں نے خاک میں ملا دی ـــــ شمن کو کلبلاتا دیکھ کر وہ جلدی سے پانی پینے لگا۔

عموماً شمن جاگ بھی جاتی تو پڑی پڑی اس خاموش ڈرامے کو دیکھا کرتی، جونہی وہ اُسے دلبر ہوتا دیکھتی کروٹ لے کر جاگنے کی دھمکی دیتی گو وہ خوب جانتی تھی کہ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بیداری کا اعلان کر سکے ـــــ کروٹ لے کر وہ کبھی کبھی بڑبڑانے لگتی ہے

"مر جائے ـــــ مر جائے کاش اجو مر جائے ـــــ" وہ کچھ نہ سمجھتا اور جھک کر اس کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھنے لگتا ـــــ مگر ایک دن تو شمن کے ضبط کا پیمانہ چھلک ہی گیا۔ نہا کر وہ گیلے بال کھولے سو گئی ـــــ رات کو اُسے ایسا معلوم ہوا کوئی اُسے بالوں سے پکڑے جھٹکے دے رہا ہے جھلا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور چیخیں مارنے لگی۔ اس کی سانس رک گئی۔ منہ پھٹا تھا مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اجو اس کے بالوں میں بھوکے کتے کی طرح منہ دیے سسکیوں سے رو رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے اجو کے اس نے زور سے چپل

اٹھا کر ماردی۔

صبح کو اس نے گھر کا کونا کونا چھان مارا۔ مگر چپل نہ ملی۔

"میں نے رات کو کتے کے کھینچ ماری تھی ـــــ نہ جانے کدھر گئی۔"

"او ئی کتا رات بھر بندھا رہا ہے ـــــ کتا کہاں سے آیا ـــــ" کسی نے کہا۔

"اے شاید موری کھلی رہ گئی ہو ـــــ کوئی جنگلی کتا ہوگا۔"

"ہاں جنگلی ہی تھا ـــــ ایسا ڈراؤنا۔" شمن نے سہارے پر چلنا شروع کیا۔

"یہ کتے مونڈی کاٹے اٹھا بھی تو لے جاتے ہیں۔"

"کتے چپل کا کیا کریں گے؟"

"اے یونہی اللہ مارے اٹھا لے جاتے ہیں، میری نئی دلی کی جوتی کلیم میاں کی کتیا اٹھا لے گئی ـــــ حرامخور نے ساری چھلنی کر ڈالی۔"

بات بھٹکتی ہوئی کہیں سے کہیں پہنچی۔ مگر شمن کی الجھن نہ گئی ـــــ آخر چپل گئی کہاں؟ اس دن سے اچو کا پلنگ دوسرے چبوترے پر پہنچ گیا۔ شمن نے شکر کیا۔ کم بخت سے جان تو چھوٹی۔ اس کے بعد اس نے اچو کو حد درجہ بے تعلق اور اپنے پڑھنے لکھنے میں غرق دیکھا جو ٹی کھا کر جیسے اس کا پیٹ ہی بھر گیا چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور شمن کے جانے میں دو چار دن رہ گئے تھے کہ اچو کو اسکول سے پیدل آتے میں لو لگ گئی۔ ویسے تو کسی کو پتہ نہ چلا، لیکن شام کو جب اسے سستی سے پڑے رہنے پر ابا نے ڈانٹ کر پیڑوں میں پانی دینے کے لیے کہا تو لپک کر اٹھ بیٹھا، دو چار قدم چلا بھی مگر پھر جھوم کر زمین پر آرہا۔ دیکھا تو ایک سو پانچ بخار........

شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے خدا نے اس کی دعا قبول کرلی اور اچو چلا۔

رات بھر اسے بخار اور ہذیان نے جھنجھوڑا اور دوسرا دن بھی بے ہوشی میں گزر گیا۔ ویسے ابا کو کسی کی خبر نہیں رہتی لیکن اگر کوئی بیمار ہو جائے تو گھر کو لوٹ پوٹ کر کے

رکھ دیتے ہیں یہاں تک کہ اگر مرغی کی بھی ٹانگ ٹوٹ جاتی تو ایک ہنگامہ مچ جاتا۔ اچّو کی طبیعت اور زیادہ خراب ہوگئی وہ اٹھ کر بھاگتا۔ سارا گھر اس کا ماتھا چھونے گیا۔ مگر شمن نے جا کر جھانکا بھی نہیں۔ باری باری سب کی ڈیوٹی لگائی گئی تو شمن کو بھی جبر آجانا پڑا۔ مگر وہ ارادہ کیے گئی تھی کہ مردار کو ہاتھ بھی نہ لگائے گی مگر جب اُسے بے سدھ دیکھا تو ترس آگیا اور وہ برف کی ڈلی لے کر اس کے سر پر رگڑنے لگی۔ سر میں سے بھپکے نکل رہے تھے ہونٹ پپڑائے ہوئے تھے اور آنکھوں کے کونوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اچّو کی حالت قابل رحم تھی۔ باہر برف کی قلفیاں کھل رہی تھیں۔ شمن زندگی نہ سہی پر جی تو لوٹ رہا تھا اس نے چاہا چپکے سے کھسک جائے مگر اچّو نے پانی کے لیے ہونٹ چبانا شروع کیے اس نے برف کی ڈلی لے کر اس کے گرم گرم دہکتے ہوئے ہونٹوں سے لگا دی، ہونٹ اس کی انگلی سے چھو گئے! وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ اچّو نے آنکھیں کھول دیں اور بغیر آنکھیں جھپکائے اُسے دیکھتا رہا۔ ایک مسخ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی —— شمن بھاگ کر جانے لگی۔

شمن نے اُس نے ایک بار حلق سے نکالنے کی کوشش کی مگر وہ باہر آ کر ملائی کی برف کھانے لگی، اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور حلق جل رہا تھا ٹھنڈی ٹھنڈی برف کے چھلکے اس کا گلا کھینچنے لگے۔ برف کی پیالی رکھ کر اس نے اپنی انگلیوں کے پورے بھاپ سے گرم کرنا شروع کیے، جیسے کسی لاش کو چھو لینے سے اُن کا خون جم کر رہ گیا ہو۔

وہ کھرّے پلنگ پر پانی چھڑک کر پڑ رہی۔ جسم میں گرم گرم سلاخیں دوڑتی معلوم ہوتی تھیں۔ حلق بار بار کاغذ کے ٹکڑے کی طرح خشک اور بے لذت ہو جاتا۔ اچّو کی بخار سے جھلسی ہوئی آواز اس کے کان میں سانپ کی پھنکار کی طرح رینگ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا، اُس کے جذبات کیوں بے طرح اُتھل پتھل ہوئے جا رہے ہیں۔

دوسرے دن جب اچھوؔ کا بستر بدلنے کے لیے اٹھایا گیا تو شمن کی کھوئی ہوئی چپل وہ دونوں ہاتھوں میں بھینچے ہوئے اوندھا پڑا تھا ـــــ بخار اتر کر حرارت غریزی سے بھی پارہ نیچے گر گیا تھا اور آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔

۲۰

سوتے سوتے جو آنکھ کھلی تو شمن نے گھر میں عجیب طرح کی چہل پہل دیکھی ایک لمبا بانس لیے چپراسی کمروں کے جالے لے رہا تھا اور مہترانی بدرو کی صاف نہ کرنے پر ڈانٹ پڑ رہی تھی بڑی آپا ناک پر کپڑا باندھے تختوں کے نیچے سے کوڑا نکلوا رہی تھیں، اماں الماریاں کھول کر چینی کے برتن نکلوا رہی تھیں، معلوم ہوا کلکتے والے چچا مع اپنے ہونہار سپوت عباس کے تشریف لا رہے تھے۔ عباس اکلوتے ہونے کے علاوہ انگلینڈ سے انجنیری پاس کر کے آئے تھے۔ کلکتے والے چچا حد درجہ نالائق اور نکمے تھے۔ مگر یہ ان کا بیٹا نہ جانے کس طرح ہیرا نکل آیا۔ گورنمنٹ سے وظیفہ لے کر انجنیری پاس کر آیا۔ چچا بچارے کے دن پھر گئے۔ خاندان میں اُن کی حیثیت ہمیشہ ایک خوفناک چھوت کی بیماری کی سی رہی جہاں جا کر پڑ جاتے دھکے دے کر نکالے بغیر نہ نکلتے۔ اماں تو اُن سے پردہ کرنے لگی تھیں۔ لڑکیاں یوں ہی دعا سلام کر کے چلی آتیں۔ اور وہ نوکروں کی دھتکاریں اور مذاق کا نشانہ بنے جب تک ہمت قائم رہتی جمے رہتے پھر کہیں اور ٹھوکریں کھانے چلے جاتے عباس کو ایک ماسٹر نے ترس کھا کر رکھ لیا تھا اور آج جو وہ چمکتے ستارے کی طرح آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے واپس آیا تو سارے خاندان کی آنکھیں اس کی طرف اٹھ گئیں منجھلے اور چھوٹے ماموں اسٹیشن پر ہار پھول لے کر پہنچے۔ خالہ بی نے تو چار اسٹیشن پہلے ہی ناشتہ کا انتظام کروایا تھا۔ شمن کے یہاں چینی کے برتن اور چاندنیاں قالین نکلنے لگے تھے۔ اور کوٹھے کا کمرہ سجنے لگا تھا۔

خیر خدا خدا کر کے عباس میاں مع اپنے بدقماش باپ اور کھوٹی ماں اور چیچک رو بہن فہمیدہ کے دوپہر کی گاڑی سے پہنچ ہی گئے۔ اماں نے عباس کو کھینچ کر گلے لگایا اور چچا کو سچ مچ دعا دی۔

"اے فہمیدہ ماشاء اللہ کتنی بڑی ہو گئی" بڑی آپا اُسے پیار سے لپٹا کر بولیں۔ "تم نوری کے ساتھ سونا ــــ اچھا!"

خالہ بی جل کر کوئلہ ہو گئیں۔

"اوئی بھلا اپنی عمر کی لڑکیوں کو چھوڑ کر نوری کے پاس کیا اچھا لگے گا۔ اے بیٹی تم اپنی ثمینہ آپا کے ساتھ جاؤ وہ تمہارا منہ ہاتھ دھلوائیں گی۔ کیا کھڑی کھڑی تک رہی ہو مُنیہ! اسے ثمینہ بہن کو غسل خانے لے جاؤ۔

بڑی آپا حیرت زدہ رہ گئی۔ اندھیر ہے کہ نہیں، رانڈ بیوہ کا کسی کو خیال نہیں لوگ اپنی بیٹیوں کے آگے یتیم کا حق بھی مارنے سے نہیں چوکتے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ چچی سب سے پہلے حق دار کا خیال کریں گے۔ مگر فہمیدہ کو ثمینہ اور اختری سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لے اڑیں۔

"اے دشمن عباس کے لیے گرم پانی بھجوا دیا ہوتا کہ ڈھما ہی بیٹھی ہو" ماں نے ڈرتے ڈرتے کہا بڑی کا مزاج تراتیز تھا۔

"اے دشمن خاک اتنا سوچیں گی...... نوری؟...... جا! تو ذرا میری بجلی کی انگیٹھی پر پانی رکھ کے اوپر لے جا!" بڑی آپا بولیں۔

مگر اس سے قبل کہ نوری پانی گرم کرتی چھوٹی ممانی منہ دھلوا فخریہ عباس میاں کو لے کر اوپر سے اُتر آئیں۔ سب کے سب منہ دیکھتے رہ گئے اور وہ مسکراتی ہوئی اسے کرسی پر بٹھا کر پان لگانے لگیں۔

چچا غریب تو بولا گئے اور کچھ بھی نہیں کہ کیوں اتنی خاطریں ہو رہی ہیں بے چارے کو بڑی الجھن سی محسوس ہوئی۔ وہ تو بے چارے الٹی خوشامدوں کے عادی تھے جب آتے تھے ڈیوڑھی میں پلنگ ڈلوا دیا جاتا تھا۔ وہیں بیٹھیں کھانا چلا جاتا۔ سارے کنبے کی خوشامدوں سے وہ ہول کھا گئے۔ پر جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ خاندان میں ضرورت سے زیادہ لڑکیاں ہیں اور لڑکے کم اور نکھٹو! بوکھلا بوکھلا کر کبھی وہ عباس کے لیے ثمینہ کو پسند کرتے اور کبھی نوری پر رحم آ جاتا۔ ثمینہ کی عمر جا رہی تھی تو نوری کو

یہ خصوصیت حاصل تھی کہ وہ یتیم تھی کبھی بلقیس پر مہربان تو کبھی حُسنا پر کبھی شمن پر عنایت کی بارش تو کبھی احمدی پر۔ ان کا بس چلتا تو وہ ساری کی ساری لڑکیوں کو ایک دم بیاہ لیتے۔

وہ کسی کام کو کہتے تو سارے گھر میں کھلبلی پڑ جاتی۔ مائیں لڑکیوں کو دوڑاتیں اور وہ بے چاریاں کھسیانی ہو کر رہ جاتیں۔ ایک مقابلہ ہو رہا تھا گویا دیکھیں کون چچا جی کو خاطر سے بے حال کر کے ٹرافی یعنی عباس کو جیت لے جاتا ہے۔ بڑی آپا نے تو ایک نئی ہی ترکیب نکالی وہ یہ کہ نوری انگریزی کے جملوں کے معنی پوچھنے عباس کے سر پر سوار کر دی۔ مگر ثمینہ ماشاءاللہ خود ہوشیار تھیں اور عباس کی زیادہ تر توجہ ان کی ہی طرف رہتی تھی۔ نوری کو وہ بچہ سمجھتے شمن کو بد مذاق اور احمدی کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اس بے چاری کا نتیجہ تو صاف ظاہر تھا۔

ثمینہ بی کچھ لجائی لجائی شرمائی عباس کے مذاق کا جواب دیتی رہتیں۔ اُن کے لیے سویٹر بننا شروع کر دیا تھا جسے خالہ بی بھی بڑا ہی جاتیں بلقیس حد سے زیادہ شرمیلی تھی پر اماں کے ٹھوکوں پر مجبور ہو کر آگے بڑھتی اور پیچھے کھنچ آتی۔ شام کو تاش کھیلی کا چاؤ ہوتا چچا گالیاں بک بک کر پل باندھ دیتے۔ ایک دفعہ ایسی طرح گالی بکنے پر اماں نے اُن سے پردہ کر لیا تھا۔ پر آج سب مہذب بیویاں کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔ خالہ بی پنکھے کے پیچھے مُنہ چھپا کر کھی کھی ہنستیں۔ چچا خوب بے ایمانیاں کرتے مگر شریر بچہ سمجھ کر معاف کر دیے جاتے۔ چچی اصلی زیوروں پر پیک کی پچکاریاں ماریں کر اماں لرز لرز اٹھتیں مگر کیا مجال تھی جو کوئی بول جائے۔ بات یہ تھی کہ عباس بادشاہ اماں کے غلام تھے۔

یوں تو عباس ثمینہ ہی سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔ مگر جونہی وہ کسی کام سے ہٹتی وہ احمدی شمن یا بلقیس پر مہربان ہو جاتے۔ مذاق تو وہ سب ہی لڑکیوں سے کرتے اور اُن کے مذاق کا رخ دیکھ کر ہی سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ جاتی۔ ویسے ثمینہ سب سے بڑی تھیں اور پہلا حق ان کا تھا یہاں تو بحث کی گنجائش ہی نہ تھی۔ شمن کے باپ کے احسانات چچا کی جان پر بہت تھے لہٰذا یہاں بھی بحث کی کوئی کسر نہ رہ گئی تھی

نوری یتیم تھی اور یہاں خاندان والوں کی شرافت اور عباس کی عالی ظرفی کا سب کو یقین تھا۔ پھر فیصلہ کیسے ہو گا؟ سب منتظر تھے۔

ویسے عباس بہت ہی دلچسپ تھے جونہی وہ اندر آتے لڑکیاں کسی نہ کسی بہانے سے جمع ہو جاتیں۔ اور پھر یا تو ان کا بٹن ٹوٹ جاتا جسے بلقیس احمدی یا ثمن ٹانکتیں یا ثمینہ کی چھنگلیا کے پاس والی انگلی میں نظر نہ آنے والی پھانس چبھ جاتی جو کسی نہ نکلتی پر پھانسے کی طرح کھٹکا کرتی جب عباس اس پھانس کو نکالتے تو انہیں ایسے ایسے جملے سوجھتے کہ ثمینہ پسینہ پسینہ ہو جاتی۔

"بھئی اس شریر انگلی کا تو بس ایک علاج ہے۔" وہ ہنستے۔

"بھلا کیا علاج ہے وہ۔ آپ کر دیجئے نا۔" ثمینہ شرماتی۔

"اس کا علاج یہ ہے کہ ایک جگمگاتی ہوئی انگوٹھی........"

"ہٹیے!" وہ شرما کر ہاتھ کھینچ لیتی۔ خالہ کی باچھیں کھل جاتیں۔

"اچھا خیر لائیے اب کچھ نہ ہو گا۔"

اس کے علاوہ نوری روز بروز انگریزی کے الفاظ میں کمزور ہوتی جاتی بڑی آپا غم و فکر سے گھلنے لگتی اور ڈانٹوں کے ڈر سے نوری کو نگلے لیتی۔ چچا مرغ مسلم کھاتے کھاتے ادھ مرے ہو گئے۔ چچی نے گاجر کا حلوہ اتنا نگلا کہ معدہ جواب دے گیا۔ فہمیدہ کے دوپٹوں کو رنگتے اور چنتے ثمینہ اور احمدی کے انگوٹھے سوج گئے سب سانس روکے فرائض میں غرق صبر سے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ دیکھیے اونٹ کس کل بیٹھتا ہے کس کی قسمت جاگتی ہے۔

ثمن کو عباس پسند تھے اس لیے ہی نہیں کہ ان کے بال گھونگریالے اور آنکھیں غلافی تھیں۔ بلکہ وہ منسانے جو بہت تھے بیٹھے بیٹھے گال میں چٹکی بھر لینا۔ ایک دم سے درد سر کا بہانہ کر کے گھٹنے پر لیٹ جانا۔ پان جھجاتے ہاتھ کے منہ میں لینا اور لیتے وقت انگلی دانتوں سے دبانے کی کوشش کرنا بھولے میں ران یا گھٹنا مسل دینا وغیرہ۔

جاڑوں کے دن سب رضائیاں اوڑھ کر بیٹھ جاتے اور ان رضائیوں کے بادلوں میں عباس کے ہاتھ بجلیوں کی طرح کوندتے۔ لڑکیوں کے گروہ میں ننھی ننھی لرزشیں مچل مچل کر بکھر جاتیں۔ وہ دور ہٹتیں لیکن پھر سمٹ آتیں۔ گھر کے بزرگ بھی "بچوں" کے ہنسی مذاق سے ذرا دور پان چھالیہ میں غرق بیٹھے رہتے مگر ان کے کان انہیں کی طرف لگے ہوتے۔

رات کو جب سب لڑکیاں کھسر پھسر کرتیں تو عباس کی ڈرائی ہوئی چھنگار یا دہک اٹھتیں۔ سوائے ثمینہ کے وہ سب ایک دوسرے سے بے تکلف تھیں اور ان کے دلوں میں ذرا بھی تو رشک نہ تھا۔ گوییوں کی طرح وہ مل جل کر ایک ہی کرشن کی بنسری کی لے پر ناچتیں اور جب عباس راس رچانے کے لیے کھانے یا آرام کے کمرے میں آتا تو وہ سب کچھ بھول کر اس کے گرد منڈلانے لگتیں۔ مگر ثمینہ زیادہ تر نجمہ کی دیکھ بھال میں لگی رہتیں۔ وہ انھیں اکیلے میں بھابی کہہ کر چھیڑا کرتی تھی۔ مگر ثمینہ نے اسے سب کے سامنے کہنے کو منع کر دیا تھا وہ اب عباس سے اور بھی زیادہ شرمانے لگی تھیں۔ خالہ بی دن رات گو کھرو ٹیکوں اور کڑوں کے ذکر کیا کرتیں ان کی اندھیری کوٹھڑی میں کچھ دن سے مراد آبادی اور تانبے کے برتنوں کی آواز گونجنے لگی تھی۔

بڑی آپا بھی غافل نہ تھیں انھوں نے جٹ پٹ جو بے ڈھنگیاں ترشوا کر نئے فیشن کے دست بند منوانے شروع کر دیے تھے اور ہر وقت چینی کے ان سنٹوں کا ذکر کرتیں جو وہ کلکتے یا بمبئی سے منگوانے والی تھیں جو ایک دم سے سب کچھ ساتھ طے ہو گیا تو بے چاری مارے ہولوں کے مر نہ جائیں گی۔

شمشن کی دنّاں دم سادھے ہوئے تھیں کیونکہ ذرا سی دیر میں بڑی آپا اپنے بے وقت مرنے والے میاں کو یاد کر کے ماتم شروع کر دیتی تھیں۔ نانی ہو کر نواسی کا پیغام چھین لینتیں ، پھر بھی آپا احتیاطاً طعنے دیئے رہتی۔

ہر اسے ہے لوگ یتیم بیوہ کا خون چوسنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ارے بھئی لوگوں کو تو بہت مل جائیں گے یتیم کو جڑ جائے تو بہت جانو۔ قرآن پاک میں بھی یہی لکھا ہے

کہ پہلے یتیم بیوہ کا حق ۔۔۔۔۔۔۔ پھر ۔۔۔۔۔۔۔ مگر خالہ بی تو یہ باتیں سن کر بالکل بھولی انجان بن جاتیں۔ وہ جہیز کی تیاری میں منہمک تھیں۔

اس کے علاوہ اور بھی قیاس آرائیاں ہوتیں۔ جیسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں لوگ موسم دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں اسی طرح بڑی آپا خالہ بی سے اور چھوٹی ممانی سے باتیں کرتیں۔

"نہیں بی میری بات مانو یا نہ مانو پر دیکھ لینا وہ بلقیس سے تو کرنے کا نہیں۔ ہاں اپنی نوری ۔۔۔۔۔۔" ممانی آپا کو خوش کرتیں۔

"اے بی تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔ ثمینہ تو کیا ثمن ہی سے کرے تو بہت جانو ۔۔۔۔۔۔" بڑی آپا جواب دیتیں۔

"دیکھو اب کیا ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ ویسے تمہاری خالہ پیچھے جھاڑ کر پیچھے تو پڑ گئی ہیں۔ اے کل آنچھ کے لئے کا لحاف بنایا ہے، کیا موا چھوڑا ڈالوں جیسا ۔۔۔۔۔۔ میں نے تو کہہ دیا بہن ۔۔۔۔۔۔۔"

غرض ایسا معلوم ہوتا تھا میدان میں گھوڑے چھوٹ چکے۔ کبھی ایک آگے تو کبھی دوسرا آگے یا جیسے انٹرویو ہو رہا ہے لوگ اپنی اپنی کر چکے ہیں۔ نتیجے کا بے صبری سے انتظار ہے۔ چچا چچی پیغام دے ہی نہیں چکتے۔ اور نہ ہی مُنہ سے پھوٹتے ہیں۔ کھایا پیا اور پیر پسار کے سو گئے۔ اور یہاں سب کی نیندیں حرام ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ہر ایک کے دروازے پر بارات کھڑی ہے مگر دولہا اندر قدم نہیں رکھ چکا۔

ادھر عباس نے آنکھ مچولیاں کھیلنا شروع کر دی تھیں۔ بلقیس جب پچھلے برآمدے سے چھالیا نکال رہی تھی تو نہ جانے عباس کدھر سے آن پہونچے اور پکڑ لیا بڑی مشکل سے بھاگی اور پھر ایک دن جو ثمن ایکدم ڈرائنگ روم میں چلی گئی تو وہ ثمینہ خاتون کو گھیرے کھڑے تھے۔ ثمینہ تو بھاگ گئی پر جب ثمن جانے لگی تو عباس نے ہاتھ پکڑ لیا۔

"کھو گی تو نہیں؟ کیوں ثمن!"

"کیوں نہیں کھوؤں گی۔ ٹھہر جائیے ذرا!" ثمن نے ذرا شرارت سے کہا اور ہنسی۔

"نہیں نہیں .... دیکھو کسی سے نہ کہنا .... سنو ......" اور وہ کوئی بہت ضروری بات سنانے اور قریب آ گئے "

"اچھا .... بھئی چھوڑ دیجیے تو کسی سے نہ کہوں گی" وہ اپنی جان چھڑانے لگی

"اوں ہوں .... قسم کھاؤ .... ہمارے سر کی قسم کھاؤ پہلے" عباس نے گھسیٹ کر اسے اور قریب کر لیا۔

"اچھا ..... اچھا ..... آپ کے سر کی قسم ..... چھوڑ دیجیے" وہ بوکھلائی۔

"لیکن ...... سنو تو ......" انھوں نے اسے کھینچنا چاہا۔

"شمو" انھوں نے تڑپ کر بھاگتی ہوئی مچھلی کو پکڑنے کی ناکام کوشش کی دیر تک وہ جھلائی ہوئی ہانپتی رہی۔ عباس کے قریب سے نہ جانے کیوں اسے اتنی گھن آئی۔ وہ ان سے مذاق کر سکتی تھی۔ مگر دور سے یہ اتنے قریب کی چہلیں اسے بڑی کڑوی معلوم ہوئیں۔

"کیوں؟" وہ دیر تک سوچتی رہی۔ عباس کے بال رشید سے کتنے ملتے تھے وہ کچھ قہقہے بھی اسی کی طرح لگاتے تھے .... مگر، تو پھر کیا چیز تھی جس سے اسے گھن آئی؟ لوگ ایک ہی چمچہ منہ میں ڈال ڈال کر کھاتے ہوں تو جی متلا ہی جاتا ہے۔ اس منہ کا لعاب منہ میں! توبہ! تھوڑی ہی دیر پہلے ثمینہ بھاگی تھی ..... اور ......

عباس کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور جانے کے خیال سے وہ اداس ہو جاتا اس کے ساتھ ساتھ لڑکیاں بھی بددل ہو جاتیں اور سارے بڑے بوڑھے بھی سہم جاتے وہ ایک ایک دن ٹال رہا تھا اور بڑی سنجیدگی سے لڑکیوں کو اندھیرے اجالے گھیر رہا تھا۔ اور ادھر بھی چاروں طرف پھنکیاں چل رہی تھیں۔ دانے ڈالے جا رہے تھے۔ جال پھینکے جا رہے تھے۔ اور شکاری آس لگائے آس میں بیٹھے تھے۔

شادی بیاہ کے دن رات چرچے ہوتے مگر چچی اور چچا منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ آخر خالہ بی کے صبر کا پیمانہ چھلک ہی گیا چچا کے جواب سے ایسا معلوم ہوا ایک آندھی آئی اور آبادیوں کی آبادیاں ویران کرتی چلی گئی۔ آئی سی ایس کا

انٹرویو ہوتا ہے۔ کامیاب طلبا کیسے ہشاش بشاش مسکراتے ہوئے مٹھائیاں بانٹتے ہیں نذر نیاز پوری کی جاتی ہے اور جو بیچارے قسمت کے مارے رہ جاتے ہیں اُن کے یہاں چھوٹی موٹی موت سی ہو جاتی ہے سینکڑوں ارمانوں کا خون اور لاکھوں تمناؤں کا قتل۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو کہ گورنمنٹ نے دھاندلی کر کے آئی سی ایس کا عہدہ ہی توڑ دیا تو یہ ایک قومی ملکی موت کہلائے گی۔ یہی ہوا کہ چچی نے چلنے سے پہلے سب کو عباس کی شادی کا زبانی بلاوا دے دیا۔ اس شادی کا جو انگلینڈ جانے سے پہلے ہی اُن ماسٹر صاحب کی لڑکی سے طے ہو چکی تھی جنھوں نے عباس کو تعلیم دلوائی تھی۔ لڑکی کالی بھی تھی اور غریب بھی مگر سگھڑ بہت تھی

سگھڑ بہولے نہ جانے کتنے جہیزوں جو بے ڈیوں اور آنکھ کے نشے کے لحافوں پر جھاڑو پھیر دی۔ ایک دم اماں کو مرغیوں پر پیار آنے لگا۔ گاجر کے حلوے ختم ہو کر دوبارہ نہ بنے۔ فہمیدہ کو جو قالہ جوڑا دے رہی تھیں اس کا دوپٹہ نہ جانے کہاں کپڑوں کے نیچے ہو گیا اور کرتے پاجامے کا کپڑا احمدی کو بھا گیا۔ دیوار پر پیک کی پچکاریاں لمبے اور گہرے زخموں کی طرح دلوں کے پار ہونے لگیں۔ چچا اور چچی ایک ضروری کام کی وجہ سے فوراً روانہ ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اور تمینہ کے ہسٹریا کے دورے پھر سے تازہ ہو گئے۔ نوری کی نیچی موادبھری رسولی کی طرح ابھر آئی اور منجھلی ممانی بلقیس کو نامراد نصیبوں جلی کے خطابوں سے پکارنے لگیں۔

چچا اور چچی خوفناک پھوڑوں جیسی ٹیسیں کلیجوں میں چھوڑ گئے۔ چچی دو تکیے بستر میں بھولے سے باندھ لے گئیں اور فہمیدہ تمینہ کے چاندی کے بندے اُتار نا بھول گئی۔ چچا سارے تاش کے پتے تھوک میں سان گئے۔ اور عباس نہ جانے کتنی آہیں اور شب بیداریاں چند معصوم دلوں میں چھوڑ کر چل دیا۔

۲۱

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوتے ہی اس کا داخلہ ایک امریکن مشنری کالج میں ہو گیا۔ اب شمن کو معلوم ہوا کہ دنیا کتنی لمبی چوڑی ہے اب تک تو وہ جیسے انڈے کی سطح پر رینگ رہی تھی۔ چکنی بے رنگ اور لامتناہی...... مگر پھر بھی محدود۔ جتنا بھی چلے جاؤ وسعت ختم نہیں ہوتی، پھر بھی جہاں تھے وہیں، کالج میں قدم رکھتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے ڈاک گاڑی میں اڑی چلی جا رہی تھی کہ جنکشن آ گیا۔ اسے بہت جلد اس جنکشن کے غل غپاڑے میں ڈوب جانا پڑا۔ ادبی جلسے، دلچسپ لکچر پرزور تقریریں، ہنگامہ خیز سیریں۔ اور قیامت انگیز عشق بازیاں۔ پہلی بات جو دو لڑکیاں بے تکلفی کی کرتی ہیں وہ عاشقوں اور چاہنے والوں کی ہی ہوتی ہیں لڑکیاں ایک دوسرے کا بھاؤ اسی ذریعے سے معلوم کرتی ہیں۔ مثلاً میری پر ساری یونیورسٹی مرتی ہے۔ بینا رائے پر سیاست کی پوری کلاس فدا ہے، اور کملا پر سنسکرت کے پنڈت جی تین سال سے مر رہے ہیں۔ کشور پر فارسی کے استاد نیم جاں تھے۔ باقی لڑکیوں پر بھی حصہ رسد ان کے چچیرے اور ممیرے بھائی اور پڑوسی فدا تھے۔ کم از کم کالج کی فضا میں تو ان کا یہی حصہ تھا۔ کالج کے قوانین بڑے سخت تھے۔ ویسے تو کسی کا سگا باپ بھی بغیر چھان بین کے ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود بھی عشق کا اتھاہ ساگر پڑا ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور اس معاملے میں پچپلے ہوئے منہ اور سڑے ہوئے پیلے دانتوں والی میٹرن کی بھی کچھ نہ چلتی تھی۔

ان میٹرن سے سب کو ہی بغض لگی تھی۔ شاید جنگ عظیم میں ان کا عاشق مارا گیا تھا، یا شاید چھوڑ چھاڑ کر چل دیا اور غریب نے اس بہانے کی آڑ میں پناہ لے لی۔ ہر لڑکی کے راز معلوم کرنے کی فکر میں لگی رہتیں جہاں دس بجے اور اللہ کی بندی بجلی گل کرنے کے لیے سر پر سوار، خود دو دو گھنٹے پہلے سے سونے کی تیاریاں شروع

کر دیتیں۔ غسل کرکے منہ پر پالش کی جاتی گنتی کے چار بال اینٹھ کر گھونگر بنائے جاتے اور یہی گھونگر بنے ہوئی بتیوں کی صورت میں ان کی پیشانی پر تھر کتے نظر آتے ڈھیلا ڈھالا جاپانی گون جس پر اژدھوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اور بغیر ایڑی کی سلیپریں پہن کر جب وہ چلتیں تو ان کا ڈھلا ہوا جسم ایسے کلبلاتا گویا ان اژدہوں میں جان پڑ رہی ہے۔

باوجود انتہائی نفرت کے ہر لڑکی کو ان کی خوشامد میں انوار کو ان کے مرحوم عاشق کی تصویر کی تعریف کرنی پڑتی۔ یہ تصویر ایک فوجی گورے کی تھی۔ نہایت کریہہ، فٹ بھر لمبا کرخت چہرہ اور اوپر کا تنگ ہونٹ دانتوں پر سے کھنچا ہوا جیسے کسی پر غصے میں دانت پیس رہا ہے۔ منڈی کھبڑیں اور چھدرے بال۔ سیاہ فوجی کی لڑکیوں کا خیال تھا کہ میٹرن اور اس گورے کا بیج مل جاتا تو یقیناً گھوڑے کی کوئی عجیب الخلقت قسم پیدا ہوتی۔

یہ میٹرن کسی لڑکی کو بغیر عاشق کے تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ حالانکہ خود بے چاری نن تھیں۔ ایک دفعہ پریا کا سگا بھائی آیا تو وہ برآمدے ہی میں کھڑی تھی۔ اجازت لینے کا خیال بھی نہ آیا اور وہ اس سے باتیں کرنے لگی۔ ملکہ شمن کو بھی ساتھ گھسیٹ لے گئی۔

بیچارا ترپید حد سے زیادہ بوکھلایا ہوا لوٹا پھر بھی جونہی میٹرن کو پتہ چلا ہانپتی ہوئی موقع واردات پر پہنچی۔ ہیترا پریا نے کہا کہ وہ اس کا سگا بھائی ہے دوسرے نہایت جغد ہے مگر وہ نہ مانی اور رپورٹ کر دی مگر پریا ایک جلتی پر زہ وہ دانوں لگا یا کہ پرنسپل بھی خاموش ہو گئیں پہلے تو وہ ملاقاتی کارڈ ڈھونڈھ کر ان پر ملنے والوں کے نام لکھے گئے اور پھر ان پر شمن اور پریا کے سرپرستوں کے دستخط کرائے گئے، جو ایک بی اے کی لڑکی لئے کر جیسے۔ ان کارڈوں کی رو سے شمن کو نہ صرف پریا کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت تھی بلکہ وہ اس کے گھر چھٹیوں میں جا کر دن رات

رہ سکتی تھی۔ حالانکہ شمن اور پریما صرف دو ماہ سے کلاس فیلو تھیں۔ لیکن ان کارڈوں پر لکھا تھا کہ ان کے والدین خاندانی دوست ہیں۔ یہ کارڈ پرنسپل کی میز پر چپکے سے رکھ دیئے جب پرنسپل آئیں تو پریما نے بڑی معصومیت سے کارڈوں کا ذکر کیا۔ بلکہ اخبار کے نیچے سے نکال اُن کے ہاتھ میں پکڑا دیے۔ الٹی شمن پر ڈانٹ پڑی۔

لہٰذا اتوار کو شمن پریما کے ساتھ اس کے گھر گئی۔ نریندر کے ساتھ اور چھ سات دوست بھی تھے مگر پریما نے زبردستی کی اور موٹر لبالب بھر گئی۔ دوپہر کا وقت چلچلاتی دھوپ لُو کے تھپیڑے جھلسائے دے رہے تھے مگر شمن کے جسم میں ٹھنڈی ٹھنڈی چنگاریاں رینگ رہی تھیں۔ عمر میں پہلی بار اتنے ڈھیر سے لڑکوں سے کوٹ پتلون پہنے جوتے اور بے ضرورت سہیٹ اس سے اتنے قریب آئے تھے۔ شاید ان دونوں پر رعب ڈالنے کے لیے سب لڑکے اترا رہے تھے۔ وہ پریما سے بے حد بے تکلف تھے۔ ان میں سے ایک تو سب ہو ہو کہہ رہے تھے پریما کے شانے سے لگا اونگھ رہا تھا۔ اور ہر جھکولے کے ساتھ اس کا سر پریما کے سینے پر آن گرتا۔ جس پر پریما دانت پیس کر اس کے گھنے بالوں کے گچھے جھنجھوڑ ڈالتی۔ اور اس کے برہنہ بازو پر ابھی تین دن کی مونڈی ہوئی مونچھیں چھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ نہایت نزاکت سے نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ قصہ شمن کو سنانے میں غرق تھی۔ موٹر احاطے میں گھومتی ہوئی برآمدے کے سامنے رک گئی۔ بیٹھے بیٹھے جوڑ سُن ہو گئے تھے۔ بڑی مشکل سے ٹانگیں کھینچ کھینچ کر نکالیں اور سب چیختے چلاتے اندر پہنچے۔

شمن سب سے پیچھے تھی اس نے دیکھا کہ پریما کسی سے صوفے پر کشتی لڑانے میں مشغول تھی۔ اور بڑی مشکل سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نریندر اور اس کے دوست چیخ چیخ کر اُن دونوں کی ہمت افزائی کر رہے تھے۔ آخر کو پریما پست ہو کر صوفے سے لڑھک پڑی۔

”شاباش رائے صاحب!“ نریندر نے حریف مخالف کی پیٹھ ٹھونک کر کہا۔

”ارے شمن ...... رائے صاحب یہ ہے شمن!“ پریما نے تعارف کرایا۔

”ہوں!“ وہ چشمے کے نیچے سے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر بولے اُن کے

ہونٹوں میں ایک ملبا سا سگار جھول رہا تھا اور اس میں سے دھوئیں کی لمبی لمبی چُسکیاں لے کر وہ ہونٹ کے کونے سے باریک ڈوروں کی صورت میں پھونک رہے تھے پاس ہی اسٹول پر رنگوں کی طشتری اور برش بکھرے پڑے تھے اور سامنے ایک عورت کی نامکمل تصویر دیوار پر چپاں تھی۔

شمن آنکھ بچا کر غور سے انھیں دیکھنے لگی۔ خوب مضبوط مگر چھریرا جسم، اونچا قد اور تپے ہوئے سونے جیسا رنگ، اس پر چاندی سے بھی زیادہ اُجلے بالوں کا ڈھیر! یہ عجیب و غریب صورت دیکھ کر شمن ایسی بوکھلائی کہ اُسے یاد بھی نہ رہا کہ وہ کتنی دیر سے انھیں گھور رہی ہے کہ ایک دم رائے صاحب بولے۔

"ارے...... کیا نام ہے اس لڑکی کا؟...... کچھ جنگلی سی معلوم ہوتی ہے"

"شمن،" دو تین گلے ایک دم چلائے۔

"چمن؟"

"نہیں...... شمن"

"ادھر آ.... چمن!" رائے صاحب نے دھوئیں کی ڈوریاں پھونکتے ہوئے کہا۔ شمن اٹھ کر گئی چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے وہ اس کے قریب آ گئے اور ایسے تمنے سے دیکھنے لگے گویا وہ کوئی عجیب و غریب جانور ہے۔ شرارت سے اُن کے چہرے کے چھپے چھوٹے عضلات مُسکرا رہے تھے اور بھویں پھڑک رہی تھیں۔ ایک دم سے انھوں نے اس کی آنکھوں کے پپوٹے کھینچ کر دیکھے۔

"زبان نکالو،" انھوں نے سنجیدگی سے کہا۔ شمن نے بے ساختہ زبان نکال دی جس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا اور وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ آئی۔

"کیا بات ہے کچھ بھوکی معلوم ہوتی ہے۔" ارے پریا کچھ دانہ پانی تو ڈال اس چڑیا کے لیے...... کیا ہے تیرا نام...... چمن، شمن رائے صاحب! پریا چلائی، "شمن؟...... یہ شمن کیا ہوتا ہے؟ نہیں ہم تو اسے چمن کہیں گے۔ اسے کھانے کو دو دیکھ...... ارے ٹھہر، تو اتنی پتلی کیوں ہے کیا تیرے پاس پوڈر سودر کچھ نہیں...... ادھر آ،" اس سے پہلے کہ شمن کچھ سمجھی رائے صاحب نے اُسے

گالوں پر برش سے سرخ رنگ لگا دیا کھسیا کر وہ ہتھیلیوں سے گال رگڑنے لگی۔

"بڑے خراب ہیں آپ بیٹے" پریما نے انہیں دھکیل دیا اور شمن کو غسل خانے میں لے گئی۔

شام کو رائے صاحب اور سب لوگ تیرنے کے لیے حوض میں اترے شمن کو تیرنا نہیں آتا تھا۔ اس لیے وہ کنارے پر پانی میں پیر ڈال کر بیٹھ گئی۔ رائے صاحب روز تین دفعہ اوپر سے کودے اور بڑی دیر تک تیراکی کے کمالات دکھاتے رہے۔ کبھی چت تیرتے تو کبھی پٹ اور کبھی دیر تک پانی میں غوطہ لگا جاتے۔

"ارے یہ جل کوا کیسا بیٹھا ہے" انھوں نے شمن کو کنارے پر پیر لٹکائے دیکھ کر چھیڑا "یہ پانی میں کیوں نہیں اترتی" جب پریما نے بتایا کہ وہ تیرنا نہیں جانتی تو انھوں نے اس کے کان میں کچھ کہا اور غوطہ مار گئے۔ شمن حیرت سے منہ پھاڑے حوض کو گھورتی رہی کہ اب نکلیں اور اب نکلیں کہ ایک دم سے سب چلائے۔

"مگر...... مگر!" اور شمن غڑاپ سے پانی میں ا... بدحواس ہو کر رائے صاحب کو ناخونوں سے کھرچنے لگی جو اُسے ڈوبنے سے بچانے آئے تھے۔

"ہیں ہیں...... ارے نوچے گی تو پھر مگر کو دے دوں گا"

شمن کھسیا کر بسورنے لگی اور سب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔

رات کو جلدی جلدی کھانا کھایا گیا اس کے بعد ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے سب کی رائے ہوئی کہ ناچ ہو۔ پہلے تو پریما نے اپنے تازہ سبق کا مظاہرہ کیا اور جب وہ تھک گئی تو سب چلائے "رائے صاحب، رائے صاحب"

پہلے تو رائے صاحب خاموش رہے پھر انھوں نے سگار طشتری میں ڈال دیا اور لیمپ کی طرف پشت کر کے خاموش کھڑے ہو گئے۔ باجا بجتا رہا اور وہ پاؤں جمائے دیوار پر گھورتے رہے۔ پھر آہستہ سے انھوں نے کرتا اتار کر ہوا میں اچھال دیا اور اپنے برہنہ بازوؤں کو سہلاتے رہے پھر...... شمن کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بجلی کی سی تیزی سے وہ مڑے اور ان کا کسرتی جسم تھرتھرانے لہرانے لگا

جیسے کوئی سنگین بُت یکایک انگڑائی لے کر جاگ اٹھا ہو۔ وہی بدن جو کچھ دیر پہلے تودے لوتھڑا معلوم ہو رہا تھا کھنچے ہوئے ستار کی طرح بج اٹھا۔ سڈول قیضوں کی بے پناہ جنبش، پنڈلیوں کا مضبوط خم اور چوڑے چکلے سینے کا جلال...... معلوم ہوتا تھا سُر باجے سے نہیں بلکہ اُن اعضا کی لوچ دار جنبش سے نکل رہے ہیں۔ انگلیوں کی حرکت پیر کا دھما کا اور مچھلیوں کی ہر لرزش نغمہ بن کر پھیل گئی۔ پشت پر روشن لیمپ چاندی جیسے گھنے اور خم دار بالوں کو ترشے ہوئے ہیروں کی طرح منور کر رہا تھا۔ ایک دم جیسے طوفان کی دوڑ تیز ہو گئی۔ ساز دوگن میں بجانے لگے۔ قہر و غضب کا پُر جلال دیوتا پُر اسرار دُنیا سے نکل کر غیض و غضب کے کوڑے برسانے لگا۔ دھوم گرج کے ساتھ کائنات کو ہلا کر رکھ دیا۔ رائے صاحب ایک ہیبت ناک پہاڑ معلوم ہو رہے تھے اُن کی سفید دھوتی سمندر جھاگوں کی طرح قدموں میں لہریں لے رہی تھی۔ اُن کے نقرئی بال بالکل ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے پہاڑ کے پیچھے سے سورج طلوع ہو رہا ہو۔

ساز رک گئے .... ناچ ختم ہو گیا مگر شمن کا دماغ ناچتا رہا اور جب مذاق میں رائے صاحب نے زور سے ہو کر کے اس کے آگے تالی بجائی تو بے ساختہ ان کی گھگی سی بندھ گئی اور اگر سب نہ ہنس پڑتے تو وہ بالکل ہی بدحواس ہو جاتی۔ وہ حیران سب کی صورتیں دیکھنے لگی اور پھر خود بھی قہقہے مار کر ہنس پڑی۔

"ڈرپوک چوہیا!" رائے صاحب نے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھکول ڈالا اور اس کے پاس بیٹھ گئے۔

"بول سیکھے گی تو بھی؟"

شمن نے دانت نکال کر سر ہلا دیا۔

"ہُنہ! بڑی آئی سیکھنے والی" پریا ذرا اس چھوکری کو دیکھنا۔ کہتی ہے ناچ سیکھے گی ارے بھئی لاتا تو ڈگڈگی .... میں ذرا اس کو ناچ سکھا دوں؟"

"میں کوئی بندیا ہوں .... واہ!"

"ادھوا بندیا نہیں تو پھر کیا بھالو ہے؟ .... اچھا مٹھائی لا اور شاگرد بن جا"

"پہلے آپ کھائیے تو پھر مٹھائی کھلاؤں گی۔"

"واہ بھئی۔ خوب رہی۔ پہلے فیس دو بھی تو ناچ سکھائیں کرو ویسے ہی بس دو مہینے میں تیتری کی طرح ناچنے لگے گی۔"

"واہ میں تو آپ کی طرح...... آپ

دشمن" رائے صاحب نے میری تو مٹھائی ہضم کرلی اور کچھ نہ سکھایا" پریا بولی۔

"ارے شش۔ خاموش......... ہاں کیا نام ہے لڑکی تیرا...... جمن؟

اچھا مٹھائی جانے دے بس تو اب کے چھٹی میں آکر ہمارے کرنے میں ٹن ٹنا ٹک دے ا: زہم تجھے ناچ سکھا دیں گے سمجھی؟"

"ٹن؟"

"ہاں ٹن" سب کرتوں کے ٹن ٹوٹ گئے ہیں یہ جو پریا ہے نا ایک دم ردی تھی بس شوخی کرنا جانتی ہے" پریا اس تعریف پر اترا اٹھی اور رائے صاحب کی گود میں لد گئی۔

ٹن ٹنا ٹک کرناچ سیکھنے کا پکا وعدہ کرکے وہ پریا کے ساتھ ہی ہوسٹل لوٹ آئی راستے بھر وہ رائے صاحب کی باتیں دہرا کر ہنستی رہی جسم کو پلنگ پر ڈال کر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ میلوں کی دوڑ لگا کر آئی ہے۔ ناچ کے تاثر میں اب تک اس کی روح چھنی ہوئی پیچ درپیچ گھوم رہی تھی نجانے کیوں آج اس کا دل کسی مقناطیسی طاقت کے آگے ماتھا ٹیک دینے کو چاہتا تھا۔ آج اس کے دل میں عبودیت نوخیز کلی کی طرح کھل رہی تھی۔

"رائے صاحب کا نام کیا ہے؟" اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں پریا سے پوچھا

"ارے پگلی! میرے پتا جی ہیں رائے صاحب!" پریا ہنسنے لگی۔

"مگر...... مگر پریا!" وہ پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیوں؟" اس نے کروٹ لے کر پوچھا۔

"کچھ نہیں پریا" وہ خاموش ہوگئی۔

"ہم اُنھیں رائے صاحب کہتے ہیں، اُنھیں سب ہی رائے صاحب کہتے ہیں۔ بڑے اچھے ہیں، میرے اوپر جان چھڑکتے ہیں۔"

"دشمن چڑ گئی۔ اس کا جی چاہا پریا کو ڈانٹے کہ وہ کیوں اُن سے جان چھڑکواتی ہے مگر پھر یہ بات اُسے انتہائی بے تکی معلوم ہوئی۔ وہ خاموش تکیہ اپنے سینے سے چمٹائے آگے پیچھے جھولتی رہی۔ لوہے کے پلنگ کے زنگیلے ہوئے تاروں سے اکھڑا اکھڑا نغمہ نکل کر اُسے سوچنے میں مدد دینے لگا۔

۲۲

شام کو لڑکیاں اُونچے اُونچے سیاہ بلومرز پہن کر کالج کے میدان میں آزادانہ چھلانگیں لگاتیں، مالی، بیرے اور چوکیدار برہنہ رانوں اور سڈول پنڈلیوں کو گھور گھور کر آنکھیں سینکتے، چھوٹا بھتر بھی شام کو اسی وقت برآمدے جھاڑتا۔ میٹرن کو اس بھتر سے خاص عناد تھا، وہ ان کے ہاسٹل میں صفائی کرتا تھا اور بقول اُن کے نہایت ہی بدمعاش اور بدنگاہ تھا۔ زیادہ تر وہ اُسے ڈانٹتی ہی نظر آتیں، جب دیکھو جب ہوسٹل کے سنسان کونوں میں اُسے گھیرے ایک آدھ تار مکڑی کے جالے کا دو چار آوارہ تنکے دکھا دکھا ڈانٹ رہی ہیں، مگر وہ بھی بلا کا ضدی تھا، سر جھکائے اپنے سفید دانت چمکایا کرتا۔ وہ اُن جھلا جھلا کر چڑھی بیٹھتی تھیں، مگر وہ انہیں کوئی ہوئی جھاڑو سے بھی زیادہ ناکارہ سمجھتا۔ اس کی جھاڑو کے سپاٹوں سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ کبھی کا اپنی دانست میں کوڑے کے ساتھ جھاڑ چکا ہے، پر اُن کا ڈھیٹ پن تھا کہ پھر بھی ٹوٹی پڑی تھیں، نہ معلوم اُسے دیکھ کر انہیں کیا ہو جاتا تھا جب وہ لڑکیوں کو گھورتا تو وہ بلبلا اٹھتیں اپنی چھوٹی سی مونڈھیا پر بیٹھ کر تاسف سے سر ہلاتیں۔ انہیں تعجب تھا کہ ذہین لڑکیاں اُن غنڈوں کی آنکھیں اپنی رانوں پر رینگتی ہوئی بھی نہیں محسوس کرتیں۔ وہ خود اپنا پھنسا ہوا فراک ذرا ڈھلتے ہوئے کولھے جو مونڈھیا کے چاروں طرف پہاڑ کی چٹانوں کی طرح جھولتے رہتے سمیٹنے میں مشغول رہتیں۔ نہ جانے اتنی نحیف و نزار مونڈھیا اُن کا وزن کس طرح برداشت کر رہی تھی۔ وہ اس ظالمانہ انداز سے اس پر پہلو بدلتیں گویا وہ چھوٹے ٹٹو پر سوار اُسے دلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان کا بس نہیں تھا ورنہ وہ اس کی ہڈیاں چیر کر پھاڑ دبا ڈالتیں یا اس کے خون سے فرش دھلوا ڈالتیں وہ اس کی بدمعاشی کو ہندوستان کی مذہبی تنگ نگاہی پر محمول کرتیں، اُن کا خیال تھا کہ اگر وہ عیسائی ہو جائے تو یقیناً اس کی سیاہ روح پاک ہو جائے۔

بڑے راز داری کے انداز سے وہ لڑکیوں سے اُن کے چال چلن کے بارے میں گھما پھرا کر سوال کرتیں۔ وہ انھیں چھپ کر جھانکتا تو نہیں؟ کمرہ صاف کرتے میں کوئی فحش اشارے تو نہیں کرتا؟ اس کی مسکراہٹ بڑی لرزہ خیز تھی۔ ایک مہتر تھا مینی تال میں جہاں وہ پہلے پہل نوکر ہوئی تھیں وہ اکیلے دوکیلے لڑکیوں کو پکڑ کر چوم لیا کرتا تھا۔ ایک اور بھنگی وہ جبل پور مشن اسکول میں انھیں نہاتے میں چھپ کر دیکھا کرتا تھا۔ یہ بھنگی لوگ ہم لوگ کو بڑا حیران کرتے ان کا عزت بھی بہت خراب کرتے ہیں۔ یہ قصے سُناتے وقت اُن کی دھنسی ہوئی بے رونق آنکھیں کسی گذشتہ زمانے کے خوانِ نعمت کی یاد میں بھوکی بھوکی ہو جاتیں، اور ہونٹوں پر شدت سے پسینہ پھوٹ نکلتا۔ یہ بے چاری سفید دیوداسیاں بجائے وجیہہ قباؤں والے کاہنوں کے اُن کالے بھنگیوں کے ہتھے چڑھ رہی تھیں۔ اُن کی سیاہ روحوں کو خدا باپ کے قدموں تک گھسیٹ لے جانے میں وہ خود غلاظت کی دلدل میں دھنسی جاتیں۔ ان میموں کی یہ گت دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے، ایک فاتح قوم ہندوستان کی جھلسا دینے والی ہوا اور ہندوستانیوں کی پاگل کر دینے والی تاریک ذہنیت کے آگے بالکل ہاری ہوئی اور پرشکستہ نظر آنے لگتی۔ وہ گلاب کو شرما دینے والی رنگتیں ابل میں ڈوبے ہوئے پرانے چمڑے کی طرح سوکھ جاتیں، وہ آسمان کی نیلاہٹ سے زیادہ شفاف آنکھیں سوکھے تالاب میں پیاسے مینڈکوں کی طرح اُبل آتیں، بال اور پلکیں خزاں رسیدہ پتوں کی طرح غائب، جگہ بہ جگہ گوشت کے ابھار، تنگ جوتوں میں سے ٹخنوں پر کے گوشت کے جھولتے ہوئے لوتھڑے، یہ تھیں وہ چیزیں جو باقی رہ جاتیں۔ میٹرن جب ہندوستان آئی تھیں تو جنگِ عظیم کی لو سے جھلسی ہوئی مگر نوخیز کلی تھیں اور اب گوبھی کی پالا ماری گانٹھ کی طرح بکھری جاتی تھیں۔

بھنگی سے اُن کی ایسی لاگ ڈانٹ بڑھی کہ ایک دن وہ چھری لے کر اُس پر پل پڑیں۔ اُسے مار کر وہ پسینے میں شرابور روتی ہوئی کرسی پر گر گئیں۔ لڑکیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ پرلطف چہرے بنا کر سب ہمدردی کا اظہار کرتی رہیں لیکن کسی کو بھی اتنی توفیق

نہ ہوتی کہ اُن کے ہاتھ پیر پھیلاتی تاکہ اُن کا جی ٹھکانے ہوتا۔ دوسرے ہوسٹل کی میٹرن کو خبر ہوئی اور وہ دوڑی ہوئی آئیں، لڑکیوں کو بھگایا اور اُن کے جسم کو جو رڑکے فیتوں اور ڈوریوں سے مصنوعی گڑیا کی طرح جکڑا ہوا تھا ذرا ڈھیلا کیا تو ہوش ٹھکانے ہوئے۔ علم نفسیات کی لڑکیاں آپس میں سرگوشیاں کر کے قہقہے لگانے لگیں۔ بات پرنسپل تک پہنچی اور چھوٹے ہنٹر کو میٹرنی ہون ہوسٹل میں بھیج دیا گیا۔

بے چاری معاملات کی اس الٹ پھیر کے لیے بالکل تیار نہ تھیں اور نہایت بُردباری سے سر ہلا کر کہتیں کہ پرنسپل کو اپنے اس فیصلے پر پچھتانا پڑے گا اُن کے دباؤ سے نِکل کر بھنگی ساری لڑکیوں کو خراب نہ کر دے تو بات نہیں!

چھوٹے بھنگی کے بجائے بوڑھا ہنٹر جو بانی کالج کے زمانے سے کام کر رہا تھا ملحقہ محل میں صفائی کرنے لگا۔ اُسے سب جمعدار کہتے تھے۔ ڈاکوؤں جیسی صورت۔ سیاہ جھاڑو جیسی رنگت، شب بیداری اور بھنگ کی وجہ سے سرخ انگارہ آنکھیں، آواز ایسی جیسے گہری سی باؤلی میں کوئی بھوت گڑگڑا رہا ہو۔ نہایت صاف اور مقطع وردی، رعب دار چال۔ میٹرن جو کوئی بھی حکم دیتیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا "جانتے ہیں!" بیچاری ہیبت زدہ ہو کر رہ جاتیں۔ لڑکیوں سے دبی سی آواز میں اپنی بے عزتی کا گلہ کرتیں، جو زیادہ جی بھر آتا تو سارا غصہ انہیں پر اتار دیتیں۔ کیلے کے چھلکے بے جگہ کیوں پھینکے؟ ردّی کاغذ جمع کر کے بڑی کھوج لگاتیں کہ اس پر کس لڑکی نے لکھا ہے، معلوم کر لینے کے بعد وہ سارے پرزے ایک کڑی تنبیہ کے ساتھ نوٹس بورڈ پر لٹکا دیتیں۔ لڑکیاں نوچ ناچ کر پھینک دیتیں۔ ایک دفعہ پرنسپل نے جو دنیا بھر کی ردّی بورڈ پر چپکی دیکھی تو غریب کو الٹی ڈانٹ بتائی۔

دنیا میں اُن کی صرف ایک دوست تھیں مس جوزف۔ چھ فٹ سے بھی کچھ نکلتا ہوا قد، سپاٹ سینہ، اور مردوں جیسے کٹے ہوئے بال! شیو کرتی تھیں جو اُن کی لاابالی عادتوں کی وجہ سے دو دو دن نہ ہوتا۔ یہ ورزش اور کھیلوں کی تعلیم دیتی تھیں، نیک بخت اس زور سے گیند میں بٹ لگاتی تھیں کہ جی لرز اٹھتا۔ نئی نئی لڑکیاں تو اُن کے

سامنے ٹانگیں کھلے جمپر پہنتے شرماتیں۔ آواز پھٹی ہوئی جیسی پندرہ سولہ برس کے لڑکے کی ہوتی ہے۔ میٹرن اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو "ڈارلنگ" کہتی تھیں اور جب کوئی سویٹر یا اُن کا اور کوئی کپڑا بُن لیتیں تو جان جان کر لڑکیوں کو دکھاتیں۔ ذکر کرتے میں وہ ہمیشہ "ڈیئر مس جونسن" ہی کہتیں" اور ان ڈیئر مس جونسن سے لڑکیوں کو بڑی نفرت تھا اوّل تو وہ سوائے ورزش کے احکامات کے بہت کم بولتیں۔ شمن کو تو اُن سے بات کرتے موت آتی، گڑ گڑ کرتی بھاری امریکن لہجے والی انگریزی زبان کا ایک لفظ بھی پلے نہ پڑتا ورزش کرنے میں ذرا کسی نے غلطی کی اور دیوی نے جھپٹ کر لگایا ایک مُکّا!

ایک دن کھیل کی نئی یونیفارم کے لیے مس جونسن لڑکیوں کی ناپ لے رہی تھیں شمن کو سخت گھبراہٹ معلوم ہوئی۔ ایک ایک لڑکی اندر جاتی اور ناپ دے کر واپس لوٹ آتی۔ شمن کی جب باری آئی تو وہ ہچکچاتی ہوئی دفتر میں داخل ہوئی۔ مس جونسن ناپنے کا فیتہ لیے ایک کاپی پر جھکی کچھ لکھ رہی تھیں شمن کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ "گڑ گڑ"، نہ جانے انھوں نے کیا حکم دیا، مگر وہ کچھ گھبرا کر دوپٹے کا پلّو چباتی رہی "گڑ ڑ ..... گڑ ڑ!" وہ پھر کچھ بڑبڑائیں۔ شمن نے دو قدم اٹھائے۔ آگے نہ پیچھے! اب کے جو انھوں نے ڈانٹ کر ذرا صاف زبان میں قریب آنے کا حکم دیا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"یہ کیا واہیات ہے؟" وہ گرجیں

شمن کھسیانی زبردستی کی مسکراہٹ جمائے آگے بڑھی۔ فیتہ لے کر انھوں نے ناپ لینا شروع کیا۔

"ہاتھ اوپر کرو!" شمن کچھ نہ سمجھی۔

"اُدھر نہیں بے وقوف ہاتھ اوپر" شمن نے بغلیں بھینچ لیں۔

مس جونسن نے ایک جھنجھوڑی دے کر اُسے سیدھا کھڑا کیا، اور دو جھٹکے کندھوں میں جمائے۔ شمن ڈری ہوئی بکری کی طرح روتی ہوئی فرش پر گڑی کھڑی ہوگئی "سیدھی کھڑی ہو" مس جونسن کہتی رہیں اور وہ اسی طرح کھڑی رہی، ناک سے

رونے کی آوازیں نکالتی ہوئی بھاگ کر دروازے سے جا ٹکرائی۔

"ارے!....... سلی گرل!" مس جونسن کا دو دن کا موندا ہوا بالائی ہونٹ مسکراہٹ سے پھڑ پھڑایا۔ مگر شمن سیدھی اپنے کمرے میں آکر پلنگ پر گر پڑی اور دیر تک گھٹنے کے ہنہنانے جیسی دبی آوازیں نکال کر روتی رہی۔

اس دن سے اسے مس جونسن سے ایسی شرم آئی کہ وہ برابر وہ نیلی چھٹی جو بیمار لڑکیاں مس جونسن کے لیٹر بکس میں ورزش سے معافی مانگنے کے لیے ڈالتی تھیں دبے پیر جا کر ڈال آتی۔ ان نیلی چھٹیوں کی تعداد اتنی بڑھی کہ وہ اس کی ہیلتھ رپورٹ کے ساتھ چپکا کر ہوسٹل کی لیڈی ڈاکٹر کے پاس بھیجی گئیں اور پھر ایک دن بورڈ پر اس کا نام اُن لڑکیوں کی فہرست میں نظر آیا جو مسلسل خرابیٔ صحت کی وجہ سے ڈاکٹری معائنے کی محتاج تھیں۔

ہوسٹل کا یہ مختصر سپتال تعلیم گاہ سے ذرا دور ہٹ کر امرودوں اور نارنگیوں کے باغ میں واقع تھا۔ نہایت صاف ستھرے خوبصورت کمرے اور سامنے کھلا میدان عام طور پر لڑکیاں اتوار کو غل غپاڑے سے بچنے کے لیے رات کے کپڑے پہن کر اُن کمروں میں ذرا سا بیماری کا بہانہ کر کے جا لیٹتیں۔ یہ بھی مشہور تھا کہ کالج سے ملحق جو یونیورسٹی تھی وہاں کے لڑکے آتے جاتے اُن کمروں کی کھڑکیوں کی طرف تاکا کرتے تھے اور کئی تیسے بھی اُن کھڑکیوں سے وابستہ تھے۔ کئی لڑکیاں بدمعاش لڑکوں سے فرار ہونے سے پہلے اِن ہی کمروں میں بیماری کا بہانہ بنا کر رہی تھیں۔

اسپتال کی نرس ایک سیاہ فام حبشی نژاد امریکی نرس تھیں پھیلے ہوئے جسم کی ٹھنگنی سی عورت، نرسوں کے سفید براق لباس میں سنگ موسیٰ اور سنگ مرمر کا بنا ہوا مقبرہ معلوم ہوتیں۔ عام طور پر اُن کی گفتگو اُن فرار ہونے والی لڑکیوں کے متعلق ہوتی جو بھاگنے سے پہلے اُن کے زیر سایہ رہی تھیں۔ ہر لڑکی کو وہ اصول صحت سمجھاتے وقت جسم کی خوبصورتی قائم رکھنے کی اہمیت پر مدلل لیکچر دیا کرتیں "لوائز" کو گھیرنے کے تیر بہدف نسخے تو انہیں ازبر یاد تھے۔

پنڈلیوں کے بال فلاں پوڈر سے اڑاؤ تو موٹے نہیں نکلیں گے۔ کمر پر سے ساڑھی خوب کھینچ کر باندھو...... ایسے، وہ ساڑی کو بالکل تہبند کی طرح کس کر بتاتیں: "اتنا تنگ باڈی مت پہنا کرو، سارا جسم تنگ جائے گا۔ انگلش گرلز کو دیکھو" وہ انگلش گرلز کا ایسے ذکر کرتیں گویا انگریزوں نے یہ ساری مفتوحات ان منڈی ہوئی ٹانگوں اور چست باڈیوں کے ہی بل بوتے پر زیر کر رکھی ہیں۔ جسم سے بدبو دور کرنے کی اور مختلف پوشیدہ دواؤں کے نام مفت بتایا کرتی تھیں، مگر بجائے شکر گذار ہونے کے لڑکیاں الٹی چراغ پا ہو جاتیں۔

یہ نرس ہر وقت امریکہ یعنی اپنے دیس کی تعریفیں کیا کرتیں، اور بڑے بڑے معززین کا ایسے ذکر کرتیں جیسے وہ اُن کے سگے چچا ماموں تھے۔ عبادت کے لیے جب ساری لڑکیاں اور پروفیسر روز دوپہر کے کھانے سے قبل جمع ہوتیں تو وہ بھی امریکن استانیوں کے بیچ میں کالے تل کی طرح ملاحت سے چمکا کرتیں۔ اُن کی آنکھیں سفید چمڑی کی قربت کے غرور سے اور بھی گہرائیوں میں جا کر چمکنے لگتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ سب کو اس معجزے سے متاثر کرنا چاہتی ہیں، کہ دیکھو ہم سفیدی کے کتنے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ سفید میمیں بھی اپنے ہر انداز سے یہی کہتی معلوم ہوتیں کہ لوگو دیکھو تم ہمیں اور عیش کرو، ہم کتنے ملنسار کریکٹر ہیں یا کو ملہم ہر ایک کو پاس بٹھا لیتے ہیں۔ یہ دیکھو ہم اس الٹے توے کے ساتھ کس خندہ پیشانی سے بیٹھے مسکرا رہے ہیں اور تم ہمیں تنک چڑھا اور مغرور کہتے ہو؟ نہ جانے یہ سفید قومیں سیاہ انسانوں کو انسان سمجھ کر اس کا احسان کس پر جتانا چاہتی ہیں اور کس دھوم سے اس کا ڈھنڈورہ پیٹتی ہیں۔ انگلش چرچ جدا ہے اور وہاں کتوں اور اُن کے ساتھ ہندوستانیوں کے جانے کی اجازت نہیں، مگر مہینے میں ایک دفعہ باری باری سے سفید استانیاں کالے چرچ میں عبادت کر کے اُسے مقدس بنانے ضرور چلی جاتیں۔ ہندوستانی لڑکیاں مارے غرور اور احسان کے بوجھ کے گردنیں اکڑا اکڑا عبادت گاہ میں داخل ہوتیں۔

شمن کی ایک عیسائی دوست ایلما تھی۔ بڑی منہ پھٹ اور زباں دراز،

جنوبی ہند کی مخصوص چاکلیٹی رنگت بھورا سے سیاہ بال اور سادھوؤں کی سی سرخ ڈوروں سے کھنچی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں اودے رنگ کے پکے "جامن جیسے پھیلے ہوئے ہونٹ اور رستا ہوا چہرہ اس کے گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور دانت غیر معمولی نیلاہٹ مائل سفید تھے، جب وہ زور سے قہقہہ لگاتی تو بہت سے دانت چمک اٹھتے جو بڑے دھاردار اور زہریلے معلوم ہوتے۔ لڑکیاں اس کے متعلق عجیب عجیب باتیں کیا کرتیں گو وہ عیسائی تھی، لیکن گرجے بہت کم جاتی، اور اگر جاتی بھی تو صرف لڑکیوں کے ساتھ مل کر حمد گانے۔ اس کی آواز بہت رسیلی تھی، اور گانے کا بہت شوق تھا غسل کرتے وقت وہ پوری آواز سے اوٹ پٹانگ گیت گایا کرتی، اس کے کمرے میں پہلے یسوع کے کرشن کی تصویر لگی تھی جس کے آگے وہ سونے سے پہلے گھٹنے ٹیک کر بائبل کی آیتیں پڑھ کر سینے پر صلیب کا نشان بنایا کرتی تھی، وہ کہتی تھی "مجھے سفید رنگت سے گھن آتی ہے، اور صلیب پر لٹکے ہوئے مسیح پر رحم آتا ہے اور رحم کے ساتھ عقیدت کا جذبہ بجائے عبودیت کے دل میں بغاوت کی آرزو پیدا کر دیتا ہے، دوسری طرف ہنستے کھیلتے بنسری بجاتے کنہیا جی کو دیکھ کر دل ناچ اٹھتا ہے۔"

پھر ایک دم سے نہ جانے کیا ہوا کرشن کی تصویر تو نکال کر پھینک دی اور اس کی جگہ ایک تصویر لگا دی جس میں ایک بندر پیڑ پر بیٹھا کیلا کھا رہا تھا، دوسرا بندر نیچے سے ایک لکڑی اس کی پیٹھ میں چبھو رہا تھا اور پہلے بندر کا آدھا کھایا ہوا کیلا زمین پر گر رہا تھا جس پر نیچے والا بندر مسکرا رہا تھا جب لڑکیوں نے اس سے اس تبدیلی کی وجہ پوچھی تو وہ اپنے مخصوص قہقہے لگا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتی۔

"کرشن جی کی بنسری کو کیڑا لگ گیا تھا، اس میں سے مینڈک ٹرٹرا رہا تھا" وہ ہانکتی، "مکھن کا بڑا شوقین تھا نا، معلوم ہوتا ہے تھوڑا سا مکھن بنسری میں لگا رہ گیا سو دیمک چاٹ گئی۔"

اور پھر وہ منہ چڑا کر کہتی:

"انہیں سوائے عورتوں سے مذاق کرنے کے اور کام ہی کیا تھا، سنا ہے۔ بیاہ ہی

عورتیں زیادہ پسند تھیں؟

اس پر لڑکیوں نے اس کی بری گت بنائی۔ پرنسپل سے شکایت کر دی۔ یہی نہیں وہ کئی بار شمن سے الجھ پڑی۔

" یہ سب پیغمبر عورتوں پر کیوں فدا تھے ــــــ یوں تو ہنری ہشتم بھی پیغمبر تھا ....."

مگر شمن غصے سے بے قابو ہو گئی اور آنسو نکل آئے۔ ایلما نے خاموشی سے معافی مانگ لی۔

تین چار دن بعد بندروں کی تصویر میں تغیر ہوا۔ پیڑ پر بیٹھا ہوا بندر جان بل بن گیا اور نیچے والے نے دھوتی پہن لی اور ہاتھ سے چھوٹ کر گرتا ہوا کیلا ہندوستان کا نقشہ بن گیا۔

ایلما کو ڈرائنگ بہت بری آتی تھی، مگر وہ اس بھدی تصویر میں نت نئی گلکاریاں دکھاتی اور اپنے نیلگوں دھاردار دانت کھول کر لمبے لمبے قہقہے لگاتی۔

اس کی بیہودہ گوئی اس قدر بڑھی کہ ایک دن لڑکیوں نے سختی سے پرنسپل سے شکایت کر دی۔ دیر تک وہ اس سے بحث کرتی رہی جب دفتر سے نکلی تو بہت خاموش تھی اور منہ اترا ہوا تھا۔ شمن کو اس کی باتیں بری معلوم ہوتی تھیں، مگر اسے اداس دیکھ کر اس کا جی کڑھ گیا۔ اس نے بتایا کہ پرنسپل نے کہا ہے کہ اگر آئندہ اس کے متعلق شکایت سنی گئی تو رسٹی کیٹ کر دیا جائے گا، اور وہ باقاعدہ عبادات میں شریک نہ ہوئی تو ہوسٹل سے نکال دی جائے گی۔ گو شمن کو اس کی باتوں سے ڈر معلوم ہوتا تھا پھر بھی وہ اسے سمجھاتی رہی۔ دسمبر کی چھٹیوں کے بعد ایلما نے کالج چھوڑ دیا اور یونیورسٹی چلی گئی۔ وہیں کیلاش ہوسٹل جو یونیورسٹی میں لڑکیوں کے لیے خاص طور پر کھولا گیا تھا چلی گئی۔ مگر اکثر وہ شمن کے پاس آیا کرتی۔

شمن کو اس نے کچھ خشک سی کتابیں بھی پڑھنے کو دیں۔ مگر ان میں اس کا ظاہری جی نہ لگا۔ ایلما یونیورسٹی میں جا کر چمک اٹھی۔ کلاس میں اول رہنے کے علاوہ اسے یونین کا پریذیڈنٹ بھی بنا دیا گیا، جہاں وہ ہنگامہ خیز تقریروں سے لڑکوں اور پروفیسروں پر چھا گئی۔

۲۳

اسکول اور کالج میں کتنا لمبا چوڑا فرق ہے کہاں ایک مسلم درس گاہ اور کہاں امریکن مشن کالج، کہاں تو یہ حال کہ اگر کوئی لڑکی کھیل کھیل میں سیاہ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہن کر آجائے تو لڑکیوں کو دورے پڑ جائیں اور تہلکہ مچ جائے، چرمیگوئیاں ہوتے پھریں۔ اور کہاں کہ کالج میں دوسری ٹرم شروع ہوتے ہی نئی لڑکیوں کو یونیورسٹی کے لڑکوں سے مہذب طریقے پر ملایا جاتا اور اس مقصد کے لیے ایک باقاعدہ دعوت ہوتی پرنسپل اور استانیاں اور پروفیسر خود ہر ایک لڑکی کو ایک لڑکے سے ملوائیں تھوڑی دیر ساتھ رہتیں اور پھر اُن کو بے تکلف باتیں کرنے کے لیے چھوڑ جاتیں، اس جلسے کی بڑی زور دار تیاریاں ہوتیں، چائے پانی کے علاوہ ڈرامے اور ناچ گانے کا بھی ایک پروگرام تیار کیا جاتا، لڑکیاں بھی کپڑوں لتوں کا انتظام کرتیں خوب شاندار جوڑے تیار کیے جاتے۔

نئی لڑکیاں تو جلسے کی دہشت سے ہی بے حال ہو جاتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی سخت عیب کی بات ہونے والی ہے، بہت سی تو اپنے گھروں پر اس کا ذکر ہی نہ کرتیں بلکہ چھپے چوری ہی گناہ کر لیتیں۔ پرانی لڑکیاں ان کا مذاق اڑاتیں۔

"سنو شمیم تمہیں اپنے ساتھی کا پیار لینا ہوگا" پریما نے شرارت سے کہا۔

"ہائے! شمیم کو پسینہ آگیا۔

"اور کیا پیار تو لینا ہی ہوتا ہے اور پھر دوسرے دن پرنسپل کو ایک پرچے پر لکھ کر دینا ہوتا ہے کہ تم نے اتنے لوگوں کا پیار لیا" اوروں نے تائید کی۔

"ہاں اور پھر جس نے سب سے زیادہ پیار لیے ہوں اس کو انعام ملتا ہے"

"اور .... اور جو نہ لے تو؟"

"جو نہ لے تو اس کو جرمانہ، اور سالانہ رپورٹ پر لکھ دیا جاتا ہے، کہ یہ لڑکی بالکل

کمزور ہے..... خراب!"

مارے پریشانی کے شمن کی نیند اڑ گئی، جو ابا میاں کے پاس سالانہ رپورٹ پہونچی اور انہوں نے دیکھا تو بس خیر نہیں۔ نہ جانے کن مصیبتوں اور سفارشوں سے تو بھیجا تھا۔ وہ تو یہی کہتے تھے کہ ای کالج کی کلاسیں کھلنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ دوسرے محیط بھیا جب سے انگلینڈ سے آئے تھے تعلیم نسواں کے حد سے زیادہ خلاف ہو گئے تھے، یہ الٹی ہی بات تھی، حمید بھائی نے انگلینڈ سے آکر بوڑھی نانی تک کا پردہ ترڑوا دیا، بیچاری ہزار برڑبڑائیں سیکھوں کی آہ لیتیں مگر بھنگی بھشتی، باورچی، سب ہی گھر میں آتے، جوان جوان بہوئیں مزے سے لیٹی بچوں کو دودھ پلایا کرتیں خالہ اماں بیٹھی خوب آرام سے جھوایا کرتیں۔ اور بیگم اماں نہایت بے تکلفی سے لیٹی چودہ پندرہ برس کی میراسے ٹانگیں دبوائیں۔ بوڑھی نانی لرزتیں اور شرمائیں بھشتی بھنگی پہلے لنگی سر پر ڈال کر آتے تھے اب یہ خود بیچاری گھونگھٹ کاڑھ لیتی ہیں۔

"نانی اماں اتنی بوڑھی ہو گئیں مگر مردوں سے شرمانا نہ چھوڑا....." حمید بھائی چڑاتے اور نانی غریب منہ بسورت دیکھتیں۔

مگر محیط بھیا نہ جانے کن متعفن موریوں کی غلاظت میں ہو کھیل کر آئے تھے۔ کہ اور زیادہ پردے کے حامی ہو گئے تھے، خاندان کی سب سے بے وقوف اور بیگم لڑکی سے شادی ٹھے کی اور شمن کی تعلیم کے خلاف جہاد قائم کر دیا۔

بکرے کی ماں کب تک خیر منائی جلسے کا دن بھی آہی گیا شمن کو تو بخار سا چڑھ آیا۔ رات بھر اسے عجیب عجیب داہیے خواب بن بن کر ستاتے رہتے کبھی کالج کے غنڈے اسے چیختے چلاتے اپنے پیچھے دوڑتے دکھائی دیتے۔ کبھی دیکھتی وہ شیشے جیسے چکنے پہاڑ پر الٹی پھسل رہی ہے اور اس کے کپڑے تار تار ہو گئے ہیں ہتھیلیاں چھل گئی ہیں کبھی دیکھتی میٹرن چھوٹے ٹکنگی کی پیٹھ پر سوار اسے جھاڑو سے ہانک رہی ہے، وہ غسل خانے میں نہا رہی ہے کہ حبشی نژاد نرس نے چوپٹ دروازے کھول دیئے وہ چیخ مار کر گری گڑی مڑی ہو گئی....... جب اس کے حواس درست ہوئے تو

پریا اُس کے مُنہ پر سے چادر اتار رہی ہے۔

"کیا ہوا؟ کیا کوئی برا سپنا دیکھا تو نے؟"

"ہاں!" وہ گھبرا کر آنکھیں مَلنے لگی۔

"پگلی کہیں کی! ایسے زور سے چیخی کہ میں ڈر ہی تو گئی۔ اُٹھ نا، چائے کی گھنٹی بھی ہوگئی۔"

سارے دن کسی کام میں جی نہ لگا۔ عام طور پر لڑکیاں بالکل بے فکر سی نظر آرہی تھیں، غور سے وہ ہر لڑکی کو گھور کر اس کے دل کا حال معلوم کرنا چاہتی مگر کچھ بھی تو ظاہر نہ ہوتا ان کے چہروں سے یا تو وہ واقعی بڑی بہادر تھیں یا اس کی طرح بن رہی تھیں۔

شام کو ہر کمرے میں کپڑے بدلے جانے کی ادھم شروع ہوگئی، سوئی دھاگا بٹن سے لے کر ساڑھیاں بلاؤز اور بُندے وغیرہ ایک دوسرے سے مستعار مانگے جانے لگے۔ شمن نے اپنی لٹھے کی شلوار اور چُنا ہوا دوپٹہ نکالا۔ آج اُسے دوپٹہ سمیت ناکافی معلوم ہو رہا تھا وہ اس باریک جِنٹ کو کھول ہی رہی تھی جو اس نے انگلیوں میں چھالے ڈال کر بڑی کاوشوں سے بنائی تھی کہ پریا آگئی۔

"ارے پگلی، شلوار قمیص پہن کر جائے گی، وہ ڈانٹ بتائیں گی پرنسپل کہ یاد کرے گی"

"کیوں؟"

"کیوں کیسی؟ معلوم نہیں کہ ساڑھی پہننی چاہیئے کالج کی لڑکیوں کو"

"مگر میرے پاس تو اس وقت بس وہی چار خانے والی ہے اور کچھ بھی نہیں۔"

"تمہارا تو بالکل ہی دماغ خراب ہو گیا ہے، بھلا اس جلسے میں سوتی ساڑھی چلے گی میرے پاس ہے ——— آؤ!" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لے گئی۔

شمن نے بہتیری کوشش کی، خوشامدیں کیں مگر پریا نے اسے کاسنی ریشم کی ساڑھی جس پر بھاری بنارسی فیتہ لگا تھا اور بروکیڈ کا بلاؤز پہنا دیا۔ وہ تو ہلکا سا پاؤڈر ہی لگا رہی تھی اور بس، مگر پریا نے سانی اور روج جیسی سرخی اور کاجل لگا کر پھر بھر بھر ہاتھ چوڑیاں اور جھمکے جن پر ملمع کیا ہوا تھا مگر اصلی معلوم ہوتے تھے اس نے خود ہی

پہن لیے۔ نہایت نُوک ایڑھی کا جوتا پہن کر چلنا اُسے بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے وہ پُل صراط پر چل رہی ہے۔ جوتا ذرا اینچہ دیتا تھا مگر وہ سہہ گئی۔ آج اُس نے پریما کی ضد میں قم قم کی بندی بھی لگائی۔

جلسے کا شور شروع ہو گیا، جسے دیکھو لے طرح سج رہا تھا، مس جونس تک نے آج اپنی مردانہ وضع کی فراک پر پھولوں کا پھندا لگا کر کچھ نسوانیت سی پیدا کر لی تھی۔ تھوڑا بہت زنانہ پن جو اُن میں باقی رہ گیا تھا آج ابھر رہا تھا۔ میٹرن نے بھی آج تنگ فراک کو اور زیادہ تنگ بنا کر منڈھے ہوئے تھیں اُن کے جسم پر بندھی ہوئی ڈوریاں اور فیتے بستر بند کے تسموں کی طرح اُن کی فراک میں سے جھلک رہے تھے ایلا بھی مہمانوں میں آئی تھی، اپنی سادہ دھلی ساڑھی اور اونچے جوڑے میں وہ بالکل آورا کے غاروں کی دیوداسی معلوم ہو رہی تھی۔

شمن کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سارے مہمان اسی کو گھور رہے ہیں اور کوئی دم میں بھاری بنارسی فیتے کی ساڑھی اس کے جسم سے پھسل کر اُسے برہنہ چھوڑ جائے گی ساڑھی پہننے کی عادی نہ ہونے کی وجہ سے کبھی پلو کھینچتی کبھی پلیٹوں کو ٹٹولتی کہ کھل تو نہیں گئیں۔ پھر ایک دم آنچل بہت زیادہ لمبا لگنے لگتا تو چپکے سے اُسے سرکا کر اُڑس لیتی۔ ایک دم سے ایسا معلوم ہوا کہ قم قم کی بندی گولی کی طرح ماتھے میں اٹکی ہوئی تپ رہی ہے اور کوئی دم میں انار کے دانے کی طرح پھوٹ کر اس کے سارے چہرے پر بہ جائے گی۔ اور ساتھ ہی ساتھ ملمع کے جھلکے بوجھل ہو کر کان کی لوؤں کو کھینچنے لگے۔

اتنے میں پروفیسر اور پرنسپل بھی آگئیں، اور تعارف کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اندھا دھند لڑکیاں پکڑ پکڑ کر جوڑے لگانے شروع کر دیے، اور تھوڑی ہی دیر میں زیادہ تر لڑکیاں ایک ایک لڑکے کی ہمراہی میں نظر آنے لگیں۔ جب شمن اس عجیب و غریب تماشے کو خوب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ چکی تو اُسے اپنے سامنے بیٹھا ہوا پریشان حال لڑکا نظر آیا۔ شمن نے اُسے چونک کر دیکھا، اس کی حقارت بھری نظروں سے وہ اور بھی سمٹ سا گیا، اور بری طرح ہکلا کر اپنی ٹائی ٹٹولنے لگا، شاید وہ بھی آج

شمن کی طرح پہلی دفعہ سوٹ پہن کر آیا تھا۔

جب ذرا حواس درست ہوئے تو اُس نے نہایت گھبراتے ہوئے اور لڑکوں کی نقل میں چائے بنا کر کیک وغیرہ شمن کو پیش کرنے شروع کیے، انگریزی میں شمن شکریہ کہتی اور وہ جواب میں مستعدی سے "کوئی بات نہیں میڈم" کہتا لیکن بوکھلاہٹ میں کئی بار "میڈم" کے بجائے "سر" کہہ جاتا۔ اور پھر شرم سے نیلا ہو کر اس کے حلق میں پھندے پڑنے لگتے۔ اس کو اتنا گھبرایا ہوا دیکھ کر شمن کو ہنسی آ گئی وہ کافی بہادری سے انگریزی کے گھسے پٹے جملوں میں اس سے باقاعدہ باتیں کرنے لگی چھوٹی سی بات کو نہایت شستہ اور قواعد سے مرصع انگریزی میں، وہ دونوں باتیں کرنے لگے لیکن دو چار جملوں ہی میں گفتگو کا سارا مواد ختم ہو گیا۔ مجبوراً دونوں نے نہایت انہماک سے کھانا شروع کر دیا۔ اور باقی وقت میں چائے کی پیالیاں منہ سے چپکائے رہے کیونکہ چائے پینے میں بولنا ضروری نہ تھا۔ بیچ بیچ میں وہ نہایت حسرت سے اور لوگوں کو دیکھتے جو ایک دانہ بھی نہیں کھا رہے تھے اور برابر قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک دم شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے گندے نالے کی تشنج اُس کے حلق میں گھول دی، بڑی زور سے اُبکائی آئی مگر اس نے گلا بند کر کے بڑے سے گھونٹ سے لقمہ نگل لیا، گرم چائے نے سارے حلق اور سینے کو جھلسا دیا۔ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو چھوٹ نکلے، اس کا ساتھی بے رحم سی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا اس کی طرح وہ بھی شمن کا مچھلی کھانے کا عادی نہیں۔ اس مچھلی کو کھانے کے لیے مشق کی ضرورت ہے، ورنہ شوق برسوں میں مسلسل الٹیوں کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ مگر اس وقت وہ دونوں چڑیاں پنجرے کی تیلیوں کو حسرت سے تک رہی تھیں۔ اور زبان بند تھی

شمن نے دیکھا کہ ایلما اُسے بڑے غور سے دیکھ کر چپکے چپکے لپٹ بر...... کہہ رہی ہے...... پھر اس کا مخصوص قہقہہ سنائی دیا، اور دھاریں دانتوں کی قطاریں چمک اٹھیں۔ گھبرا کر دونوں نے چائے کی پیالیاں رکھ دیں اور ایک

دوسرے سے چھپا کر رومال ڈھونڈنے لگے۔
ایلما نے تاک کر ایک پکا سا انگور پھینکا شمن ایسی گھبرائی جیسے ڈوب ہی تو جائے گی اُن کے رس میں باوجود تن دہی سے تلاش کرنے کے رومال نہ ملا کر اُن کے بوکھلائے ہوئے میاں بھی نے جلدی سے رومال نکال کر اس کا گال پونچھ دیا۔ شمن کو معلوم ہوا جیسے قمقمے کی پھواری اُن کے سارے جسم پر بہہ گئی اور بے چارہ بھی کرنے کو تو اس قدر ہمت کا کام کر گیا۔ مگر پھر اس بُری طرح جھینپا کہ شمن کو ترس آ گیا۔ ایلما اور اس کا ساتھی بے حال ہو کر ہنسنے لگا، پھر وہ دونوں اپنی کرسیاں گھسیٹ کر اُن کی میز پر آ گئے۔

"ارے مسٹر تم تو بہت چل نکلے ہو...... واہ بھئی!" ایلما کے ساتھی نے اس زور سے بے چارے کی پیٹھ ٹھونکی کہ ہل کر رہ گیا۔
"شمن اپنے دوست سے ملاؤ نا" ایلما نے کہا۔
"یہ...... یہ......" وہ ہکلا کر بولی۔
"میاں؟ ایسی کھانے میں مشغول ہو کہ نام بھی نہ پوچھا۔
"جی..... نہیں تو" حمایت میں بولا۔
"ارے بھائی اتنی دیر سے برابر کھا رہے ہو اور......"
"جی ہاں......" وہ بھی ہکلایا، اس پر دونوں نے پھر قہقہوں کی بھرمار کر دی۔
"اور تم بڑے آوارہ ہوتے جاتے ہو...... بھئی"
"میں سچ کہتا ہوں...... آ معاف کیجیے گا" وہ جلدی سے شمن کی طرف مڑا۔
"میں نے تو یونہی پونچھ دیا تھا کہ آپ کا رومال نہ خراب ہو"
شکر ہے کہ ایلما اور اس کے ساتھی افتخار کے آ جانے سے وہ دم گھونٹنے والا طلسم جاتے ہی ٹوٹ تو گیا۔ افتخار نے دونوں کو چھیڑ چھیڑ کر بے تکلف

بنا دیا تھوڑی دیر میں ڈرامہ شروع ہو گیا۔ ایلما افتخار کو کہیں چھوڑ کر تمن لوگ اس کے ساتھی کے بیچ میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں جلسے کا لطف آ گیا۔ عجیب مزاج تھا۔ ایلما کا بھی، عشق بازی پر تل جاتی تو سب کو نیچا کر پھینک دیتی، اور ایک دم جی اکتا جاتا تو سب کو سوکھے پتوں کی طرح جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوتی"۔

ڈرامہ ختم ہوا اور جلسہ بھی بکھر گیا۔ لوگ جانے لگے۔ پریما اپنے بھائی نریندر کے ساتھ اسے ڈھونڈنے آ پہونچی۔ دوسرے دن چھٹی تھی۔ اور پریما اسے اپنے ساتھ دو دن کے لیے گھر لے جانا چاہتی تھی۔ دونوں کپڑے بدل کر جو رجسٹر میں دستخط کرنے گئیں تو میٹرن نے کہا پہلے پرنسپل سے لکھوا کر اجازت لاؤ۔ ایک ہندو لڑکی کے گھر جانے کے لیے عام دستور سے مختلف اور زیادہ سخت اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔

پرنسپل کے پاس سے پریما روٹھی صورت بنائے واپس آئی

"کہیں، اجازت ملی؟"

"نہیں ...... ڈانٹ ملی اور جرمانہ"

"اچھا ہوا، ہم پہلے ہی کہتے تھے، ٹھیک نہیں، بہت ڈھٹی کرتی ہو تم"، میٹرن خوش ہو کر بولیں۔

اور پرنسپل صاحبہ نے کہا ہے کہ کیونکہ یہ جرمانہ آپ کی کوششوں سے ہوا ہے، لہٰذا آپ کو ہی چاکلیٹ کھانے کے لیے دے دیا جائے۔ یہ کہہ کر اس نے ان کے سامنے اجازت کا پرچہ ڈال دیا جس میں نہایت شستہ سختی سے یاد دلایا گیا تھا کہ انھیں بے کار باتوں کے لیے پرنسپل کو حیران نہ کرنا چاہیے

اس کے بعد نہ پوچھیے کیا ہوا۔ میٹرن نے بے عزتی کی حد دیکھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ استعفا دینے کی دھمکی دینے لگیں،

جو وہ کبھی زد سے چکی تھیں۔

شمن اور پریتیا کپڑے بدل کر دوسرے دن پہننے کے لیے کپڑوں کی پوٹلیاں باندھ کر نریندر کے ساتھ موٹر کی اگلی سیٹ میں گھس گئیں۔ کچھ مہمان ابھی رخصت ہو رہے تھے زور شور سے شب بخیر کہا جا رہا تھا جب موٹر احاطے میں مڑ کر پھاٹک سے گذری تو شمن نے دیکھا اس کا جلسے والا ساتھی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ جیسے وہ جاتے جاتے رک گیا ہو!

"اوہ!" اس نے پہچان کر کہا۔

"کون تھا؟" پریما نے پوچھا۔

"کوئی نہیں، ایک...... ایک"

"لڑکا تھا؟ ہوں...... یہ بات ہے،" پریما نے زور سے اس کے چٹکی لی۔ اور نریندر نے ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔

شمن ایک عجیب شیریں جذبے کے ماتحت مسکرا اٹھی۔ کیرم کھیلتے میں نشانہ ٹھیک بیٹھے تو دل جھوم اٹھتا ہے۔ بالکل اسی طرح کوئی چیز دماغ میں سرد اور شیریں لہر کی طرح تیر گئی۔

راستے بھر پریما جمائیاں لے کر اونگھتی رہی اور نریندر نہ جانے غلطی سے یا قصداً اس کی ران کو کہنی سے پیتا رہا مگر وہ کہیں اور تھی، دور موٹر سے بہت آگے وہ اڑی چلی جا رہی تھی۔

۲۴

رات آرام سے گذری۔ دوسرے دن شمن کرسی پر بیٹھی رائے صاحب کے کرتوں میں بٹن ٹانکتی رہی اور وہ اس کے پیروں کے پاس قالین پر پھسکڑا مالے بیٹھے کہانیاں سناتے رہے اور سوئی میں تاگہ پرو کر بھی دیتے جاتے۔

"الٹا مت ٹانک دیجیو بٹن شمنا" وہ بڑی معصومیت سے بٹن کو الٹ پلٹ کر غور سے الٹا اور سیدھا دیکھتے۔

"یہ سیدھا" وہ بڑی ہچکچاہٹ سے کہتے، اور شمن ہنستی۔

پھر وہ اسے شہزادیوں بھٹیاریوں اور جادوگرنیوں کے قصے سنانے لگے۔ یہ کہانیاں شمن نے ہزاروں بار سنی تھیں مگر رائے صاحب ان میں دل سے باتیں جوڑتے جاتے۔ وہ بار بار بھول کر اس ایک بھٹیاری کا ذکر بیچ میں گھسیٹ لاتے جو ہر مسافر کے ساتھ چوسر کھیلتی تھی اور پاس اپنی بلی بٹھا لیتی تھی۔ جب ہارنے لگتی تو بلی کو اشارہ کر دیتی اور بلی لیمپ بجھا دیتی۔

"اتنے میں وہ چال بدل جاتی اور مسافر ہار جاتا!" رائے صاحب بڑے جوش سے کہتے۔

"وہ بھلا بلی لیمپ کیسے بجھا سکتی ہے؟"

"ہیں؟" رائے صاحب بڑے بھولپن سے چونکتے۔

"اور کیا، بلی لیمپ کیسے بجھا سکتی ہے؟"

"پھو...... کر کے" وہ بلی کی نقل کرتے، شمن ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی اور رائے صاحب بھی بچوں کی طرح کھلکھلا اٹھتے۔

"نہیں، اصل میں بھٹیاری جو تھی وہ چراغ جلا کر بلی کے سر پر رکھ دیتی، جب اشارہ کرتی تو بلی سر ہلا کر چراغ گرا دیتی بس"

"مگر مسافر بڑے بے وقوف تھے، اوّل تو وہ چراغ بلّی کے سر پر کیوں رکھنے دیتے تھے، بھلا بلّی کا سر بھی چراغ رکھنے کی چیز ہے، دوسرے وہ اس کے ساتھ کھیلتے ہی کیوں تھے؟"

"چل ہٹ بھی، اب یہ میں کیا جانوں، تو ہوتی تو ان سے ضرور پوچھتی۔"

"اور کیا، اور بھٹیارن کو پولیس سے پکڑوا دیتی۔"

"او ہنہ، سارا کہانی کا مزا کرکرا کر دیا، بھلا کہیں کی بھلا بھٹیاریوں کو پولیس پکڑ سکتی ہے؟"

کہانی کہتے وقت ان کے چہرے اور دماغ میں کتنا بچپن آ جاتا تھا! ان کے چہرے کی جھریاں خفیف مسکراہٹیں بن جاتیں اور آنکھوں پر سے بڑھاپے کا غلاف سرک جاتا۔ یہی چہرہ اخبار پڑھتے وقت اور دفتر میں کام کرتے میں کس قدر بردبار اور خشک ہو جاتا تھا۔

شام کو رائے صاحب کرسی پر لیٹ گئے اور پکارا:

"بھئی ہمارے سر میں تیل کون ڈالتا ہے؟" پریما اور نریندر لڑنے لگے۔ پریما کا کہنا تھا کہ وہ تو ہوسٹل میں رہتی تھی۔ نریندر سارے وقت رائے صاحب کو ہریا کرتا رہتا تھا۔ پھر بھی اس کا جی نہیں بھرتا، نریندر کہتا تھا کہ پریما کو ایک سرے سے تیل ڈالنے کا سلیقہ ہی نہیں۔

"چمن تیل ڈالے گی، نریندر پیروں کے انگوٹھے کھینچے گا اور پریما میری گود میں بیٹھے گی۔" رائے صاحب نے فیصلہ کیا، پریما فوراً اٹھلا کر ان کی گود میں پسر گئی۔

رائے صاحب کے بال بالکل سفید نہ تھے، ان میں پلاٹینم کی سی دھندلی سیاہی جھلکتی تھی، جیسے پہاڑوں پر جمی ہوئی بلوریں برف پر ہلکا سا شام کا غبار چھایا ہوا ہو، بالوں میں غضب کا گھناؤ تھا اور ذرا سا چھو دینے سے ان میں بجلی سی دوڑ جاتی تھی، رائے صاحب ان بالوں سے کس قدر پُراسرار اور غیر مرئی معلوم

ہوتے تھے۔

شمن محویت کے عالم میں ان کے پالش کیے ہوئے ناخنوں کو ڈری ڈری چھو رہی تھی، پاس ہی پریما گھاس پر اوندھی لیٹ کر اونگھنے لگی، نریندر بیڈمنٹن کورٹ بنوانے چلا گیا۔ اور شمن رائے صاحب کے بالوں کے گنجان گچھے میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔ پرسکون انداز میں ان کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر پلکیں کانپ رہی تھیں، وہ سوئے نہیں تھے۔ آدھے کھلے ہونٹوں میں سے سچے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے مصنوعی دانت اور سونے کے تار نظر آ رہے تھے۔ ان کے تلخ تبسم کو نیند کے ہلکورے لیتے دیکھ کر شمن کو ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ نرم نرم ٹھنڈی دلدل میں دھنستی چلی جا رہی ہے۔ کنپٹی کے پاس ننھی ننھی شریانیں معلوم ہوتا دبی ہوئی زندگیاں پھڑک رہی ہیں۔ بیچوں بیچ ماتھے پر اودے قشقے کی طرح کھنچی ہوئی رگ، آنکھوں کے گوشوں میں چڑیا کے پنجوں کے نشان پتھر میں سے تراشا ہوا مضبوط جبڑا! اس پر رعب اور نامعلوم سی دہشت طاری ہوگئی۔ بے خیالی میں اس کی سرد اور سہمی ہوئی انگلیاں ان کی مڑی ہوئی گردن پر جا ٹکیں۔

"ارے کیا کر رہی ہے......" دنیا جاگ پڑی...... شمن گھبرا کر اپنی انگلیوں کو چٹخانے لگی۔ رائے صاحب نے ماتھے پر شکن ڈال کر زور زور سے کھانسنا اور جھنکنا شروع کر دیا۔ شمن کو ان کی اس چھچھوری حرکت سے سخت کوفت ہوئی وہ جاگ پڑی۔

"تھک گئی؟...... چل ہاتھ دھو، آج تجھے چاٹ کھلائیں گے۔" وہ پیار سے بولے۔ رائے صاحب اٹھ کر پریما کے کان میں گھاس کے تنکے سے گدگدی کرنے لگے۔ پریما ننھے بچوں کی طرح مچل مچل کر اٹھی، اور گھاس پر بیٹھ کر سب نے چاٹ اور کافی اڑائی۔

رات کے کھانے کے بعد پریما بیٹھی اکتارہ جھاڑ پونچھ رہی تھی کالج میں

فرصت نہ ملتی تھی جو مشق کرے اور یہاں کبھی کوئی آتا جاتا تو کچھ یاد بھی ہوتا۔ کل رائے صاحب نے اُسے کوئی فلمی گیت گاتے سنا تو ملامت کرنے لگے۔ تو اگلیاں بھول کر وہ بس ٹیں ٹیں پر ہی جا رہی تھی۔ انھیں کتنا ارمان تھا کہ بہت نہیں تھوڑا ہی سہی کچھ تو آرٹ سے ان بچیوں میں بھی لگاؤ پیدا ہو جاتا۔

طنبورا اٹھا کر انھوں نے نہ جانے کس راگ کا الاپ شروع کر دیا پیر کے پنجے سے تال دیتے جاتے۔ دیر تک وہ کچھ گاتے رہے۔ شمن خاک نہ سمجھی مگر وہ ان کی گہری لوچ دار آواز رات کی خاموشی میں مل جل کر اُسے نیند کے جھولے جھلانے لگی۔ نہ جانے کیا سُر تھے دھیمے اور نرم جو احساسات پر پھوار کی طرح برستے رہے۔

قریب قریب ہر اتوار کو شمن اُن کے گھر جاتی، ہر سال لڑکیوں کو ملنے جلنے والوں کا نیا کارڈ بھروانا پڑتا تھا۔ عام طور پر تو لڑکیاں کارڈ پھینک پھانک دیتی تھیں۔ کیونکہ جو گھر والوں کے دستخطوں کے لیے بھیجتیں وہ کبھی واپس نہ آتے اب کارڈ بھروانے کے لیے بڑی مصیبت آئی۔ پہلے کارڈ پر جو دستخط تھے وہ جعلی تھے اور اس دفعہ پرنسپل نے کارڈ بجائے لڑکیوں کو دینے کے سرپرستوں کو خود براہِ راست بھیج دیے تھے۔ اور وہاں سے شمن کے لیے یہ جواب آیا کہ کہیں جانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں' اگر کوئی رشتہ دار ملنے آئے گا تو وہ اجازت نامہ ساتھ لائے گا لیکن اس طرح بڑی گڑبڑ ہوئی۔ خود بڑے بھیا ملنے آئے اور گھنٹوں پرنسپل سے لڑے' وہ ابا میاں کے پاس ہو کر نہیں آ رہے تھے۔ لہٰذا اجازت نامہ ندارد تھا۔ غصے میں آ کر وہ کارڈ خود بھر کر دستخط کر کے دے گئے۔ ایک اور لڑکی کا گارڈین ملنے آیا لہٰذا اس سے بھی اجازت نامہ طلب کیا گیا وہ بہت چراغ پا ہوا خیر یہ طے ہوا کہ وہ وہیں بیٹھ کر اجازت نامہ لکھے۔ میٹرن سوتے سے اٹھائی گئی تھیں وہ بڑبڑاتی ہوئی پرنسپل کے کمرے سے ملاقات کے کمرے تک پیغام رسانی کرتی رہیں، پھر قلم دوات منگوایا گیا، گھنٹوں لگ گئے پر ملاقات نہ ہو سکی۔ گارڈین

جھنا کر چل دیا اور سر پھرے نے اخبار میں الٹی سیدھی چیزیں چھاپ دیں۔ ایک اور لڑکی کا سگا بھائی ملنے آیا اتفاق سے وہ سامنے ہی برآمدے میں کھڑی تھی، بے اختیار دوڑ کر لپٹ گئی۔ بڑی دیر بعد خیال آیا کہ اجازت تو لی ہی نہیں اگر میٹرن کو خبر ہو گئی تو؟ اور واقعی سانپ کی طرح اس کی پسلی پھڑکی اور سر پر موجود،

"بغیر اجازت کس سے بات کر رہی ہو؟"

"اپنے بھائی سے۔"

"ثبوت کیا ہے کہ یہ تمہارا بھائی ہے؟"

"ثبوت؟ ارے یہ میرا سگا بھائی ہے، دوسرے کیا تم سمجھتی ہو یہ میرا عاشق ہے"

"کیا معلوم؟" لڑکی جل گئی

"مگر یہ تو کہتا ہے کہ آپ سے ملنے آیا تھا...... آپ کا"

"شٹ" اس کا بھائی بولا اور میٹرن کا تو یہ حال کہ انگاروں پر لوٹ گئیں لڑکی بولی "اگر آپ کو یقین نہیں کہ یہ میرا سگا بھائی ہے تو چلیے سائنس روم میں خون کا معائنہ کرا کے دیکھیے اور کیا، غرض آئے دن یہی جھگڑے ہوا کرتے روز روز کے قصوں سے منتظمین بھی تنگ آ گئے تھے۔ لڑکیوں کی چالوں کے آگے کسی کی نہ بن آتی بڑی لے دے مچتی لہٰذا پھر کارڈ بھروانے کا تقاضہ ہوا۔

اب کے شمن کو دوسری چال چلنا پڑی یعنی نہایت صفائی سے کارڈ پر دستخطوں کی نقل کر ڈاک سے پرنسپل کی خدمت میں بھیج دیا۔ یہ ننھی ننھی چڑیاں بڑی پیاری معلوم ہوتیں، اتنے رعب دار بزرگوں کو الو بنا کر لڑکیاں چپکے چپکے ان کے بھولپن پر ہنستیں۔ ڈھائی تین سو کارڈوں میں دو چار جعلی چلا دینا کچھ مشکل بات نہ تھی۔

شمن کا جانا صرف چند اتواروں کے لیے رکا اور وہ پھر جانے لگی۔ رائے صاحب سے اس کی خوب گھٹتی، بچوں میں وہ بچہ بن کر کھیلتے خوب بے ایمانیاں کرتے۔ پریما کی تو ان سے باقاعدہ کشتی ہوتی۔ پھر بھی اگر وہ پریما کی طرح شمن کے گدگدیاں کر دیتے یا

گال تھپتھپا دیتے تو وہ بُری طرح جھینپ جاتی اور دیر تک الگ الگ رہتی اُن کے سامنے ننھا سا بچّہ بن جانے کی خواہش ہونے لگتی۔

ایک دن مذاق میں انھوں نے اُسے بھینچ ڈالا تو وہ کھسیا کر رو پڑی۔ رائے صاحب کچھ متحیر اور کچھ پریشان ہو گئے۔ اتنے زور سے تو انھوں نے بھینچا بھی نہ تھا۔ جب شمن مسکرا دی تو وہ بن کر روٹھ گئے۔

کھانے پر وہ نریندر سے کچھ گاؤں وغیرہ کے متعلق باتیں کرتے رہے اور پھر کسی کام سے اپنے دفتر میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ شمن اُن کی بے رخی سے روہانسی ہو گئی۔ اگر وہ واقعی خفا ہو گئے تھے تو؟ ...... بے اختیار اس کا دل بورڈنگ بھاگ جانے کو چاہا۔

پلنگ پر چت پڑی وہ سنسان دوپہر سوچ رہی تھی، آخر اتنی جلدی اس کے آنسو کیوں نکل پڑتے رائے صاحب کو دیکھ کر اتنی رقت کیوں طاری ہو جاتی تھی؟ پھر اُسے نریندر کا خیال آ گیا، وہ سب کے سامنے کتنا چُپکا بنا رہتا تھا، پر اکیلے میں بُری طرح سٹ پٹا جاتا۔ شمن اس کی گھبراہٹ سے اور بھی شیر ہو جاتی، اور جب وہ شوق بھری کن انکھیوں سے اُسے تاکتا تو بزرگانہ انداز سے مسکرا اٹھتی۔ اب وہ بچّہ نہ تھی اُسے معلوم تھا نریندر اُسے چاہتا ہے! یہ چاہت کیا ہوتی ہے؟ نریندر اُسے بالکل چغد معلوم ہوتا، اس کی محبت کتنی بے تکی اور کتنی بے ہنگم تھی!

اور رائے صاحب؟ وہ تو اسے دیوتا نظر آتے، بیٹھے بیٹھے اس کا جی چاہتا وہ لمبی لمبی اُن کے صندل جیسے پاک قدموں میں لپٹ جائے۔ وہ آہستہ سے اسے سہارا دے کر اٹھائیں اور اس کا چکر کھاتا ہوا سر اپنے پُر اسرار سینے سے لگا لیں اُن کا فراخ سینہ جس میں سے مقدّس مندروں کی سی مسحور کن خوشبو آتی تھی۔ ایک بار ہی وہ اپنے نتھنے چوڑے کر کے اس مہک کو پی جائے اور ابدی غنودگی میں ڈوب جائے۔

یہ سنا کرتی تھی کہ ماں کے مرنے کے بعد انھوں نے دوسرا بیاہ نہیں کیا۔

دونوں بچوں کے لیے سب کچھ بن کر رہ گئے۔ کچھ لوگ تو انھیں چھچھورا کہتے تھے، اور بعض انھیں فلسفی، مجذوب اور نہ جانے کیا کچھ سمجھتے تھے۔ سمن کو وہ نادر چیز اور نادر معلوم ہوتے۔ پریا کے ساتھ رہ کر اُسے ہندو دھرم بہت مقدس معلوم ہونے لگا تھا۔ کبھی کبھی وہ قم قم کی بندی چھپ کر لگاتی، اور آئینے میں اسے اپنی شکل عجیب سی معلوم ہوتی۔ ننھی سی خونیں بوندسے اس کے چہرے پر ہزاروں زنجیریاں اور سنگار پیدا ہو جاتے۔ اُس کی آنکھیں کچھ کچھ اَپسرا کی مست سادھوؤں کی سی آنکھوں سے مشابہ ہو جاتیں۔ اور بال زندہ سانپوں کی طرح رینگنے لگتے، معلوم ہوتا وہ ٹھنڈے ٹھنڈے شعلوں میں لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ سلگ رہی ہے ...... اس وقت رائے صاحب کے طلسمی بال اور ڈھلی ہوئی صبح کی طرح جھلملاتی پیشانی کے علاوہ کچھ نہ نظر آتا، اور وہ نہ جانے کن نامعلوم تاریکیوں میں بھٹکنے لگتی۔

شام کو کھانا کھاتے میں کچھ دھرم اور سماج کا ذکر چھڑ گیا پریا تندہی شور سے لکچر دینے لگی۔ نریندر بھی بیچ بیچ میں بول اٹھتا۔ یکایک رائے صاحب بولے،

"ارے او چمن، تو ہندو ہے کہ مسلمان؟"

سب ایک دم خاموش ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"رام رام، جو کہیں مسلمان ہوتی تو ہمارا دھرم تو بھرشٹ ہو گیا سمجھو۔"

"رائے صاحب ہمارا دھرم ایسا بودا نہیں کہ کوئی اُسے بھرشٹ کر سکے، دنیا کی کوئی شکتی ہمارے دھرم کو آنچ نہیں پہونچا سکتی" پریا بولی۔

"چل چل جانے دے" انھوں نے پریا کے جوش کو ایک طرف جھٹک کر کہا۔ "کیوں ری چمن تو بتا۔"

"رائے صاحب دیکھیے میری طرف" نریندر جو تڑپ سے چیخا۔

"نہ۔ نہ بھئی میں کچھ نہیں دیکھتا، یہ جو لڑکی ہے نا، یہ اگر مسلمان ہوتی تو......"

"رائے صاحب آپ" پریا غصّے سے بے حال ہو گئی "اور آپ کے کتنے دوست جو مسلمان ہیں تو......"

"ہمارے دوستوں کی اور بات ہے وہ.......... مگر یہ لڑکی تو........ مجھے نہیں معلوم تھا، رام رام" مارے شرم کے نرتینہ اور پرتیا دونوں لسینے ہوگئے اور شمن نے سہم کر پلیٹ سے ہاتھ کھینچ لیا۔ رائے صاحب کے چہرے پر ویسی ہی ڈرتی قائم تھی۔

"مذاق نہیں ہے، اب ہم سب کو پرائشچت کرنا پڑے گی سوالگ؛ اور بھی اس چھوکری کو ہندو بنانا پڑے گا...... کیوں پھر......" وہ جھک کر شمن کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔

"تو لے تجھے بھی ہندو بنائے دیتا ہوں" گلاس میں سے پانی لے کر وہ ناخونوں سے شمن کے منہ پر چھڑکنے لگے" اوم شرم نہ جلینے انھوں نے کیا پڑھنا شروع کیا۔ ایک دم سے پرتیا دوڑ کر اُن کے بازو سے جھول گئی اور زور سے شانے میں دانت گاڑ دیے۔

"افوہ، کتیا!" رائے صاحب جلدی جلدی اپنا کندھا سہلانے لگے۔

"اچھا مت بنانے دو، ہم تو کہتے تھے جلد بھی اچھا رہے گا، کوئی موٹا سا بنیا ڈھونڈھ کر اس کا بیاہ کر دیں گے........ مگر"

شمن سنسناتی ہوئی میز پر سے اٹھ کر کھڑکی میں جا بیٹھی اور آنکھیں بھینچ بھینچ کر جھوٹے آنسو نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ارے رے رے، ہمارا بیٹا روٹھ گیا" وہ پیچھے پیچھے آئے، دیر تک وہ اسے بہلاتے رہے، مگر شمن روٹھی رہی۔

"آنکھیں میچیں کون آئے آنکھیں میچیں کون آئے......" انھوں نے آنکھیں بند کر کے اُس کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا دیے، اُن کی بائیں آنکھ کھلی ہوئی تھی جس میں سے شربتی شراب شرارت سے جھانک رہی تھی، شمن ہنس پڑی، لپک کر رائے صاحب نے اسے اٹھا لیا اور کرسی پر ڈال دیا۔

شمن نے ایک کہانی سنی تھی کہ ایک آدمی اپنے ایک دوست کو دفن کرنے گیا تو اس کی تسبیح قبر میں گر گئی، بعد میں اسے یاد آیا تو اُس نے سوچا چل کر پیچھے ہی

کیوں نہ آؤں۔ اُس نے جا کر قبر کھولی اور نیچے اُترا تو دیکھا وہ غائب ہاں قبر کے سرہانے ایک کھڑکی کھلی ہے، اُس کھڑکی کے اندر داخل ہوا تو سامنے اس کا دوست ایک مرصّع تخت پر جلوہ افروز نظر آیا۔

"یار بڑے ٹھاٹ ہیں تمہارے تو" اس نے کہا "ہاں بھائی تمہاری دعا سے مزے میں ہیں اور بھائی تمہاری تسبیح رہ گئی تھی سو یہ رہی" وہ بولا "ہاں وہی تو لینے چلا آیا تھا، خیر تم سے بھی ملاقات ہوگئی۔ اچھا بھئی السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام"

وہ آدمی قبر سے نکلا تو معلوم ہوا دنیا ہی بدل چکی ہے، نہ گھر نہ بار نہ بیوی نہ بچے! ایک سو دو سو برس کے بوڑھے نے بتایا کہ اُس کے لکڑ دادا کے لکڑ دادا کے سکڑ دادا کے زمانے میں سُنا جاتا تھا کہ کوئی آدمی اس نام کا رہتا تھا۔

تو یہ ہیں قدرت الٰہی کے کرشمے یہاں تو علیک سلیک ہی ہوئی اور وہاں جُگ بیت گئے۔ جب رائے صاحب نے اُسے اٹھا کر کرسی پر ڈالا تو اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ آسمان پر ستاروں کے ہنڈولے میں چک پھیریاں کھا کر ایک دم رُک گئی۔ ہر چیز اُسے اپنے گرد ڈگمگاتی محسوس ہو رہی تھی اور مندروں جیسی مقدس خوشبو سے اس کا دماغ سُن ہو کر رہ گیا۔ جلدی سے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ٹھنڈے پانی کا گلاس اٹھا کر اپنے صدیوں کے پیاسے ہونٹوں سے لگا لیا۔

۲۵

دسمبر کی چھٹیوں میں اُسے اس مرتبہ کوئی گھر سے لینے نہ آیا گنتی کی دو چار لڑکیاں بورڈنگ میں رہ گئیں وہ بھی اپنے اپنے مشغلوں میں ڈوبی رہتیں پدما اور شمن ہر وقت ساتھ رہتی تھیں، اس کے جانے کے بعد شمن دن بھر پریشان بھٹکتی رہتی۔ کسی پیڑ کے نیچے دری ڈال کر ناولیں پڑھا کرتی۔ پھر کبھی کبھی شام کو دو چار لڑکیاں مل کر سینما چلی جاتیں۔ تب تو شمن اور بھی بوکھلا جاتی۔ خاموش کرسی پر لیٹ کر وہ رامائن کا ترجمہ پڑھا کرتی، سیتا جی کی زندگی پر اُسے بڑا رشک آتا۔ کس مزے سے وہ رام چندرجی اور لچھمن جی کے ساتھ جنگلوں میں پکنک منایا کرتی ہوں گی، چودہ برس کی لمبی چوڑی حسین پکنک! اوملا کہتی تھی کہ اچھا ہی ہوا جو رام چندرجی کو بن باس ملا کچھ تو غریبوں کی دکھ بھری زندگیوں کا اندازہ ہو گیا ہو گا، کتنے انسان ہیں جو جانوروں سے بدتر اور جنگلوں سے بھی گئی گذری زندگی گذارنے پر مجبور ہیں لیکن تاریخ میں کوئی ایک لفظ بھی اُن کے بارے میں نہیں لکھتا، یہ بڑے لوگ اگر عیش و عشرت سے اکتا کر سنیاس لے لیں تو مفت کی پبلسٹی۔ لیکن اُن جنم سنیاسیوں کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا جو پیدا ہی ننگی دنیا میں ہوتے ہیں۔

چند ہی دنوں میں اس نے ان گنت کتابیں پڑھ ڈالیں جن میں سے "جین ایر" نے اُسے حد سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ آخری باب جہاں وہ اپنے اندھے آقا کے پاس لوٹ کر آتی ہے اس کو اتنا پیارا معلوم ہوا کہ تین چار بار پڑھ کر بھی سیری نہ ہوئی۔ ٹیگور کی کہانیاں خصوصاً "کاسٹ آوے" پڑھ کر تو سچ مچ آنسو نکل پڑے ہارڈی کی مشہور ناول "ٹیس" نے بھی اُسے ہلا کر رکھ دیا۔ مگر سب سے زیادہ جس چیز نے

اس کی رگ رگ کو بجا کر پست کر ڈالا وہ بائرن شیلے اور کیٹس کی شاعری تھی۔

جب کل پانچ چھٹیاں رہ گئیں تو پریما اور نریندر اُسے لینے آ پہنچے، شمن کو یاد بھی نہ رہا کہ وہ پریما سے ناراض تھی۔ نریندر کے ساتھ گھس کر بیٹھنے میں بھی اعتراض نہ ہوا۔ اور جب اس نے حسب عادت اس کا پیر کچلا۔ شمن نے جھلاّ کر اس کے گال پر ایک تھپڑ دھر دیا۔ پریما بھی اس کی حمایت میں نریندر کے چٹکیاں بھرنے لگی۔ موٹر اُڑی چلی جا رہی تھی اور اس سے بھی تیز شمن اُڑ رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ روحانی طور پر تو پہنچ بھی چکی ہے........ رائے صاحب، پریما اور نریندر سے ناراض ہیں کہ وہ اُسے اتنی دیر میں کیوں لائے، وہ اس کے انتظار میں کس قدر تھک گئے ہوں گے اُسے دیکھتے ہی وہ نقلی مگر اصلی موتیوں جیسے دانت ایک دم جگمگا اٹھیں گے۔

مگر گھر پہنچ کر نہ ہی دانت جگمگائے اور نہ اس کے انتظار میں کوئی تھکا ہوا نظر آیا، رائے صاحب اپنے چند دوستوں کے ساتھ شکار کو گئے ہوئے تھے، آنے کے متعلق کچھ نہیں کہہ گئے تھے، گھر سونا سونا ہو رہا تھا۔ شمن آ کر پچھتائی، اوپر سے نریندر نے بدمذاقیاں شروع کر دیں، پریما کو سوتا پاکر اس نے شمن پر سچ مچ اعلانِ عشق کر دیا اور وہ بھی اس بھونڈے طریقے سے کہ بس ٹوٹ ہی تو پڑے۔ شمن کو اس پر بجائے غصے کے پیار سا آ گیا، وہ مسکرا دی؟ اور جیسے ایک عقلمند ماں بچے کو شیشے کا کھلونا مانگنے پر بڑے پیار سے بہلا دیتی ہے۔ اسی طرح شمن نے نریندر کو چمکار دیا اور جب وہ ناامید ہو کر سسکیاں لینے لگا تو شمن کا جی چاہا اس کا بے وقوف سر اپنے سینے سے لگا کر تھپکیاں دے، اور سُلا دے، وہ اپنے آپ کو ایک دم نہایت عقلمند اور بزرگ سمجھنے لگی، نریندر اُسے بے حد یتیم اور بے کس معلوم ہو رہا تھا وہ بے چارہ اس کی بزرگانہ باتیں سُن کر ویسے ہی حیرت زدہ ہو رہا تھا، بالکل ہی سٹ پٹا گیا چلتے پرزے جھینپا کچھ رو ٹھا بیٹھا رہا۔

شام کو رائے صاحب اچانک واپس آ گئے گویا شمن کی خاموش پکار نے انہیں کھینچ بلایا۔ خاک اور دھول میں اَٹے ہوئے خاکی کپڑے، روپہلی بالوں پر

خاک کی افشاں جیسے سورج پر ہلکے ہلکے بادلوں کی پرچھائیاں، دھوپ سے رنگ کچھ اور جھلس کر شوخ ہو گیا تھا۔ اور جب پپڑائے ہوئے ہونٹوں کے درمیان ستاروں کی لڑیاں چمکیں، تو شمن کا دل خوب زور زور سے اچھلنے لگا۔ اور اس کی نگاہیں مٹی میں لتھڑے ہوئے بھاری جوتوں پر جم گئیں۔

آتے ہی انھوں نے بھر گلاس برف کا پانی پیا اور خلافِ معمول سر ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گئے۔ پریما اور تریندر ویسے اُن سے اتنے بے تکلف تھے، مگر انھیں خاموش دیکھ کر بے چاروں کی زبانیں گنگ ہو جاتیں، اُن کی ایک تنبیہی نگاہ چانٹے کی طرح لگتی اور پریما جیسی بے چین ہستی بھی دبک کر رہ جاتی۔

"کیا بات ہے؟" شمن نے خاموشی اور سکون سے متاثر، آہستہ سے پریما سے پوچھا۔

"تھک گئے ہیں، یا شاید......" وہ رک گئی۔

"کیا؟"

"شاید مِس غلیب سے لڑائی ہو گئی، وہ بھی تو شکار کو گئی تھیں" پریما نے اُسے ڈرائنگ روم کے آخری کونے میں لے جا کر کہا۔

"کون ہیں یہ مِس غلیب؟"

"ہیں ایک، یہاں انسپکٹرس آف اسکولز ہیں، رائے صاحب کی کلاس فیلو تھیں۔ شادی بھی طے ہو گئی تھی، مگر جب انگلینڈ میں رائے صاحب ممی سے ملے تو بس نہ جانے کیوں دو دن میں شادی بھی کر ڈالی، اب...... ارے تم نے ممی کی نئی تصویر نہیں دیکھی جو رائے صاحب نے بنوائی ہے، ٹھیرو ابھی دکھاؤں گی، ہاں تو، ممی کی زندگی ہی میں یہ گھنٹوں آ کر بیٹھا کرتی تھیں، ممی آرٹسٹ تھیں اور اس قدر سیدھی، کہ ہماری دادی جی خوب اُن سے گھر کا کام کرواتی تھیں۔ دھوتی باندھتی تھیں اور بڑی کاہل تھیں۔ یہ چڑیل جب ہی سے انھیں پھانسنے کی فکر میں تھی، یہ غلیب کی بچی، رائے صاحب اسے بہت چاہتے ہیں، مگر جلانے بھی

خوب ہیں مگر جب روتی ہے تو چھپاتے ہیں۔"

"بڑی بری ہے!" شمن کے دل نے پکارا۔

"ہاں، مگر رائے صاحب اُسے کبھی نہیں مناتے۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ بس ملاقات ہو جاتی ہے۔ کسی پارٹی جلسے میں اور رائے صاحب کی تو یہی عادت ہے کہ ذرا دیر میں ہنسا دیا اور ذرا میں رُلا دیا...... پھر اس دن"

"پریما،" رائے صاحب کی بھرائی ہوئی آواز لمبے چوڑے ہال میں گونجی۔

"ارے جمن بھی آیا ہوا ہے! کب آئے دوست" رائے صاحب نے گویا اب اُسے دیکھا، وہ ذرا مسکرا اُٹھے۔ بولے...... "بھئی ذرا اتارو" وہ کوٹ میں پھنستے ہوئے بولے۔

شمن کوٹ اُتارنے لگی، قمیص بُری طرح پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی، اور جسم جل رہا تھا، وہ پُراسرار مندروں کی سی خوشبو کا جھونکا اُسے آہستہ سے جھنجھوڑ گیا، مگر وہ سنبھل گئی اور زمین پر بیٹھ کر جوتا کھولنے لگی، رائے صاحب نے پیر کھینچ لیے اور جھک کر ہولے سے اس کے گال پر دو انگلیاں مار دیں، شمن گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور پیرا جوتے کھولنے لگا۔

کھانے کے کمرے میں شمن کو چوہے سے رینگتے معلوم ہوئے، اُس نے بجلی جلائی تو نریندر نامراد عاشقوں کے سارے ضروری تاثرات چہرے پر جمع کیے کرسی پر اکڑوں بیٹھے تھے، شمن جیسے اس کے حالِ دل سے بے خبر کرسی کھینچ کر پاس بیٹھ گئی۔

"کتنی گرمی ہے!"

نریندر چپ!

"آج تو آئیس کریم بنتی؟"

نریندر چپ!

"رائے صاحب کو فالودہ پسند ہے نا؟" اُس نے بڑا نواز است پوچھا

چپ!

"اونہہ، کوئی سامنے کی کھڑکی ہی کھول دے پنکھے بھی تو بند ہیں، معلوم ہوتا ہے کہیں آگ لگی ہے...... ہائے کوئی......"

نریندر نے ایک حقارت آمیز نظر اس پر ڈالی اور بھنّاتا ہوا کھڑکی کے کواڑ ادھر ادھر کھولنے لگا۔

"نری کیا بہت غصّے ہو؟" اس نے پیار سے چھیڑا۔

"نہیں"

"ہاں؟..... تو پھر آئس کریم کے ذکر پر مسکرائے کیوں نہیں؟" باوجود کوشش کے نریندر مسکراہٹ کو نہ روک سکا،

"اہو ہو، بن رہے تھے جناب! نرید ے کہیں کے، کہیں جاڑوں میں بھی کوئی آئس کریم کھاتا ہوگا،

"تم نہیں جانتیں کہ......"

"ہونہہ، جیسے تم تو بہت جانتے ہو،"

"اگر تمہیں کسی سے اتنا پریم ہوتا" وہ انگریزی چھانٹنے لگا۔

"آہا، پریم! پریم کی نیا...... پریم...... کھونا آگئے؟"

"ہُنہہ...... میں......" نریندر جھنّایا

"دیکھو نریندر تم مجھے ڈانٹو گے تو...... ہاں، اچھا نہ ہوگا، بڑے آئے ڈانٹ کے بولنے والے، اور ابھی یہ کہتے ہو پریم ہے؟ خاک پریم ہے تمہیں، جی ہاں پریم ہوتا تو یوں اپنا رکیٹ چھپا کر نہ رکھتے، اور لوکاٹ توڑتے وقت سب کچے خود نہ نگل جاتے۔"

"کیوں جھوٹ بولتی ہو، کتنے سارے تو توڑے، مگر اس نے پہلے پیلے لپک لیے، ہُنہہ!"

"خیر لوکاٹ تو پریما نے لپک لیے اور ریکٹ کی بات گول ہی کر گئے،

ہُنہ جیسے میں کھا ہی تو جاتی تمہارا ابلاّ۔"

ایک دم سے نریندر پیر پٹختا چل دیا، شمن مسکراتی ہوئی اطمینان سے کرسی پہ پھیل گئی۔

"یہ لو ریکیٹ، اور مجھ سے بات نہ کرنا" نریندر نے ریکیٹ پٹخ دیا۔ کچھ دیر شمن اُسے دیکھتی رہی اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"او ...... تو وہ نری!"

"مجھ سے مت بولو جی، سو دفعہ کہہ دیا، ہاں نہیں تو،"

شمن ماماتا کے معصوم جذبے سے بے چین ہو کر ہنسنے لگی۔ اگر اس طرح، بالکل ایسے ہی فرہاد شیریں کے سامنے تیشہ پٹخ کر کہتا "ہم سے نہیں کھدتی نہر...... جی!" تو یقیناً وہ شہر یار کو چھوڑ چھاڑ اُسی کے گلے کا ہار بن جاتی، اور پھر حکم ملتا ہے ــــ

"ہم سے مت بولو جی!" وہ خوب ہنسی۔

"اُوہ نری ڈیر!" وہ نریندر کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اُس کا مُنہ تکنے لگی ایک دم سے نریندر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ریچھ کی طرح لپٹ گیا، شمن نے گھبرا کر اُسے دور دھکیلا، سارے بال، اور کان کھسوٹ ڈالے۔ بے چارا پٹے ہوئے کتے کی طرح کونے میں دبک گیا، اور شمن کچھ خوف زدہ کچھ شرمندہ بھاگنے لگی کہ آتی ہوئی پریما سے ٹکر ہوئی

"ارے کیا ہوا؟"

"آ...... آ...... کچھ نہیں، یہ نریندر مجھے مار رہا تھا" وہ ایک دم بات پلٹ کر ہنسنے لگی، پھر مصنوعی غصے سے گال پھُلا لیے

"ہائیں نری کے بچے، یہ رہا تیرا ریکٹ اور کہتا تھا کہ گم ہو گیا۔"

"ہاں، جھوٹا سارے زمانے کا،" شمن نے تائید کی

"کیوں مار رہا تھا بچاری شمن کو؟ کیوں؟ کیوں؟" وہ ریکٹ کے جال سے نریندر کے سر پہ ٹیپے لگانے لگی۔

بھرا ہوا نری جھنجھوڑ ہی کھا تا کہ اتنے میں رائے صاحب کمبل لپیٹے آ پہنچے اور بات ٹل گئی۔

"آج نریندر کو کیا ہو گیا ہے؟" رائے صاحب نے اُسے غصے اور شرم سے سرخ دیکھ کر کہا، "تم دونوں نے ستایا ہو گا۔ کیوں؟"

"پریم ہو گیا ہے بے چارے کو" شمن نے دبی زبان سے ہنسی روک کر کہا۔

"کیا ہو گیا ہے؟"

"پریم، پریم ہے.... رائے صاحب" پریما نے چیخنا شروع کیا۔

"کیسے؟ اپنے نری کو" رائے صاحب بن کر فکرمند ہو گئے۔

"ہاں، چہ بے چارا!"

"میں مار دوں گا، ہاں" نریندر غرّایا۔

"ارے باپ رے! مگر کس سے ہو گیا ہے پریم؟"

"ایک ہے" شمن اترانے لگی

"چھوٹی ہے، ہُنہ" نریندر مارے شرم کے اور بھی بھنّا گیا۔

"ہا، بے چارا، رائے صاحب اب؟ اپنا نری تو......"

"میں چھری مار دوں گا...... پریما کی بچی"

"اور رائے صاحب......" قبل اس کے کہ پریما کچھ بولے نری نے کھٹ سے چھری کا دستہ اُس کی انگلی پر رکھ دیا۔

کھانے پر نریندر کے عشق نے سب کو ہنسا دیا، خصوصاً شمن تو بے تحاشا ہنستی رہی، اُسے یہ کھیل نہایت ہی مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا، رائے صاحب میں بھی اپنی پرانی شگفتگی لوٹ آئی، وہ دیر تک بیٹھے کانٹوں اور چھری کی مدد سے میز پر معمے بنا کر امتحان لیتے رہے، مگر انھوں نے صرف شوربہ پیا اور جلدی سے جا کر سو گئے۔

شمن اور پریما اُداسی سے نڈھال ہو کر ایک ہی پلنگ پر سو گئیں یعنی شمن

جاگتی رہی اور پریما سو گئی۔ شمن نے جاگنے اور خود سے بات کرنے کی ایک عادت سی ڈال لی تھی، روزانہ سونے سے پہلے وہ خود اپنے حضور میں اپنے سارے احساسات اور تجربات ایک ایک کرکے پیش کرتی اور ان پر خود اپنا فیصلہ سنتی، یہاں تک کہ وہ نہ جانے کب سو جاتی۔ اس سونے میں اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے مزے دار کہانیاں سنا کر سلا دیا ہو، رائے صاحب نے جو ہولے سے اس کے گال پر دو انگلیاں چھوا دی تھیں وہ ایکدم تازہ ہو گئیں، ساتھ ہی اسے گذرے ہوئے جنم کی بھولی ہوئی باتیں یاد آ گئیں۔۔۔۔۔۔ دور بہت دور، صدیوں پہلے، رشید نے کیرم کھیلتے میں اس کی کلائی کو پکڑا تھا، چٹکی مارنے کے لیے دو انگلیوں کو ملا کر۔۔۔۔۔۔ پھر چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ سسکتی ہوئی چٹکی اب بھی اس کی رگ رگ میں چمکیں لے رہی تھی۔ اس نے اپنی کلائی پر سنسناتا ہوا گال رکھ دیا اور رائے صاحب کی دو انگلیوں کا مس کلائی میں رینگ گیا، اس طرح گویا اس نے اس نیم مردہ چوٹ میں نئی جان ڈال دی اسے سکون کی نیند آ گئی۔

صبح اس کی آنکھ خلاف معمول دیر میں کھلی تو کالج کی گھنٹی کی آواز کہیں دور سنائی دی، ذرا ہوش آنے پر معلوم ہوا وہ کالج میں نہیں بلکہ پریما کے پلنگ پر ہے اور یہ آواز ــــــ؟ کسی نے کانسی کی تھالی رسوئی میں گرائی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

رائے صاحب اب بھی سست نظر آ رہے تھے، شمن دیر تک مس ملیب کو کوستی رہی جس سے لڑ کر وہ اتنے مکدّر ہو گئے تھے۔ مگر پھر بھی اسے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں تازگی آ جاتی اور وہ ایک آدھ جملہ ضرور کس دیتے، دیر تک بیٹھ کر تاش بھی کھیلے اور بے ایمانیاں بھی کیں، آج شمن کا دل بے اختیار انھیں چھونے کو چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ پریما کے ساتھ ساتھ ان سے لڑنے بھی لگی، نہ جانے کس بات پر انھوں نے زور سے اس کی انگلی جھنجھنا دی

تو بچّوں کی طرح مچل گئی۔ اس کا جی چاہتا تھا ایک دم ان کے مند ر جیسے سینے کے پٹ کھل جائیں اور وہ سرنگوں ہو کر اُن میں سما جائے۔

مگر وہ ردھی ہی رہی پرتیما دھوبی کو کپڑے دینے چلی گئی اور نریندر کا دورہ قائم تھا۔ وہ منہ پھلائے برآمدے میں پڑھتا رہا۔ کہ رائے صاحب آئے۔ شمن نے لپک کر منہ پھلالیا، انھوں نے اُس کے پھولے ہوئے گالوں کی نقل میں اپنے گال پھلا لیے اور شمن کے ہنسنے پر اُس کے پاس بیٹھ گئے۔ شمن پر تو بھتنی سوار تھی، وہ نہ جانے کس بات پر مچل اٹھی، اور ان کے چھیڑنے پر بگڑ کر رونے لگی۔

ارے۔ رے۔ رے میرا چمن" رائے صاحب نے اُسے چھیڑا تو وہ اور بھی بگڑ گئی۔ وہ متعجب ہو کر غور سے دیکھنے لگے۔ انھیں سنجیدہ دیکھ کر وہ ڈر گئی اور بُری طرح اُن سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی رائے صاحب نے ہنستے ہوئے اُسے بچّوں کی طرح تھپکنا شروع کیا وہ خاموش ان کے سینے سے سر لگائے لمبی لمبی سانسیں بھرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ رائے صاحب نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا تو وہ ایک دم سوتی بن گئی۔ رائے صاحب اُسے تھپکتے رہے پھر آہستہ سے انھوں نے اُسے سرکا کر پلنگ پر لٹانے کا ارادہ کیا تو وہ ایک دم انھیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کانپ اٹھی۔

"نہیں، نہیں، رائے صاحب" اُس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا ہے ...... کچھ .... ارے" وہ اس کی آنکھوں کی وحشت سے ڈر گئے۔

"نہیں رائے صاحب، مجھے گرائیے مت، رائے صاحب.....

رائے صاحب .... رائے صاحب میں .... میں۔ آپ سے پریم کرتی ہوں" اس نے سوکھے ہوئے گلے سے آخر کہہ ہی دیا۔

"ہیں؟" وہ اُس کی طرف اجنبیوں کی طرح دیکھنے لگے۔

"میں... میں آپ سے ...... پریم ...... رائے صاحب میں" اس کی آواز گھٹ کر سہم گئی۔

"ایں، چمن ...... اچھا سو جاؤ" وہ جلدی سے اُس کی لپٹتی ہوئی انگلیاں الگ کرنے لگے۔

"نہیں ..... نہیں رائے صاحب، میں مرجاؤں گی، رائے صاحب مجھے، رائے صاحب، مجھے دور نہ کیجیے" رائے صاحب ایسے جھجکے جیسے کسی نے ان کے ماتھے پر پتھر مار دیا۔

"رائے صاحب ...... میں اپنا دھرم بھی بدل دوں گی" اُس نے اور قریب ہو کر کہا، رائے صاحب چاروں طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے

"ارے پریما ......" انھوں نے آواز دی۔

"مت بُلائیے کسی کو، رائے صاحب میں مر جاؤں گی، میں پریم کرتی ہوں رائے صاحب" سامنے دروازے میں نریندر کتاب لیے حیرت سے مُنہ پھاڑے کھڑا تھا جو نہیں اس نے شمن کو یہ کہتے سُنا، اس کا چہرہ کانوں تک لال ہو گیا۔ جیسے کسی نے اُسے ماں کی گالی دے دی ہو، شمن کی زبان لڑکھڑا گئی وہ ڈھیلی ہو کر پلنگ پر اوندھے مُنہ گر پڑی۔

رائے صاحب چلے گئے، بغیر دوسرا لفظ زبان سے نکالے، اور شمن کا جی چاہا کاش، پلنگ سمیت وہ زمین میں سمائی چلی جائے نیچے نیچے اتنے نیچے کہ بالکل زمین کے کلیجے میں جا چھپے، مارے ہیبت اور شرم کے وہ آنکھیں بند کیے اسی طرح شام تک پڑی رہی، کوئی ایسی ترکیب ہوتی جو وہ بنا کچھ کہے سُنے اپنا مُنہ ڈھانکے وہاں سے بھاگ نکلتی، اس کے کمرے میں کوئی نہ آیا مگر اُسے صاف معلوم ہو گیا کہ نریندر اور پریما دوسرے کمرے میں ڈرے ڈرے کیا باتیں کرتے رہے۔ یہ اس نے کیا کر دیا؟ اب کیا ہو گا؟

کانپتی، لرزتی، آنکھیں جھکائے جب وہ باہر نکلی تو نریندر جلدی سے اپنے کمرے میں گھس گیا وہ بھی اُسے مُنہ دکھاتے ڈر رہا تھا۔ پریما نے عورت کی پوری بہادری سے اس کا پورا مقابلہ کیا، گویا وہ آج پہلی مرتبہ اس کا بہ حیثیت ایک

اجنبی ہستی کے استقبال کر رہی ہے۔ وہ بڑے اخلاق سے بولی اور دونوں نے جاکر مہذب لوگوں کی طرح چائے پینا شروع کی۔ آج نہ کچا لوؤں پر جھگڑا ہوا نہ بسکٹوں پر چھینا جھپٹی ہوئی، اس کی ہمت نہ پڑی چودائے صاحب کا نام بھی لیتی۔ پریما بنایت تپاک سے اُسے پھل وغیرہ دیتی رہی شمن بھی تکلف سے کھاتی رہی۔ کبھی کبھی اُسے پریما آنکھ بچاکر دیکھ بھی لیتی۔ مگر ایسے گھبرا جاتی گویا اسے نہیں پہچان پائی، دونوں بے طرح سہمی ہوئی تھیں۔ وہ بے تکلف سہیلیاں ایک دوسرے سے بہت دور غیریت کی خشکی میں جا پڑی تھیں۔

اُن کے حواس بے طرح بھٹک گئے تھے۔ جیسے دو دوستوں کے بیچ میں ریگستان در آیا ہو اور ایک دوسرے کو پکار بھی نہ سکیں شام تک خاموش رہنے کے بعد شمن نے بڑی مشکل سے اس سے بورڈنگ جانے کی اجازت دبے الفاظ میں طلب کی جو ایسی تیزی سے ملی کہ اس کا منہ اُتر گیا، ڈرائیور تو جیسے تلا ہی بیٹھا تھا۔

آن واحد میں وہ خالی ڈھنڈھار بورڈنگ کی چہار دیواری میں تھکے ہوئے قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ اُس نے بجلی نہیں جلائی اور جوتوں سمیت لحاف میں سکڑ کر لیٹ گئی۔

دوسرے دن لوگوں سے آنکھ ملاتے وحشت معلوم ہونے لگی، گو وہ کچھ نہ جانتے تھے پھر بھی جیسے اس کے منہ پر لمبی لمبی سطریں کھنچی اس کے گناہ کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھیں، وہ کچھ چھپانا چاہتی اُن متجسس نظروں سے جو اس پر اچانک جا پڑتیں اور وہ جھجک کر دور ہو جاتی،

تو وہ بدمعاش تھا، پرلے درجے کی آوارہ، اُس نے ایک مقدس انسان کی پاک دامنی پر سیاہ دھبے ڈالنے چاہے مگر خدا نے اُسے بچا لیا، یہ اُسے کیا ہو گیا تھا...... یہ ٹوٹے ہوئے ذرے اب کیسے جڑیں گے؟ اب کیا ہو گا؟

چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی لڑکیاں لوٹنا شروع ہو گئیں۔ اب

پریمیا بھی ایک دن بعد آجائے گی! پھر کیا ہوگا؟ وہ اِن آئینے میں اپنی صورت کیسے دیکھ سکے گی؟ اس کی وحشت بڑھتی گئی۔

دوسرے دن صبح لائبریری میں لڑکیاں سر جوڑے اخبار پر مکھیوں کی طرح چپٹی ہوئی تھیں، کچھ بلند آواز سے پڑھ رہی تھیں جیسے کوئی حادثہ ہو جاتا ہے تو تماش بین لاش کو چاروں طرف سے گھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اسی طرح ایک کے بعد دوسرا گروہ اخبار پر جمع ہو رہا تھا: "چہ ..... ہا ..... بے چاری پریمیا .....؟" اس نے کسی کو کہتے سنا، اور اس کے ہاتھ سے لرز کر کتابیں چھوٹ پڑیں مجرم کی طرح نظریں نیچی کیے وہ منتظر رہی مگر پریمیا نے شاید اسے دیکھا نہیں اس کی نظریں اخبار کی طرف اٹھیں لڑکیاں اسے چھوڑ کر جا چکی تھیں، آہستہ سے وہ بڑھی، احتیاطاً کرسی پر بیٹھ گئی۔ رات کو رائے صاحب ہارٹ فیل ہو جانے کی وجہ سے فوت ہو گئے۔ یہ ان کی پرانی بیماری تھی جس کا یکایک حملہ ہو گیا، وہ خاموش میز پر کہنیاں ٹیکے بیٹھی رہی کسی نے کلاس چلنے کے لیے شانہ ہلایا اور وہ چلنے لگی لڑکیوں کی آڑ کے ساتھ،

"کہاں جا رہی ہو؟" ایف اے کلاس نے اسے اپنی جماعت چھوڑ کر آگے بڑھتے دیکھ کر روکا۔

"ہیں؟" وہ ٹھٹک گئی۔

"تمہاری کلاس تو پیچھے رہ گئی یہ اب کہاں جا رہی ہو"

"اوہ، میں نقشہ لینے جا رہی ہوں، کل سٹنگ روم میں بھول آئی تھی"

اسے عین موقع پر بات سوجھ گئی ورنہ غضب ہو گیا تھا وہ یقیناً پکڑی جاتی تیز قدم وہ سٹنگ روم کی طرف چلی مگر وہ کافی دور تھا، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے، اور وہ جلدی سے پلٹ پڑی، اپنی کلاس میں گھس گئی۔

نہ جانے اس نے اس دن کیا پڑھا اور کیا سنا، آنسو تو اس کی آنکھوں سے جب ہی خشک ہو گئے تھے جب وہ دن رات متواتر اپنی بدمعاش انا کی

یاد میں روئی تھی چہرے پر کوئی آثار لانا کمزوری کی نشانی تھی، مگر پرتیبا کی خالی کرسی دیکھ کر اسے یہی محسوس ہوتا تھا کہ رائے صاحب نہیں پرتیبا مر گئی۔

رائے صاحب مر گئے! اس خیال سے ہی اس پر ایک نامعلوم سی دہشت طاری ہو جاتی، اُن کو جلا دیا گیا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اُن کے وہ بال، وہ سیج سے زیادہ روشن تاج جلایا نہیں جا سکتا، وہ پکے سونے جیسی رنگت، اور سچے موتیوں جیسے مصنوعی دانت، ناممکن...... وہ خود ہی فیصلہ کر لیتی۔

راتیں بڑی بھیانک ہو گئیں، رائے صاحب اس کے دماغ سے کسی طرح نہ نکلتے تھے۔ اور پھر تو یہ حالت ہو گئی کہ وہ باقاعدہ اُن سے ڈرنے لگی۔ رائے صاحب سے جن کے قرب کے خیال سے ہی وہ لرز اٹھتی تھی ایک دن اس نے ایک مہارشی کی ارتھی بڑی دھوم دھام سے نکلتے ہوئے دیکھی، مہارشی کو پالکی میں باندھ کر بٹھا دیا گیا تھا، دانت کھلے ہوئے اور منہ پر سیندور، ہلدی اور چندن کے داغ، جلد باسی بینگن کی طرح جھرّیوں دار اور سیاہ اس پر سے ہلکی ہلکی سڑے گوشت کی سی لباند!...... پھر تو یہ حال ہو گیا کہ مارے ڈر کے دن کو اکیلے کمرے میں جاتے دم نکلتا۔ رات کو معلوم ہوتا وہی پالکی والا مردہ اس کے سرہانے بیٹھا ہے وہ ہمت کر کے آنکھیں ٹیڑھی کر کے دیکھتی اور وہ جھپ سے پلنگ کے نیچے چھپ جاتا۔ کبھی پٹی کے نیچے سے ہاتھ پھیلا کر اس کا گلا ٹٹول رہا ہے۔ کبھی غسل خانے میں اس کے پیچھے پکڑنے لپکتا۔ جاتے جاتے وہ دلیری سے مڑ کر دیکھتی اور ایسا معلوم ہوتا کوئی تیزی سے کھمبے کی آڑ میں ہو گیا، جھاڑیوں میں دبک گیا، گیلری میں سرک گیا۔ پسینے چھوٹ جاتے اور گھٹنے لرزا کرتے۔

بعض وقت رات کو کھانا کھاتے میں ایسا معلوم ہوتا کہ مردہ انگلیاں اس کے ٹخنے میز کے نیچے ٹٹول رہی ہیں، وہ ڈر کر پیر کھینچتی تو وہ ہاتھ بھی ساتھ لٹکا چلا آتا...... چیخ مار کر الگ کرتی تو معلوم ہوتا کہ وہ خود اس کی شلوار کا پائنچہ ہے۔

ایک دن وہ پڑھتے پڑھتے میز پر سر ڈال کر سو گئی...... دیکھا رائے صاحب کے ساتھ بیٹھی تاش کھیل رہی ہے کہ ایک دم وہ اٹھ کر ناچنے لگے ان کے بازوؤں کے پٹھے پھول پھول کر اچھلنے لگے اور بال گرگٹ کے سانپوں کی طرح کھڑے ہو کر جھومنے لگے۔ مصنوعی دانت ہسپتال میں بجنے لگے...... تاشوں کے پتے مشعل کی طرح جل اٹھے اور وہ شمیم کی طرف بڑھے...... اس نے ایک دل دوز چیخ ماری لیکن انھوں نے اس کی آنکھوں میں آگ ٹھونس دی۔ شمیم متواتر چیخیں مارتی رہی اور دونوں ہاتھوں سے شعل سے کے شعلوں کو آنکھوں سے دور ہٹاتی رہی۔

"غن غن" کچھ کہا اور وہ اٹھ کر بے تحاشہ بھاگی۔ وہ بھاگتی چلی گئی اور شاید ساری رات اسی طرح بھاگتی رہتی اگر ایک دم چوکھٹ کے ماتھے پر اچھل کر نہ لگتی۔ وہ گر پڑی۔ جب آنکھ کھولی تو رائے صاحب اس پر جھکے ہوئے کچھ ناک میں ٹھونس رہے تھے جو دوزخ کی آنچ کی طرح دماغ کو جلائے ڈالتی تھی...... اس نے پھر چیخ ماری اور اٹھنا چاہا مگر دو تین سفید سفید لمبوتری شکلوں نے اسے دبوچ لیا۔

"چپ چاپ لیٹی رہو!" یہ پرنسپل کی آواز تھی۔

"میں نے جیسی ہی ٹارچ ڈالی یہ پاگلوں کی طرح نوچنے لگی اور پھر بھاگی" میٹرن خود نہایت خوف زدہ ہو رہی تھیں۔

تو یہ میٹرن تھیں جنھیں وہ رائے صاحب کا بھوت سمجھ رہی تھی۔ ان کے سفید بال کاغذ کی بتیوں میں لپٹے ہوئے روپہلی تاج کی طرح چمک رہے تھے...... ٹارچ ہاتھ میں تھی۔ اور وہ خود ہسپتال کے کمرے میں پڑی تھی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ اسے بجلی بجھ جانے کے بعد بھی میز پر اوندھا پڑا دیکھ کر انھوں نے ٹارچ ڈالی۔ بس وہ پاگلوں کی طرح بھاگی......

حسنِ اتفاق سے اس کا خواب اور میٹرن کا ہیولا ایک ہی کڑی میں اُلجھ کر دماغی ہلچل کا باعث ہو گئے۔ صبح تک اُسے زور کا بخار چڑھ آیا اور اسی حالت میں اُسے گھر پہنچا دیا گیا جہاں تین مہینے اُسے ٹائیفائڈ نے جی بھر کر جھنجھوڑیاں دیں۔

۲۶

بیماری طویل تھی اور ساتھ ساتھ غیر دلچسپ۔ حالاں ہی میں اس نے ایک کتاب پڑھی تھی، جس کی ہیروئن شروع سے آخر تک بیمار رہتی ہے اور اس بیماری کے وسیلے سے اُن کے عاشق صاحب کو اس قدر بہترین موقعے حاصل ہوتے ہیں کہ حد نہیں۔ جب دیکھو جناب مریضہ کو سہارا دیے دوا پلا رہے ہیں، اس کے نازک ہاتھوں کی نازک ترین نبضیں ٹٹول رہے ہیں، اس کے پیاسے لبوں میں انگور کا رس نچوڑ رہے ہیں۔ اس ناول کو پڑھ کر بے اختیار اس کا دل بیمار پڑنے کو چاہا کرتا، وہ اُن رنگین لمحوں کا حسین تصور جس کے خیال ہی سے اس کی نبضیں اچھلنے لگتیں اور حرارت تیز ہو جاتی تھی۔

مگر اب جو وہ بیمار پڑی تو یہ حال کہ تیماردار تو درکنار زینے سے لوگ اس کے سامنے چیخ چیخ کر بولتے، بچے لڑتے اور پٹتے، سامنے برآمدے میں اناج پھٹکے جاتے، ہاون دستے میں ہلدی دھنیا کوٹا جاتا، بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ اس کی آواز نہ نکلتی سامنے لوگ لڑ لڑ کر تاش پچیسی کھیل رہے ہیں، پانی مانگا تو کون کھیل چھوڑ کر اُٹھے، نوکر کو آواز دی جا رہی ہے اور وہ بھی ایسے چنگھاڑ کر کہ مردے بھی اٹھ بیٹھیں .... ذرا غنودگی طاری ہو جاتی تو پھر کسی کی "وہ مارا" کے نعرے سے آنکھ کھل جاتی۔

سامنے روز لمبا چوڑا دسترخوان بچھتا، تر مال اڑائے جاتے۔ شمن کی روح بلبلا بلبلا کر کانوں پہ منڈلاتی، آنکھیں خوان دیکھ دیکھ کر پتھرا جاتیں، قوتِ شامہ کھانے کی مہک کے حملے سہتے سہتے سُن پڑ جاتی۔ بھائی بہن مزے دار کھانے دکھا دکھا کر کھاتے اور اوپر سے چڑا دیتے۔ سب اس کے ندیدے پن کو اس کی کمزوری اور فطری پستی پہ محمول کرتے، اس کی بیماری کی وجہ سے کمزور آنے

پریشان نہیں عاجز ضرور تھے۔ تبھی تو اس کا ایک دن جیا جب خاندان کے دو بڈھوں کو جنازے کی نماز پر بحث کرتے سُنا۔ وہ دونوں اس کی طرف مُنہ کیے رہرسل سی کر رہے تھے اور اُسے یہی معلوم ہوا کہ گویا اُسی کی نمازِ جنازہ پڑھنے کی تاک میں تیاریاں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہر وقت وضو کرتے تھے مگر اس قدر بدبو جسم سے پھوٹتی تھی کہ دم لوٹا جاتا تھا۔ دوسرے قطعی خبطی تھے۔ یعنی ان دونوں میں سے کسی کی پڑھائی ہوئی نماز سے جنّت میں جانے کی متوقع نہ تھی۔ پھر چند لوگ بیٹھ کر کفن کی لمبائی چوڑائی پر بحث کرنے لگے۔ دوران گفتگو میں وہ کاغذ کے نمونے موڑ موڑ کر تشریح کرتے جاتے، بیٹھے موڑ کر اس نے سسک سسک کے رونا شروع کیا اور جب وہ سب چلے گئے تو اس نے ڈرتے ڈرتے اس کاغذی کفن کے نمونے کو دیکھا۔ کس قدر ناکافی تھا یہ لباس خدائے ذوالجلال کے حضور میں جانے کے لیے، بھلا اگر ایک سِلا ہوا جوڑا خراب ہو جائے گا تو کون سا ایسا ٹوٹا آجائے گا۔ موت سے اُسے اور بھی ہول نظر آنے لگا۔

مگر موت اتنی بھیانک نہ تھی جتنی موت کی آؤ بھگت۔ معلوم ہوتا سب کو اس کے مرنے کا پُراشتیاق انتظار ہو رہا ہے اُسے نفرت ہو گئی۔ سب سے نفرت ہو گئی زندہ یا مردہ وہ اُن کے لیے مر چکی تھی۔ یا شاید کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ یہ کون تھے سب اُس کے؟ مانا کہ سب بھائی بہنوں نے ایک ہی ماں کے شکم میں تکمیل پائی تھی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ ایک مکان میں ہزاروں کرایہ دار آتے ہیں رہتے ہیں چلے جاتے ہیں...... سڑک پر کتنے انسان چلتے ہیں جھگڑتے گھسٹتے ہیں۔ لاریاں دوڑتی ہیں وہ کون ہیں ایک دوسرے کی؟......

کوئی نہیں! اس نے جواب دیا۔ اور وہ اُسے مل گیا۔

تین مہینے کے بعد بخار تھک گیا لیکن اُسے بھی بُری طرح تھکا گیا۔ ایک تو بیماری دوسرے اس قدر غیرِ دل چسپ، جب وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے چل کر پلنگ سے کرسی تک جانے کے قابل ہوئی تو بجائے خوشی کے اُسے رونا آگیا۔

بال سب جھڑ گئے تھے، ہاتھ پیر جلی لکڑی کی طرح خشک اور صورت ایسی جیسے مردہ کفن پھاڑ کر نکل آیا ہو۔

اُسی زمانے میں نوری بھی ایک ہفتے کے لیے آئی۔ وہ سال بھر سے اپنی ددھیال رہنے چلی گئی تھی۔ بڑی آپا بھی میکے کی روٹیوں سے تنگ آ کر دہیں ایک اسکول میں لڑکیوں کو پڑھانے لگی تھی۔ جوانی لہراتے پھنکارتے سانپ کی طرح پلک جھپکتے میں دوڑ گئی، کچھ یونہی سی دھندلی لکیر باقی تھی۔ بوڑھی خرانٹ ساس اُس کے مُنہ پر بار بار حقارت سے اُس گذرے ہوئے سانپ کا تمسخر اڑاتی، وہ خوش تھی کہ بہو جلد از جلد بوڑھی ہو کر خطرے کی حدود سے نکل رہی تھی۔ اسی لیے تو اُس نے کٹھن زمانہ گذارنے کے لیے میکے بھیج دیا تھا، کہ کچھ تو باپ بھیّوں کی لاج پیروں میں بیڑیاں ڈالے رہے گی۔ وہ اب اُسے اپنا ہم عمر سمجھنے لگی تھی۔ بات بات پر اُسے گردن توڑ بخار کی طرح چڑھتے ہوئے بڑھاپے کی طرف متوجہ کر کے رہی سہی زندگی بھی نچوڑ لینے کی کوشش کرتی۔ بڑی آپا ایک زندہ شہید کی طرح سر اونچا کیے خاموش رہ جاتی۔ اُسے اس ساس سے کافی نفرت تھی یہی تو وہ ڈاین تھی جس نے شادی شدہ زندگی کے تین مختصر سال طعنوں اور اعتراضات سے حد درجہ مکدر بنا دیے تھے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ یہ دنیا اتنی مختصر زندگی لے کر آئے گی۔ وہ تو سوچتی تھی کہ آخر ایک دن وہ ہو گی اور اس کا میاں اگر اُسے اس دن کی خبر ہوتی تو بڑھیا کے مُنہ پر خاک ڈال ان تین سالوں کو کلیجے سے لگا کر رکھتی۔ بڑھیا اکلوتے بیٹے پر دیوانی تھی مگر جب کبھی وہ بیوی کی طرف زیادہ راغب نظر آتا تو جل کر خاک ہو جاتی۔

"لے بھئی یہ ہر وقت کے چونچلے ......" وہ ناک سکوڑ کر طعنہ دیتی اور بڑی آپا شرم سے پانی پانی ہو جاتی وہ جلدی سے اپنے آپ کو اس کے ترستے ہوئے ہاتھوں سے چھڑا کر بھاگ آتی اور ساگ بینے لگتی۔ دور بیٹھا وہ حسرت سے تکا کرتا، ارمان بھرے اشارے کرتا۔ ترسی ہوئی نظروں سے گھورتا جیسے وہ اس کی جائز بیوی نہیں پرائی عورت ہو۔ مگر وہ نہ جاتی۔

جونہی وہ کالج سے آتا بڑھیا اپنے امراض کا پوٹلا بکھیر کر بیٹھ جاتی اور اُسے گھیرے رہتی، جونہی وہ اپنے جان چھڑا کر بیوی کے پاس آتا وہ بہو کو فوراً کسی ضروری کام کے بہانے بلا لیتی۔ بہو صبر کی سِل کلیجے پر دھرے بیٹھی رہتی۔ ہاتھ کام میں لگے رہتے مگر دل میاں کی آدھی بات میں

"اے دلہن کام میں جی نہیں لگتا تو جاؤ، اے ہاں نہیں تو" وہ اس کے دل کا حال معلوم کر کے نئے طعنے سے اس کے قدم جکڑ دیتی جب اُسے یقین ہو جاتا کہ بہو دانا امید ہو چکی ہے اور بیٹے کا مزاج کافی گرم ہو گیا، چاؤ چونچلے کا خطرہ ختم ہو گیا تب وہ اُسے چھوڑ دیتی۔

میاں کا پارہ اتارنے میں ساری خوشامدیں سارے لاڈ چین کے آنسو سب میں وہ پہاڑ سے دن کاٹتی، مٹی میں مل جاتے۔ دبے چھپے لفظوں میں شکایت بھی کرتی۔ معافی مانگتی۔ مگر چڑھا ہوا بھوت یوں آسانی سے تھوڑی اُترتا۔ پھر ساس کو خبر ہو جاتی تو وہ اور جلے پر پھول بھی

"اے ہم نے تو کبھی میاں کی جوتی پر ناک نہیں رگڑی، وہی بچارے اللہ بخشے ہماری تین سو ساٹھ منا کرتے تھے، پر آج کل کی لڑکیوں کا تو بس...... توبہ ہے۔ مٹی جاتی ہیں خصم پر۔"

وہ خاموشی سے یہ سب کچھ سُن لیتی اور یہ سوچ کر صبر کر لیتی کہ کبھی تو یہ طعنے قبر کے کونے میں دفن ہو ہی جائیں گے، اُسے اُلٹا بڑھیا پر رحم آنے لگتا۔ وہ اُسے تختۂ غسل پر لا چار و بے بس آخری سفر کے لیے تیار دیکھتی۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اُس کا تیجہ وغیرہ دھوم دھام سے کرے گی تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ تعلیم یافتہ بہو کے ہاتھوں بڑھیا کی عاقبت بھی مٹی میں مل گئی۔ حالانکہ اُسے پختہ یقین تھا کہ خواہ کتنے ہی تیجے، چالیسویں کیے جائیں بڑھیا بغیر تاوان دیے اپنی زیادتیوں کے عذاب سے نہ بچ سکے گی، تھوڑا بہت تو عذاب بھوگنا ہی پڑے گا۔ اگر یوں نیاز نذر سے کام چل جاتا تو پھر کیا کہنے تھے، اور پھر تو وہ فراخ دلی سے تیجا کرتے بھی گھبراتی۔

مگر بڑھیا اس کے گلے میں چکی کے پاٹ کی طرح لٹکی رہ گئی اور خود اس کی راتیں سونی ہو گئیں اور دن بھیانک کانٹوں سے بھر گئے۔

لڑکی اب جوان ہو رہی تھی۔ لہٰذا ساس ہر وقت بہو کو چال چلن سے رہنے کی

تلقین کرتی، یا تو وہ خرچے کے ڈر کے مارے کسی سے ملتی جلتی نہ تھی یا اب سارے کنبے کے لڑکوں کی بلائیں لینے پر تل گئی، ساس اور بہو نے مل کر لڑکا گھیرنے پر کمر باندھ لی۔ علاوہ نوری کی ذاتی صفات کے اس کی یتیمی کا سارٹیفکیٹ ہر جگہ کار آمد ثابت ہوا اور جلد ہی ایک نہایت مال دار اور اکلوتے لڑکے کو اس پر عاشق کرا لیا گیا۔ اس کے کنبے والوں نے لاکھ اودھم مچائی مگر ایک نہ چلی۔

نوری جب آئی تو نہایت شرمیلی اور فرمانبردار بن کر آئی۔ بڑی آپا بڑی جانفشانی سے جہیز جمع کرنے لگی اس نے ایک دم سارے خرچے بند کر کے تنگی میں گذر کرنی شروع کر دی نوری بھی پھٹے پرانے کپڑے بڑے شرمیلے فخر کے ساتھ پہن لیتی ہر چیز جہیز کے لیے رکھ دی گئی گو لڑکا ابھی میٹرک میں پڑھتا تھا اور انگلینڈ جانے والا تھا اور اس طرح نوری کو کم از کم سات سال امیدواری میں گذارنے تھے مگر وہ آنے والی خوشگوار زندگی کے حسین خوابوں کے نشے میں کچھ بھی تو نہ محسوس کرتی وہ ان جھنجھٹوں کو چوتھی کے جوڑے کی امید میں کلیجے سے لگا کر پہنتی۔

اُسے اب احساسِ بزرگی بھی ہو چلا تھا۔ اُس نے سارا چلبلا پن چھوڑ دیا تھا اور ایک دم گھر والیوں کی طرح سنجیدگی اختیار کر لی۔ وہ شمن سے اپنے آپ کو کچھ برتر خیال کرنے لگی تھی اس کا مول اتنی جلدی ہو گیا، اور جس طرح دکان میں رکھی ہوئی چیزوں میں سے کسی ایک چیز کا مول تول غیر متوقع قیمت پر ہو جائے۔ کوئی گاہک کا پورا آن پہنچے تو باقی کا مال حقیر پڑا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح شمن بھی کچھ بیچ اور حقیری سی رہ گئی اُسے ایک ہلکا سا احساس کمتری بھی ہونے لگا۔ آخر وہ کیوں زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے رہ جاتی ہے؟ بیماری سے اٹھی ہوئی دُم کچی مرغی کی طرح وہ بدہیئت اور حقیر نوری کی رومانی کم سنی کے آگے ایک متعفن پھوڑا معلوم ہوتی۔

اسی عرصے میں کالج سے لوٹتے میں انجم دو چار روز کے لیے آیا۔ جب اس کا خط آیا تو کسی کو پڑھ کر سنانے کی مہلت بھی نہ ملی وہ خود ہی تانگے میں بیٹھ کر گھر تلاش کرتا آن پہنچا لیکن جب لوگوں نے اُسے دیکھا تو اللہ کی شان یاد آنے لگی وہی سوکھا یا رابد وضع جانور ایک وجیہہ نوجوان بن چکا تھا۔ اس کا گٹھا ہوا سر چمکیلے بالوں سے آراستہ تھا قیمتی سوٹ کیس میں رکھے ہوئے کپڑے

کو انہیں بھی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکیں۔

اُسے دیکھ کر شمن کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ معلوم ہوا وہ برسوں کی کھوئی ہوئی چپل نہ جانے کس گم نام کونے سے اچھل کر اس کے منہ پر لگی، وہ خود بخود پیچھے سمٹ گئی۔ سوتی چہرہ کے مارے ہوئے بال اور بھی بے رونق اور سوکھے ہاتھ زیادہ ڈراؤنے نظر آنے لگے اس نے اُسے دیکھتے ہی ایک دم اس کے خلاف ایک مورچہ قائم کر لیا وہ اپنی پرانی نفرت کو اعجاز کے سامنے جھکتا دیکھ کر اور بھی چڑ گئی۔

اعجاز بالکل نیا چولا بدل کر آیا تھا وہ جھینپ اور چھچھورا پن تو کوئی اس کی موجودہ ذات سے کسی طرح وابستہ نہ کر سکتا تھا۔ نہایت چرب زبان ہنس مکھ اور دلیر، آتے ہی اس نے جھٹ سے شمن کو گھورا، وہی بھوکی آنکھیں کس گستاخی سے اس کے آر پار تیرتی چلی گئیں

"ارے یہ شمن آپا اتنی دبلی۔ اور تمہاری چوٹی کیا چوہے کتر گئے بھئی واہ" اس نے قہقہے لگانا شروع کیے اور شمن جھلا کر رہ گئی لوگوں نے اُسے باتوں میں لگا لیا۔ کسی نے بھی تو یہ نہ بتایا کہ وہ ابھی بیماری سے اٹھی ہے، یہ نہیں کہ وہ اعجاز کے سامنے اپنی بد صورتی کا کوئی عذر پیش کرنا چاہتی تھی، بلکہ یونہی، کیوں وہ غلط فہمی میں مبتلا رہے۔

وہ اس کی جان کو ایک بلا بن کر آیا، دن بھر قہقہے لگاتا، آیا تو دو دن کے لیے تھا مگر دو ہفتے بعد بھی بہانے بنا کر رہے چلا جا رہا تھا۔ لوگ اس میں اس قدر دلچسپی لینے لگے تھے کہ روز روز وہ کسی نہ کسی بہانے سے روک لیا جاتا۔ نزہت تو اس سے خوب گھل مل کر باتیں کرتی وہ بھی اس کے ہونے والے میاں کی باتیں کر کے چھیڑا کرتا۔ وہ سارے کام چھوڑ کر بس اعجاز سے الجھا کرتی۔

شمن کا جی چاہتا کوئی اعجاز کو اس کی پرانی تصویر دکھا کر اسے وہ غلاظتیں بھی تو یاد دلائے جو وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا نہ جانے لوگ اپنے ماضی کو کس طرح اس قدر آسانی سے جھٹک کر آگے بڑھ جاتے ہیں، اُسے ان لوگوں سے سخت نفرت تھی جو پہلے والے غریب بدھو، کم عقل اجڈ کو بھول کر اس نئے انسان کی آؤ بھگت کرنے لگے تھے، وہ اسے کیسی کیسی حقارت بھری ٹھوکریں مار چکے تھے مگر آج اس پر فدا تھے، وہی منجھلے بھائی

جن کے سامنے وہ ناک پکڑ کر اٹھک بیٹھک کر چکا تھا اُسے موٹر میں لیے لیے گھومتے، وہی اماں اُجو اگر وہ کتوں کا کھانا چرا لیا کرتا تھا تو صبح کا ناشتہ بند کر دیتی تھیں اب مرغن کھانے اس کے منہ میں ٹھونسے دیتی تھیں، کبھی وہ دن بھی تھے کہ ذرا دیر تک سوتا رہتا تو اجو پر پانی کا لوٹا اوندھا کر اس کی چارپائی اُلٹ دی جاتی تھی آج وہ دن چڑھے تک سوتا رہتا پھر بھی لوگ یہی کہتے، "اللہ رکھے جوانی کی نیند ہے سونے دو"، شمن سلگ کر رہ جاتی، لوگ سچ بولتے کیوں ڈرتے ہیں، یہ کیوں نہیں کہتے روپے کی نیند ہے، اس جائداد کی نیند ہے جو اس کے چچا نے اپنی زندگی ہی میں اس کے نام کر دی تھی۔ بڑا ذلیل تھا اعجاز، وہ اُن کی ٹھوکریں جیسے بھول گیا؟ سچ کہیں کا جب لوگوں نے ٹھوکا جب بھی خاموش اور شاکر رہا اور جب کہ وہی لوگ اپنا تھوکا چاٹ رہے تھے وہ نہایت خوش تھے۔ یہ کیوں اور کیسے؟ .... مگر شمن اب بھی وہی شمن تھی۔ وہ اب بھی اعجاز کے وجود پر تھوکنے کو تیار تھی وہ گھنٹوں بیٹھ کر لوگوں کے ساتھ تاش کھیلتا، ہنسی مذاق کرتا مگر شمن اُن سب سے دور کسی نہایت غیر دلچسپ کام میں ڈوبی رہتی۔ وہ اعجاز سے بالکل مخالف سمت چلتی، اگر وہ اس سے کبھی کچھ کہنا بھی چاہتا، یونہی کوئی نہایت معمولی سی بات تو وہ سُنی اَن سُنی کر جاتی۔

جب سے وہ آیا تھا لوگ نئے نئے پینتروں سے ہر وقت اس کی شادی کا ذکر کرتے۔ ٹریا آپا بے چاری کے تو ہاتھ کٹ چکے تھے، وہ نوری کے لیے ہاں کر چکی تھی حالانکہ کئی دفعہ اس کی نیت بہک بھی گئی۔ سال دو سال میں اعجاز نوکر ہو جائے گا۔ اور وہ ہونے والا داماد نہ جانے کب جل میں جوتنے کے قابل ہو؟ ...... اس کے علاوہ اور سارے خاندان کی لڑکیاں اس کے قدموں میں لا ڈالی گئیں مگر وہ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتا۔

اتفاق کہیے یا قسمت، انہی دنوں بلقیس اور جلیس اپنی خالہ کے یہاں آ گئیں زنانہ کلب میں اچانک شمن سے ملاقات ہو گئی، بلقیس بال برابر بھی تو نہ بدلی تھی،

وہی چلبلا پن چیخ چیخ کر بولنا اور اونچے اونچے قہقہے، شمن سے اس قدر کھینچ کھینچ کر گلے ملی کہ شانے دکھنے لگے۔ گھُل مل کر دونوں میں باتیں ہوئیں، بلقیس اپنی خالہ کے یہاں زنانے کالج سے عشق لڑانے آئی ہوئی تھی۔ خالہ کا گھر اچھا خاصہ بھرتی کا دفتر بنا ہوا تھا، شہر کے تمام شادی کے قابل یا قابل ہونے والے لڑکے اُن کے یہاں حاضری دیتے تھے تین چار اپنی لڑکیوں کے علاوہ وہ اپنے عزیزوں کی لڑکیوں کے نصیبے کھولنے میں ملکہ رکھتی تھیں انھیں اس قدر مشق ہو گئی تھی کہ جیسا لڑکی کا جس لڑکے سے چاہیں جوڑ لگا دیتیں، لڑکیاں کتنا ہی چاہیں کچھ بس نہ چلتا کھٹ سے تیمت لڑکے کا رخ دیکھتے ہی تصویر کی طرح ہر طرح چین زادے نکال کر پھینک دیے جاتے ان کا آنا ایک لخت قابلِ اعتراض ہو جاتا۔

بلقیس خالہ کی تمام سہولتوں کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی، پڑھائی چھوڑ کر اس نے کچھ دن سلیقہ اور فیشن سیکھنے کے لیے انگریزی اسکول میں نام لکھوا لیا تھا اور وہاں سے ایسی دھار دار ہو کر آئی تھی کہ حد نہیں۔ عجیب بات اس لڑکی میں یہ تھی کہ وہ ہر اُس نسوانی حربے کا جو مرد کو مارنے کے مصرف میں آتا ہے فخریہ ذکر کرتی، چالاکیوں، خود غرضیوں اور مکاریوں کا بڑی معصومیت سے اعتراف کرتی۔

"عیسیٰ مجھے خاک پسند نہیں پر جب میں نے اسے ستار سنایا تو کم بخت مر گیا جیسی نے وائلن بجایا مگر بے چاری شرما گئی۔

منور جاتو ہے، پتہ ہے کل برنارڈ شا میرے لیے نہ جانے کہاں سے ڈھونڈ کر لایا۔ بڑا پڑھا کو ہے، کہتا ہے پروفیسر بنوں گا۔ اب بھلا شمن کتنے سال لگ جائیں گے کم از کم چار سال رکھ لو۔ بھلا کون بیٹھا رہنے دیگا مجھے؟ اختر سپرنٹنڈنٹ پولیس ہے جان کو آ گیا ہے۔۔۔۔ مگر میں نے ابھی تو کسی کو جواب نہیں دیا ہے۔ خدا قسم جو اختر میرے لیے ہیرا جیسی انگوٹھی نہ لایا تو کبھی جو کر جاؤں منگنی۔

خالہ بی کہتی ہیں اختر خاصہ ہے، مگر میں کہتی ہوں موئے کی جائداد جدی بڑی ہے ۔۔۔۔۔ پتہ ہے تین موٹریں ہیں اور ۔۔۔۔۔

کلب کے بعد وہ شمن کو اپنی خالہ کے گھر لے گئی اور دوسرے دن دونوں بہنیں بغیر کہے سنے آ دھمکیں شمن کے گھر۔ یوں تو گھر اچھا خاصہ تھا مگر بے سلیقہ پن اور لاپرواہی کی وجہ سے

یہ حال تھا کہ دو چار ٹوٹی کرسیاں میلی دریوں کے تخت، اور بان کی کھرّی چارپائیوں کے سوا کچھ اٹھنے بیٹھنے کا انتظام نہ تھا۔

جھینپتی کھسیانی شمن انھیں اپنے کمرے میں لے آئی، اس کا کمرہ کہنا بالکل بے جا تھا، اسی جگہ کچھ صندوق چینی کے برتنوں کی الماری بھی تھی، ایک طرف چھت میں بڑا اول کا سامان جھول رہا تھا۔ کونے میں جالا لینے کا بانس کھڑا تھا، جسے کبھی حرکت نہ دی جاتی۔ مکڑیوں اور چھپکلیوں کا پرسکون راج قائم تھا۔

"اپنے کمرے میں چلو نا" بلقیس نے چپکے سے اس کے کان میں کہا اور شرم کے مارے شمن کا جی مر جانے کو چاہا۔ روپے کی کچھ بھی نہ تھی پیش ہی اتنی کافی تھی کہ اگر چاہتے تو ڈھنگ سے رہنا مشکل نہ تھا۔ پنشن سے بھلے کون سے ٹھاٹھ تھے ویسے گھر میں بیند، بیس نوکر اور مفت خورے موجود۔ باہر چار چار بھینسیں گھوڑے کتے مرغیاں وغیرہ بھری پڑی تھیں، باہر تو کچھ بیٹھنے کے لئے مونڈھے وغیرہ تھے بھی مگر گھر میں بڑی بڑی بیویاں بھی آتیں تو لشتم لیشتم پلنگوں اور تختوں پہ چادریں بچھ جاتیں۔ اس لئے کبھی کسی کو اپنے گھر کی حالت نہ بتائی تھی۔ اور بلقیس جلیس سے دو چار دفعہ گپ بھی مار دی تھی، وہ تو اس گھر میں پیدا ہو کر پچھتائی تھی۔ کاش وہ کہیں اور جنم لیتی۔ اتنے بہن بھائیوں کے بجائے دو ایک لائق فائق بھائی اور وہ ایک اکیلی لاڈلی بیٹی ہوتی، کوٹھی بنگلہ ہوتا صوفے اور کوچیں ہوتیں، چاہنے والے چچا اور قربان ہونے والی خالائیں ہوتیں......... کاش اس کے گھر میں بھی ایک باغ ہوتا اور وہاں نارنگی اور لوکاٹ کے پھول مہکا کرتے جنھیں توڑنے کے لیے اس کی انگلیاں حسین اور نازک ہو جاتیں۔ مگر......... یہ تو اسے خواب میں بھی میسّر نہ ہوا، اس نے خواب بھی سدا بھیانک اور ڈراؤنے ہی دیکھے، بھوتوں اور چڑیلوں کی دنیا کے۔

وہ بلقیس اور جلیس کو لے کر احاطے کے ایک سنسان کونے میں چلی گئی، یہ کونا بھی کوڑے کرکٹ ٹوٹی ہوئی اینٹوں، بوسیدہ ڈلیوں اور ٹوٹی موٹی جھلنگوں سے پٹا پڑا تھا، مگر بلقیس بڑی بے تکلفی سے دہلیز پر اخبار کا کاغذ بچھا کر بیٹھ گئی جلیس لونڈی کے رومان سننے اور املیاں بیننے چلی گئی۔

گھنٹوں سر جوڑے وہ نہ جانے ایک دوسرے کو کیا باتیں بتاتی رہیں بلقیس نے

اُسے بتایا کہ وہ کس طرح تن دہی سے شادی کی تیاریوں میں لگی ہوئی ہے اور وہ تمام تیاریاں یہ تھیں کہ اتنے ڈھیر سے لڑکوں میں سے ایک زندگی کا ساتھی چننا تھا اتنے جنوں میں سے ایک کو چن لینا اور باقیوں کو مونگ پھلی کے چھلکوں کی طرح جھاڑ دینا۔ بلقیس جیسی جذباتی لڑکی کے لیے کتنا مشکل تھا۔

"آخر تمہیں محبت کس سے ہے ؟"

"محبت جو سچ پوچھو تو مجھے عباس سے ہے، بچپن سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور پھر ہمارے خیالات بھی ایک جیسے ہیں۔"

"چہ .... چھوٹی! پہلے کہتی تھی میں انصار پر مرتی ہوں، بڑا قوم پرست ہے، یہ ہے، وہ ہے" شمن نے چڑ کر کہا۔

"ہے تو وہ قوم پرست مگر بہن سچ بتاؤ گذر کیسے ہو سکتی ہے اس کی؟ بھئی بات یہ ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو مجھے سوسائٹی پسند ہے۔"

"بلقیس حد مکار ہو تم بھی، محبت میں تو انسان ان باتوں کو سوچتا بھی نہیں۔"

"مگر اصل میں تو مجھے اختر ہی سے زیادہ محبت ہے۔"

"ہنہ! اختر سے یا اُس کی نئی موٹر سے۔"

"چہ بھئی تم تو ہو بے وقوف، موٹر اس کی خاک پسند نہیں، خدا قسم موسے کی موٹر دیکھو تو بس مر جاؤ۔

"تو پھر محبت ؟"

"محبت تو غریبوں ہی سے زیادہ ہوتی ہے مگر ......"

"مگر ؟"

"مگر شادی تو امیر ہی سے کرنا پڑتی ہے ...... کیوں ہے نا بھئی ؟"

"کیوں ؟" یہ تو بالکل رنڈیوں جیسی بات ہوئی۔"

"ہشت، رنڈیوں جیسی کیوں ہوئی، اور اگر ہے بھی تو کیا ہوا شمن ایک ہی تو بات ہے"

"کیا ؟"

"ہاں بھئی، دیکھو........ آپ جیسے...... اُنہہ بھئی مجھے نہیں معلوم تم تو بحث کرتی ہو، چہ تو بہ ہم کیا باتیں کرنے لگے...... شمن میں نے کل نماز پڑھی تھی۔"

"اچھا......؟"

"ہاں اختر نے کہا تھا میں شلوار قمیص میں بالکل لیلیٰ معلوم ہوتی ہوں، وہ جو میرا کالا شنان کا ستاروں والا دوپٹہ ہے میں نے ایرانیوں کی طرح لپیٹ کر اوڑھا تو کہنے لگا......"

وہ کچھ رکی۔

"کیا کہنے لگا؟"

"کہنے لگا لاؤ تمہاری تصویر کھینچ کر دیلی میں بھیجوں گا...... میں نے کہا جائے نماز پر کھڑی ہو جاؤں تو زیادہ اچھا رہے گی...... مگر شمن کھڑے ہو کر تو حد بُری لگی تو میں بیٹھ کر دعا مانگنے لگی...... تصویر کھینچ کر...... ہی...... ہی" وہ ہنسی

"کیا؟ کیا؟"

"دہی کم بخت پیار کر لیا، بدتمیز کہیں کا؟ بلقیس بن کر شرمانے لگی۔

دونوں ہنس رہی تھیں کہ اعجاز خاص معشوقانہ انداز سے ریکٹ گھماتا ہوا برآمدے میں آ نکلا۔

"اوہ؟ معاف کیجئے گا" وہ جلدی سے مڑ کر جانے لگا۔

"حد!!!"

"کیوں؟"

"کون تھا یہ؟ ہائے بالکل فریڈرک مارچ کی سی شکل ہے" بلقیس نے زور سے شمن کا بازو مسل کر پوچھا۔

"ہے ایک ہمارا رشتے کا بھائی"

"اچھا؟ بے ایمان کہیں کی"

"واہ!" شمن مسکرائی۔

"جان ہے خدا قسم، شرطیہ تم مرتی ہو اُس پر"

"ہُنہ، کبھی بھی نہیں۔"

"ہائے بڑی بدمذاق ہو، خدا قسم وہ...... وہ دیکھو ادھر ہی دیکھ رہا ہے۔ تمہیں گھور رہا ہوگا" وہ پھر اترائی۔

"چُپ گدھی کہیں کی" شمن نے اس کے خوب چٹکیاں لیں، کوئی غیر مانوس سی چیز دل میں کلبلائی مگر وہ جھلّائی ہی رہی۔

جب بلقیس اور تلبیس جانے لگیں تو اعجاز پھر باہر نکل کر کسی لڑکے سے فضول باتیں کرنے لگا جب اُن کی موٹر چلی گئی تو وہ شمن کی طرف مڑا وہ جلدی سے اندر چلی آئی۔

شام کو کھانے کے وقت اعجاز جان بوجھ کر اس کے پاس گھس کر بیٹھا، کہیں بلقیس کی باتیں سُن تو نہیں لیں بدذات نے؟ دو چار میٹھی باتیں بھی کرنے کی کوشش کی۔ مگر شمن نے کسی بہانے سے اٹھ کر جگہ بدل لی۔ وہ پان لگا رہی تھی کہ پاس آ بیٹھا۔

"ایک ہمیں بھی پر بھئی مُنہ نہ کاٹ دینا"... وہ اترا کر بولا شمن نے جب پان دیا تو اُس نے اُس کی انگلی پکڑنے کی کوشش کی، شمن نے جل کر پان چھوڑ دیا یہ فرسودہ رومان اُسے ایک آنکھ نہ بھایا اُسے اُن گونگے عاشقوں سے سخت نفرت تھی جن کا رومان بولتا ہے پر مُنہ سے نہیں پھوٹتے۔

"لاؤ میں پڑھا دوں" اُسے پڑھتا دیکھ کر وہ پاس آن بیٹھا۔

"پڑھ چکی" شمن نے شرارت سے کتاب بند کر دی اور جوتا پہنتی چل دی، وہ خوب اس کی چالوں کو پہچان رہی تھی' وہ آج پھر وہی پرانا بھوکا اچّو معلوم ہو رہا تھا اور اردگرد ایسا منڈلا رہا تھا جیسے گوشت پر چیل، شمن جان جان کر اُسے دھتکار رہی تھی اعجاز کو پیاسا بلبلاتا دیکھ کر وہ دل ہی دل میں تری محسوس کر رہی تھی۔

دو دن تک وہ ترستا رہا۔ مگر شمن نے اُسے بولنے کی مہلت نہ دی۔ مگر رات کو جب سب کچھ سو چلے تھے وہ باہر سے کسی بہانے سے آیا پہلے تو وہ حسب عادت دکھانے کے لیے کچھ ڈھونڈتا رہا، پھر پانی پینے لگا رک رک کر اس نے پورا گلاس چڑھا لیا شمن ہنسی دبائے خاموش پڑی رہی وہ مڑا تو شمن نے آنکھ کے گوشے سے دیکھا کہ

وہ واپس لوٹا۔

"شمن" اُس نے آہستہ سے پکارا۔

"کیا ہے؟"

"یہاں بیٹھ جاؤں" مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دے اعجاز پلنگ کے کونے پر بیٹھ گیا۔

"شمن ایک بات کہوں؟ ..... کئی دن سے ......" اس کی آواز اٹک گئی شمن کے ہاتھ بے پرسکون ہونے لگے جیسے جو اس ایک نقطے پر جمع ہو کر بھنچنے لگے۔ اُس نے سانس روک لی۔

"تم جانتی ہو دو سال کی ٹریننگ اور ہے اور پھر کسی اچھی جگہ پوسٹ ہو جاؤں گا چچا میاں کی جائداد بھی کافی ہے مگر میں سوچتا ہوں شمن اگر ایک کوٹھی خرید لی جائے تو"

"کوٹھی اور باغ ...... نارنگی کی کلیاں ......" شمن کی انگلیاں اینٹھنے لگیں۔

"میرے خیال میں میری حیثیت کا انسان ایک تعلیم یافتہ لڑکی کے لیے ناموزوں تو نہیں ...... ٹھیک ہے نا"

"اعجاز" اُس نے سانس کو پھیپھڑوں میں گھونٹا۔

"ہاں شمن ...... یہ لوگ تو جاہل ہیں ...... کچھ نہیں سمجھتے، احساس کمتری ہے اور کچھ نہیں، تو بس اب تمہارے ہاتھ میں ہے سب کچھ شمن"

"میرے ...... میرے ہاتھوں میں ......" شمن نے زور سے مٹھیاں بھینچ لیں تاکہ وہ نامعلوم سی دولت کہیں رینگ نہ جائے۔

"وہ تمہاری دوست ہے نا ......"

"ایں؟" شمن نے مضبوطی سے پیٹ میں ہوا روک دی۔

"ہاں ...... بلقیس تمہاری پرانی دوست ہے ...... تم چاہو تو شادی کروا سکتی ہو"

"مگر ......"

"بھئی دیکھو بہلانے مت بناؤ، ہماری بھتیجی کیسی، خدا قسم جو تم کہوگی...... وہ تمہیں ہارڈی کا تیمر طے سے والا پور اسیٹ پسند ہے نا......"

"مگر......" اس نے اُسے روک کر کہا، "بلقیس کا ٹیسٹ بہت اونچا ہے...... معاف کرنا اعجو......" وہ سنجیدہ ہو کر بولی "وہ ذرا اور قسم کی لڑکی ہے"

"مگر شمن...... میں کافی آزاد خیال ہوں......"

"میرا مطلب ہے آج کل لڑکیوں کو آزاد خیالی سے زیادہ کلچر چاہیے......"

"تو......"

"اور وہ خاندان دیکھتی ہیں، معاشرت دیکھتی ہیں، بلقیس کے امیدوار زیادہ تر تو نوابوں ہی کے خاندان سے ہیں۔ دوسرے تم سوچتے ہو یہ تمہاری جائداد بہت ہی زبردست ریاست ہے کہ......"

"میں یہ تو نہیں کہتا......" اعجاز کی آنکھوں میں اُسے بھوک اور شکست جھلکتی نظر آئی۔

"فضول بکواس ہے"

اعجاز سر جھکائے چلا گیا، وہ خاموش بے حس و حرکت پڑی رہی...... کچھ نہ سوچا، اُسے تو بس ایک احساس تھا کہ اس نے نارنگی کے جھاڑ میں ہاتھ ڈالا اور کسی زہریلے ناگ نے پھن مار دیا۔ زہر کی طرح کوئی چیز سنسناتی لہراتی اس کے دماغ کی طرف چڑھتی چلی گئی جسے جھٹکنے کی بھی اس نے کوشش نہ کی۔

کیا اُسے اعجو سے محبت ہو چلی تھی؟...... چھ، توبہ کیجیے، اس واہمے کو سوچ کر وہ ہنس پڑی۔ پھر؟ اس نے اس کا جواب پانا ضروری نہ سمجھا۔

اعجاز کے جانے سے پہلے اس کی شادی کا ذکر چھڑا، وہ کچھ دل برداشتہ سا رہا چونکہ شمن کے والد نے اس کی پرورش میں کافی پیسہ خرچ کیا تھا اس لیے پہلا حق تو انہیں کو پہنچتا تھا۔ اس سے قبل کہ کچھ اعجاز سے کہا جاتا اُس نے نوری سے کہہ دیا کہ وہ اعجاز کے علاوہ ہر جانور سے شادی کر سکتی ہے، جھگڑے اٹھے، کچھ رونے دھونے

کے ڈھونگ رچے مگر کالج جاکر اس نے صاف صاف انکار لکھ دیا، اور اس قدر بے حیائی سے کہ یہ سانحہ خاندان میں تاریخ بن گیا۔ ابّا زِچ کھسیانا اور متحیر سا رہ گیا لیکن اس کا ذکر اس نے کسی سے نہ کیا...... اور شمّی؟ زور لگا کر اُس نے ہر گرفت سے پھسلنا شروع کیا۔ بغاوت! اس کی رگ رگ غرور سے پھڑک اٹھی۔ اُسے خود اپنی طاقتوں پر حیرت ہونے لگی۔ اس نے سب کے مُنہ پر طمانچہ مار دیا، دل توڑ دیے امیدیں خاک میں ملا دیں، اوہ کتنی ظالم تھی وہ؟

۲۷

ایلما کو دیکھ کر تو وہ اس سے لپٹ ہی گئی، اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے تو وہ دوزخ کی آگ میں سے بھی مسکراتی ہوئی گزر جاتی۔ وہ اس دفعہ ایک تحفہ لائی تھی نا ایلما کے لیے ایک باغی کی گود میں وہ ایک نیا باغی ڈالنے لائی تھی۔ ایلما نے اپنی جادو بھری آنکھیں اس کی کاندر آنکھوں میں ڈال دیں اور مسکرا اٹھی۔

"کیوں؟" اس نے صرف اتنا پوچھا۔

"میرا دل!" بجائے لمبی چوڑی تفصیل کے ٹیٹے باغی نے سر چلنے میدان میں Good ایلما نے مسرت سے جھوم کر کہا۔ "ٹھیک کہتی ہو، کسی کو ہم سے کچھ کہنے کی جرأت ہی نہ ہونا چاہیئے۔ آؤ چلیں" کہ دے نے چیلے کی بانہہ پکڑلی۔

اسی دن ایلما نے اسے یونیورسٹی کے یونین کے صدر اور سکریٹری سے ملایا۔ بہت تیزی سے شمن نے دنیا کے اس رخ کو دیکھ لیا جہاں انسان اپنے گھونگھے جیسے خول سے باہر نکل کر اپنے وجود کے سوا بھی کچھ دیکھتا ہے۔

وہ ایلما کے کمرے میں گئی تو ذرا دیر کو ٹھٹک کر رہ گئی، اس کے پلنگ پر یونین کا پریزیڈنٹ افتخار لیٹا ہوا تازہ اخبار دیکھ رہا تھا وہ جھینپ کر لوٹنے ہی والی تھی کہ ایلما سر پر تولیہ کو صافے کی طرح لپیٹے غسل خانے سے نکلی۔ اس نے شمن کا تعارف کرایا گو وہ افتخار سے اچھی طرح واقف تھی مگر بات چیت کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایلما بال سکھانے لگی اور شمن سے چائے بنانے کو کہا۔

"دودھ بالکل نہیں، شکر ایک چمچہ" افتخار نے تکیہ پر سر گھما کر حکم دیا۔

"یہ سڑی چائے میں دودھ نہیں لیتا، بلکہ لیموں نچوڑ لیتا ہے" ایلما نے تشریح کی "لیموں"

"جی ہاں۔ آپ نے کبھی نہیں پی روسی چائے" افتخار نے بات اٹھائی۔

"روسی چائے"

"ہاں روسی چائے میں نیبو ڈالتے ہیں، آپ بھی آزمائیے، بڑی مزے دار ہوتی ہے۔" شمن نے ہچکچاتے ہوئے نیبو اٹھا کر پیالی میں نچوڑ لیا۔

"اور لوگ تو ابھی تک آئے نہیں سیتل سیدھا وہیں پہنچ جائے گا۔" نوجوانوں کے آزاد اور ترقی پسند گروپ کی میٹنگ پکنک کی صورت میں کھلے میدان میں ہونا قرار پائی تھی۔

"کیا مس بوگا بھی چلے گی؟"

"تو امس بوگا نہ چلے گی تو پھر جا ہی کون سکتا ہے۔ مگر کیوں پوچھا تم نے؟"

"یونہی۔ ایسے ہی، بات یہ ہے کہ مجھے کم بخت سے نفرت ہے، عورت ہے کہ........" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا، پھر تیزی سے بولا۔

"کیا ہی اچھا ہوتا جو ہم کسی طرح اسے بھولے سے چھوڑ جاتے۔"

"ارے وہ اپنی موٹر سائیکل پر دندناتی چلی جائے گی۔ تم نے دیکھی نئی موٹر سائیکل لی ہے اس نے۔"

شمن بڑے انہماک سے چمچہ چلا رہی تھی افتخار نے اسے غور سے دیکھا۔

"یہ اب چینی گھل رہی ہے" وہ ادھر سے اشارہ کر کے بولا۔ "میرا مطلب ہے پیالی کی چینی کب تک چلائیں گی، کچھ دیر میں پیندے میں سوراخ ہو جائے گا۔" ایلما نے دانت چمکا کر اپنی مخصوص ہنسی اگلنا شروع کی اور شمن نے جھینپ کر بڑا سا گھونٹ چڑھا لیا۔ زور سے ابکائی آ گئی۔ اور وہ منہ پر رومال رکھ کر ہچکیاں لینے لگی۔

"یہ........ یہ چائے؟" نیبو سے دودھ پھٹ کر گدلے رنگ کے لوتھڑے چائے میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔

"خوب ابھی دودھ ڈالو تو نیبو نہیں نچوڑنا چاہیے۔" افتخار نے اس کے لیے نئی چائے بنائی۔ "روسی چائے پینے کے لیے مذاق ہونا چاہیے

چائے پی کر گروہ کے گروہ شہر کی حدود سے باہر مقررہ مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ تانگوں میں اور کچھ سائیکلوں پر لڑکیوں کو بٹھائے قہقہے لگاتے چل دیے راستے میں مس بو گا اپنی نئی موٹر سائیکل پر سینٹ سنگیھ کالج کے مشہور کھلاڑی کو بٹھائے سب کی آنکھوں میں دھول جھونکتی نکل گئیں۔

آسمان گہرا لاجوردی اور شفاف تھا، معلوم ہوتا تھا گاڑھی گاڑھی وارنش کی ہوئی ہے خشک ہوا موسم خزاں کی نیم مردہ پتیوں کو ادھر سے اُدھر گھسیٹے پھر رہی تھی۔ گو ہوا ہلکی پھلکی اور نرم پڑ گئی تھی مگر اس کا ہر طمانچہ جسم میں زندگی دوڑا رہا تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چھدرے پیڑوں کے نیچے بے تکلفی سے بکھر گئے دو مخالف عناصر کے لطیف اور اچھوتے ملاپ سے فضا میں پیار رچی ہوئی معلوم ہوتی تھی مردانہ آوازیں زیادہ بھاری بھرکم اور لڑکیوں کے قہقہے زیادہ سریلے ہو گئے تھے۔

لڑکیوں کی تعداد قدرتی طور پر محدود تھی لہٰذا ایک ایک لڑکی بطور تبرک ہر گروپ میں بانٹ دی گئی یوں ایلما سے جدا ہو کر شمن ایک بالکل نئے اور جھینپو قسم کے غیر دلچسپ گروہ کے ہتھے چڑھی قدم پھونک پھونک کر نہایت عالمانہ اور شستہ گفتگو شروع ہو گئی، اور بہت جلد سب کی قابلیتیں جواب دے گئیں۔ بے طرح دم گھٹنے لگے۔ اُدھر ایلما کے گروہ میں یونیورسٹی کے چنے ہوئے موتی جگمگا رہے تھے اُن کی آب و تاب دور ہی سے لوگوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی، ایک طرف مس بو گا چند بے فکروں کے جھاؤ میں اپنی کھردری آواز میں انگریزی کے مزاحیہ گیت گانے کی کوشش کر رہی تھیں، تالیاں بجاتے میں اُن کی باہوں کا پلپلا گوشت تھل تھل ہل رہا تھا۔ ایک جھاڑی میں

آدھا گھسٹا ہوا انتخار سب سے الگ چیونٹیوں کی قطاروں کو بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا گویا وہ آیا ہی اس غیر ضروری کام کے لیے تھا۔ شمن کے ساتھی جن میں سے اکثر ایلما کے پرستار تھے بے چینی سے اس کے قرب میں پہنچنے کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ مگر مجبوراً بیٹھے شمن کو بھگت رہے تھے ورنہ اُن کے دل تو ایلما اور مس بوگل کے قہقہوں کے سُر تال پر ناچ رہے تھے۔

شمن کو اس گھٹے ہوئے سکون سے سخت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ خود بھاگ کر ایلما کے قرب میں پہنچ جاتی۔ یا کم از کم یہی معلوم کرتی کہ انتخار جھاڑی میں الجھا ہوا کون سے معمے سلجھا رہا تھا۔ شمن کی بے دقوفانہ خاموشی سے وہ جی ہی جی میں سلگ رہی تھی۔ فضا نہ جانے کتنی دیر کثیف رہتی۔ اگر سینتل اور ایلما میں پُر جوش جنگ نہ شروع ہو جاتی۔ سینتل ایلما کا برابر کی چوٹ کا مقابل تھا گو ایلما اسے ہر میدان میں ایک قدم پیچھے چھوڑ جاتی تھی۔ پھر بھی وہ جب بھی مڑ کر دیکھتی اُسے جیتا ہوا پاتی۔ اُن دونوں میں قابلِ رشک نفرت تھی۔ اگر ایک فن تھا تو دوسرا رات، جتنی ایلما پُر اسرار تھی اتنا ہی سینتل چٹیل میدان میں طرح بے لوث، ایلما انتہا کی تلخ اور تیز، سینتل حد درجہ بے فکرا اور مسخرہ! کرکٹ کے علاوہ انگریزی شاعری میں بھی ٹانگ اڑی ہوئی، اور یہاں اس کی ایلما سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ کہتی تھی کہ سینتل کے بازو گوریلے کے سے اور سینہ گینڈے کا سا لیکن دماغ اونٹ سے بھی بدتر۔ وہ شاعری سے اتنا ہی دور ہے جتنا ٹیگور گلی ڈنڈے سے اس پر ہر موقع پر ہر جگہ دونوں ایک دوسرے کی کاٹ کرتے۔ زبانیں دونوں کی تیز تھیں لہٰذا لوگ بے چینی سے اُن دو متضاد عناصر کے ٹکرانے کا انتظار کرتے۔

آج ایلما ہندوستان کی آبائی غلامی اور ناداری کا علاج واحد ایک سرے سے عام تباہی اور قتل تجویز کر رہی تھی۔ اس کی رائے تھی کہ اس کی سسکتی ہوئی قوم کو آبِ حیات نہیں بلکہ زہریلی گیس ملنا چاہیے۔ تاکہ ایک بار بالکل نام و نشان مٹ جائے۔ طاعون کا علاج کیلشیم کے انجکشنوں سے نہیں بلکہ جھٹکے سے داغنے سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ صدیوں کا سمویا ہوا زہر مرہموں سے نہیں بلکہ زہر ہی سے نچوڑا جا سکتا ہے۔

سینتل نے تلے مہذب جملوں میں اُسے ایک نیم حکیم خطرۂ جان سے تشبیہ دے رہا تھا وہ ڈاکٹر نہیں جو علاج نہ جانے۔

نہ وہ ڈاکٹر نہیں گدھا ہے جو ایک عضو کے سڑ جانے پر اُسے جڑ سے کاٹنے کے بجائے

ڈمبک کی لاش تجویز کرے۔ یہ صدیوں کے بجھاتے ہوئے کیڑے عبث ہے ان میں جان ڈالنے کی کوشش کرنا۔ مٹی کا تیل چاہیے تھوڑا سا۔

"وہ بے جان تو نہیں ہاں کمزور ہیں۔"

"تو کرکٹ کھلانی چاہیے ان سب کو" ایلما کے حق میں قہقہہ پڑا۔

"ہاں، اور تھوڑی سی شاعری کی خوراک......" سوائے مس بوگل کے کسی نے داد نہ دی ان کی ہنسی میں وہ جھنکار تھی کہ سب کے قہقہے ماند پڑ جاتے۔ ایلما انھیں مادہ چرخ کہا کرتی تھی، وہ زندگی کو ہلکے پھلکے غبارے کی طرح ہوا میں لہراتا دیکھنا چاہتی تھیں۔ اب ایک نئے یتیم سے مضمون میں ایم۔ اے کر رہی تھیں اور ان کے رویے سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بھر کے ہر مضمون کو لے کر ایم۔ اے کر ڈالیں گی۔ مگر ایلما کا خیال تھا کہ علم سے زیادہ انھیں کالج کی زندگی کی ایک عادت سی پڑ گئی تھی یونیورسٹی کی چہار دیواری کے باہر ان کی زندگی صفر کے برابر ہو جاتی تھی۔ سوائے پروفیسروں اور کالج کے لڑکوں کے انھیں کسی سے بات کرنی بھی نہ آتی تھی، انھوں نے بہت چاہا کہ نئی زندگی کی عادت ڈالیں، کہیں نوکری کر لیں مگر گاڑی نہ چلی۔ تانگے میں جتنے کا عادی ٹٹو کھلے میدان میں کلیلیں کرتے شرماتا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ پیدائشی بدشکل تھیں، اور سوائے کالج کے ان پر کوئی لٹو نہ ہوا۔ بلکہ وہ خود باوجود کوششوں کے کسی پر لٹو نہ ہو سکیں۔ لیکچر ہال، لائبریری، ریڈنگ روم، بورڈنگ کا کھانا آئے دن نئے نئے انسانوں کا داخلہ اور اخراج، انھیں اس کی ایک لت پڑ گئی تھی وہ ہر نو وارد پر قابض ہو جاتیں اسے ساتھ لیے لیے تمام اصول اور یونیورسٹی کے عجائبات سے دوچار کراتیں بالکل ایک محبت کرنے والی ماں کی طرح وہ ان کو چھوٹی موٹی پریشانیوں اور پرانے اور شریر لڑکوں کی بدمعاشیوں سے بچا لیتیں بعباس ایک بالکل تازہ فرسٹ ایر فول کو تو وہ بالکل پروں تلے چھپائے رکھتیں لیکن ہر نیا شکار کچھ دن بعد الٹا شکاری بن جاتا، ان کے دست شفقت کی گرمیوں سے اکتا جاتا اور الٹا انھیں مشق ستم بنا ڈالتا۔

جنسی اعتبار سے وہ ایک عجیب غریب معمہ تھیں سنا ہے جب وہ سائنس میں ریسرچ کر رہی تھیں تو پروفیسر رستم سے ان کی بڑی راہ و رسم تھی یہاں تک کہ وہ بارہ بارہ بجے تک بیٹھی سائنس کی گتھیاں سلجھایا کرتیں لیکن ایک دن جب مشتاق پروفیسر نے جو انھیں نہایت ہی دقیق گتھی

سمجھانے کی کوشش کی تو انھوں نے تیزاب سے اُنھیں اندھا کرتے کرتے چھوڑا۔ اب تک ننھے سہمے ہوئے بچے کی طرح اس حادثے کی تفصیل بیان کرتیں اور اس بھولپن سے لڑکوں کے سترا کا جواب دیتیں کہ وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے۔ وہ ذرا بھی نہ جھینپتیں اور پروفیسر کی دست درازیوں کی تشریح عملی حرکتوں سے کرتی جاتیں۔

ایلما کہتی تھی کہ افتخار بھی کسی زمانے میں ان کا چہیتا تھا پر اسے اُن سے اس دن سے نفرت ہو گئی جس دن انھوں نے عشق و محبت کا کچھ عجیب بھونڈے اور گھناؤنے پن سے ذکر کیا۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ ورنہ یہی افتخار گھنٹوں اُن کے کمرے میں لیٹا رہتا۔ وہ سوئٹر بنا کرتیں اور افتخار اُن کے زانو پر سر رکھے پڑا رہتا۔ وہ اُس کی دست درازیوں کو غلطیاں سمجھتیں اور اشارے کنائے کو بھولپن۔

آج کل وہ بڑے زور شور سے سیتل پر کرم فرما تھیں دو سوئٹر تو بُن کر دے چکی تھیں اور وہ دن بھر موٹر سائیکل پر لادے پھرتیں۔ اس کی ہر بات پر "وَنڈرفل" اور "مارولس" کہتیں۔ گو ایلما سے اچھے خاصے تعلقات تھے مگر سیتل کی پیٹھ ٹھونکنا اپنا فرض سمجھتیں۔ جب سیتل نے ایلما کے باغیانہ خیالات کا مذاق اڑایا تو وہ جوش سے چیخ پڑیں اور جب ایلما کوئی چبھتا ہوا جملہ کہہ دیتی تو وہ سیتل کو پٹتے ہوئے بچے کی طرح چمکارتیں جس پر اُس کا مُنہ سرخ پڑ جاتا لڑکوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ اُسے گود لینے والی ہیں اور گجرات میں جو اُن کے پاپا کی کپڑوں کی ملیں ہیں۔ وہ سب اُسی کو ملیں گی۔

سیتل نے ہارتے ہوئے پہلوان کی طرح ٹینٹوے پر حملہ کیا۔

"عورت کو سیاست سے کیا تعلق ... اس کا تو صرف ایک منصب ہے۔ اور وہ ......" ایلما کی آنکھیں نفرت سے چمک اٹھیں۔ وہ سیتل کے اس حملے سے آگے کچھ بے دست و پا ہو جاتی۔ مگر قبل اس کے کہ سیتل عورت کے اس ایک صرف کی تشریح کرتا افتخار نے آ کر محفل درہم برہم کر دی۔ افتخار کے عروج کے ساتھ ہی ساتھ سیتل کا وجود چاند کی طرح پھیکا پڑ جاتا۔ وہ کبھی افتخار سے نہ الجھتا بلکہ فوراً ہار مان لیتا۔

افتخار نے فوراً نہایت نفاست سے کوئی پروگرام بنا ڈالا۔ ایک لڑکے کی

آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور باقی سب گھیرا بنا کر کھڑے ہو گئے، نیا اور شرمیلا لڑکا ذرا ہی دیر میں تختۂ مشق بن گیا گھنٹوں چکر زنا رہا کوئی ہاتھ نہ آیا۔ اس عرصے میں مس بوگا مسرت سے چیخ چیختے بالکل بدحواس ہو چکی تھیں۔ تالیاں بجا کر اور ہنس کر وہ کھیل کو اور تماشہ بنائے دیتی تھیں۔ پسینے میں شرابور منہ تازہ سِکے ہوئے کیک کی طرح تمتمایا ہوا تھا، ڈھیلے برہنہ بازوں پر بھورے تل چھاپے کی طرح جمے ہوئے تھے ہوا میں بات بے بات اچھل رہے تھے۔ باڈی کے بند کھل کر کندھوں پر سے نیچے آ رہے تھے اور ساڑھی اونچی نیچی ہو گئی تھی جب ان کے بتائے ہوئے داؤں پیچ لگا کر بھی وہ لڑکا کسی کو نہ پکڑ سکا تو وہ لوگوں کو جان بوجھ کر چور بن جانے کی رائے دینے لگیں اور پھنکار! آنا آگے کو۔ تو کیوں دُبکا ہوا ہے۔ تھک گیا بے چارا۔ ارے ستیل سنگھ اب بھی تیری باری، تو بن چور۔"

جب کسی نے نہ سُنا تو وہ کھیل کے تمام اصول توڑ کر چور سے بغل گیر ہو گئیں۔ چور نے انھیں فوراً بوجھ لیا، اور غریب پر اُس معنی خیز قہقہے نے گھڑوں پانی الٹ دیا جو اُس کے دوستوں نے اس کے حال زار پر لگایا۔

مس بوگا نے مچل مچل کر پٹی بندھوائی اور تُتلا تُتلا کر ہر ایک کو پکارنے لگیں لیکن بے چاری کی خوشی نہایت مختصر رہ گئی۔ کیونکہ افتخار نے فوراً آگے بڑھ کر اپنے آپ کو پکڑوا دیا۔ کھسیانی ہو کر وہ اُسے تھپڑوں سے مارنے لگیں اور ہنستی ہوئی پھر تماشبینوں میں آن ملیں کھیل بدمزہ ہو کر مصیبت بن گیا۔ کیونکہ افتخار جب کسی کو پکڑتا جان بوجھ کر اس کا نام نہ بتاتا اور سزا کے طور پر پھر چور بنتا۔ اگر اس کے بجائے کوئی اور ہوتا تو نہ جانے کیا گت بنتی۔ مگر لوگ نہایت خندہ پیشانی سے ہنس رہے تھے۔

شمن کھیل سے بے تعلق، نہ جانے کدھر دیکھ رہی تھی اور کیا سوچ رہی تھی کھیل سے ذرا ہٹ کر اکیلی کھڑی ستیل کے لمبے چوڑے جسم کو جو سوکھی پتیوں پر لیٹا انگڑائیاں لے رہا تھا ایک عجیب نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی ستیل نے کچھ کہا اور اس کے زہریلے دانت کھُل کے بھیڑیئے کی دھاردار کچلیوں کی طرح چمکنے لگے شمن نے اس کی تلخیوں کا جواب ایک طنزیہ مسکراہٹ سے دیا اور اپنے بھاری جسم کو بیلن کی طرح پتیوں پر لڑھکا دیا۔ کراری خشک

پتیاں چھوٹی چھوٹی چنگاریوں کی طرح چٹک کر خاموش ہو رہیں۔ ایلما نے اس پتنگ آمیز لباڈے سے کھسیا کر زمین سے ایک مٹی کا ڈلا اٹھایا اور زور سے سامنے پیڑ کے تنے پر کھینچ مارا۔ اسپیل نے بروقت قہقہہ اور ایسا معلوم ہوا وہ قہقہہ اس ڈھیلے میں چھپا بیٹھا تھا اور باریک ذروں کی شکل میں فضا میں بکھر گیا۔

شمن زور لگا کر اپنا بازو چھڑانے لگی۔ بے خیالی میں اس نے دیکھا بھی نہیں اور افتخار نے اسے پکڑ لیا۔ وہ ایسی بری طرح بھڑکی جیسے سچ مچ کے چور نے دبوچ لیا ہو۔ افتخار کی انگلیاں رسی کے پھندوں کی طرح اور مضبوط ہو گئیں۔ وہ چھوڑنے والا آدمی نہ تھا۔ غل مچا کر بے انصافی اور بے ایمانی کی دہائی دینے لگا۔ ساتھ ہی مس بوگا پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ شمن کو مجبوراً خاموش کھڑے ہو کر اپنے آپ کو چھڑانا پڑا۔ حالانکہ افتخار اسے فوراً پہچان گیا تھا مگر بن کر وہ اسے ٹٹولنے چلا گیا۔ ناک کو ہاتھ، ہاتھ کو پیر بتا کر سب کو خوب ہنسایا۔ خصوصاً مس بوگا تو بالکل ہی پاگل ہو گئیں۔

"ارے یہ بتاؤ یہ ہمارے ہی گروپ کا کوئی آدمی ہے یا......"

"بلی...... اچھا ارے بلی۔ ہی ہی" مس بوگا اپنی جگہ پر دونوں پیروں پر پھدک ہی تھیں۔

"ارے مونچھیں! نہیں مونچھیں نہیں...... کون ہو سکتا ہے؟" سنبل عباس قادری...... ؟ رتن؟ وہ اور بنا اور شمن ادھ ہنسی ہو گئی۔ افتخار نے پٹی کھول دی۔

"ارے آپ؟...... معاف کیجئے گا"، وہ مضحکہ خیز ادب سے جھکا اور مس بوگا نے پھر ہنسی کی چیخیں ماریں۔

افتخار نے اتنا مذاق کیا کہ شمن کو جیسے گودڑ کی پوٹلی میں سے نکال کر اونچے چبوترے پر کھڑا کر دیا۔ یوں شمن کا صدمہ معمولی ہنسی نہیں، اگر وہ کسی میں دلچسپی لینا ہے تو کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے واپس لوٹتے وقت دس بیس تکلفیں پیش کی گئیں یہاں تک کہ مس بوگا نے اسے سنبل کے ساتھ ہی بیٹھ جانے کی دعوت دے دی۔

"ہاں ہاں تم اس کی گود میں بیٹھ جانا"۔ وہ بڑی معصومیت سے رائے دینے لگیں۔ سنبل نے مسکرا کر تانوں کو ایک استقبالیہ جنبش دی اور شمن کا جی چاہا مس بوگا کے ایک زور کی چپت لگائے جیسے وہ اپنے بدتمیز چھوکرے کے گندے گلاس میں پانی پلانے پر لگا دیا کرتی تھی

رات کو ثمن ایلما کے ساتھ ہی رک گئی وہ نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتی رہی۔ گھوم پھر کر سیتل کا ذکر آجاتا اور ایلما دانت پیس کر رہ جاتی۔

"مگر جانتی ہو؟" اس نے بستر پر بیٹھ کر کہا۔

"کیا؟"

"یہ...... کہ مجھے سیتل سے نفرت کیوں ہے؟"

"پتہ نہیں۔"

"دنیا میں متضاد عناصر ایک دوسرے کے قرب سے ہی بھڑک اٹھتے ہیں۔ پانی کو قریب پا کر آگ اور بھڑکتی ہے سیاہی کو دیکھ کر سفیدی اور زیادہ تیزی سے چمکتی ہے۔"

"ہوں" ثمن سوچنے لگی۔

"کیا مجھے سیتل سے محبت ہو سکتی ہے؟ ویسے ہی پوچھتی ہوں

"کیا پتہ ہو بھی جائے؟"

"ہاں شاید مگر جانتی ہو وہ ..... وہ محبت کس قسم کی ہو گی؟"

"جانے!"

"اسے دیکھ کر دل میں بڑے ذلیل جذبات متحرک ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے میں ایک گوشت کا حقیر لوتھڑا ہوں جیسے ......"

"کیا؟"

"کچھ نہیں، تم نہیں سمجھو گی۔" تھوڑی دیر وہ خاموش بیٹھی اپنے خیالوں میں ڈوبی آنکھیں کھولتی بند کرتی رہی۔

"ثمن..... سیتل کو دیکھ کر...... بدمعاشی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ہے نا؟" اس نے ہولے سے کہا۔

"ہٹو...... اللہ نہ کرے۔ نفرت ہے مجھے تو" ثمن جھجکی۔

"ہاں ہاں نفرت ہی تو ہے...... اونہہ تم نے سمجھیں" وہ کچھ اداس ہو گئی۔

"دیکھو...... مگر ہوتا ہے ایسا...... دُنیا میں کئی طرح کے انسان ہوتے ہیں کچھ تو ایسے جنھیں دیکھ کر سوئی ہوئی ہا مَتا انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ اور کچھ ایسے جن کے ساتھ دو چار باتیں کر کے جی بھر جاتا ہے" وہ شمن سے زیادہ خود کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

"مگر کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ لمبا چوڑا معاہدہ کر کے ان کے ساتھ لمبا چوڑا سفر کرنے کو دل چاہتا ہے۔

"سفر؟...... کیسا سفر؟"

"زندگی کا سفر!"

"مگر سیتی؟"

"ہاں ٹھہرو، اور چند ایسے بھی ہیں جن سے ایک با تجربے کے طور پر ——"

"توبہ ہے ایلما!"

"اور پھر اُن کی صورت سے گھن آنے لگتی ہے، اُن کے لہجے سے جی متلاتا ہے، جی چاہتا ہے پھر انھیں اٹھا کر دور پھینک دیں اور بھول جائیں!"

کمرے کی دھندلی روشنی میں ایلما کا سانولا چہرہ اندھیرے غاروں میں جمی ہوئی کائی کی طرح بے جان ہو رہا تھا، اس کی آنکھیں اور بھی غیر مانوس اور بوڑھی ہو رہی تھیں۔

"عجیب لڑکی ہو!" شمن نے جیسے خود سے کہا۔

"کیا؟ عجیب لڑکی، ممکن ہے عجیب لڑکی ہوں میں...... شاید" وہ چپ ہو گئی

"شمن!" اُس نے پھر کہا، "جب میں اپنے دل کو ٹٹولتی ہوں تو وہاں بڑے وحشی خیالات چھپے نظر آتے ہیں جنھیں میں جلدی سے ڈھک بند کر کے لوٹ آتی ہوں، میں ڈرتی ہوں کہ کہیں ایک دن وہ باہر نکل کر مجھے دبوچ نہ لیں...... شمشاد، اگر میں ان بھوتوں کو باہر نکل آنے دوں تو......"

"کون سے بھوت؟"

"یہی...... یہی جو میرے دل میں ادھ ٹیڑھا تگ ناچا کرتے ہیں، مگر بہت بُرا ہوا!..... بہت ہی بُرا!"

"دیکھی ہو تم تو۔ ایلما پاگل کہیں کی بھلا یہ بھی کوئی بات ہے........ کمبخت ستیل...."

"نہیں نہیں تم ڈرو نہیں میں جو بات کہہ ڈالتی ہوں کبھی نہیں کرتی، سمجھیں تم۔ جب ایک بار کچھ سوچتی ہوں تو........ اچھا سو جاؤ تم تھک گئی ہو۔"

"نہیں نہیں مجھے نیند نہیں آرہی ہے، کہو تم دیکھو ایلما تم اس کم بخت سینل کے منہ نہ لگا کرو...... نہ جانے مجھے کیوں اُس سے ڈر لگتا ہے؟"

"ڈر؟ تو تمہیں بھی اُس سے ڈر لگتا ہے؟" ایلما نے اُس کے پاس جھک کر پوچھا۔

"اور کیا بھئی، ایسی کمینی آنکھیں ہیں۔"

"ارے پگلی وہ ڈر...... وہ ڈر...... اب کیسے بتاؤں، اُہنہ تم سمجھتی کیوں نہیں۔" ایلما اس کی کند ذہنی سے عاجز آگئی۔

اور وہ کیا کہہ رہا تھا، عورت کا ایک ہی مصرف ہے، کیا ہے وہ؟

"اوہ وہ، یہی مصرف، جو، جو، تم نہیں سمجھتیں، وہ ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ عورت مرد کی دل جیبی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔"

"چہ تو یہ منحوس کہیں کا! تو تمہیں غصہ آگیا تھا؟"

"اِیں! نہیں تو، مجھے اس بات پر غصہ نہیں آیا تھا، بلکہ...... جب وہ لیٹا تھا تو تم نے دیکھا تھا؟"

"دیکھا؟"

"اُہنہ، اب تمہیں کیسے بتاؤں ہائے تو یہ، اور اوٹی ٹوٹی کرنے لگو گی، مثلاً ابھی اگر میں تمہیں بتاؤں کہ مردوں کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جن کا...... جو......"

"دیکھا۔ آ؟" شمن نے ڈر کر پوچھا۔

"جنہیں دیکھ کر دل میں ایک عجیب خواہش جاگ اٹھتی ہے، مثلاً جیسے افتخار ہے، اب مجھے اس سے محبت نہیں ہے بھی وہ بڑا عجیب مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میرا پہلا بچہ افتخار کا ہو۔"

"ایلما!" شمن بے ہوشوں کی طرح سینے میں سانس لانے کی کوشش کرنے لگی۔

"ہاں پگلی، اور کتنا دل چاہتا ہے میرا کہ وہ...... وہ"

"مر جاؤ خدا کرے" شمن بگڑ گئی

"لیکن میں ایک لمبے سفر میں افتخار کو نہیں بھگت سکتی"..... آ آ....... اس نے لمبی سی جماہی لی اور لحاف میں پھسل گئی۔

"تھک جاؤں! میں تو دو دن میں تھک جاؤں" اس نے سونے سے پہلے بار بار تھکی ہوئی جماہیوں کے درمیان دُہرایا۔

۲۸

ایلما کی چیلی بن کر "کیلاش ہوسٹل" آنا پڑا۔ پرنسپل اُس کی گمراہی پر بیہودگی کے ہاتھوں مجبور ہو گئیں انھیں درسِ اخلاق دینے کے لیے اُسے نکالنا پڑا۔ آنے سے پہلے کیا کیا منصوبے باندھے تھے، کہ آزادی ملی تو یوں گُل چھرّے اُڑائیں گے۔ مگر جب چڑیا کے پَر ایک بار کتر دیے جائیں تو وہ پنجرے کے باہر بھی قیدی رہتی ہے۔ اور یہ کاٹے ہوئے پَر اِس جنم میں تو نکلتے نہیں نکلے بھی تو ٹیڑھے بڑھے! دوسرے جب انسان پر خود اپنی نگرانی کا بار پڑتا ہے تو وہ بہت کوتاہ نظر ہو جاتا ہے چھوٹے چھوٹے اور بہانے خود کو دینے میں کیا لطف؟ لیکچر میں جانے کا بہانہ کر کے سینما اُڑ جانا اب اس کی ضرورت ہی نہ رہی۔ آزادی سے جلد ہی جی بھر گیا معلوم ہوتا تھا اب کسی کو بھی اس کے چال چلن کی فکر نہیں رہی وہ بلا سے کچھ کرے کسی کو کیا؟ ایسا معلوم ہوتا تھا لوگ اپنے کاندھوں کا بوجھ پھسلا کر آہستہ آہستہ اس کے سر پر ڈالتے جا رہے ہیں اور دوں کی قید سے چھوٹ کر خود اپنی ذمہ داری کی زنجیروں میں جکڑی جا رہی ہے اس کی ہستی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک محافظ اور دوسرا محفوظ لائبریری سے نکلتے ہی سیتل سے ٹکر ہو گئی! یقیناً اتنا تو غیر مرئی نہیں ہوں کہ دکھائی بھی نہ دوں" اُس نے مصنوعی جھلاہٹ سے کہا شمن نے حال ہی میں عینک لگانا شروع کی تھی جھینپ کر شیشے رومال سے صاف کرنے لگی۔

"جی ہاں، خوب صاف کر کے دیکھیے، ویسے چھ فٹ کی چیز اتنی باریک تو نہیں کہ خوردبین سے دیکھنا پڑے!"

شمن کو ہنسنا پڑا سیتل بھی ہنس دیا۔ وہ پنسل لینے جا رہا تھا لیکن اب تو اُس کے قلم سے کام چل جائے گا۔ ایلما سچ کہتی تھی کہ سیتل کے قرب میں انسان گوشت کا لوتھڑا بن جاتا تھا۔ اُس نے نہایت بے تکلفی سے اس کے گریبان سے قلم لپک لیا اور قبل اس کے کہ وہ کچھ بُرا مانتی وہ تیزی سے معافی مانگتا ہوا نوٹ لینے پرلے کونے میں چلا گیا، شمن کھچی ہوئی شکل لیے دوسرے کونے کی میز پر بیٹھ گئی۔

باوجود کوشش کے شمن سیتل کے وجود کو نظر انداز نہ کر سکی۔ بار بار اس کی نظر اُسی گوشے کی طرف بھٹک جاتی جہاں وہ کچھ کتابیں اُلٹ پلٹ کر رہا تھا۔ وہ میز پر کہنیاں ٹکائے موٹی سی ڈکشنری کھولے کچھ ڈھونڈ رہا تھا اور سوچ سوچ کر کچھ لکھتا جاتا تھا۔ بار بار وہ قلم کو ہونٹوں پر رگڑ کر کچھ سوچنے لگتا اور کتاب پر جھک جاتا۔ اُس کی پھنسی ہوئی سپورٹ شرٹ کھال کی طرح سینے اور شانوں پر منڈھی ہوئی تھی۔ مضبوط گردن ورزش کی وجہ سے آہنی سانچے میں ڈھلی معلوم ہوتی تھی۔ وہ بار بار پہلو بدلتا۔ اس کا کسرتی جسم بالکل اڈونس کے مجسمے کی طرح کھنچا ہوا اور سڈول تھا۔ بھوئیں زیادہ گھنی اور نکوکی آنکھیں ازحد چمکیلی اور گہری ہو رہی تھیں۔ جب وہ اپنے ہونٹ روٹھنے کے انداز میں سکیڑ لیتا تو بالکل ضدی بچے کی سی شکل ہو جاتی۔

شمن نے جھنجھلا کر کتاب بند کر دی اور نہ جانے کس پر دانت پیسنے لگی۔ سیتل کے خلاف!!

اُسے فضول غصہ کیوں آنے لگا؟ دھڑکتے ہوئے دل سے ایلما کے الفاظ یاد آ گئے۔ تخیل نے اُسے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، کیا کیا منظر دکھا دیئے...... اندھیرے گوشے، سنسان گپھائیں اور دھندلے دھندلے پیڑوں کے گھنے جھنڈ...... خزاں رسیدہ پتیوں کی چُرمُر ٹوٹنے کی آواز...... مگر نہیں تو سیتل کے پہلو بدلنے سے میز چرچرائی تھی —— سیتل! سیتل! سیتل! اُوہ! آخر کیوں وہ اُس کے دماغ پر چڑھا چلا آتا تھا؟ بغیر قلم لیے وہ چپکے سے لائبریری سے نکل بھاگی اور کامن روم میں جا کر لیٹ گئی۔

لیکن پھر وہ خود بخود ہنسنے لگی۔ یہ اُس کی کمزوری نہیں سیتل کی طاقت تھی جو اُسے تھکائے دے رہی تھی۔ وہی طاقت جو ایک حسن فروش بیسوا میں پا کر اچھے بھلے انسان جیبیں خالی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس نے اس سے پہلے کسی سے سنا بھی نہ تھا کہ جیسے فاحشہ عورتیں سینہ تانے کمر لچکا ناز و عشوہ کی بجلیاں گراتی لوگوں کے دل مسلتی چلتی ہیں اسی طرح بعض مرد بھی اپنے جسم کی مستی اور چھچھوری نمائش کیا کرتے ہیں۔ سیتل کی ہر جنبش سے معلوم ہوتا وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے "لو دیکھ لو یہ مضبوط پٹھے، یہ بانہیں، یہ چوڑا چکلا سینہ ہے، ہمت نظر بھر کے دیکھنے کی؟" وہ جو بار بار قلم کو ہونٹوں پر رگڑ رہا تھا کیا بھونڈا طریقہ تھا پیغام رسانی کا۔ اُسے گھن آنے لگی۔

کمرے میں بھاری پردے پڑے ہوئے تھے اور عجیب پُراسرار نرم اندھیرا پھیلا ہوا تھا

کبھی کبھی کوئی پردہ ہوا سے لرزتا، روشنی کی ننھی سی کرن سسکیاں بھرتی پھر اٹھتی خوشگوار تاریکی میں گھل مل جاتی، اس کے دماغ کی رگیں سوکھی پتیوں کی طرح خستہ ہو رہی تھیں۔ ڈر تھا کہ کہیں ایک ہی دھیما جھٹکا اور ان کا چورا ہو جائے گا۔

"ارے آپ یہاں؟" سیتل ربڑ کے جوتے پہنے بلی کی طرح چلتا نہ جانے کب کرسی کے پیچھے آن کھڑا ہوا۔ شیمن اچھل پڑی جیسے وہ بے خبر مزے سے نہا رہی تھی اور کسی نے دروازے کے پٹ کھول دیئے، اس نے جلدی سے اپنے حواس سمیٹ لیے اور بیٹھ گئی۔

"یہ آپ کا قلم" اس نے گال کھجلانے کے بہانے اُسے گال سے لگایا، اس کی آنکھوں نے بتا دیا کہ کیوں قلم دیتے وقت اس کی انگلی ذرا زیادہ دیر تک کانپ گئی تھی۔ شیمن نے گھبرا کر قلم چھوڑ دیا۔

"ارے ہاتھ جل گیا" وہ اپنی بھرتیلی آنکھیں جھپکا کر ہنسنے لگا۔

دور لاپروائی سے مڑ کر اس نے ایک پینٹنگ کو دیکھنا شروع کیا جیسے وہ جلتے جلتے رُک گیا ہو، پاس رکھے ہوئے اسٹول کا سہارا لے کر دو چار انگڑائیاں لیں اور پھر شیمن کی طرف مُڑا۔

باہر برآمدے میں نوکر چاکر گھوم رہے تھے لائبریری بھی دور نہ تھی لیکن شیمن کا دل ایسے دھڑکا جیسے وہ سنسان تنہائیوں میں نامعلوم خوف سے بھاگ رہی ہے۔ مگر سب راستے بند ہیں بڑے بڑے حشرات الارض لمبے چوڑے دہانے کھولے چاروں طرف سے لپک رہے ہیں۔ اگر سیتل ایک لمبی سی چھری لے کر اس کا قیمہ کر ڈالتا تو بھی اس میں جنبش کرنے کی سکت نہ آتی..... مگر سیتل اتو نہ تھا، اُسے کچے پھلوں سے نفرت تھی وہ نہایت صبر سے پیڑ کے نیچے کھڑا ہونٹوں پر زبان پھیرا کرتا اور پھل کے پک کر رس دار ہو جانے کا انتظار کرتا۔ یہاں تک کہ خود اس کی آغوش میں رس کی بارش ہو جاتی مجبوراً وہ اُسے چکھ لیتا، بالکل زبردستی کی دعوت سمجھ کر۔

سیتل چلا گیا۔ مگر بڑی دیر تک اُسے وہ ملاجی یاد آیا کیے جو بہت دن ہوئے جب وہ اور لوری کھڑکی میں بیٹھی گلی سے جھانکا کرتی تھیں اور پھر حواس باختہ ہو کر کھڑکی سے گر جایا کرتی تھیں، وہ جلدی سے کامن روم سے بھاگ آئی۔

یونیورسٹی میں دو گروہ تھے، ایک تو پروفیسروں کا چہیتا اور ہر دل عزیز، مگر جس کی حرکتوں پر یونیورسٹی کے منتظمین کے علاوہ حکومت کی نظر بھی رہا کرتی تھی۔ اس گروہ کے سرتا

ایلما اور افتخار تھے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ افتخار مفسد اور مکار تھا اس کی زبان اس قدر طرار تھی کہ چند لمحوں میں ساری یونیورسٹی کو بہکا دیتا مگر جونہی دل میں کوئی نیا خیال پیدا ہوتا، بڑے سے بڑے فساد کو ذرا سی دیر میں ختم کر دیتا۔ اسی لیے منتظمین کو ہر معاملے میں اس کی مدد کی ضرورت پڑتی۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کے اہم موقعوں پر اسی کی رائے سے مہمان اور صدر چنے جاتے یونیورسٹی کو کوئی بہانہ بھی تو اسے دفع کرنے کا نہ ملتا تھا ورنہ وہ تو کبھی کا کلرکی کے جوئے میں جتا نظر آتا۔

صورت شکل سے وہ نہایت معمولی درجے کا انسان نظر آتا تھا عام طور پر ایک قسم کی نا سمجھی اور بے وقوفی طاری رہتی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ اس کا اصلی چہرہ نہ تھا۔ اس کا اصلی چہرہ تو بہت تھوڑی دیر کے لیے صرف پرنسپل نے اپنے دفتر کے پرائیویٹ لمحوں میں دیکھا تھا یا کبھی کبھی جب وہ خود کو بھول جاتا تو دیکھنے والے اس کے چہرے سے ملتذ رخاطر ہو جاتے۔ اس کے ہونٹ حملہ آور بھیڑیے کی طرح ہونٹوں پر سے کھنچ جاتے اور آنکھوں میں صدیوں کی دبی ہوئی غلامی کی خاموش بغاوت سلگنے لگتی۔ اس کی صحت عموماً خراب رہتی تھی اور زیادہ تر کھانستا چھینکتا رہتا تھا

قدرتی طور پر شمن کی نظر بار بار افتخار کی طرف اٹھتی، گو وہ بہت کم اس سے بات کرتا مگر جب کبھی وہ ملتے ایسا معلوم ہوتا وہ ایک دوسرے کو برسوں سے پہچانتے ہیں وہ اس کی ہر بات پر آنکھ میچ کر صاد کرنا اپنا فرض سمجھ چکی تھی اب وہ مداحوں کے گروپ سے قدم بڑھا کر ممدوح بنتی جا رہی تھی اور نئے انتخاب پر اسے یونین کا کارکن بھی بنا دیا گیا آہستہ آہستہ خود اعتمادی بڑھ کر کچھ غرور کی حدود کو چھونے لگی تھی۔ اب ایلما اسے اپنی ہی جیسی مگر زیادہ عقل مند اور ذہین نظر آتی تھی، اب وہ پہلے کی طرح مسحور ہو کر اس کی پُر اسرار آنکھوں اور زہریلے دانتوں سے اتنی متاثر نہ ہوتی تھی اُسے خود اپنی ہنسی میں ایک غیر مانوس سی جھنکار سنائی دینے لگی تھی۔ ہاں افتخار اور اس کی کھوئی ہوئی سی جھلاّہٹ اُسے اب بھی متحیر کر دیتی تھی۔

انہی زمانے میں الٰہ آباد میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کا جلسہ شروع ہو گیا اور پرانے حقداروں کو پیچھے چھوڑ کر نہ جانے کیسے شمن کا انتخاب نمائندہ جماعت میں ہو گیا۔

۲۹

گھر کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ نوری کی شادی ہو رہی ہے لہٰذا لوٹتے میں رک گیا۔ نوری اندر کمرے میں مایوں بیٹھی ملی۔ شمن کو دیکھ کر وہ اس سے لپٹ گئی۔ نوری اور شمن ہمیشہ ان مصنوعات سے پاک رہی تھیں۔ مگر نہ جانے کیوں دونوں طرف سے پیار اُبل پڑا۔ بڑی محبت سے دونوں ایک ہی رضائی میں لپٹ کر سوئیں اور رات گئے تک باتیں کرتی رہیں۔ عام باتیں جو ایک مایوں بیٹھی ہوئی لڑکی اپنی بچپن کی سہیلی سے کرتی ہے۔ ہونے والے شوہر کے متعلق سُنے سنائے افسانے، ساس نند کے ارمان بھرے دُکھڑے، ٹیکہ، جھومر اور پازیبوں کا ذکر۔ ماں دادی اور دوسرے رشتہ داروں کے پردے سے اس نے دور ہی دور سے عشق کر لیا تھا۔ جہیز کی تیاری میں گویا روحانی کورٹ شپ ہو گئی تھی۔ ہر ٹانکے پر دو ہونے والے میاں کا خیال ایک لڑی میں پروتی جاتی۔ ساس نندوں کا [illegible] بری اور چڑھاوے کے ذریعے سے وہ ہونے والے ساتھی کو بخوبی پہچان چکی تھی۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی ضد اور عادت وہ اچھی طرح جان گئی تھی۔

"انھیں مہندی سے نفرت ہے، گہرے رنگ سے تو چڑتے ہیں، بڑی خوشامدوں سے تو سہرا باندھ رہے ہیں۔" وہی عام چھچھورے دولھاؤں کے نخرے، مگر نوری انھیں بے انتہا عجیب و غریب بنا کر سنا رہی تھی۔

"کہتے ہیں گھونگٹ نہیں کاڑھنے دیں گے، بھلا میں بھائی میاں کے سامنے کیسے چلوں گی، میرا دم تو نکل جائے گا۔" اس نے منگنی کے بعد ہی سے اس کے تمام رشتہ داروں سے ناطے جوڑ لیے تھے اور انھیں ناموں سے پکارتی تھی جن سے وہ اُن کا ذکر کرتا تھا۔

"روز صبح شیو کرتے ہیں ورنہ ایسے کھردرے گال ہو جاتے ہیں کہ حد نہیں۔" وہ ایسے کہنے لگی گویا وہ برسوں سے ان گالوں کو سہلانے کی عادی ہے۔ [illegible] بھی کیا غضب کی چیز ہے جہاں

کسی کی رسائی نہ ہو، پرندہ پر بھی نہ مار سکے وہاں مزے سے خیالوں کے ہنڈولے میں جھولتے چلے جاؤ، منگنی سے پہلے ہی نوری کا پردہ کرا دیا گیا تھا۔ اور اب وہ تین سال انگلینڈ رہ کر آ رہا تھا، کوئی پوچھے کم بخت یہ سب تجھے کس نے بتایا کہ اس کی داڑھی کھردری ہے۔ مونچھیں چبھنے والی ہیں، اور ہتھیلیاں کھچی ہیں۔

شمن نے اس سے بالتفصیل نہ پوچھا ورنہ وہ اُسے شادی کے بعد کی اپنی پُر سکون زندگی، بچوں کے پیار کے نام، روزانہ گوشت ترکاری کا حساب کتاب سب کچھ بتا دیتی۔ نہ جانے کب سے وہ زندگی کی اس جمع تفریق میں مشغول تھی، اور پھر سب کا خیال تھا کہ نوری ابھی کم سن ہے۔ بوجھ نہ اٹھا پائے گی یہ بھولی مائیں! اتنا نہیں جانتیں کہ ذرا سی فتنی تھی جبھی سے بوڑھی دادی بن چکی تھی۔

نوری کو چھوڑ کر وہ دورِ زندگی کے ہیر پھیر پر غور کرنے لگی، یہ لڑکی ذات بھی معمہ ہے چار پانچ سال کی بچی نانیوں جیسی۔ جو دیکھے کانوں پر ہاتھ رکھے، کہ ابھی یہ حال ہے تو بڑھ کر آفت کا پرکالہ نکلے گی۔ جہاں دس پانچ سال اور بیتے ایک دم رنگ پلٹا، وہ بزرگوں جیسی گفتگو اور طور طریق غائب اس کی جگہ دوپٹہ کہیں ہے تو پاجامہ کہیں گریبان چاک ہے تو جوتی پیروں سے نکلی بھاگتی ہے۔ بات کرنے میں سو بار زبان لڑکھڑاتی ہے۔ اور ہزار بار چہرے کا رنگ بدلتا ہے۔ کیا نئے انقلاب اور تازہ مصیبتیں اس شدت سے حملہ آور ہوتی ہیں کہ سُدھ بدھ ہی غائب ہو جاتی ہے یا احساسِ شباب ایک پھنکار بن کر ہوش و حواس کو معطل کر دیتا ہے۔

نوری خواب بیداری سے جی سیر کر کے سو بھی گئی مگر شمن نے اس کا سر اپنے بازو سے نہ ہٹایا، اس کا نرم گرم جسم، خوابوں سے رنگین چہرہ، ابٹنے میں لبسے ہوئے میلے کپڑے، وہ غور سے اُسے دیکھنے لگی، عورت! کیا یہی تھی۔ عورت جو حلوے کی مرغن قاب کی طرح سجا بنا کر کل ایک نئے مہمان کے سپرد کی جانے والی تھی اسے نہلا دھلا کر عطر میں لسایا جائے گا کہ اگر تھوڑی بہت لسانڈ ہو بھی تو معلوم نہ پڑے ایسے ہی جیسے سڑے گلے آلو کی چاٹ بنانے والا گلی چھپانے کے لیے ڈھیر سا مسالہ چھڑک دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح دلہن کو شیشے میں اتار کر دولہا کے حلق میں اتار دیا جائے گا۔ اور جب ایک بار نگل گیا تو پھر شیرا اپنا ہے یہ دبتی دانش وہ چار گھنٹوں میں اُتر جائے گی اور دلہن صرف بیوی رہ جائے گی! لفظ بیوی کے خیال ہی سے شمن کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی

نوری کے نوجوان جسم سے لپٹے ہوئے درجنوں بچے اور ہزاروں فکریں جونکوں کی طرح چپکی خون چوستی نظر آنے لگیں

"عورت کا صرف ایک مصرف ہے......" اُسے سیتل کے الفاظ یاد آگئے۔

دفعتاً اُسے الہ آباد کی میٹنگ بھی یاد آگئی، خصوصاً آخری اجتماع، جو تاروں کی چھاؤں میں الاؤ لگا کر کیا گیا تھا چاروں طرف گچھوں کی صورت میں بیٹھ کر کانا پھوسی ہو رہی تھی۔ دُنیا کے اہم مسائل طے کیے جا رہے تھے، لڑکوں کی بھاری اور مدھم آوازوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی مہین بولیاں روپہلی گھنگھروؤں کی طرح بج رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں مونگ پھلیوں کے چھلکوں کی چڑ چڑ، بالکل ساز سنگیت کا لطف آ رہا تھا۔ الاؤ دھیما ہو گیا تھا صرف کبھی کبھی جب کوئی گروہ مونگ پھلیوں کی مٹھیاں بھر کر پھینکتا تو ایک آدھ شعلہ لپک اٹھتا۔

اُس دن کتنی نگاہیں اُسے اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور بجائے ان کو جھٹک دینے کے سینے سے لگا کر تھپکیاں دی تھیں۔ اُسے سردی لگی تھی تو کتنے کوٹ اور مفلر اس پر برس پڑے تھے ہر ایک خود دکھ اٹھا کر اس کے قیمتی جسم کو بچانے کی فکر میں تھا نہ جانے اس قربانی میں کیا لطف آ رہا تھا کہ ہر ایک تھکا جا رہا تھا۔ اتفاق کہیے یا جو کچھ بھی اس کے ہاتھ میں افتخار کا کوٹ آیا تھا، پہلے تو اس کا دم گھٹنے لگا تھا سگریٹ کے علاوہ اور بھی بہت سی پریشان کن خوشبوئیں ایک دم دماغ پر چڑھ گئی تھیں شمن نے اوڑھے ہی کون سے ہزاروں کوٹ تھے جو ان خوشبوؤں کو پہچان سکتی۔ اس نے چھپے چوری اس دل چسپ کوٹ کی جیبیں بھی ٹٹول ڈالی تھیں۔ فتحن بڑا لاپروا تھا منوں کوڑا بھرا پڑا تھا۔ تمباکو کا چورا، ٹوٹی ہوئی دیا سلائیاں، دو چار پنسل کی چھیلن کے ٹکڑے، پروگراموں کے تڑے مڑے پرچے۔ دوسری جیب میں مونگ پھلیوں کے چھلکوں کے علاوہ ایک خط بھی تھا جو وہ الاؤ کی روشنی میں نہ پڑھ سکی اور نہ جانے کیوں اُسے اپنی صدری میں اڑس لیا جلسہ بکھرنے لگا تو وہ افتخار کو ڈھونڈنے لگی۔

"کمال کر دیا آپ نے تو کبھی میں نے تو سب کی حرص میں دے دیا تھا کوٹ اور آپ قبضہ ہی جما بیٹھیں۔ خدا قسم مرا جا رہا ہوں سردی کے مارے ہاں تو مجھے بھی لپیٹ لیجیے اسی میں یا......"

افتخار کو ہذیان بکتے دیکھ کر شمن سہم گئی۔

"لیجیے اپنا کوٹ" اس نے ہمت کر کے کہا۔

"میں اور آپ؟ مرنے کا شوق ہے؟"

"میں یہ پہنے ہوں کافی گرم ہے۔"

"اوہو...... جل گیا میرا ہاتھ تو......" اس نے بن کر صدری کا کپڑا انگلی سے چھوا

"اچھا اب بیٹھیے مت اور جلدی سے کیمپ میں جا کر بستر میں دبک جائیے۔"

"نیند ہی نہیں آ رہی ہے میں جا کر اپنا کوٹ پہن لوں گی۔ لیجئے۔"

دونوں کیمپ میں آئے اور افتخار نے کوٹ نہ لیا بلکہ اس کی رضائی اوڑھ لی دونوں باہر آ گئے۔

"کا ہے کی خوشبو ہے؟" افتخار نے نیا ری رضائی کو ناک سے رگڑ کر پوچھا تھا شبنم نے نہ جانے کیا جواب دیا تھا۔ ایک بے تکی خاموشی درمیان میں حائل ہو گئی تھی اور دونوں کو ایک دوسرے کا وجود بری طرح کھٹکنے لگا۔ افتخار نے سگریٹ سلگایا اور پھر جھنجھلا کر مسل ڈالا۔

"ہُنہ!" وہ طنز سے غرّایا

"جی؟"

"آپ چاہتی ہیں میں چلا جاؤں؟ یہ سنبھالیے اپنی رضائی۔"

"ایں؟"

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ مجھ سے نفرت کرتی ہیں...... میں.... بلکہ میرا مطلب کچھ بھی نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کندھوں کو بے معنی سی جنبش دی

"مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے بہت پسند کرتی ہو۔"

"یہ......میں؟" وہ چڑ کر ہکلائی۔

"ہاں، اور جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں یہی وجہ ہے کہ میں آج تم سے کھل کر باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" وہ اُسے روک کر بولا "میں تم سے بہت بڑا ہوں، دنیا بھر کی ٹھوکریں کھا چکا ہوں بہت کچھ سمجھنے لگا ہوں۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اس لیے...... تو...... خیر جانے دو...... تو میں کیا کہہ رہا تھا،" وہ ایک دم گم ہو گیا۔

"ہاں اسی لیے تم سے کچھ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔"

"کہیے!"

"تم بہت بھولی ہو...... اس میں کوئی فخر کی بات نہیں۔" اس نے جلدی سے اپنے الفاظ کی تردید کی "معصومیت ایسی دولت نہیں جس پر کوئی اس دنیا میں ناز کر سکے..... تو میرا خیال ہے..."

"تم نے کسی سے محبت نہیں کی؟" وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔ شمن خاموش رہی نہ جانے کیوں اُسے تردید کرنے میں احساس کمتری ہونے لگا۔

"اور میری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گذری ہے، میں نے اتنا پیار محبت کی ہے کہ یاد بھی نہیں ماں کی محبت سے لے کر مجھے داشتاؤں نیز نیوں اور ان سے بھی گری ہوئی عورتوں کی محبت نصیب ہو چکی...... مگر تم سے جو محبت...... لاحول ولا قوۃ!" وہ جھلا یا کہیں یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تم سے زیادہ کبھی کسی سے محبت نہیں ہوئی نہیں بلکہ تمہیں دیکھ کر میرے دل میں عجیب جذبات موجزن ہونے لگتے ہیں۔

"تم سمجھ بھی تو نہیں سکتیں۔ تم سے لگاؤ پیدا ہوتے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے...... جیسے...... جیسے یوں سمجھو جیسے میں تمہیں اپنا کوٹ دے دوں اوڑھنے کے لیے تو مجھے یقین ہے کہ وہ محفوظ رہے گا۔" شمن ڈر گئی کہ کہیں اس نے خط نکالتے دیکھ تو نہیں لیا۔

"تم اس میں سے کچھ نہ چرا سکو گی برسوں کے لیے بھی اگر میں اپنی محبت مع تمام لغزشوں کے سپرد کر دوں تو بھی خیانت نہ کرو گی اور یہ اطمینان جتا نہیں سکتا ایک مرد کے لیے کیا حیثیت رکھتا ہے میرا مطلب اور مردوں سے نہیں خود اپنی ذات سے ہے۔"

"مگر یہ کیوں؟" وہ ایک دم بولا۔

"یہ آپ ہی بتا سکتے ہیں؟"

"میں؟ میں کچھ نہیں بتا سکتا، میں نہ خود ہی نہیں سمجھتا، کہ تم جیسی سیدھی سادی لڑکی مجھے کیا دے سکتی ہے جو مجھے در در کی خاک چھان کر بھی نہ ملا۔ میں تمہارے ساتھ بغیر تھکے بہت دور تک جا سکتا ہوں......" شمن کو ایلیا کا لمبا سفر یاد آ گیا۔

"مگر ہمارے راستے جدا جدا ہیں......"

"کیوں؟" شمن نے کسی بچوں کا منہ سے گلا چھڑا کر کہا۔

"اس لیے کہ...... تم بالکل چوکور ہو...... اور دنیا کے گھسنے کھانے میں بالکل گول ہو چکا ہوں"

"مگر تراشنے سے میرا اور میش بہا ہو جاتا ہے" شمن اپنی زبان کی طراری پر جھینپ گئی۔
"ہیں؟..... مگر میں پتھر ہوں..... تم سمجھ رہی ہو گی کہ میں بن رہا ہوں" وہ بگڑا۔
"نہیں تو"

"ہنہ..... جانتی ہو میں نے تمہاری رضائی کیوں اوڑھی؟" شمن کا دل دھڑکا۔
"اسے دیکھ کر مجھے گذری ہوئی زندگی کی باتیں یاد آگئیں..... تمہیں نہیں معلوم میری ایک بہن بھی تھی ہم دونوں میں بڑی دوستی تھی، مجھے اب تک یاد ہے ہم دونوں کیسی توس ترح کی طرح رنگیلی رضائی میں گھس کر ریل ریل کھیلا کرتے تھے۔ آج اس رضائی کو دیکھ کر..... ہنسو مت! تم ہنستی کیوں ہو، ہاں اسے دیکھ کر میرا دل بے اختیار ریل ریل کھیلنے کو چاہا، تمہیں دیکھ کر میرا دل ہمیشہ پھڑکنے کو چاہتا ہے۔ مگر میں رک جاتا ہوں کہ کہیں تم اسے کچھ اور نہ سمجھنے لگو، شمشاد معشوقاؤں کے تو ہم نے ہزاروں چٹکیاں لی ہیں، مگر ویسی چٹکی جو میری بہن پلنگ کے نیچے گھس کر میری پیٹھ میں بھر لیا کرتی تھی، اس کی یاد آج تک میری رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے، میری بہن مر گئی اور پھر مجھے ویسی محبت نصیب نہ ہوئی۔

وہ تھوڑی دیر تک رضائی پر ٹکے ہوئے ستارے ناخونوں سے کھرچتا رہا پھر کچھ یاد کر کے بولا
"ہم صبح ناشتے پر اڑد کی کھچڑی کھایا کرتے تھے، وہ دبلی پتلی اور بڑی ہلکی سی تھی، اور میں پلنگ پر بیٹھ کر کودا کرتا تھا تو وہ لڑھک کر میرے اوپر آن گرتی اسے کھانسی کی وجہ سے گھی کھانے کو منع کر دیا گیا تھا، مگر وہ ضد کرتی تو بیوی روئی کی گولی بنا کر کھچڑی پر رکھ دیتیں۔ وہ قطعی نہ سمجھتی اور مزے سے کھچڑی کھا لیتی۔ ایک دن میں نے اسے بتا دیا۔
"سچ، یہ گھی تھوڑی ہے، روئی ہے۔

"روئی؟" وہ حیرت زدہ ہو کر رہ گئی اور جب اسے اماں کی چالاکی معلوم ہو گئی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ مجھے بڑا افسوس ہوا تھا تم نے کبھی اڑد کی کھچڑی کھائی ہے؟"
"آہاں" شمن کا گلا بھر آیا

"اور..... اور۔ ارے یہ میں تم سے کس قدر بچپنے کی باتیں کر رہا ہوں لاحول ولا قوۃ تم سمجھ رہی ہو گی کہ میں بھی نرا چغد ہوں" وہ کھسیا گیا۔

"ارے میں تو بالکل بھی ......"

"جھوٹ، تم مجھے نطی الو سمجھ رہی ہو ورنہ نہیں تو کیا میں جب تمہیں پسند کرتا ہوں تو بجائے تمہیں آغوش میں لینے کے یہ اردلی کی مجبوری"

"تو کیا ہوا، آپ مجھے بہن کی طرح چاہتے ہیں"

"میں؟ قطعی نہیں، میں ان لوگوں کو پرلے درجے کا مکار سمجھتا ہوں۔ جو غیر لڑکیوں کو جوان کی معشوقہ بن سکتی ہیں، بہن کہتے ہیں، مگر شاید تم ٹھیک کہتی ہو، میں معشوقائیں بناتے بناتے تھک چکا ہوں، یہی وجہ ہے کہ میں لفظ بیوی سے چڑتا ہوں، مگر میں تمہیں بہن تو نہیں بنانا چاہتا۔ لاحول ولا قوۃ"

"کیوں؟"

"کیونکہ یہ ہو ہی نہیں سکتا، ایک سرے سے میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتا بہت دفعہ میرے دل میں تمہاری طرف سے ایسے خیال آئے ہیں، جو ایک بہن کے لیے نہیں آتے، تم ابھی نہیں سمجھو گی۔ ایک دن آئے گا۔ جب ان الفاظ کے معنی تم خود بخود سمجھ جاؤ گی۔ تم ...... کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم بھائی نہیں بلکہ دوست سمجھو، ایسا دوست جس سے کسی قسم کا تکلف نہ ہو۔

"کیوں نہیں"

"میری بہن زندہ رہتی تو میں اسے کبھی بھی صرف بہن نہ سمجھتا، اس کی شادی ہو جاتی مگر ہم بہترین دوست رہتے"

"آپ شادی نہیں کریں گے؟"

"شادی سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ کیا سہرا باندھ کر گھوڑے پر چڑھنا اور ایک لڑکی کو بجا اشامیہ لگا کر وصول کرنا ہی شادی ہے تو میں کنوارا ہی بھلا، اور ویسے تو ...... دشمن کچھ جب گئی"

"تو اس میں کیا ہوا" وہ جلدی سے بولا۔ "مرد ہونا کوئی عیب تو نہیں گو ہم کہتے نہیں مگر ہماری مائیں بہنیں خوب جانتی ہیں کہ ...... ہم مردہی ہیں اسے گناہ نہیں سمجھتا"

"آپ شادی کے خلاف ہیں، میرا مطلب ہے نکاح کے"

"قطعی، نکاح ایک معاہدہ ہے جو صرف اس لیے پختہ کیا جاتا ہے کہ کہیں وعدہ کرنے والا مکر نہ جائے ذرا سوچیے تو سہی زندگی کے اتنے اہم معاملے کو کاغذی گواہ کس طرح مضبوط بنا سکتے ہیں شادی ایک فعل ہے قول نہیں۔"

شمن کچھ نہ سمجھی۔

"تو پھر لوگ نکاح کیوں کرتے ہیں؟"

"گدھاپن کرتے ہیں۔"

"واہ" شمن لاجواب ہو کر ہنسی

توری نے کروٹ لی اور اس کا سر بازو سے ڈھلک کر تکیے پر ٹک گیا شمن نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا شاید وہ آنے والے کل کے سب سے زیادہ رنگین لمحوں کو سمیٹ کر خواب دیکھ رہی تھی اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور آنکھیں نیم وا تھیں۔ رات کی تنہا خاموشی میں شمن کا جی چاہا کاش وہ کسی طرح جھانک کر اس کی جگمگاتی دنیا کی ایک جھلک دیکھ سکتی، مگر افتخار کے الفاظ گھوم پھر کر اسے اپنی دنیا میں واپس گھسیٹ لے گئے۔

"اور کیا گدھاپن تو ہے ہی، اگر مجھے کوئی عورت کہے کہ مجھے تمہارا اعتبار نہیں چار آدمیوں کے سامنے کہو کہ تم مجھے...... مجھے......" شمن کی گھبراہٹ دیکھ کر وہ رک گیا تھا، مگر پھر جلدی سے بولا۔ "تو میں اس سے کہوں گا۔ بیگم صاحبہ چلتی پھرتی نظر آؤ، ہمیں چار آدمیوں کی گواہی کے بغیر ہی کوئی چڑیل مل جائے تو پھر......"

"مگر یہ تو ناانصافی ہے آپ کی!" وہ جلدی سے بولی۔

"کیوں؟"

"کیونکہ جن عورتوں کی زندگی اس طرح خراب ہو جاتی ہے وہ کیا کریں۔"

"کیوں صاحب عورتوں کی زندگی خراب ہو جاتی ہے تو مردوں کی نہیں ہوتی؟"

"لوگ تو عورتوں کی ہی زندگی دوبھر کر دیتے ہیں۔"

"مردوں کی نہیں کرتے؟"

"مرد پرواہ جو نہیں کرتے!"

"تو عورتوں سے کون کہتا ہے کہ وہ پیدا کریں۔ کہیے سماج"

"اور کیا؟"

"اور یہ سماج بنایا کس نے؟ خود انڈا پھوٹ کر بچّہ نکل آیا؟"

"نہیں تو!"

"جب ہم نے ہی سماج بنایا ہے تو ہم ہی توڑ سکتے ہیں"

"مگر اور بھی مصیبتیں ہیں جو صرف عورتوں کو بھگتنا پڑتی ہیں" شمن نے ڈرتے ڈرتے کہا

"یعنی بچّے وغیرہ؟"

"جی ہاں"

"بھئی واہ کیا عورت ہیں آپ بھی کہ اپنے عظیم ترین فرض کو مصیبت سمجھتی ہیں۔ جبھی تو لوگ کہتے ہیں عورتوں کو زیادہ نہیں پڑھانا چاہیے"

"ارے!" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے اور وہ اس کی بدحواسی پر زور زور سے ہنسا۔

"مگر جو بچّے ہوں گے وہ......"

"حرامی ہوں گے وہ......"

"حرامی ہوں گے؟"

"ہاں......"

"حد ہے بھئی ہمارے اور آپ کے نظریے بہت مختلف ہیں میں حرام حلال اور جھٹکا سب ایک ہی چیز سمجھتا ہوں۔ قدرت کے اصول کی پیروی کر کے پیدا ہونے والا جاندار انسان بننے کا حق دار ہے"

"مگر میرا مطلب ہے...... اقتصادی مشکلات"

"تو یوں کہیے میاں نہیں بینک کی کتاب چاہیے"

"یونہی سمجھ لیجیے"

شمن کو کچھ لاجواب سا دیکھ کر افتخار کو دکھ سا ہوا، وہ بولا۔

"ٹھیک کہتی ہو یہی تو وہ سوال ہے جس کا جواب میں برسوں سے تلاش کر رہا ہوں ابھی تو نہیں شاید ہماری تمہاری زندگی میں وہ وقت آجائے کہ اس کا جواب مل جائے۔

دیر ہو گئی تھی اور وہ واپس کیمپ کی طرف چل دیے

"ہاں ایک بات اور جو تم سے کہنا بھول ہی گیا" اس نے رضائی دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا پھر رک گیا "ہاں تم اپنی یہ رضائی مجھ کو دے سکتی ہو؟"

"رضائی؟"

"ہاں اس کوٹ کے بدلے میں نہیں بلکہ مفت"

"لے لیجیے" وہ الٹی احسان مند تھی۔

"سلام" اس نے مسخرے پن سے ماتھے کو ہاتھ لگائے۔

"ایک بات اور وہ یہ...... کہ میں سینی ٹوریم جا رہا ہوں، ڈاکٹروں نے مجھے ٹی بی بتادی ہے۔ ارے......؟ وہ شمن کی گھبراہٹ پر مسکرایا "جیسے یہ کوئی نئی بات ہے پرانی شکایت ہے، دو دفعہ بھوالی رہ آیا ہوں مگر۔ مگر اب کے شاید جلدی نہ نکل سکوں"

"لیکن آپ اتنے بیمار تو نہیں نظر آتے"

"نظر تو نہیں آتا، مگر تم جیسی نظروں کو، اندیشہ ہے کہ کہیں میرے جراثیم دوسروں کو لگ نہ جائیں یہ چھوت کی بیماری ہے" اس نے معنی خیز قہقہہ لگایا ہماری مہربان گورنمنٹ نے "ٹی کلاس میں میرے لیے پلنگ دلوا دیا ہے۔ سارا خرچہ یونیورسٹی اور حکومت کے ذمے" وہ ہنستا رہا "جب شارع عام پر ایک گڑھا ہو کر اس میں غلاظت بھر جائے جو ہر آنے جانے والے کے منہ پر اچھلنے لگے تو حکومت کا فرض ہے کہ عام صحت کی خاطر اسے دور کر دے..... شکر کرو کہ پولیٹیکل جیل سے بچ گیا...... ورنہ...... اوہ میں کیا بکنے لگا......" چلنے سے پہلے اس نے کہا۔

"ہاں ایک وعدہ کرو...... یہ رضائی تو میں نے لی اب ایک اور بھی قیمتی وعدہ مانگنا چاہتا ہوں"

"کیسے" وہ اب بے صبر ہو چکی تھی۔

"کہ جب کبھی میں تمہیں کوئی ہدایت دوں تو تم اس پر عمل کرو گی میرا مطلب ہے کہ میری وہ

درخواست جس سے تمہارے اوپر آنچ نہ آئے۔"

"میں آنچ سے نہیں ڈرتی۔"

"مجھے معلوم ہے تم میں انہیں اپنے ننددمیں نہیں گھسیٹنا چاہتا ہیں پختہ وعدہ نہیں چاہتا سوچ لو، اگر تم سمجھتی ہو کہ ...."

"آپ نے میری خاموشی کا غلط اندازہ لگایا۔"

"تو ......"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔"

"تو آؤ۔"

قلم اور کاغذ لے کر افتخار نے اس کی کلائی پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا جب سارا کیمپ غفلت کی نیند سو رہا تھا، دو سہمے انسانوں نے سر جوڑ کر چند سطور لکھیں۔

"آنکھیں بند کر دو۔" افتخار نے ٹھوڑی پکڑ کر اس کا منہ دوسری طرف پھیر دیا۔

"ہائے!" سوئی کی نوک شاید انگلی میں گہری اتر گئی۔

"لکھو۔"

"شمشاد!" شمن نے لرزتے ہوئے انگلیوں سے لکھ دیا۔

"خدا حافظ،" وہ رضائی میں منہ چھپائے تاریکی میں ڈوب گیا۔

شمن جاگ اٹھی۔ یہ خواب اس نے لفظ بہ لفظ دہرا لیا؟ بکھرتے ہوئے حواس سمیٹ کر اس نے پھر زنجیر کو پکڑا تیز آنکھیں پھاڑے جیسے وہ اب بھی کیمپ کے ہلتے ہوئے پردے کو دیکھ رہی تھی آج، آج اسے کسی نے خوب جھنجھوڑیاں دے کر زندگی کے نئے موڑ پر دھکا دے دیا تھا۔ دیر تک ہچکیاں تڑا کر بھاگتے رہے کرد و دھندلی روشنی میں اسے بہت ہی لمبا را اٹھتا گرتا نظر آ رہا تھا آج اس نے اپنے خون سے اپنے دیوتا پر عبودیت کا قشقہ کھینچ دیا تھا۔ اسے معلوم بھی نہ تھا کہ اس کا خون اتنا سرخ ہے اور یہ نام شمشاد سرخ پرچم کی طرح شفق بن کر کتنی دور تک پھیلا آ رہا تھا۔

اس نے پھر بیاہی دلہن کی طرف دیکھا، کل وہ بھی اپنے دیوتا کے حضور میں ماتھا ٹیک دے گی پوری دھندلی ہو کر ایک آدمی کی عورت رہ جائے گی۔ غرور اور اطمینان کی لہروں نے ہلکورے لے کر اسے سلا دیا۔

۳۰

شادی کے درمیان میں اُسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے کتنے ہی بزرگوں سے بڑی ہو گئی ہے اُس نے بڑھیوں کو خوب چھیڑا یہاں تک کہ وہ مچل مچل گئیں۔ وہی اعتراض جنھیں سُن کر وہ رو دیا کرتی تھی اُس نے توڑ مروڑ کر اُلٹے انہی کے سر مار دیے اور اس مسخرے پن سے کہ معترض کھسیا گئے اور لوگ ہنس دیے۔ خصوصاً ان بڑھیوں کو تو رلا کر چھوڑا جو ہر بات پر......

"اے ہے توبہ جو ہمارے زمانے کی لڑکیاں ایسی بے شرم ہوتیں!"

"توبہ ہے، گریبان تو دیکھو سارا آگا پیچھا کھلا پڑا ہے"

"جب دیکھو جب کھٹی کھی۔ جب دیکھو دھاچوکڑی، لڑکیاں ہیں کہ گھوڑے؟"

اُن لوگوں کو جلا کر اُسے بڑا مزا آیا، نہایت ڈھٹائی سے اُس نے اُن کی ہر بات کی کاٹ شروع کر دی، گویا ساری عمر کی ڈانٹ کا آج پورا پورا بدلہ لے کر چھوڑے گی۔ اُسے آج معلوم ہوا کہ بجائے غصے کے اُن بڈھوں پر رحم آنا چاہیے۔ جوانی کہیں ڈانٹ پھٹکار سہتی ہے؟ ہار تو ہمیشہ بڑھاپے کی ہے جب قدرت کسی کو خزاں کے بے رحم ہاتھوں سے مسلنا شروع کر دیتی ہے، تو وہ دانت کچکچا کر بہار ہی پر جلن اتارتا ہے مسرّت بھرے قہقہے کھی کھی، عشق بدمعاشی، اور جوانی بے حیائی نظر آنے لگتی ہے جوان لڑکیوں کی چکنی نرم بانہیں اور سڈول جسم دیکھ کر بڑھیوں کو اپنے کھائی جیسے جھرّی جسم پر غصہ آتا ہے جی پر چھریاں چل جاتی ہیں۔ یہی جی سے دعا نکلتی ہے کہ کوئی ان کی طرح جوانی کو بھی خزاں کی چادر میں لپیٹ کر ان کے ساتھ ساتھ دفن کر دے تاکہ وہ بھی ان کی طرح مردہ اور   بے رنگ ہو جائے۔

محفل میں جتنی لڑکیاں نظر آئیں سب بدمذاق اور چھوٹی، دو چار لڑکے دکھائی دیے وہ ڈرپوک اور دبّو سے۔ مگر پھر بھی اُن میں گھل مل گئی تاکہ ایک دفعہ وہ بھی پڑھی لکھی لڑکیوں کے اخلاق سے متاثر ہو جائیں۔ چند لڑکیاں پڑھی لکھی بھی تھیں۔ مگر شمن کی طرح لڑکوں سے گھل مل جانے کا موقع نہ ملا تھا۔ ان کے لیے لڑکے اب بھی ردمنٹک بدمعاش اور بے رحم

داہمے بنے ہوئے تھے جن کی آوازیں سن کر وہ اصطبل میں بندھی گھوڑیوں کی طرح ہنہنانے لگتیں گو زبان سے بیٹھی لڑکوں کو کوس رہی تھیں، مگر جان بوجھ کر ایسی جگہ جا رہی تھیں کہ ان سے ٹکر ہو جائے۔ اور پھر وہاں سے ایسی اترا کر شرماتی لجاتی بھاگتیں گو یا پچھین ہی تو گیا پھر گھنٹوں پسینے میں ڈوبی دل دھڑکایا کرتیں۔

لڑکے بھی بھاگ دوڑ میں جو کچھ نہ کر جاتے کم تھا۔

"کم بخت کہیں کا ــــــ میرا کلیجہ اب تک کانپ رہا ہے" وہ اس پُر لذت ٹکر کی گدگدیا یاد کر کے دوسری ٹکر کی آس میں لرزا کرتیں۔ اس کے علاوہ کچھ لڑکیاں اپنی ہونے والی ساس نندوں سے وہ شاندار جشن ہو رہی تھیں کہ کیا کہنے، وہ اُن سے ہونے والے شوہر کا تصور وابستہ کر لیتیں اور اُن سے ایسے شرمائیں جیسے نئی دلہن دولہا سے شرماتی ہے۔ بھلا اس رومانی عیاشی سے کون رو ل سکتا ہے؟

کہاں یہ رنگین فضا اور کہاں کالج کے کھلے میدان میں پروفیسروں کے زیر سایہ ایک دوسرے سے مصنوعی ہنسی طاری کر کے پوچھنا "آپ کا مزاج کیسا ہے؟ گویا ایک لڑکی کو ایک لڑکے کے مزاج ہی کی توڑی رہتی ہے۔

شمن کو محسوس ہوا کہ یہ آزادی ہی تو قید ہے۔ ٹھیک کہتے ہیں یہ بوسیدہ لوگ کہ عورت کو پردہ میں رہنا چاہیے۔ سچ تو ہے کتنے مزے سے پردے، آنکھ مچولی کھیلی جا سکتی ہے جی چاہا جس سے چھپ گئے اور جی چاہا جسے دکھا دیا۔ بدصورت تو خاص فائدہ میں رہتی ہوگی جیسے ہلکی سی جھلک دکھا دی وہی حسین سمجھ بیٹھا۔ یہ تھوڑی کہ مقابل بیٹھے ہیں اور ہر عیب سامنے رکھا دل دکھا رہا ہے۔

جب ہی تو پچھلے زمانے کا ادب اٹھا کر دیکھیو ہر عورت حسنِ مجسّم رکھی ہے۔ عورت حسینہ تھی یا دوشیزہ اور اب اُسے اُستانی، ڈاکٹرنی ترس نفیری، ھنگوں یا لڑکی کہا جاتا ہے یہ پردے سے نکل کر حسینہ سے صرف عورت کیوں رہ گئی؟ وہ اس کے سارے قتل و غارت کے حربے کیا ہوئے؟ تیر نظر کُند اور ابروؤں کی دھار کھٹی! بات یہ ہے کہ پردے سے نکل آنے پر غازہ، سرمہ مستی کا راز کھل گیا۔ سب کو معلوم ہو گیا کہ ابرو

نیچ کر کمانیں بنائی گئی ہیں اور آنکھوں سے بجلیاں مسکارہ کی مدد سے گرائی جا رہی ہیں ہونٹ "ٹینجی" کے صدقے برگِ گل بنے ہوئے ہیں اور گالوں پہ روز کی شفق کھیل رہی ہے گو ویسے ہندوستان میں حقیقی حسن کی قلت پہلے بھی تھی اب بھی ہے مگر یہ پردہ ہٹ جانے سے تو نظر کا پردہ بھی اٹھ گیا عورت بڑے نقصان میں رہی۔

دولہا شام کو گھر میں آیا تو صنفِ نازک بھوکی مکھیوں کی طرح جٹ گئی آج بھی پردہ والیاں پل بھر کو سٹ پٹائیں پھر وہ بھی مست ہو گئیں۔ مرد ہیں خواہ وہ دولہا ہی کیوں نہ بنا ہوا ہو کتنی جاذبیت ہوتی ہے کہ اچھے بھلے دماغ کھو بیٹھتے ہیں اس پر ستم یہ کہ ساتھ ساتھ دو چار دولہا کے شہ بالے بھی رنگ آئے۔ پہلے تو دو چار ڈھیٹ بھوکی ناکارہ بڑھیوں نے غل مچایا مگر پالا جوان ہی مارے گئے۔ طے ہوا کہ شہ بالے خیر بیٹھ جائیں بشرطیکہ اپنی رشتہ داروں کے دوپٹوں میں منہ چھپانے کا پختہ وعدہ کریں اُن کی دوپٹوں میں سے جھلکتی شریر آنکھوں کو دیکھ کر شمن کو بے اختیار بلقیس کی سالگرہ کا دن یاد آگیا جب کبڈی کھیلنے میں رشید کو رومال کا گھونگٹ نکال کر کھیل میں شریک ہونے کی اجازت مل گئی تھی۔

"یہ بھی دولہا کے دم چھلے کیوں آ گئے ہیں؟" شمن نے منہ ہی منہ غصے سے پوچھا تو ان میں سے ایک کبوتر باز جیسی آنکھوں والے نے کچھ دانتوں ہی دانتوں میں جواب دیا جس پر اس کے ساتھی نے کہنی ماری۔

"پاگل ہے بیچارا،" ایک نے شمن سے سفارش کی۔

"پاگل نہیں دیوانہ کہو،" اس نے پھر کبوتر باز جیسی آنکھیں چلائیں۔ اور پھر کچھ بڑبڑایا جس پر اس کے ساتھی نے چپ رہنے کی رائے دی۔

جتنی دیر دولہا دلہن سے آرسی مصحف کی کشتی لڑتا رہا لڑکے دوسری لڑکیوں کے چٹکیاں بھرنے کی تاک میں لگے رہے معلوم ہوتا تھا ایک نہیں چھ سات آرسی مصحف ہو رہے تھے لڑکیاں چڑھ کر باتیں سنا رہی تھیں مگر ہٹنے کا نام نہ لیتی تھیں بڑی اچھی طرح مقابلہ کر رہی تھیں

رخصت ہوتے وقت نوری کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر روئی۔ شمن جل گئی

"مرن کیوں رہی ہو مری تو جاتی تھیں شادی کے لیے۔"

"واہ!" نوری کھسیا کر نتھ سنبھالنے لگی۔

"یا اس لیے خوشی کے مارے رو رہی ہو کر اتنی مشکلوں سے شادی ہوئی؟"

نوری چپ ہو گئی اس کے آنسو بھی نہ جانے کیسے خشک ہو گئے۔

"کوئی زبردستی ہو رہی ہے تمہاری شادی، کیوں کر لی۔ اب طلاق لے لو۔" شمن اُسے خاموش دیکھ کر اور جلے کٹے جملے سنانے لگی۔

اُسے نوری بالکل گائے بیل کی طرح لگ رہی تھی۔ ایک دن بازار میں وہ اپنی جوانی کا سودا کر کے ایک مرد کے ساتھ جا رہی تھی بے وقوفوں کی طرح نہیں بیچا کاغذ لکھا کر کہ اگر وہ بعد میں تڑپے تو، اور پھندا اُس کے گلے میں تنگ ہوتا جائے۔ اور وہ چند بھی ڈھول تماشے سے اُسے خرید کر لے جا رہا تھا۔ آخر فرق ہی کیا ہے اس سودے میں اور آئے دن جو چاوڑی میں خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے وہ چھوٹا موٹا بیوپار ہے جیسے کچالو پکوڑیوں کی چاٹ اور یہ لمبا ٹھیکہ ہے جب تک ایک فریق خیانت نہ کرے بیوپار چلتا رہتا ہے ورنہ سودا پھٹ۔

مگر دولہا جب نوری کو لے کر جانے لگا تو شمن کے دل کے کسی نامعلوم کونے میں ایک عجیب سا شبہ پیدا ہوا جیسے نوری فروخت نہیں کی گئی بلکہ یہ جو اُسے کلیجے سے لگائے لے جا رہا ہے اپنی زندگی کے پیروں میں زنجیریں ڈالنے لے جا رہا ہے یہی نوری۔ یہ کم عمر الھڑ لڑکی اس کی ہستی میں ایسے گہرے پنجے گاڑے گی کہ وہ دنیا کو چھوڑ چھاڑ اُسی کے ہاتھ میں لگام دے کر اُسی کے چلائے راستے پر چلتا چلا جائے گا جیسے ہے کہ یہ مرد عورت کو پیر کی جوتی، ناقص العقل اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں، مگر جب یہ جوتی اُن کے سر پر پہنچتی ہے تو احساسِ خودی بھی فنا ہو چکتا ہے اُسے سارے مرد مظلوم نظر آنے لگے اور ساری سونے روپے میں لدی ہوئی بیویاں ظالم، جو ان کی کمائیاں بالکل اسی طرح قابض تھیں جیسے خون چوسنے والے سرمایہ دار غریبوں کی مشقت پر۔ وہ اپنے جسم کی قیمت لیتی تھیں ——
بجائے دو جھونکوں کے صرف ایک سے۔

پھر یہ مرد عورت کو کمزور کیوں کہتے ہیں۔ شاید اس طرح خود اُن کی کمزوری آڑ میں

چھپ جاتی ہے۔ ظالم کبھی پکار پکار کر اپنے ظلم کا ڈھنڈھورا نہیں پیٹتا۔ بزدل ہی شیر کی طرح گرج کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ مگر عورت؟ عورت اس حاکم کی طرح ہے جو دیمک کا چاکر، بن کر انھیں اُتو بناتی ہے۔ اس کی چالیں کس قدر خطرناک اور پُر اسرار ہیں! بجائے شرمندگی کے اُسے اپنی نسوانیت ایک بلند چیز نظر آنے لگی۔

مراثنیں گا رہی تھیں۔ اُن کی آوازیں میں رقت تھی!

ہم تو بابل تورے کھونٹے کی گیاں
جدھر ہانکو ہنک جائیں

"کیا کہتے ہیں اس معصومیت کے گویا یہ گائیں بیلوں سے زیادہ بھولی ہوتی ہیں" شمن نے پاس بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے کہا۔

"اور کیا بن گائے بیچاری تو ہوتی ہی سیدھی ہے۔"

"کیا گائے سینگ نہیں مارتی۔ ویسے بیل بیچارا زندگی میں زیادہ اُتو بنتا ہے یہ کولھو کا بیل غریب کس کے سینے میں سینگ مارنے جاتا ہے۔ ہل کے بیل کو کب فرصت ملتی ہے کہ لوگوں سے مذاق کرنے جائے لیکن یہ گائے! سوائے گھاس چلنے اور دودھ دینے کے اور کیا کام کرتی ہیں؟ اُن کی بلا سے دودھ بچھڑے نے پیا آدمی نے کھیر بنا کر کھالی۔ نہ ہاتھ بلانے کی ضرورت نہ پیر۔ اور پھر بھی انسان گائے کی پوجا کرتا ہے اور بیل کو پوچھتا بھی نہیں۔"

اس کا اور بھی جی جل گیا۔ مراثنیں بےچارے دولھا کا مذاق اُڑا رہی تھیں، جی چاہا جا کر اُن کا منہ مسل دے کمبختو، بیلوں میں بھی جان ہے۔

تیسری منزل

۳۱

شادی سے لوٹی تو ایسا معلوم ہوا دو عزیزوں کو دفن کر آئی، ایک تو نوری اور دوسرا افتخار۔ نوری کو تو دوسرے دن سے سوائے دولہا کی شرارتوں کے اور کسی جھگڑے میں دلچسپی نہ رہی۔ سارا دن بیٹھی وہ ہمجولیوں کو سرگوشیوں میں افسانے سنا سنا کر بے حال کرتی رہی۔ پتہ نہیں ان ہمجولیوں کو سب کچھ معلوم ہونے کے بعد بھی ــــ کس چیز کی تلاش تھی یا شاید یہ وہی جذبہ تھا جو لوگوں کو قصے کہانیوں میں جنسی ذائقے کا متلاشی بنا دیتا ہے۔

اور افتخار؟...... وہ الہ آباد سے سیدھا بھوالی چلا گیا۔ انچارج پروفیسر نے تذکرے کے طور پر بتا دیا کہ انھیں بڑا افسوس ہے کہ افتخار ان کے ساتھ نہیں جا سکتا بلکہ وہ اپنے پرانے مرض کے علاج کے لیے سینی ٹوریم چلا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے چند دعائیہ جملے بھی کہے مگر وہ صاف ڈھکوسلے معلوم ہوتے۔ وہ خوب جانتی تھی کہ خواہ اللہ کتنا ہی افتخار پر مہربان ہو، اگر دنیا نہ چاہے تو وہ کبھی بھوالی سے صحت یاب ہو کر نہیں نکل سکتا۔ گو لوگ اس کی موت کا سارا الزام ملک الموت اور نوشتۂ تقدیر کے سر تھوپ دیں گے۔

افتخار کے بعد سینل خود بخود یونیورسٹی کی باگ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی پشت پر پروفیسروں اور پرنسپل کی شفقت بھی تو تھی۔ نہ جانے کن ہتھکنڈوں کی مدد سے اسے پریذیڈنٹ بنا دیا گیا۔ ایلما کچھ ششدر، کچھ جھلائی سی نئی نئی باتیں کرنے لگی۔ اس نے سینل کی مخالفت نہ کی نہ ہی یونین کے کسی جھگڑے میں دلچسپی لی۔ نہ جانے وہ کس چیز سے کچھ خوف زدہ سی نظر آتی تھی۔ وہ اس کی بزرگی میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کسی نامعلوم دھمکی سے خوف زدہ ہو جاتیں تو وہ بالکل معصوم بچے کی طرح معصوم اور بھولی معلوم ہونے لگتیں۔ اس کی ہنسی میں جھینپ آ جاتی اور دانت مصنوعی چینی کے کھلونے کے ٹکڑے بن جاتے۔

سینل کے غرور نے بجائے مرعوب کرنے کے اسے ڈرا دیا تھا۔ مگر یونین کی ساری مردنی غائب ہو کر نئی جان پڑ گئی۔ ترقی پسند گروہ میں ممبروں کی تعداد [illegible] سے جوش و خروش سے میٹنگیں

میٹنگیں ہونے لگیں نئے قواعد بنے کئی انجمنیں بنائی گئیں ڈرامہ سیکشن اور مشاعرے، ہنگامی اجلاس ہونے لگے اور بیٹھکیں ہنگامے شروع ہو گئے

چند روز تو شمن کچھ غیر مطمئن سی رہی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک دم سے افتخار کی جگہ ستیل کو دیکھنے کی کیسے عادت ڈال لے۔ کالج اور یونیورسٹی کی زندگی بھی پانی کا بلبلہ ہوتی ہے جو چند لمحے تیرتا رہتا ہے تو ہزاروں رنگینیاں اُس کے خول پر منعکس رہتی ہیں مگر جونہی پھوٹا سب کچھ غائب۔ وہی افتخار جس کا وجود یونیورسٹی میں بھی ستارے کی سی حیثیت رکھتا تھا آج آسمان سے ٹوٹ کر نہ جانے گمنامی کے کس غار میں جا گرا تھا اور در و دیوار کو اس کی کمی بھی نہ محسوس ہوتی تھی۔ گویا خاک کا ایک حقیر ذرہ تھا جسے آندھی نے اٹھا کر دور پھینک دیا تو کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ دو چار دن تو غلطی سے لوگوں نے بجائے ستیل کے افتخار کا نام لیا۔ مگر پھر بہت جلد سب نئے بول کے عادی ہو گئے اور ستیل کی خوش بیانی، حسین اور لمبے چوڑے جسم نے افتخار کی یاد کو دلوں سے مار بھگایا۔ اگلا سکریٹری رہی لیکن شمن کو تو اپنی کرسی سنبھالنا پڑی نئے عہدے کی دہشت نے اسے کچھ اب ایسا احساس کرا دیا کہ سوچے سمجھے بغیر وہ ترقی پسند گروپ کی پُرجوش رکن بن گئی۔

ہیرا جب تک کان کے گمنام اندھیرے میں رہتا ہے کار کنکری بنا پڑا رہتا ہے مشک کو جب تک گھسا نہ جائے تو فاسد مادے کی ایک گولی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ستیل کے سوا کسی نے بھی نہ پرکھا کہ شمن کی اس پریشان اور ڈری ہوئی شخصیت کی آڑ میں استقلال اور بغاوت کا لاوا دبا پڑا ہے۔ اس خاموش چٹیل میدان کے سپاٹ سینے میں آگ کی آتش بھی سو رہی ہے صرف جگانے کی دیر ہے اور پھر وہ ساری دبی ہوئی طاقتیں پورے جوش سے ابل پڑیں گی۔ شمن کو اپنی ہستی کے اس انوکھے ٹکڑے کے وجود کا علم بھی نہ تھا وہ اس نئی شمن کو پہلے تو نہ سمجھی، مگر پھر اس نے اسے تخفی طور پر دیکھ لیا۔ وہ خود اس کی جگمگاتی ہوئی شخصیت سے آنکھوں میں چکا چوند سی محسوس کرنے لگی۔ اور بہت جلدی پر اس نے اس نئی چیز کو کھرے سے دیکھا۔ باد مخالف کے اس تندی تھپیڑوں کے سامنے دشمنوں کی فوج سے مقابلہ کرتی ہوئی یہ قوت طاقت اب تک کہاں پوشیدہ تھی۔ وہ پرانی شمن اس کے سامنے کس قدر بودی حقیر معلوم ہو رہی تھی۔

"کوئی چیز ہے جو عام لوگوں کو چھوڑ کر صرف اسے بخشی گئی ہے!" اور بہت جلد اس نے اپنے آپ میں ایک پُراسرار کشش، ایک خاموش دبدبہ، ڈھکی چھپی ہوئی شان پائی۔ ستیل کی رائے

سیما نے اس نئی شخصیت کو جس کا انکشاف اسے ہچکچا چھوڑ گیا تھا سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کی ادب اور فلسفے کا مطالعہ کرنا شروع کیا شاعری سے دلچسپی پیدا کی اور بہت تیزی سے وہ پرانا خول جو کہ چھلکے کی طرح پچک گیا۔ اور اندر سے ٹھوس مینگ نکل آئی، اس بھربھرے چھلکے کو اس نے مسل کر دور پھینک دیا اور مینگ کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر جتنا جتنا وہ اسے پہچانتی گئی معمہ اور پیچیدہ اور مبہم ہوتا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا شمن اس سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہے جونہی وہ اسے چھونا چاہتی وہ ہوا میں تحلیل ہو کر پیچھے چلی جاتی۔ کبھی تو ایسا معلوم ہوتا اس نے اسے پکڑ ہی لیا ہے مگر قبل اس کے وہ ٹھیک سے اس کا [illegible] پہچان سکے وہ ہاتھ چھڑا کر غائب ہو جاتی۔ پھر وہ دگنے شوق سے اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیتی مگر بعض وقت اس دوڑ میں وہ کسی ایسے بھیانک اور سنسان گوشے میں پہنچ جاتی جہاں وہ خود اکیلی رہ جاتی اور وہ تخیل کی شمن نا معلوم ہو کر تحلیل ہو جاتی۔ [illegible] عجز اور غیر مانوس فضا سے اس پر خوف طاری ہو جاتا اور وہ الٹے پیروں بھاگ آتی جیسے غلط راستے پر چلنے سے انسان پریشان ہو [illegible] طرح وہ بھی وہاں سے کبیدہ خاطر لوٹ آتی۔

شمن سیمی کو کیا سمجھی تھی اور وہ کیا نکلا! گوشت پوست کے شاندار پہاڑ [illegible] ایک فلسفی شاعر پوشیدہ تھا جس کا دل انسانیت سے لبریز اور محبت میں ڈوبا ہوا تھا جس کی اندرونی زندگی قوم اور ملک کے قدموں پر نچھاور ہونے کے لیے بے قرار تھی۔ ظاہر میں وہ دنیا دار اور ٹیس کو دیکھا شوقین نظر آتا تھا مگر کسی کو کیا معلوم تھا کہ ان مسکراہٹوں میں کتنے آنسو جذب تھے، ان قہقہوں میں کیا الجھی ہوئی آہیں صرف سننے والے کانوں کو ہی سنائی دے سکتی تھیں۔ وہ خوف جو شمن ہمیشہ اس کے وجود سے محسوس کیا کرتی تھی قطعی بے بنیاد ثابت ہوا وہ صرف دیکھنے میں بدمعاش معلوم ہوتا تھا، یوں تو کہتے ہیں سانپ کے بچے بھی زہریلے معلوم ہوتے ہیں مگر چوہے سے بھی زیادہ بے ضرر ہوتے ہیں۔

وہ بدمذاق بھی نہ تھا بعض وقت تو لوگ اس کی باتوں پر ہنستے ہنستے بے تاب ہو جاتے تھے۔ پریزیڈنٹ ہونے کی وجہ سے اسے ہر ایک کو خوش رکھنا پڑتا تھا۔ مس لوگا جو کبھی ہندوں اس پر لکھے تیر عشق برسایا کرتی تھیں اس کے۔ [illegible] تن دہی سے کام کرتیں پر سنجیدہ اور

غیر سنجیدہ مجمع میں ان کی موجودگی لازمی تھی جب تک سوکھی اور مشکل باتیں ہوتی رہتیں وہ فرمانبردار بچے کی طرح خاموش بیٹھی سنا کرتیں نہایت انہماک سے وہ مقرر کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو سننے کے بجائے دیکھنے کی کوشش کرتیں ذرا سی بھی آہٹ ہوتی تو پریشان ہو کر شی شی کرنے لگتیں اگر سخت ضرورت سے اٹھنا ہوتا تو اپنی ننھی سی گرگابی کے نازک پنجوں پر لنگڑے کوے کی طرح بغیر آواز کیے پھدکنے کی کوشش کرتیں۔ کوئی بات کہنا ہوتی تو بالکل کان کے سوراخ سے منہ چپکا کر سہمی ہوئی گھس پھسا دیتیں لیکن ان کی یہ ساری احتیاطیں حاضرین جلسہ کی توجہ اور بھی منتشر کرتیں وہ مقرر کے مزاحیہ جملے کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتیں اور جونہی موقع ملتا سب سے پہلے تالیاں اور قہقہہ شروع کر کے سب سے آخر میں بند کرتیں بعض وقت کوئی دلچسپ بات سنائی نہ دیتی یا سمجھ میں نہ آتی تو بچوں کی طرح پریشان ہو کر "اوہ اوہ" کر کے پاس بیٹھنے والوں سے اس کا مطلب پوچھنے لگتیں۔ اس طرح ان کا قہقہہ عموماً ذرا دیر سے ظہور میں آتا یتیل انھیں بڑے پیار سے جھڑکتا تو کم عمر بچیوں کی طرح زبان نکال کر شرمانے لگتیں۔

یونیورسٹی میں بہت سے مذاقیہ لطیفے انھی کی شخصیت سے ایجاد کیے گئے تھے اور چھوٹا بڑا ان سے بے تکلف تھا۔ کچھ دنوں سے وہ فرسٹ ایر کے نئے لڑکوں کی چڑ مقرر کر لی گئی تھیں۔ کتنی ہی فاختائیں مس بوگا سے دالینہ کر کے اڑائی جاتیں کبھی کبھی وہ برا مان جاتیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔ روتے میں وہ بڑی تیز انگریزی میں خود اپنی حالت پر رحم کھاتیں اور دوسروں کو شرمندہ ہونے کی رائے دیتیں۔

کچھ دن سے یعنی افتخار کے زوال اور یتیل کے عروج کے بعد سے وہ عوام کی نظروں میں کچھ گر گئی تھیں۔ افتخار کی اور بات تھی پر یتیل تو ان کا اپنا آدمی تھا اسے تو ان کی عزت افزائی کرنا لازمی تھا۔ اس کے انتخاب میں سب سے بڑی مدد مس بوگا کی تھی۔ ووٹ جمع کرتے وقت وہ ہر ایک کی جان کو آ گئی تھیں۔ اپنے خرچ سے پمفلٹ چھپوا کر بانٹے اور جب اسے فتح نصیب ہوئی تو کسی کو خاص حیرت نہ ہوئی۔ یہ وہ خوشی کے مارے پاگل ہو گئیں۔ لوگ چھیڑنے کو مٹھائی مانگنے لگے تو انھوں نے سچ مچ ہی کھلا دی۔

ترقی پسند گروہ اب اور شدت سے اشتراکی رنگ میں رنگتا گیا۔ ممبروں کی تعداد

پڑھ گئی۔ مس لوگا نے ایک دم گجراتی اطلس چھوڑ کر کھدر پہننا شروع کر دیا۔ اور بے چاری ہر وقت کھدر اوڑھے اپنی پیٹھ پر نکلے ہوئے گرمی دانوں کو انگریزی کی گالیاں دیا کرتیں۔ دیکھنے میں اُن کا جسم بے مصرف گوشت کا لوتھڑا تھا مگر ذرا سی ٹھیس سے چھل جاتا اور قومیت کے لمحات عموماً ہر ایک کو گھاؤ اور پھنسیاں دکھانے میں صرف کرتیں۔ نیز ہزاروں قسم کے پاؤڈر اور مرہموں کے نام انھیں یاد ہو گئے تھے۔ اُن کا جسم تو ایک ہی تھا مگر ہندوستان کے خطوں کی طرح زمین اور آب و ہوا مختلف تھی، اگر ایک مقام کی پھنسی زمبک سے اچھی ہوتی تو دوسرے حصے کی کیوٹی کیورا سے اگر پیٹھ کے دانے ڈسٹنگ پاؤڈر سے سوکھتے تو بغلوں میں بورک چھڑکنے سے شفا ہوتی۔ جتنا وہ دیسی مال کی سرپرستی میں بچا لیتیں اتنا ہی بدیسی دواؤں پر خرچ ہو جاتا۔ بعض لوگوں کی رائے سے انھوں نے نیم کی چھال اور ہندوستانی لیپ وغیرہ استعمال کیے مگر ان سے اور بھی بدحواس ہوتا۔ اُن کے برخلاف شستی ایک ہی لڑکی ہر چیز دیسی استعمال کرتی تھی یہاں تک کہ اُس کے برتن خالص گوالیار چینی کے اور کمرے کا پورا فرنیچر کشمیر اور میسور کی صنعت گری کا نمونہ تھا۔ مرشد آباد کی سلک، میسور کی جارجٹ اور مدورا کی ساڑھیاں پہنتی۔ اس کا سارا خاندان لیڈروں کا خاندان کہلاتا تھا۔ اس کے پتا جی بڑے پکے "قوم پرست" تھے اور ہر قومی جلسے میں اُسے ساتھ لے جاتے تھے جہاں وہ مائکروفون کے سامنے بندے ماترم گایا کرتی تھی۔ بہن کی شادی ہو گئی تھی اور میاں انگلینڈ گیا ہوا تھا۔ باوجود دیش بھگت ہونے کے فیشن گھر میں کافی تھا۔ انگریزی زبان مادری سی ہو گئی تھی "ماما" "پاپا" اور "آنٹی" کا رواج تھا۔ سب لڑکیاں فراک پہنتی تھیں اور بال کٹے ہوئے سر تھے۔ مگر ایک تار بھی بدیسی نہیں استعمال ہوتا تھا، گو روحیں یورپ زدہ ہو چکی تھیں۔ مگر خول دیسی تھے۔

اس کے خاندان میں کوئی سرکاری نوکری نہیں کرتا تھا۔ پتا جی نے تو خطاب بھی لوٹا دیا تھا اور کئی بار جیل میں گئے تھے۔ بمبئی میں روئی کا بیوپار ہوتا تھا جس میں خاندان بھر پلتا چلا جاتا تھا۔ پھر غلامی کی نوکری کون کرتا۔ دوسرے

بیوپار میں بھارت کے مال کی اُتنی بھی ہوتی ہے۔ گو بعض بدمذاقوں کا خیال تھا کہ لالہ جی کو بھارت کی اُنتی سے زیادہ اپنے بیوپار کی اُنتی کی فکر تھی۔ کھدر کے پرچار سے بھارت ورش کے بیوپاری بے شک دھنی ہو گئے مگر مزدور ویسے ہی ننگے بھوکے رہے۔ وہ پہلے بھی موٹا جھوٹا پہنتے تھے اور اب بھی وہی ملتا رہا، ہاں ذرا جاپان کے سستے مال نے ریشم پہنوا دیا۔ غریب بھی اطلس کے مَس سے واقف ہو گئے، بھنگی چمار بھی جاپانی کھلونوں سے کھیل لیے چینی کے سیٹ اور شیشے کے گلاس چپراسیوں کی لڑکیوں تک کو جہیز میں ملنے لگے۔ مگر یہ جاپانی مال کب تک؟

ترقی پسند گروہ کی ہر میٹنگ زیادہ دلچسپ ہوتی گئی جتنے ممبر تھے سب ہی ہتھیلی پر جان رکھے "کام" کو تیار تھے۔ زیادہ تر ایسے لوگوں کی تعداد تھی جو دل شکستہ اور تقدیر کے ٹھکرائے ہوئے تھے اور زندگی کی تلخیوں سے دوچار ہو چکے تھے۔ احمد کو ایک عیسائی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا جو انتہائی بے رخی سے منہ موڑ کر ایک پروفیسر کی ہو رہی۔ رحمان اپنی چچازاد بہن کے عشق میں گرفتار تھا جس کے لالچی باپ نے اُسے صرف اس لیے ٹھکرا دیا تھا کہ وہ سرکاری نوکری نہ حاصل کر سکا تھا اور وطن پرستی کا عزم کر چکا تھا۔ تین سال وہ متواتر مختلف مقابلوں میں شریک ہوا لیکن صرف خاندان والوں کی زبردستی سے قوم کی خدمت سے اُسے اتنی فرصت نہ ملی جو ان لغویات کی طرف توجہ دیتا۔

انور زنانہ کالج کی ایک خوبصورت لڑکی سے محبت کرتا تھا جس کی خمیدہ زلفوں اور لچکتی کمر نے اُسے شاعر بنا دیا تھا۔ امید کی جاتی تھی کہ بہت جلد وہ اپنے زمانے کا سب سے زیادہ ترقی پسند شاعر ہو جائے گا۔ اس کی شاعری بالکل انوکھی تھی وہ پرانی روش سے ہٹ کے نئے راستوں پر گامزن تھی۔ اس کی رومانی ہیروئن زہر عشق، گل بکاؤلی وغیرہ کی فرسودہ محبوبہ سے بالکل مختلف ایک کالج کی روشن خیال حسینہ تھی جو بجائے ظلم و ستم ڈھانے کے خود اس پر پروانہ وار فدا تھی مگر ظالم سماج کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک آئی۔سی۔ایس کے پلے بندھ چکی تھی لیکن انور کی شاعری پیشین گوئی کرتی تھی کہ انقلاب آئے گا جب یہ ساری پابندیاں ٹوٹ جائیں گی سماج کو میٹ کر رکھ دیا جائے گا، شفق خون برسائے گی۔ اور زمین و آسمان سرخ ہو جائیں گے۔ اور سرخ آندھیاں چلیں گی۔ پھر اس سرخی کے شعلوں میں

ساری بلائیں بھسم ہو جائیں گی ـــــ آزادی کا قرمزی جھنڈا لہرائے گا۔ مزدور کا راج ہوگا ...... اس وقت وہ اُس لڑکی سے جی کھول کر محبت کرے گا اور اس کی مشکیں جوتی کو حسین راتوں کی خاموشیوں میں کھول کر فضا میں خوشبو پھیلا دے گا۔ پھر کیا ہوگا؟ پھر پتہ نہیں کیا ہوگا۔

اس کے علاوہ آنند تھا جس پر شہر کی کل طوائفیں عاشق تھیں۔ وہ اُن کے یہاں مفت جاتا تھا۔ شراب ہر فن کار کے لیے ضروری ہوتی ہے اور وہ ایک سچا فن کار تھا۔ اس نے روسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ کچھ سال تراجم چھپ لینے کے بعد وہ اور طبع زاد کہانیاں لکھنے لگا تھا اور آثار کہتے تھے کہ بہت جلد وہ بلند مرتبہ مصنفوں کی صف میں آگے آگے نظر آئے گا۔

برکت عجب جنونی تھا۔ وہ تاریخ میں ایم اے کر رہا تھا۔ مگر اس کا زیادہ وقت جنسیات کے متعلق مواد فراہم کرنے میں صرف ہوتا تھا جیمس جوائس اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس تو اُس کے روحانی دیوتا تھے جن کا وہ ہر قدم پر حوالہ دیتا۔ اور جنسی آزادی کو سوراج سے بھی زیادہ اہم سمجھنے لگا تھا۔ اس کی زبان میں بڑی روانی تھی اور عام طور پر لوگ قائل ہو جایا کرتے تھے۔ شمن کو اس سے کوئی ذاتی عناد نہ تھا اور اس کے اصولوں کی بھی کچھ شدت سے مخالف نہ تھی۔ پھر بھی پتہ نہیں کیوں جب اکیلے میں وہ مختلف نفسیاتی نکات کی تشریح کرتا تو اسے چھوٹے جانتے.. انسان جانور سے بھی گیا گذرا ہو گیا کہ جب تک اُسے مذہب کا رسہ اور قانون کا ساری نکیل نہ دیا جائے محبت ہی نہ کرے۔" لفظ محبت وہ بہت ہی پُر معنی طور پر استعمال کرتا تھا۔ وہ ایسے پھسپھسے عشق کا قائل نہ تھا جس میں ٹھنڈی سانسیں اور شب بیداری شامل ہوتی ہے اُسے تو بس خالص عشق پسند تھا۔ اُسے طوائفوں سے بڑی شدت کی ہمدردی تھی! اُن کی زندگی اور رہن سہن اُن کی مالی مشکلات گندے مکانات مختلف انواع و اقسام کی بیماریوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں سناتا تھا کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے کبھی تو شمن کو اس سے گھن آنے لگتی کہ کم بخت نہ جانے کن غلاظتوں میں غوطے مار کر آتا ہے اور کبھی اُسے طوائفوں پر غصہ آتا کہ مُردیاں کیوں اتنی گندی ہوتی ہیں۔ کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کرتیں۔ ارے کچھ نہیں چکی پیسیں کپڑے سئیں اور عزت سے رہیں...... مگر اُسے خوب معلوم تھا کہ یہ طوائفیں اتنی اُلّو

نہیں۔ اگر چولھا چکی اتنا آسان کام ہوتا تو وہ کبھی کا شروع کر دیتیں۔

"اس کا علاج؟" وہ کبھی برکت سے پوچھتی۔

"سرمایہ داری کا خاتمہ!"

"وہ کس طرح؟"

"جس طرح روس میں ہوا!" اور وہ دونوں گھنٹوں روس کے انقلاب کی پرچھائیاں ناپا کرتے۔ غرض جو کوئی بھی اس ترقی پسند گروہ میں تھا پہنچا ہوا تھا۔ عشق و محبت بے وفائی اور جفا کاری، مفلسی اور بے کاری نے سب کو مجذوب بنا دیا تھا۔

شمن ایک دم جو کالج سے لوٹی تو ایلما کو پلنگ پر پیر لٹکائے بیٹھے پایا۔

"ارے تم دیر سے بیٹھی ہو؟" اس نے کچھ خجل ہو کر پوچھا اور پاس بیٹھ گئی۔ اس کا ضمیر ایلما کو خاموش دیکھ کر ملامت کرنے لگا۔ افتخار کے جانے کے بعد کیسے کیسے دونوں میں عہد و پیمان ہوئے تھے مگر اس نئے انتخاب کے ساتھ ساتھ دونوں کے درمیان فاصلہ پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا اور اب تو یہ حال تھا کہ یہ سڑک کے اس کنارے پر تو وہ دوسرے پر۔ کبھی بھولے بھٹکے نگاہیں ملیں بھی تو جلدی سے بچا لیں۔ گویا دیکھا ہی نہیں یونہی وہم ہوا تھا۔ مگر آج نہ جانے کیوں شمن نے اس کے گرد باہیں لپیٹ کر چمٹا لیا اور دیر تک اس کے چہرے کو تکتی رہی۔

یہ ایلما کو کیا ہو گیا تھا وہ ایلما ہی نہ تھی آنکھیں اور زیادہ بوڑھی ہو گئی تھیں جیسے ان پر سیلولائڈ کا غلاف چڑھا دیا گیا ہو گالوں کی ہڈیاں زیادہ ابھر آئی تھیں اور بال پہلے سے بھی زیادہ گھنیرے معلوم ہو رہے تھے بجائے تمتماتے ہوئے قہقہے لگانے کے وہ خاموش تلخی سے مسکرائے جا رہی تھی جو بجائے دلی حالات کی آئینہ داری کے بالکل ایک مصنوعی خول کی طرح منڈھی ہوئی تھی۔ اس مسکراہٹ میں نہ کڑواہٹ تھی نہ مٹھاس اور نہ ہی کوئی طنز پوشیدہ تھی۔

پھر وہ باتیں کرنے لگیں۔ دیر تک ایک دوسرے کے قریب لیٹی وہ وقت سے غافل ہو کر باتیں کرتی رہیں۔ افتخار کی باتیں جلسوں کی باتیں اور نہ جانے کیا کیا؟

"بعض وقت ہمارا ہر پانسہ الٹا ہی پڑتا ہے۔" ایلما ایک دم سے بولی۔

"کیا کہا تم نے؟" شمن نے اس کے قریب جھک کر پوچھا۔

"میں نے کہا...... ہم کیا سوچتے ہیں اور کیا کرتے ہیں!"

"کیا مطلب؟"

"شمن؟"

"ہاں!"

"کیا میں کچھ بدل گئی ہوں؟"

"کیوں؟ نہیں تو!" شمن نے ایلما کو سر سے پیر تک دیکھا، ایک دھوکا سا ہوا مگر مٹ گیا۔

"مگر ڈاکٹروں کا خیال ہے میں امتحان میں نہیں شریک ہو سکتی۔" وہ ادھ جھیل گئی۔

"تم...... تم...... ایلما؟" وہ ہکلا گئی۔

"ڈرو مت...... میری بیماری چھوت دار نہیں، وہ تمہیں نہیں لگ سکتی۔ ایلما نے طنز بھرا قہقہہ لگایا۔ وہ اس عرصے میں صرف ایک بار ہنسی اور یہ قہقہہ ایسے کھڑکھڑاتا ہوا شمن کے کانوں میں گونجا جیسے کسی نے بہت سے پتھر ٹین کے خالی ڈبے میں ڈال کر جھنجھوڑ دیے۔ اس کے دانت بالکل زہر میں بجھے ہوئے کیلوں کی طرح چمکے اور آنکھوں میں سے گھٹا ہوا دھواں نکلنے لگا۔ اب شمن کو معلوم ہوا کہ اس کے رخساروں کی ہڈیاں کیوں ابھر آئی تھیں اور بال چہرے کی مناسبت سے زیادہ گھن دار معلوم ہو رہے تھے۔

"تم مجھے کچھ نہ بتاؤ گی؟" اس نے بہت کچھ جان کر پوچھا۔

"بتانے کو ہے ہی کیا میرے پیٹ میں بچہ ہے۔" شمن ایسی بری طرح جھجکی جیسے اس کے سر پر چھت آن پڑی مگر فوراً ہی کھسیانی ہو کر سنبھل گئی نہ جانے کیوں سماجی اصولوں کے آگے قدرت کے بنائے ہوئے اصول کمزور اور ذلیل ہو جاتے ہیں۔ اگر بنظر غور دیکھا جاتا تو قدرت کی طرف سے ماں بننے کی مکمل آزادی تھی مگر سماج اس سے پروانۂ راہ داری مانگتا تھا۔ شمن کو خود اپنی روشن خیالی پر ناز تھا۔ مگر روشن خیال بننے سے پہلے ہمیں عادت ڈالنی

پڑتی ہے۔ شمن جلد ہی سنبھل گئی اس کے خیالات جنگلی ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرنے لگے۔ اب سے بہت پہلے جب پکنک سے واپس آکر دونوں سہیلیوں نے باتیں کی تھیں اس وقت شمن اور بھی بے وقوف تھی مگر اب تو وہ ان الفاظ کے معنی خوب سمجھتی تھی پھر اسے کیمپ کی وہ رات یاد آگئی جب اُس نے ایک نئے موڑ کی طرف قدم اٹھائے تھے۔ افتخار کے کوٹ کی خوشبو کوشش کرنے سے وہ دوبارہ دماغ میں کھینچ لا سکتی تھی اور پھر اُسے اپنی وہ رضائی یاد آئی جو افتخار نے اس سے مانگ لی تھی۔

"مجھے معلوم ہے تم کیا سوچ رہی ہو" ایلما نے ہولے سے کہا۔

"میں؟"

"ہاں تم سوچ رہی ہو کہ ——— میں بڑی بدنصیب ہوں جس نے پاپ کیا ہے۔ یہ بات نہیں میں اسے پاپ نہیں سمجھتی۔ مگر" ——— اس کے چہرے پر پھر وہی بے معنی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ "تم نہیں سمجھ سکتیں ——— میں نے واقعی پاپ کیا ہے۔"

"ایلما!"

"میں نے بہت بڑا پاپ کیا ہے ——— میں نے اپنی روح کو دھوکا دے کر جسم کا پیٹ بھر دیا۔"

"کیا بک رہی ہو ایلما۔ کیا مطلب؟"

"ہیں؟ نہیں ——— میں بہک گئی تھی ———" وہ تھوڑی دیر کو چپ ہو گئی۔ پھر بولی۔

"تم نہیں سمجھتیں ——— تم بھول گئیں ——— میں نے تم سے کہا تھا کہ ———"

"ہاں تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم افتخار کا......"

"ہاں ہاں ——— یہی تو مصیبت ہے اگر ایسا ہوتا تو" وہ پھر کچھ سوچنے لگی۔ "اگر ایسا ہوتا تو میں اس کی امانت اپنے سینے سے لگا کر رکھتی ———" وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور بچی آواز سے بکنے لگی

"اس وقت جو شیطان میرے جسم میں سانس بھر رہا ہے وہ جمیل کا تحفہ ہے ——— اور ——— میں نے اپنے جسم کی آنند دیوری کر دی مگر میری آدرش ابھی بھوکی ہے میں اسی ہفتے بنگلور جا رہی ہوں۔ وہاں آپریشن کرا دوں گی۔"

آنکھیں پھاڑے سانس روکے شمن سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ "کیوں؟"

" تم ان باتوں کو شاید عجیب سمجھ رہی ہو مگر میں کہتی ہوں کیونکہ مجھے سینل سے نفرت ہے اور اُسے مجھ سے ہم کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے۔ بھلا تم ہی سوچو میں اس کا یہ گناہ کیسے برداشت کر سکتی ہوں۔ آپریشن کے ذریعے سے میں اپنی انتہائی نفرت کا ثبوت دے سکتی ہوں کہ اس کا یہ قیمتی تحفہ ٹھکرا دوں۔

" بھلا اس کم بخت کو کیا رنج ہوگا ؟"

" اوہ ـــــ یہی تو تم نہیں جانتیں۔ فرض کرو تم نے میری دعوت کی میرے منہ میں تر بتر نوالہ دیا۔ اب اگر میں اُسے تمہارے منہ پر تھوک دوں تو کیا حال ہوگا تمہارا ؟"

" اوہ۔ ایلما "

مگر ایلما نے دھما زور زور کے قہقہے لگانے شروع کر دیے۔

" مگر ـــــ تمہارا بھی تو کچھ حصہ ہے اس میں "

" ہاں ہاں۔ مگر جب کوئی چیز زمین پر گر کر مٹی میں لتھڑ جائے تو اُسے پونچھ کر کھانے کی ضرورت نہیں بلکہ اپنے نقصان پر صبر کر کے اُسے پھینک دینے میں ہی مصلحت ہے "

" سینل کو معلوم ہے ؟ " تھوڑی دیر خاموش رہ کر شمن نے پوچھا۔

" ہاں ـــــ جب اُسے معلوم ہوا تو ناول کے ہیرو کی طرح دوڑا سینہ چوڑا کیے کہنے لگا مجھ سے شادی کر لو "

" پھر تم نے کیا کہا ؟ "

" میں نے کہا میں تم سے چار پیسے کا سودا کرنے کو تیار نہیں پھر بھلا زندگی بھر کا پٹا کیسے لکھ دوں۔ پھر وہ اور وعدے کرنے لگا تو میں نے کہا میں بنگلور آپریشن کے لیے جا رہی ہوں۔ بے چارے کا منہ اُتر گیا " وہ دل کھول کر ہنسی۔

ایلما چلی گئی۔ شمن دیر تک بیٹھی سوچتی رہی۔ سینل کا مزاج کچھ دن سے بگڑا ہوا تھا کچھ جھنجھلایا سا رہتا اس کا لیے اختیار جی چاہا کہ جا کر اس کے دل کی باتیں پوچھے۔ سینل جیسا لاپرواہ بے رحم انسان کیا واقعی ایلما کے رد کیے سے کچھ ہتک محسوس کر رہا تھا۔ شادی بیاہ کو چھوڑ کر تخلیق انسان کا پہلا فرض ہے۔ خدا نے انسان کو یونیورسٹی سے ڈگریاں لے کر دفرد لے

میں جھک مارنے کے لیے تو یقیناً نہیں پیدا کیا ہوگا تخلیق، خواہ وہ کسی صورت میں ہو انسان کی بہترین کمائی ہے۔ تو شاید اپنی کمائی کو ضائع جاتا دیکھ کر اُسے کچھ دکھ ہو رہا تھا! عیش و عشرت اور آوارہ گردی کا زبردست حامی ہوتے ہوئے بھی وہ خصلت انسانی کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا۔ شاید اگر ایلما عام عورتوں کی طرح روتی پیٹتی تو اس کے احساسات کچھ مختلف ہوتے تھوڑا سا قانون اور سماج کا بھی ڈر ہوتا اور پھر وہ خود ہی یہ تجویز ایلما کے سامنے پیش کرتا۔ مگر اب تو وہ اُس کی حقارت بھری بے رحمی پر کھنّا رہا تھا ویسے اُسے اپنے ننھے کے ضائع جانے کی پرواہ نہ ہوتی۔ مگر یوں ایک بد دماغ لڑکی کو اُسے ذلیل کرنے کا کیا حق تھا؟ یہ نہیں کہ اس ناممکن شئے سے اُسے کچھ اُنس ہو گیا تھا یا اس کی آئندہ نسل کا انحصار اسی کی ذات سے وابستہ تھا پھر بھی وہ خوش نہیں تھا۔ شاید ایلما کی جگہ مس لوکا ہوتیں تو اس کی اس قدر بے قدری نہ ہوتی، اور پھر شاید وہ اس قدر حساس بھی نہ ہوتا۔

دو تین دن بعد ایلما جنوبی ہند روانہ ہو گئی شیمتی کو اس کی جدائی کا بڑا رنج ہوا واپسی کے متعلق اس نے نہایت مبہم سے جملے کہے نہ ہاں نہ نا۔ وہ عجیب فلسفیانہ جواب دے گئی۔ چلتے وقت اسٹیشن پر اُس نے شیمتی کو بھینچ کر بڑے جوش سے پیار کیا۔

"میں اب افتخار سے تو مل نہ سکوں گی۔ اگر اتفاق ہو ملنے کا تو یہ پیار تم میری طرف سے پہنچا دینا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میں اب زندہ نہیں رہوں گی۔

"کیا بکتی ہو!"

"پگلی میرا مطلب یہ نہیں —— جسمانی طور پر تو میں واقعی ابھی بہت دن زندہ رہوں گی مگر میری روح مر چکی ہے!"

"تمہارے یہ خیالات اور اتنے تاریک!"

"میں جانتی تھی تم ایسے بکواس کہو گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم ہندوستانی ایک مقررہ حد سے آگے بڑھتے تو ہیں مگر فوراً دھکا کھا کر لوٹ آتے ہیں یہ تاریکی ہمارے خون میں رچی ہوتی ہے۔ جہاں تک تخیل کی دوڑ کا سوال ہے کوئی ہماری گرد پا کو بھی نہیں پہنچ سکتا خوابوں میں تو ہم بڑی آسانی سے پاتال تک کو فتح کر لیتے ہیں لیکن جہاں عمل کا سوال آیا

ہم پیچھے گرے۔ یہی دیکھو افتخار کتنا جوشیلا، کتنا سچا ہے، مگر صرف وہاں تک جہاں تک مجبوری کا سوال ہے۔ وہ جو کچھ سوچ سکتا ہے۔ کاش اس کا ہزارواں حصہ بھی عملی صورت میں ظاہر کر سکتا تو وہ ہندوستان کا سچا رہنما ثابت ہوتا نہ جانے کیا ہو جاتا۔ لیکن اگر اُسے معلوم ہو کہ میں نے ...."

"افتخار روشن دماغ ہے!" شمن نے کیمپ کی آخری ملاقات کو یاد کر کے کہا۔

"کتنا بھی روشن دماغ ہو، یہ سیاہی ایک دفعہ تو وہاں بھی اندھیرا کر دے گی۔ میری زندگی میں رہ بھی کیا گیا ہے، صرف اپنے ضمیر کی ملامتیں۔"

"قوم کی خدمت جس کا تم بیڑا اٹھا چکی ہو۔"

"اس بیڑے سے بھی منہ نکل گیا .... کچھ نہیں دنیا میں ہر چیز ذلیل ہے ہم لوگ ایک چیز بڑی شان سے شروع کرتے ہیں۔ مگر جلد ہی آپس کی رقابت، خود غرضیاں پست خواہشات اور چھچھورے خیالات درمیان میں آ کر سب کچھ میٹ دیتے ہیں۔ سوائے زبانی بکواس اور تالیاں پیٹنے کے ہمیں کچھ بھی تو نہیں کرنا آتا۔"

"لیکن اس کی کوئی تو وجہ ہے؟"

"وجہ؟ ہماری آبائی توہم پرستی .... ہم خواہ کہیں چلے جائیں، کچھ سیکھ جائیں اپنے خون سے اس پست مادے کو دور نہیں کر سکتے۔ یہ جنم جنم سے ہماری تمام تباہیوں کا باعث بنتا چلا آ رہا ہے۔ ہم پیدا ہی غلامی اور دوسروں کو سجدہ کرنے کے لیے ہوئے ہیں گاندھی نے ہمیں غلامی سے آزاد کرانے کی کوشش کی ہم نے الٹا اُسے مہاتما بنا کر پوجنا شروع کر دیا۔ سارا قومی جذبہ ایک دیوتا کی پھول پرستش بن کر رہ گیا۔"

"پلیٹ فارم پر ٹہلتے ٹہلتے ایلما فلاسفر بن گئی۔ شمن حیرت سے چپ چاپ خاموش رہی۔"

"جب ہم ایک دیوتا کو پوجتے پوجتے اکتا جاتے ہیں تو دوسرا بنا لیتے ہیں۔ ہماری بلا سے اس کا رنگ سفید ہو یا سیاہ۔ اگر کوئی ہم سے دنیا میں بغیر دیوتا کے رہنے کو کہے تو ہم کبھی تیار نہ ہوں۔ میں نے تمہارے مذہب کے بارے میں بھی پڑھا ہے مگر مشرقی اور مغربی مذہب میں بھی فرق ہے، اتنا ہی جتنا دیسی اور فرانسیسی شراب میں۔ ایک سلجھی ہوئی

فلاسفی کا خمار ہے تو دوسرا فطرت کا جنگلی نشہ، ایک میں عقل ہے تو دوسرے میں سانڈ کا جوش یہاں ہندوستان میں کوئی مذہب سلامت نہیں رہ سکتا اس پر فوراً گھوالی میّا اور راکھشسوں کی حکومت شروع ہو جاتی ہے ——

"مگر تم لوگ تو .... عیسائی؟"

"سب واہیات ہے ہم تم، وہ سب ایک ہی ناؤ میں جھولتے چلے جا رہے ہیں، بڑے جوش سے میلے کپڑے اتار کر نیا چولا پہنتے ہیں مگر دم بھر میں کیچڑ میں مچل جاتے ہیں۔ ہم ہر نئی چیز پر جھپٹتے ہیں خود دنیا بننے کے لیے نہیں بلکہ اسے بوسیدہ بنانے کے لیے ہم بالکل مکڑی کی طرح ہیں، جو حسین سے حسین پروانے کو اپنے جالے میں لتھیڑ کر فنا کر دیتی ہے، ایسے کہ پہچانا بھی نہیں جا سکتا، نمک کی کان میں جو کچھ بھی گر جائے نمک بن جاتا ہے۔

"تو تمہارے خیال میں ہندوستان کا مرض لا علاج ہے؟"

"مرض تو کوئی لا علاج نہیں ہے" وہ تھوڑی دیر سوچ کر بولا۔ "مگر ہمارے طبیب ابھی تک مریض کے سرہانے کھڑے مرض کی تشخیص کی کوشش کر رہے ہیں، کسی نے گنٹھیا تجویز کی ہے کوئی کہتا ہے صرف فسادِ خون ہے ہاں یہ سچ بھی ہے، یہ خون، ہندوستانی خون بہت ہی سیاہ ہو گیا ہے!" وہ اپنی سیاہ دھوؤں جیسی آنکھوں سے نہ جانے کس سمت گھورنے لگی۔ گو ایلما کی صحت گر رہی تھی۔ مگر جسم پھل دار درخت کی سی بھاری بھرکم لطافت چھائی ہوئی تھی۔ شمن اسے خاموش پا کر غور سے دیکھنے لگی، نہ جانے کیوں اس کا گلا بھر آیا، اگر ایک درخت قدرت سے جنگ شروع کر دے تو وہ کتنے دن زندہ رہ سکتا ہے۔ آم بور لگتے ہی مچل جائے اور پھل پیدا کرنے سے انکار کر دے تو؟ مگر ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس بغاوت کا حق تو صرف اشرف المخلوقات ہی کو حاصل ہے کہ اگر وہ قدرت کی ضد پوری کرنے کو تیار نہ ہو تو کوئی اسے مجبور نہیں کر سکتا مگر یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ بغاوت اس نے سیکھی کہاں؟

ایلما کی ٹرین روانہ ہو گئی تو ہزاروں سوال اس کے دماغ میں گورکھ دھندوں کی طرح الجھتے سلجھتے رہ گئے دل ایک عجیب سے بوجھ کی شدت سے دھنسنے لگا۔ وہ پُرحسرت بوسہ جو ایلما افتخار کے لیے اس کے ہونٹوں پر چھوڑ گئی تھی انگارے کی طرح دہکنے لگا اس کی امانت محفوظ

رہے گی؟ کاش، انسان اتنا بزدل نہ ہوتا!

واپسی پر اُس نے لان کی بنچ پر سینل کو بیٹھے پایا۔ وہ گھاس کے درمیان جھلکتی ہوئی خشک زمین پر کسی گذرے ہوئے کیڑے کے نقش پا ڈھونڈ رہا تھا۔

"گھاس کی جڑ تک کھا جاتے ہیں یہ کیڑے!" اُس نے زنجیر نما ہرے کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"کیا بوٹنی کا مطالعہ شروع کر دیا ہے؟" شمن نے آواز میں طنز کی جھنکار پیدا کرکے جواب دیا۔

"نہیں نہیں، ابھی میں نے مالی سے پوچھا یہ ٹینس کورٹ کیوں گنجا ہوتا چلا جا رہا ہے تو....." مگر شمن کے چہرے پر دبی ہنسی مسکراہٹ دیکھ کر وہ چپ ہو گیا۔

"اُسے بچا کر آ رہی ہیں، یہاں بیٹھ جائیے۔" اُس نے ایسی لجاجت سے کہا کہ شمن کو ہنسی آ گئی۔ یہ مرد بھی کتنے معصوم ہوتے ہیں، آگ کو ہمیشہ بھوبل میں دبانے کی کوشش کرتے ہیں، ہنسی ہنسی میں جیسے کانچ کا گلاس توڑ کر بیٹھا منہ لپیٹ رہا ہو۔ شمن اس کے پاس بیٹھ گئی۔

ظالم اور مظلوم کا فرق بھی بالکل وہم کی سی نوعیت رکھتا ہے۔ اگر ایلما بھی سینل کو معقول سزا دے دیتی تو وہ یوں خود اپنے ضمیر کی جوتیاں نہ کھاتا۔ اس کی بے نیازی نے تو خائن گھٹن کو اور بھی بڑھا دیا۔ کاش سزا پر طمانچہ مار دیا جائے تاکہ احساس تو ٹھوکریں کھانے سے بچے!

"میں نے اس سے کہا بھی کہ میں پتاجی کی دھمکیوں کی پروا نہیں کرتا۔ میری ماتا کی جائداد کافی ہے۔" وہ شکایتاً بولا اور شمن کو اس پر ترس آ گیا۔ لوگ ابھی تک جائداد اور والدین کی دھمکیوں کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں۔ گویا پیسہ ہی تو ضمیر کا مول ہے۔ مگر سینل یہ عذر شمن کے سامنے کیوں پیش کر رہا تھا۔ شاید خودداری مظلومیت کی پناہ میں شکست خوردہ ریزوں کو دوبارہ جوڑنا چاہتی تھی۔

"ٹینس نہیں کھیلیں گی؟" اس نے شمن کو اٹھتے ہوئے دیکھ کر روکا۔ جیسے اُسے تنہائی سے خوف آ رہا ہو۔

"میرا ریکٹ تو کمرے پر ہے۔" گو وہ ارادہ کر کے آئی تھی کہ سینل کی جی بھر کے گت بنائے گی۔ مگر نہ جانے ماتا کی کون سی رگ پھڑک اٹھی کہ وہ بالکل ہی [illegible]

ٹینس کے تین سیٹ ختم کر کے جب وہ ہلکی پھلکی کمرے پر پہونچی تو اس کا ضمیر اس پر ہٹیکا برسانے لگا چیف ہے کہ وہ اپنی سب سے پیاری سہیلی کے دشمن کی دل جوئی کر رہی تھی! وہ مرجھا کر بیٹھ گئی جیسے ایلما کی چتا پر ناچ کر آ رہی ہو۔ خوف زدہ ہو کر اس نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے خوب چھینٹے دیے آئندہ سے وہ سیتل سے بات بھی نہ کرے گی۔

لیکن یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ یونین کی اتنی اہم عہدے دار ہوتے ہوئے اسے سیتل سے نجات ملنا مشکل تھی وہ جب چاہتا اس سے ضروری معاملات کے متعلق مشورہ کرنے آن دھمکتا۔ کلاس میں کلاس سے باہر لائبریری میں ٹینس لان پر کھانے کے کمرے میں اور یونیورسٹی کے ہر کونے سے سیتل نے اس پر بادلوں کی طرح امنڈنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ایک ننھے سے نکتے میں کھنچتی چلی جا رہی ہے۔ یہ گھراؤ اس کا دم کیوں گھونٹے دیتا ہے؟ قوت مقابلہ اتنی سست اور پست کیوں ہوتی جا رہی ہے سیتل نے تین گھنٹے لائبریری میں اسے لغو شاعری سنائی وہ سنتی رہی!

وہ پیر سکیڑے آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھی بڑھتی ہوئی تاریکی کو آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے محسوس کر رہی تھی ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری جھلک کمرے کو مسحور کن رنگ میں ڈبوئے ہوئے تھی کہ اچانک اس کے دماغ میں گھس کر ہیلین اور لیانڈر میں ملی جلی ایک شیریں بسا کر چھپا ہوا کالا۔ وہ اس تنیلی لپیٹ سے دماغ کو چھڑا کر پیچھے مڑی سیتل ورزش کے بعد پسینے میں نہایا ہوا اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال بھرے بازو عریاں تھے اور پنڈلیاں پسینے سے چمک رہی تھیں۔ نہ جانے کیا ہوا کہ شمن کا دم گھٹنے لگا۔ معلوم ہوا کسی نے اسے گوشت پوست کے انبار میں لپیٹ کر جکڑ دیا۔ لمبی لمبی سانسیں بھر کے وہ سنبھلی اور بدحواسوں کی طرح بھاگی غسل خانے کے نل سے اس نے گٹ گٹ کے پانی پیا اور دیوار سے لگ کر بکھرے ہوئے ذرّوں کو سمیٹنے لگی۔ دیر تک ایک ابکائی کا سا احساس اس کے دماغ میں پھیلا رہا اور وہ نڈھال پلنگ پر پڑی رہی۔

کھانے کی میز پر باوجود سیتل کے شدید اصرار کے وہ وہاں سے اپنے بھاگنے کی کوئی معقول وجہ نہ بتا سکی نہ ہی اسے کچھ معلوم تھا اس کے وجود نے بھاگنا چاہا اور بغیر کچھ سنے

بھاگ نکلا۔ کہتے ہیں بہت سے حیوان طوفان کی آمد سے پہلے پناہ گاہوں کو بھاگ نکلتے ہیں۔

اور افتخار؟ اس کے خیال ہی سے غرور سے اس کا سر بھاری ہو جاتا، کیا بات تھی جو افتخار میں سینتل سے مختلف تھی جس نے اس کے وجود میں اس بلا کی کشش پیدا کر دی تھی؟ جہاں تک صورت شکل اور دولت کا سوال تھا وہ سینتل سے میلوں ہارا ہوا تھا۔ پھر بھی سوائے مس بوگل کے اس سے سب لڑکیاں چڑتی تھیں۔ کیا عجب جو ایلما نے بھی سینتل کے جسم میں افتخار ہی کی جستجو کی ہو۔ اور نا امید ہو کر لوٹ پڑی امتحان سر پر آ گئے اور سینتل کی ساری نفرت خوف اور کشش کو بھول کر اس نے کتابیں سنبھال لیں۔

۳۲

امتحان کا نتیجہ آنے سے پہلے سستی اور بے کاری کے لمبے چوڑے دن گپ بازی میں کاٹنے دشوار ہو گئے۔ بورڈنگ میں رہتے رہتے اسے گھر سرائے معلوم ہونے لگا تھا۔ بی اے کے بعد ایک طرح تعلیمی جنکشن پر اتر کر ذرا ادھر اُدھر نگاہ ڈالنے کی فرصت ملی۔ گھر میں بچوں کی تعداد چوگنی ہو گئی تھی۔ بھائی کمانے میں جُٹے ہوئے تھے اور بھاوجیں لونڈے ڈھالنے میں مشغول، معلوم ہوتا تھا زندگی کو لوٹتے ہوئے چھکڑے کی طرح ہر ایک آگے گھسیٹنے میں مشغول ہے، کوئی بھی تو مرمت کے لیے دم نہیں لیتا، چولیں ڈھیلی، پہیے پھٹے، بھاگ نکلنے کو تیار، چھت غائب، پیندے میں چھلنی جیسے چھید مگر بیل کی گردن پر جُوا مضبوط اور لاٹھیوں کے ٹہوکے جاری۔ جو کسی سے رک کر پوچھنا چاہو کہ "بھئی کہاں کا قصد ہے؟" تو ہکا بکا ہو کر جواب ملتا ہے "کہیں کا نہیں!" اس دُنیا میں ایک دفعہ آنے کے بعد آدمی موت کے سوا اور کہاں جا سکتا ہے، گرتے پڑتے سب ایک ہی نشان کی طرف دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ اس امید میں کہ وہاں جنت ملے گی۔ دفتر سے بے فکر مزے سے گذرے گی، حوریں ملیں گی اور جواہرات کے محل، جو کچھ سمیٹا جا سکے وہیں کے لیے اٹھا لو۔ ٹھوسم ٹھاس ایک بار وہاں پہنچ جائیں تو پھر نیارے نیارے ہیں۔ اگر جنت کی تاک میں دنیا دوزخ بنتی ہے تو کچھ پروا نہیں۔

چھٹیوں میں انور، برکت، عباس اور نسیم کے خط آئے۔ انجم اور ایلما فیل رہے۔ شمشی کامیاب، انگلینڈ سے مغربی بنیا بن کر آ گیا۔ مس لوگان نے فلسفے میں ریسرچ شروع کر دی اور شمن؟ نتیجہ سننے کے بعد اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس شمن کا کیا کرے؟ زندگی کی گاڑی گھسیٹنے کے لیے کئی وضع دار اچھے ساتھ دینے کے لیے موجود تھے مگر کسی کا دھڑ اکڑ دار کسی کا ہاتھ ڈھیلا۔ ڈپٹی کلکٹریاں محدود، لوہے کا دائرہ مقرر، جنگلات میں پیا کر لبریز۔ زمانے کی افراتفری کو دیکھتے ہوئے مس شمشا

نے ایک قومی اسکول کی سرپرستی قبول فرمائی۔

اسکول کی عمارت ایک دریا دل رئیس کی بے کار کوٹھی تھی جو انھوں نے بدزبان لوگوں کی بکواس سے بچنے کے لیے اپنے منہ چڑھی طوائف کے لیے آبادی سے ہٹ کر بنوائی تھی اور جہاں سے ہر کرایہ دار چھپکلیوں اور مچھروں سے تنگ آکر بھاگ چکا تھا۔ اسکول کا باقی سامان کسی اور بگڑے دل رئیس کی ناٹک کی بنچوں اور نیلام کی میزوں پر مشتمل تھا۔ ایک اور رئیس جن کے باپ دادا کو ادب سے لگاؤ تھا لائبریری مہیا کرنے پر تل گئے تھے چونکہ کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لیے کوئی کنواں میونسپلٹی کی زیادتی سے دست یاب نہ ہو سکا اس لیے دنیا بھر کی واہیات اور لغو کتابیں جنھیں مصنف کے بعد شاید کاتب نے بھی نہ پڑھا ہوا اپنی تمام بھیانک ضعیفی کے ساتھ آن موجود ہوئیں۔ جتنی لڑکیاں رجسٹر میں درج تھیں اس کی نصف تو شاید کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔ چار اسسٹنٹ معلمات تھیں جنھیں بیس روپیہ مہینہ دے کر تیس روپے کی رسید لی جاتی تھی۔ بے چاریاں غربت اور مہنگی کی لعنت میں گرفتار تھیں۔ ورنہ محکمۂ تعلیم سے ان دکھیاریوں کا تو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ دو چپراسنیں تھیں جو خوش حال دنوں میں نائکہ کی لطیف خدمات بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے چکی تھیں۔ ایک چپراسی تھا جو منیجر صاحب کا باورچی، بیرا، فراش اور بچوں کی گورنس کی خدمات کے علاوہ انسپکٹرس کے آنے پر بھورا کوٹ اور سفید صافہ باندھ کر مؤدب کھڑا کرنے کے کام بھی آتا تھا۔ اسکول کی تمام کارآمد کرسیاں اور میزیں خالی اوقات میں منیجر صاحب کے ڈرائنگ روم کو زینت بخشتی تھیں۔ چاروں استانیاں زیادہ تر ان کے بچوں کی مرزئیاں لحاف اور ململ کے کرتے سیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ انھیں کشیدے کے کام سے بہت لگاؤ تھا اور یہ استانیاں پکے رنگے ڈوروں سے ان کے غلافوں پر "سویٹ ڈریم" اور "فورگیٹ می ناٹ" بہت صفائی سے کاڑھا کرتی تھیں۔

ان میں سے ایک استانی رضیہ بیگم کو تیس روپے کی رسید پر پینتیس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ ہر ماہ منیجر صاحب یہ زائد پانچ روپیہ اپنی جیب سے ادا کرنے کی دھمکی دیتے مگر چونکہ ان کی آمد پر مسز منیجر نے فینائل اور منیجر آیوڈین وغیرہ پینے کی کھلی دھمکیاں

دی تھیں۔ رضیہ بیگم بھاری جسم کی ادھیڑ عمر بیوہ تھیں۔ قرآن شریف کے علاوہ اردو اور تھوڑی فارسی سے بھی واقفیت رکھتی تھیں کبھی خاصی قبول صورت ہوں گی مگر برص کے سفید داغوں نے ذرا بدہیئت کر دیا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ داغ پڑ گئے تھے مگر مسز منیجر کا خیال تھا کہ یہ اُن کے وظیفوں اور اُن کے پیر کی دعاؤں کا ہلکا سا عکس تھا جو رضیہ بیگم پر ٹھیکا بن کر برس رہا تھا۔

رضیہ بیگم سے سوائے خرانٹ چپراسنوں کے سب ہی مرعوب تھے یہ چپراسنیں اُن کی گذشتہ زندگی کی بہترین رازدار تھیں۔ اُن سے بہت بے تکلفی تھی اور بڑی والی بڑھیا تو انھیں رجّو بی ہی کہا کرتی تھی۔ رجّو بی کا زیادہ وقت مونگ پھلیاں ٹونگنے اور منیجر صاحب کے سویٹر بُننے میں صرف ہوتا تھا یہ سویٹر وہ اس قدر پیچیدہ نمونوں کے بُنا کرتی تھیں کہ دماغ الجھ کر رہ جاتا۔ پڑھاتی خاک تھیں۔ لڑکیاں بیٹھی یا تو اون سلجھایا کرتیں یا اُن کے سر میں چٹکیاں بھرا کرتیں اور چپراسنیں بیٹھی انھیں محلے ٹولے کی عاشقیوں کے قصے سنایا کرتیں یا بڑی استانی جی یعنی شمن کی بدحواسیوں پر مباحثہ کیا کرتیں۔ شمن سے پہلے بھی دو ہیڈ مسٹرسیں میٹرک پاس آئیں مگر تین تین مہینے بعد بھاگ نکلیں۔ شمن کی آمد پر نہ جانے کیوں مسلم گھرانوں کی توجہ تعلیم کی طرف تیزی سے مبذول ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو عیسائی عورتوں کا اضافہ ہو گیا۔ داخلے بھی تیزی سے ہونے لگے۔ ایک گریجویٹ ہیڈ مسٹرس کا لاسہ لگا کر منیجر صاحب اعلیٰ خاندان کی لڑکیاں بھی پھانس لائے۔ مگر یہ اعلیٰ خاندان صاحبزادیاں دواؤں، آتاؤں اور ایسی ہی گھنی گھناتی بڑھیوں کی نگرانی میں کالج کے کلاس میں کر آتیں چاروں طرف اٹھلاتی پھرتیں اور پھر اُن کی موٹریں بگھیاں آجاتیں اور وہ چل دیتیں۔

شمن کی آمد سے پورا انقلاب آگیا آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے منیجر صاحب اُسے عجوبہ روزگار بنائے لیے پھرتے۔

"صاحب مسلمانوں میں ہیں کہاں تعلیم یافتہ لڑکیاں؟" اور لوگ بھی اُسے ایسے گھورتے گویا اس کے منہ پر سونڈ لٹک رہی ہے۔ کام کی بات یہ ہوئی کہ انسپکٹرس شمن کے کالج کی پرانی طالبہ نکلیں اور یہ شناسائی اس قدر موثر ثابت ہوا کہ گورنمنٹ کی گرانٹ بڑھ گئی اور منیجر صاحب

گھنٹوں برآمدے میں سوکھنے کے بجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے لگے مگر وہاں بے چارے جلد ذرا بدحواس رہتے اور انسپکٹرس یا ان کا کتا آجاتا تو ہڑبڑا کر کھڑے ہو جاتے۔ ویسے بھی اس کی توہم پرستی کی دھاک بیٹھ گئی۔

آن واحد میں دُنیا بدل گئی۔ اسکول میں نیا فرنیچر، نقشے اور تصویریں نظر آنے لگیں، ٹاٹ پر بیٹھنے کی عادی لڑکیاں بنچوں پر اکڑوں بیٹھنے کی مشق کرنے لگیں اور دشمن نے بڑی شد و مد سے عمارت کو پیوند پارے لگا کر درست کرنا شروع کیا۔ چھپکلیوں کے خلاف جہاد بول دیا۔ مس ٹامس اور مس الگزنڈر نیلی اور سُرخ روشنائی سے سبجیکٹ کے ٹائم ٹیبل بنانے لگیں۔ لائبریری کی بھُربھُری بوسیدہ کتابوں کی سنبھال سنبھال کر ٹانکہ زنی کی گئی دو چار دن تو بہ جبر سینے پر پتھر رکھ کر چپراسن بھی مقررہ بنچوں پر بڈّھے طوطوں کی طرح جمی رہیں۔ رضیہ بیگم نے بھی مونگ پھلیاں ڈیسک میں چھپا دیں اور چپراسی نے دفعتاً دروازے کے بیچ میں لٹکے ہوئے گھنٹے کو پیٹ دیا۔ گھنٹہ بجاتے وقت شدّت احساس سے اس کے کان سرخ ہو جاتے اور گاڑی والے اپنی گپ بازی اور چلمیں چھوڑ کر لوٹتے ہوئے موٹر خانے سے اُسے بغور دیکھ کر مُسکرانے لگتے۔

مگر کچھ دن بعد ہی ان بندشوں کا جادو فنا ہو گیا۔ رضیہ بیگم کرسی پر ہی پالتی مار کر منیجر صاحب کے پیچیدہ سوئٹر بننے لگیں، چپراسن حسب معمول دہلیز پر پھسکڑا مار کر بیٹھا رہی گالیاں بکتیں۔ گھنٹہ بجاتے کی موگری نقشے کی کیل ٹھونکنے لے جائی گئی اور پھر قرآن والی استانی جی کے کمرے میں اُن کی چھالیا کی ڈلیاں توڑنے کے لیے محفوظ ملی۔ دشمن نے مغربی بردباری اور سنجیدگی سے بکھرتے ہوئے شیرازے کو سمیٹنے کی کوشش کی مگر وہاں تو جیسے نمک سانپ گرہ شروع ہو گئی ہر چیز اس کی آنکھ بچتے ہی پھسل پڑتی اور مچل کر قابو سے باہر ہو جاتی۔ کرسیاں اور میزیں اور رنگلے منیجر صاحب کے یہاں دعوت میں سنگار گئے اور پھر لوٹ کر نہ آئے چپراسی پھر باقاعدہ اپنے پرانے عہدے پر واپس چلا گیا اور دونوں عیسائی استانیاں پڑوس کے قومی اسکول کے ماسٹروں سے روز بروز زیادہ مانوس ہوتی گئیں۔ لائبریری کی کل جان دار کتابیں مسز منیجر اور اُن کی سہیلیاں پڑھنے کو لے گئیں جو پھر اگر واپس آئیں تو چیتھڑے

اور دال سالن میں اتھڑی ہوئی۔

رضیہ بیگم نے تو ایک مستقل محاذ قائم کر لیا جس میں دونوں چپراسنیں بڑے جوش و خروش سے شریک ہو گئیں۔ لڑکیاں دن بھر آم اور بیر کے درختوں کے نیچے کشتیاں لڑتیں اور دشمن کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی غیبی ہاتھ اس کے بنائے ہوئے گھروندے کو ڈھانے پر مُصر ہے جتنی جتنی اس نے سختی برتی عملہ بپھرتا ہی گیا۔

رضیہ بیگم اور اتحادیوں کی کوشش نے اُسے بدحواس کر رکھا تھا کہ مسز منیجر مع اپنے غلیظ اور نامعقول بچوں کی فوج کے اسکول کے معائنے کو آن دھمکیں پتہ نہیں انھیں یہ عہدہ کب اور کیوں دیا گیا تھا اصل وجہ کچھ اور ہی تھی۔ انھیں بڑے معتبر ذریعے سے معلوم ہوا کہ لڑکیاں کچی امیاں بڑی بے رحمی سے کھانے میں مشغول تھیں۔ یہ قیمتی امیاں علاوہ اچار چٹنی کے اُن کے گھر کا سال بھر کا کھٹائی کا اسٹور مہیا کرتی تھیں اور خود منیجر صاحب کو اُن کی حفاظت کی فکر گھن بن کر کھائے جاتی تھی۔

یہ تو ہونے سے رہا کہ میں لمبا سا بانس لے کر نگرانی شروع کر دوں۔“ اس نے انگا دکھڑا سُن کر لگھائی سے کہا۔ ”بچیوں کو تو میں نے منع کر دیا ہے مگر استانیوں کو کیا کہوں جو کھٹائی سکھانے کے لیے توڑتی ہیں۔“

”ہاں بہن یہی تو مصیبت ہے میں نے کتنی دفعہ کہا ان کمبختوں سے مگر نہیں مانتیں یہ رضیہ بیگم تو سب سے پیش پیش ہیں بھلا تم ہی بتاؤ بہن، بھلا ان کی عمر اب کچی امبوں کی ہے بڈھی گھوڑی!

”میں نے منع کیا تو انھوں نے کہا وہ آپ کے لیے اچار بنا رہی ہیں۔“

”خاک میرے لیے اچار بنا رہی ہے۔ اس کا بس چلے تو میرا ہی اچار بنا دے....
آپ کو نہیں معلوم .....“ وہ رازدارانہ انداز میں پاس سرک آئیں۔

”بہن کیا بتاؤں ــــ“ بڑی حسرت سے بولیں۔ ”یہ اسکول کا تو اللہ مارا بہانہ ہے، چھ بچوں کے باپ مگر ذرا دیکھو تو اللہ توبہ۔ اس رضیہ کے پیچھے دُنیا زمانے کے غنڈے لگے پھرتے ہیں اور اللہ کے بندے نے اُس کے سپرد شریف بچیوں کو کر رکھا ہے۔ میں نے تو کہہ دیا ایک دفعہ کہ پڑھنا پڑھانا تو خاک نہیں ہاں دو چار آنکھ لڑانے کے گُر بے شک سکھا دیں گی۔“

شمن ہنسی دبائے اُن کی باتیں سنتی رہی۔ امیوں کی رکھوالی کا پختہ وعدہ لے کر مسز منیجر چلی گئیں تو دیر تک شمن رضیہ بیگم ہی کے متعلق سوچتی رہی اُن کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ پھر ان میں ایسی کون سی خطرناک ادا باقی رہ گئی تھی جس نے مسز منیجر کو بدحواس کر رکھا تھا اگر کوئی جوان لڑکی ہوتی تو خیر ایک بات بھی تھی مگر اپنی ہم عمر اور نسبتاً بدصورت عورت میں انھیں کہاں سے خطرہ نظر آرہا تھا۔

"اچار میں بھی خاصہ ڈالتی ہوں مگر انھیں تو اسی مردار کے ہاتھ کا پسند ہے اُسی کی چٹنی پہ دم جاتا ہے۔ دیکھ لینا ایک دن ان کی چٹنی نہ بنا کر رکھ دے تو نام پلٹ کے رکھ دینا۔" وہ کس وثوق سے کہ گئی تھیں۔ تو کیا منیجر صاحب رضیہ کی چٹنی پر عاشق تھے۔ شمن کو ہنسی آگئی۔ یقیناً عشق نرالا تھا اور چٹ پٹا بھی۔ یعنی اچار چٹنیوں کے ذریعہ بھی عاشق بنائے جا سکتے ہیں چٹنی کھاتے وقت اُسے کبھی شبہ بھی نہ ہوا تھا کہ اس کا اتنا رومان انگیز مصرف بھی ہو سکتا ہے

شمن کا کمرہ اسکول سے ملحق ذرا جان دار حصّے میں تھا۔ سامنے اس نے چھوٹا سا باغیچہ بنا لیا تھا جہاں وہ شام کو آرام کرسی پر لیٹ کر سامنے میدان میں کھیلتے ہوئے بچّوں کو دیکھا کرتی تھی۔ بازو کے برآمدے سے گذر کر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جو رضیہ بیگم کو دے دی گئی تھی۔ ایک چپراسن دو مراہٹ کے لیے اُن کے ساتھ رہتی تھی۔ اسکول کے بعد وہ کوٹھری کے سامنے پلنگڑی پر بیٹھ کر منیجر صاحب کے تکیوں کے غلاف پہ کاڑھا کرتیں نہ جانے انھیں اتنے غلافوں کی کیوں ضرورت پڑتی تھی ضرور بیوی پار کر دیتی ہوں گی۔ رضیہ کے کاڑھے ہوئے "سویٹ ڈریم" سے اُن کی بے چاری کی اپنی نیند اڑ جاتی ہوگی۔ اب جیسے آموں کا موسم شروع ہوا تھا وہ امیاں چھیل کر چٹنیاں بنایا کرتی تھیں۔ کتاب اور اخبار کو بھول کر شمن اُن کے افسانے کو پڑھنے کی کوشش کرتی۔ رضیہ بیگم صورت سے کافی ہوشیار اور تیکھی معلوم ہوتی تھیں۔ اُن کی زندگی کچھ معصوم نہ گذری ہوگی۔ کاش کوئی ان کی کتاب زندگی کے دو چار ورق الٹ دیتا منیجر صاحب کو وہ بھائی جان کہتی تھیں۔ مگر اس لٹکے سے کہ لفظ "جان" پر بے چاری مسز منیجر کی جان ہی تو نکل جاتی۔ کہتے ہیں عورت عورت کو پہچان لیتی ہے مگر پھر یہ کیا چیز تھی جو انھیں ڈرائے ہوئے تھی اور شمن کو وہم معلوم ہوتا تھا۔

داخلے اور روزانہ حاضری کے رجسٹر بنانے کے لیے اُسے کسی مددگار کی ضرورت ہوئی تو منیجر صاحب نے اپنے جان پہچان والے دو ماسٹروں کو بھیج دیا جو روز شام کو آ کر اُسے اور دونوں نئی عیسائی استانیوں کو جمع تفریق کی مشقیں از سرِ نو کرانے لگتے ضرورت سے زیادہ بے کار خانے نکتوں سے بھرنا، مہینہ بھر کی حاضری جوڑ کر اُسے سال بھر کی حاضری میں سے گھٹانا اور پھر دنیا بھر کی املا کو گڈمڈ کر دینا۔ کتنی لڑکیاں ڈرائنگ لیتی ہیں اور کتنی فارسی چونکہ یہ دونوں مضمون اسکول میں سکھائے جاتے تھے اس لیے یہ خانے نکتوں سے پُر کرنا۔

کبھی تو حبیب اور اکرم دونوں آتے اور کبھی حبیب اکیلے۔ اور جب رجسٹروں کا جھگڑا ختم ہو گیا تب بھی کسی نہ کسی بہانے سے پھیرا لگاتے رہے۔ کچھ کتابوں وغیرہ کا لین دین شروع کر دیا اُن کی ضرورت کی کتاب ساری لائبریریوں کو چھوڑ کر صرف شمن کی لائبریری ہی میں ملتی۔ حد یہ کہ حبیب کی توجہ ناقابلِ برداشت حد کو پہنچ گئی۔ لہٰذا آہستہ آہستہ اُن کے پیچھے ڈھیلے کرنے شروع کیے ایسے کہ وہ محسوس نہ کریں مگر انھوں نے تو ہرادیایہ کی صفت اختیار کر لی اور جتنا اکھاڑا اتنے ہی چلے گئے وہ آتے اور ہکلائے ہوئے مدتوں اُن سے ملتے رہتے اُن کی اس فاضل رحم گھبراہٹوں پر شمن مسکرایا کرتی ضرورت سے زیادہ بننے سنگھار کر کے آنا شروع کیا اور شمن کی لگاوٹ کی بنا پر مکمل مریضِ عشق بن گئے مگر خاموش اور مسکین ایسے کہ مجسم سوال ہیں مگر زبان بند یہ بوکھلاہٹ بھی کچھ کم مضحکہ خیز نہ تھی۔

اس میں اُن بے چارے کا کیا قصور تھا۔ جاہل خاندان کا تعلیم یافتہ عمر میں شاید پہلی مرتبہ ایک غیر اور شریف عورت سے آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کرنے کا موقع ملا تھا نوبت نہ کبھی آئی تھی مگر تاک جھانک کر اب جو یہ جیتی جاگتی بولتی چالتی مورت دیکھی تو سوتے عاشق ہونے کے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا سیدھے سادے آدمیوں کو چلتا پھرتا دیکھ کر حیرت نہیں ہوتی لیکن نٹ کو بانس کی نوک پر قلابازیاں لگاتے دیکھ کر ششدر ہونا ہی پڑتا ہے تو شمن نے بے چارے کو بازی گر کی طرح مسحور کر کے گنگ کر دیا تھا۔ اس اُلجھے ہوئے جذبے کو وہ عشق سمجھ رہا تھا اور اس بغیر معقول وجہ کے عاشق ہو جانے سے شمن کو جلن جنسِ مخالف ہونا معشوق بننے پر تو مجبور نہیں کر سکتا اور نہ ہی ہر مرد کو ہر عورت پہ عاشق

ہونے کا حق ہے۔

شمن کو اس پر ترس بھی آتا اور غصہ بھی اس نے تخیل ہی میں اس کی آئندہ زندگی، ایک مختصر مکان میں معمولی سی بیوی اور غیر معمولی تعداد میں بچے غربت کی گود میں پلتے دیکھ لیے۔ یہ لوگ بس زندگی میں ایک بار اپنے طبقے کو چھوڑ کر عشق رچا لیتے ہیں خواہ وہ یک طرفہ چیز ہو مگر ناکامی لازمی نتیجہ ہے اور شاید ایسا عشق کر کے ناکام ہونا ہی اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔ یہ درمیانہ طبقہ کا کم حیثیت لڑکا چھانٹ کر اپنے آسودہ حال پروفیسروں کی لڑکیوں، یا جس سیٹھ کے دفتر میں وہ چالیس روپے کا نوکر ہو اس کی اکلوتی لڑکی پر عاشق ہو بیٹھتا ہے۔ اگر اچانک کبھی ایسے عشق میں کامیاب ہو جائے تو بھونچکا سا رہ جاتا ہے اُسے ٹھگا کر لے جانے سے بھی خواب چورا ہو جاتا ہے دریا میں ڈوب کر بھی پیاسا رہ جاتا ہے۔ وہ تو عشق صرف نام رہنے کے لیے کرتا ہے تاکہ اس کے قصے اپنی نئی دلہن کو ٹھنڈی سانسیں بھر بھر سنایا کرے۔ زندگی کو اپنی بیوی کا رقیب بنانے میں وہ ہتک محسوس کرتا ہے نچلے طبقے کا ہوتے ہوئے بھی وہ عشق جیسے بلند جذبے کو بلندی ہی پر رکھنا چاہتا ہے۔ اپنی بیوی سے کبھی محبت نہیں کرتا مگر اُس کے جنے ہوئے کیڑوں کی پرورش میں انسان سے چرخا بن جاتا ہے۔ اس کی بیماری پر ہاتھ پیر پھیلا لیتا ہے اور ذرا دکھ جاتی ہے تو ہاتھ جوڑ کر منا لیتا ہے۔ اپنی محبوبہ کا رتبہ بہت بلند سمجھتا ہے مگر اُسے اپنی بیوی سے کم معصوم اور پارسا جانتا ہے۔

اس محبوبہ کو وہ روحانی تمازت کے لیے اپنی شخصیت میں چھپا لیتا ہے اگر اصلی نہیں تو خیالی ہی سہی وہ ہر طرح اس سے لطف اندوز ہو لیتا ہے۔ جب بیوی حاملہ ہوتی ہے یا میکے چلی جاتی ہے تو اسے بڑی احتیاط سے نکال کر عشق حقیقی سے جی بہلاتا ہے اور یہی خیالی رقیب دور بچھڑی ہوئی بیوی کے سینے میں رشک کی آگ بھڑکا کر اس کی محبت کو اور بھی پختہ کر دیتا ہے۔

جی گھبرا اُٹھا تو وہ ٹہلتی ہوئی آم کے پیڑوں کی طرف نکل گئی۔ رضیہ بیگم بان کے پلنگ پر کھڑی چھری سے آم چھانٹنے میں مصروف نظر آئیں نہ جانے کیوں وہ اس ادھیڑ عمر عورت کو بوا ہوس لومڑی کی طرح کچی امیوں کی تاک میں پھدکتا دیکھ کر

چڑ گئی۔ سچ کہتی تھیں مسز منیجر کہ بچی امیاں کھانے کی عمر ایک بالین کی عمر ہوتی ہے۔ واقعی بوڑھی گھوڑیوں کو ایسے بلک کر آموں پر ٹوٹ پڑنا زیب نہیں دیتا لیکن فوراً ہی اسے یاد آگیا کہ وہ تو منیجر صاحب کی چٹنی بنانے کے لیے توڑ رہی تھیں۔

شمن کو دیکھ کر وہ سوٹنے اوب پلنگ سے اتر آئیں اور کنواری لڑکیوں کی طرح جھینپ کر سر ڈھلکنے لگیں۔ اُن کی چہرے پر کے آثار پیدا کرنے والی ادا کا مطلب اب تک اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ اتنی بڑی تھیں مگر بہت کم عمر اور چھوٹی سی بن کر "دیکھیے، دیکھیے" کرکے اٹھلانے لگتیں اور گھبرا گھبرا کر بار بار سر ڈھانکتیں اور نیچی نظروں سے شرما کر مسکرانے لگتیں ان کی اس ادا سے آگ لگ اٹھتی مگر شاید ان کی یہی ادا منیجر صاحب کے کلیجے پر چھری چلا گئی ہو۔

بڑے پیار سے انھوں نے گری ہوئی کیریاں جمع کیں اور اپنی کوٹھری کی طرف چلی گئیں۔ رضیہ بیگم بڑی سگھڑ تھیں یہ مختصر سی کوٹھری اُن کی صفائی اور خوش مذاقی کا نمونہ بنی رہتی۔ سامنے در کے اوپر گلابی پھولوں کی بیل چڑھا رکھی تھی۔ کیاریوں میں ساگ اور دھنیا پودینہ بو لیا تھا۔ دو چار گملے بھی رکھے تھے۔ شام کو چھڑکاؤ کر کے ہلکی پلنگڑی پر بیگم کی طرح صاف ستھرے کپڑے پہن کر بیٹھتیں اور چپراسن سے محلے کی خبریں سنا کرتیں گو فیشن ایبل نہ تھیں پھر بھی اپنی حیثیت بھر تازہ ترین تراش کے جمپر پہنتیں پجامہ تنگ ہی رہتا مگر کرتے کے بجائے قمیص یا جمپر پہنتیں۔ تندرستی اچھی تھی کپڑا خوب کھلتا تھا عموماً ہلکے خوش گوار عطر میں بسی رہتیں اُن کے برخلاف مسز منیجر بے چاری حد درجہ کی پھوہڑ اور ہمیشہ بدحواس رہتیں۔ ایک بچہ کسی نہ کسی صورت میں ان پر چھایا رہتا۔ نہ تو انھیں کرتوں کے بجائے جمپر پہننے کی مہلت اور نہ اچار چٹنیاں بنا پاتیں۔ شادی کے بعد سے وہ خود ایک مستقل اچار بن کر رہ گئی تھیں جیسے گودڑ کی پوٹلی جس میں صرف چیتھڑے اور اُلجھے ہوئے تاگے تھے۔ گو منیجر صاحب نہایت اچھے قسم کے بد وضع انسان تھے۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی گھبرا اٹھتے اور اسکول کی عمارت کے معائنے کا بہانہ بنا کر رضیہ بیگم کی صاف ستھری پلنگڑی پر آن بیٹھتے اور اپنے حساب وں کسی شان دار کلب کا لطف اٹھا لیتے۔ رضیہ بیگم ان سے پردہ نہ کرتی تھیں مگر عجب معشوقانہ انداز سے ہمیشہ کسی چیز کی آڑ سے ایسے کھڑی ہو کر

بات کرتیں کہ لطف نظر آتیں۔ نیز کپڑوں کی بھینی خوشبو بھی تھوڑی بہت پہنچا سکتی۔ منیجر صاحب نہایت کھرے اور اپنی صاف گوئی کی بدولت بڑے غیر مقبول تھے مگر انھیں دیکھتے ہی مذاقیہ چھینٹے کسنے شروع کر دیتے۔

”کہیئے کیا حال ہے آپ کی بد مزاجی کا؟“ وہ ہمیشہ اسی طرح اُن کی مزاج پرسی کرتے۔ ”کوئی تازہ جھڑپ ہوئی حیرانی سے؟“

”میری کیوں جھڑپ ہوتی“، وہ ہے ہی آپ کی منہ چڑھی، میری تو بات بھی نہیں سنتی۔“ اسکول کی عام صفائی رضیہ بیگم کے سپرد تھی۔ منیجر صاحب کہتے تھے کہ جب اسکول بڑھ جائے گا تو بورڈنگ کی منتظمہ رضیہ بیگم ہی بنائی جائیں گی۔

”وہ آپ کے کرتے تیار رکھے ہیں چپراسی کو دے دوں یا آپ خود لیتے جائیں گے“ وہ اُٹھ کر پوچھتیں۔

”نہیں میں خود ہی لے جاؤں گا۔“ وہ نہ جانے کیوں سٹ پٹا جاتے۔

”وہ اچار دانی آپ کے گھر میں تو ٹوٹ ڈالی گئی۔ اب اگر اچار کھانا ہو تو گھر سے برتن بھجوا دیجیے“

”ہاں وہ بچوں نے توڑ ڈالی میں دوسری بھجوا دوں گا۔“

”پرانا سوئٹر بھیج دیجیے گا ادھیڑ کر نیا نمونہ ڈال دوں گی۔“

”ہیں بُنا بُنایا ادھیڑ دو گی“ وہ حیرت سے مسکراتے۔

”تو کیا ہوا، کام ہی کیا ہے اور مجھے؟“ وہ ٹھنڈی سانس کھینچ کر کہتیں۔ حالانکہ چند روز پہلے شمیم نے ان سے لائبریری کی کتابوں پر نمبر لگانے کو کہا تھا تو کام کی زیادتی کی شکایت شروع کر دی تھی اور آج کس مزے سے سوئٹروں کی ادھیڑ بن کو تیار تھیں۔

ادھر حبیب کا رویہ صبر آزما ہوتا گیا۔ اب اگر وہ ٹال دیتی اور مل نہ سکتا تو پرچہ ہی دے جاتا۔ آہستہ آہستہ اس پرچے کی صورت چند لائنوں سے صفحوں میں تبدیل ہو گئی اور علاوہ دستی آنے کے ڈاک سے بھی آنے لگے کبھی بار کی شدید کوششوں کے بعد اگر کبھی ملنے کا موقع بھی ملتا تو عجیب بد حواس اور مبہوت سا بیٹھا رہتا۔ شمیم کو اس سے کوفت ہونے لگی نہ جانے دل کے کس کونے کی خوشنودی کے لیے اُسے لٹکا رکھا تھا۔ اس سے کسی قسم کا لین دین کرنے کا قصد نہ تھا مگر اس کے وجود سے ایک طرح کی قلبی طمانیت

ضرور حاصل تھی جب وہ آتا تو نہ ہی اس کا دل الٹا سیدھا دھڑکتا اور نہ خون میں سنسنیاں پیدا ہوتیں پھر بھی بعض وقت تو اسے ملاقات سے محروم کرنے کے لیے ہی اس کا انتظار کرتا ،، کہیے۔ آرام کر رہی ہیں،، وہ آتا تو کہلوا دیا جاتا۔ اگر وہ پھر بھی انتظار میں ٹھیرنے کی دھمکی دیتا تو وہ جل کر خاک ہو جاتی۔ اسے یہ ربڑ کی گیند کی طرح ہر بار چوٹ کھا کر لوٹ آنے والی خاصیت سے اور بھی نفرت تھی۔ اُسے چاہیئے تھا کہ فرمانبرداری سے سر جھکا دے۔ خیر اس کی حماقت کی سزا وہ یوں دیتی کہ اسے بٹھا کر دوسرے دروازے سے سینما یا خرید و فروخت کو چل دیتی۔ وہاں سے آتے ہی وہ سب سے پہلے یہ معلوم کرتی کہ حبیب کتنی دیر تک وہاں میں بیٹھا رہا۔ اگر اُسے معلوم ہوتا کہ بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں ہاتھ پیر سُن ہو گئے تھے تو وہ اطمینان سے مسکرا کر دو چار پیار بھری ملامتیں اپنے آپ کو سنا لیتی ورنہ بات ہی ٹال جاتی۔

ایک دن چپراسی نے آکر کہا کہ کوئی صاحب ملنے آئے ہیں وہ حسب معمول کہنے ہی والی تھی) کہ وہ نہیں مل سکتیں کہ جب ہیٹ اور ہاتھ میں کسی کی تہ پکڑے انتخار کھڑا تھا تو وہ چونکی اور نہ ہی حیرت کے بے پناہ طوفان کو اپنے کسی انداز سے ظاہر ہونے دیا۔ اس زبردست بھونچال کے جھٹکے کو اس نے ایک معمولی " ارے " کے ساتھ سہہ لیا۔

انتخار پہلے سے زیادہ دُبلا اور بدصورت ہو گیا تھا اس کے بال روکھے اور بے تکے پن سے بکھرے ہوئے تھے جسم پر گھسی گھسائی قمیص اور روئی کی مرزئی تھی۔ گلے میں ایک میلا سا مفلر لپٹا ہوا تھا بہت بدل چکا تھا مگر اُس کے جاننے والوں کے لیے پہچاننا اور بھی آسان ہو گیا تھا اُس نے اب وہ چھلکا اپنے چہرے پر سے اُتار پھینکا تھا جو یونیورسٹی میں مجبوراً چڑھائے رکھنا پڑتا تھا۔ اس کے نقش و نگار دلی جذبات کا عکس بن کر رہ گئے تھے وہ باغی آنکھیں اب کھلے بندوں تلخیاں بکھیرتی تھیں اور ہونٹ مستقل طنزیہ مسکراہٹ میں ڈوب چکے تھے۔ نسبتاً زیادہ بیزار اور چڑچڑا معلوم ہوتا تھا ہنسی میں کڑواہٹ کے ساتھ ساتھ دیوانگی بھی برسنے لگی تھی جسے وہ قطعی چھپانے کی کوشش نہ کرتا۔

۔ تم اب بھی ویسی ہی ڈرپوک اور بزدل ہو " اس نے بزرگانہ انداز سے پوچھا " میرے

کپڑوں میں بدبو آرہی ہے اور شاید جوئیں بھی ہوں۔ تمہارے پلنگ پر بیٹھ جاؤں؟" مگر وہ بغیر اجازت ہی بیٹھ گیا۔

"آپ کب آئے پہاڑ سے؟"

"ایں؟ پہاڑ سے؟ اوہ...... ہاں بھولا میں پہاڑ پر ہی اپنی صحت درست کرنے گیا ہوا تھا نا۔ ہاں....." وہ ہنسا۔ "تو تمہیں کچھ نہیں معلوم؟"

"نہیں!"

"مگر مجھے تمہاری ہر بات معلوم ہوتی رہی۔" وہ کچھ جز بز ہو کر بولا۔ "میں نے اخبار میں تمہارے یہاں آنے کی خبر بھی سن لی سوچا چلو تم سے ہی مل آؤں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ اب ہمارا پہاڑ پونا میں قائم ہو گیا ہے جہاں دن میں چھ گھنٹے چکی چار گھنٹے......"

"میں؟ آپ جیل میں تھے؟"

"اور کیا ہوتا؟ خان بہادری کا خطاب ملتا؟"

"اور سب کا کیا ہوا؟"

"سارا گروہ پکڑا گیا۔"

شمن حیرت سے منہ پھاڑے رہ گئی۔ کیسا گروہ؟ کیوں گروہ پکڑا گیا؟ یہ اسے ٹھیک سے معلوم نہ تھا۔ مگر خود داری نے اسے پوچھنے بھی نہ دیا۔ آنا وہ جانتی تھی کہ افتخار اشتراکی تھا اور شتیہ، مگر یہ اسے آج ہی معلوم ہوا کہ وہ دہشت پسند بھی ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ تو اس کی بزدل فطرت دہشت پسندی کے تخیل سے جھک گئی۔ مگر پھر فوراً اس کی بھاگتی ہوئی ہمت لوٹ آئی۔ افتخار اپنی قوم اور ملک کی خاطر مٹ رہا تھا۔ اس نے اپنی جوانی اور زندگی کی بازی لگا کر آزادی چھین لینے کا عہد کر لیا تھا اس کے ہم خیالوں کا حلقہ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا اور یہ مختصر حلقہ سارے ہندوستان کو اپنی آغوش میں لیتے تیزی سے پھیل رہا تھا بیداری بڑھتی جا رہی تھی۔ کسان اور زمیندار کا پرانا رشتہ نیا چولا بدل رہا ہے۔ ان کے سارے خواب عملی جامہ پہنتے جا رہے تھے مگر اس قدر سست رفتاری سے جیسے جوں کی چال۔ یہ ہندوستان کی ہر چیز رینگنے کی کیوں عادی ہے صدیاں

چاہیئں۔ ایک طرف سے دوسری طرف گردن پھیرنے کے لیے۔

کھانے پر افتخار نے بڑی تیزی سے سونگھ سونگھ کر نگلنے اور پہچاننے کی کوشش کی مگر اس کی بھوک مر چکی تھی۔

"یہ کیا ہے؟"

"شلجم گوشت"

"شلجم؟ اور مجھے یاد ہے کبھی یہ میری مرغوب ترین غذا تھی، میری اماں تانبے کی رکابی میں موٹی کھی لگی روٹی کے ساتھ دیا کرتی تھیں۔ ہم چولھے کے پاس ہی بیٹھ کر کھایا کرتے تھے، اور جب گھی جمنے لگتا تھا تو چولھے میں سے سلگتے ہوئے اُپلے کا ٹکڑا نکال کر اس پر رکابی رکھ لیا کرتے تھے۔ میری بہن کو نیبو بہت پسند تھے" وہ گذرے ہوئے زمانے کی سوئی ہوئی یادوں کو جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"نیبو منگواؤں؟"

"نہیں نہیں مجھے نہیں میری بہن بنّو کو پسند تھے" پھر وہ خاموش ہو کر بڑے بڑے نوالے نگلنے لگا گویا کہہ رہا ہے نیبو منگوانے سے روٹھا ہوا زمانہ تو واپس نہیں لایا جا سکتا بنّو قبر کی مٹی سے ہم آغوش ہو گئی، اب شلجم اور نیبو کیا کر سکتے ہیں؟

"ایلما نے کوئی خط لکھا؟"

"نہیں تو؟"

"وہ ایک اسکول میں کچھ الا بلا پڑھانے پر نوکر ہو گئی ہے۔ پہلے تو ایک اسکول سے کچھ اُلٹی سیدھی تعلیم دینے کی وجہ سے نکال دی گئی تھی" وہ مسکرایا: "پیٹ کی پکار رہاتھ پیر کے ساتھ ساتھ دماغ کو بھی تو جکڑ دیتی ہے۔ جب تک کالج میں رہے والدین کے پیسے یا تعلیمی وظیفوں سے عیش اُڑا لیے پھر یا تو کلرکی کر دیا بھوکے مر و ساری ہیکڑی ختم! جانتی ہو کہ دلیپ کہاں گیا؟ پکڑا گیا اور اب انھی وائسرائے کے دفتر میں نوکر ہے جس کی موٹر پر بم پھینکنے کی کوشش کی تھی۔ جب وائسرائے کی موٹر گذرتی ہے تو وہ بہتیروں کے نشانوں اور ڈھول کو سلامی دی جاتی ہے۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ یہ خاک اس کی

بغاوت کو دفن کہہ سکے گی نہیں یہ جذبہ اندر ہی اندر جلتا رہے گا۔ جب وہ مر جائے گا تو یہ نامکمل آرزو اس کی اولاد میں خصلت بن کر باقی رہ جائے گی محبوب کو ان کے باپ نے نہ جانے کیسے بچا لیا اور اُسے سرکاری وظیفے سے بیرونجات بھیج دیا گیا وہاں سے وہ پروفیسر بن کر آیا ہے اور کسی کالج میں پروفیسر ہے۔"

"کچھ مس لوگا کا حال معلوم ہے؟"

"اوہ، ہاں بھول گیا، انھوں نے نرسنگ کا کورس کنگ جارج ہاسپٹل میں لے رکھا ہے جیل کے ایک حسین تحفے کے سلسلے میں مجھے بھی پندرہ دن ہسپتال میں رہنا پڑا، ذرا بھی نہیں بدلی ہیں۔ بڑی تن دہی سے کورس پورا کرنے میں لگی ہیں۔"

"سنا تھا شادی کر رہی ہیں؟"

"ایں؟ شادی، ارے وہ شادی نہیں کرے گی جب تک......

"کیا؟"

"کچھ نہیں یہی کہ جب تک کوئی رحمدل ان کا کنوارپن ختم کر دے۔

"تو یہ؟" شمن جھینپ گئی۔

"ہاں ہاں تم نہیں سمجھتیں، وہ......وہ......عجیب چیز ہے۔ وہ اُن عورتوں میں سے ہے جو پیدا ہوتے ہی ماں بن جاتی ہیں مگر شادی سے کانپتی ہیں۔"

"ارے یہ کیسے؟" شمن کچھ نہ سمجھی۔

"ماں بننے سے میرا مطلب ہے کہ جذبۂ مادری ان میں شدت سے موجود ہوتا ہے مگر شادی کو ایک گھناؤنا فعل سمجھتی ہیں جب تک کہ......"

"اچھا چھوڑیئے، نہ جانے کیا لے کر بیٹھ گئے، یہ بتائیے کیا پروگرام ہے۔

"شام کی گاڑی سے چلا جاؤں گا۔ جب تک کے لیے تم ہی بتاؤ پروگرام!

"سینما چلیے گا؟

"کہہ تو دیا کہ جیسی تمہاری مرضی۔ مگر سینما سے ذرا کم دلچسپی ہے۔ سوائے جذبات کو بھڑکانے کے اور تو کوئی مصرف نہیں اُن کا۔ میں ویسے ہی گرم مزاج ہوں۔"

"جو آج نہ جانے کیا ٹھان کر آئے ہیں جی میں"

"بھئی ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ بھلا خود ہی سوچو کسی کو عشق لڑاتے دیکھ کر مجھے کیا طمانیت قلب حاصل ہو سکتی ہے۔ سچ پوچھو تو کامیڈی دیکھ کر غصہ آتا ہے وہ سالا ہیرو کوڑی کام کا نہیں مگر عیش اُڑا رہا ہے اور ہم ہیں کہ۔۔۔۔۔۔"

"خیر چلیے ٹریجڈی ہی دیکھ لیں۔۔۔۔۔۔ وہ بود اس پسند ہے"

"واہیات، ٹریجڈی پر تو اور بھی جھنجھلاہٹ آتی ہے اور دیودا س کو تو ٹھوکنے کو دل چاہتا ہے"

"یا اللہ یہ کیوں؟"

"لیجئے کم بخت، بھاگ جاتا لڑکی کو لے کر"

"اونہہ تو نہ جائیے، یہ کیوں نہیں کہتے"

"یہاں ایک پارک بھی تو ہے"

"ہاں"

"اگر تمہارے ساتھ میرے جانے سے تمہیں اسکول سے نکال نہ دیا جائے تو چلو ذرا ٹھلی ہوا لے گی، نہ جانے کب سے مقبروں میں رہنے کا عادی ہو چکا ہوں"

"مگر ایک فائدہ تو ہے اِن فلموں سے!"

"شکر ہے کچھ تو ملا آپ کو"

"ہاں ہمارے پوشیدہ امراض کی دواؤں کی تو خوب ترقی ہو رہی ہے یہ دیکھ کر ہر فلم کے اشتہار کے ساتھ اس کی دوا موجود ہے۔۔۔۔ نہیں سمجھیں؟" شمن نے اکتائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہنسا۔ "تم لوگ مُنی ہو یا واقعی بے وقوف ہو"

"جو کچھ بھی سمجھ لیجیے!"

"ارے بھائی فلم کا آخری شو دیکھ کر جوتی کا تھرا جڑھانے کے بعد سڑک کے کنارے نالیوں میں کیا ہوتا ہے۔ سے لپٹ کر فلمی ڈرامہ رہایا جاتا ہے"

شمن چپ رہی۔

"بعض خوش نصیب تو بازارِ حسن میں اپنی سدھ جا ادھوری ڈھونڈ نکالتے ہیں اور بعض...... ؟"

"کیا؟"

"کچھ نہیں تمہیں کراہت آئے گی۔ جانے دو ان باتوں کو دوسرے یہ باتیں یا تو ضرورت سے زیادہ مقدس ہیں یا فحش کہ ان کا ذکر معیوب سمجھا جاتا ہے۔ نہ جانے ہم اپنے عیوب کا ذکر سن کر اس قدر چراغ پا کیوں ہو جاتے ہیں۔ اور نہ جانے دو...... ہاں بتاؤ کچھ اپنے اسکول کا حال، اُستانی پر بڑا رعب گانٹھتی ہو گی۔"

"نہیں تو، بے کار اترانے کی مجھے عادت نہیں۔"

دھیمی دھیمی چاندنی پھیلی ہوئی خاموشی کو اور بھی پُراسرار بنا رہی تھی۔ پارک میں چاروں طرف زندگی کا احساس موجود تھا، مگر خاموش اور دھندلا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جنت روحیں سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ چاندنی اور خاموشی نے مل کر آوازوں کو بھاری اور دھیما کر دیا تھا۔

"تمہیں تعجب ہو گا؟" فضا سے مسحور ہو کر افتخار نے کہا۔

"کس بات پر؟"

"اگر میں کہوں کہ مجھے تم بہت پسند ہو۔"

"نہیں!" شمن نے قلابازیاں کھاتے ہوئے دل کو دبوچ کر کہا۔

"اور کیا یہ بھی ضروری ہے کہ میں تمہیں بتاؤں کہ تم پہلی لڑکی ہو جس نے مجھے اس قدر متاثر کیا ہے؟"

"لیکن یہ سب کیوں؟"

"پتہ نہیں!" وہ متحیر سا تھا۔ "پتہ نہیں میں یہ سب کچھ کیوں کہہ رہا ہوں تمہیں معلوم ہے کہ میں نے ایک بار نہیں ہزار بار محبت کی ہے، کم از کم یقین تو یہی کیا ہے اور یقین دلانے کی کوشش بھی کی ہے مگر تمہیں...... تمہیں میں کچھ یقین نہیں دلانا چاہتا۔"

"اور نہ ہی مجھے کچھ یقین کرانے کا حق ہے؟" شمن کو خاموش دیکھ کر بولا۔

"شاید"

"اور یہ بھی ایک وہم ہی ہو۔"

"ہو سکتا ہے!"

"تو پھر میں جیل سے چھوٹ کر سیدھا تمہاری طرف کیوں بھاگا جیسے میرے برسوں کے سڑے بسے زخموں کا مرہم تمہارے ہی پاس ہے۔ تم سے ملتے ہی شفا ہو جائے گی۔

"شاید یہ بھی وہم ہو۔"

"او ہو، مجھے جلاؤ مت...... شمن خدا کے لیے مجھے سمجھنے کی کوشش کرو اور اگر کچھ سمجھ میں آجائے تو مجھے بھی سمجھا دو میں کیا ہوں اور کیوں ہوں؟" وہ بھولے بچوں کی طرح التجا بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ شمن کا دل بھر آیا۔ وہ کیا دے سکتی تھی۔ اُسے اس کے پاس افتخار کے دکھوں کا علاج کہاں ہے؟ وہ اس سے کچھ مانگ بھی تو نہیں رہا۔ اس کی حالت اس لاوارث بچے کی سی ہے جو گھر سے بھٹک آیا ہو اور والدین کا نام و نشان بھی نہ دے سکے۔ کون کر سکتا ہے ان گم شدہ لوگوں کی رہنمائی!

"شمن، نہ جانے کیسے میری آرزو ہے میں کسی سے محبت کروں، جی بھر کے محبت کروں، مگر میرے دل سے ہر چیز کا اعتبار اٹھ گیا ہے مجھے کسی چیز پر یقین نہیں رہا اور خدا کے وجود پر ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ محبت سے مجھے گھن آتی ہے اور خدا پر غصہ کہ وہ کیوں ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ مانا کہ یہ دنیا اس نے بنائی، تو ہم پر کیا احسان کیا، اُسے سجدے کرانے کا اتنا کیوں شوق ہے۔ اور جو نہ کرو تو دوزخ میں جلانے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ سچ بتاؤ یہ کیڑی بھینگی دنیا تمہیں پسند ہے؟ کہیں اونچائی ہے تو ضرورت سے زیادہ پستی ہے تو انتہا سے زیادہ پانی ہے تو پانی ہی چلا گیا ہے اور پھر خشکی ہے تو وہ کم بخت بے تکی۔ جی چاہتا ہے اس دنیا کے گولے کو دونوں ہاتھوں سے گوندھ ڈالوں اور پھر اتنی سُبک اور نفیس دنیا بناؤں کہ لوگ پیدا ہو کر بھی خوش ہو جائیں۔" شمن کو اس کے بچپن پر ہنسی آگئی۔

"مگر آپ تو کہتے تھے ہر مرض کا علاج ہو سکتا ہے، آپ اشتراکی ہو کر ہمت ہار جاتے ہیں۔"

"میں اشتراکی تو ہوں مگر میری روح تو فاشزم کی عادی ہو چکی ہے۔ اشتراکیت ابھی ہم سے اتنی دور ہے جتنا یہ آسمان زمین سے۔"

"کیا یہ فاصلہ کبھی کم نہ ہو گا؟"

"ممکن ہے کسی دن ہو جائے مگر میں کہاں زندہ رہوں گا!"

"ارے تو وہ آپ کی اسکیم؟"

"دو چار بم پھٹے تین چار ریلیں لڑیں، وائسرائے کی موٹر میں پنکچر ہوتے ہوتے بچ گیا۔" وہ زور سے ہنسا "نصف سے زیادہ کام کرنے والے جیل میں چکیوں پر جُت گئے اور کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ بیٹے دیکھو" اس نے ہاتھ پھیلائے۔

"چہ اے ہے، نہ جانے کیوں جاتے ہیں جیل میں"

"کہتے ہیں بغیر جیل میں گئے عوام کو قوم پرستی کا یقین نہیں ہوتا جیسے یونیورسٹی کی مہر کے بغیر سرکاری نوکری نہیں مل سکتی، اسی طرح جب تک جیل کا سارٹیفکیٹ نہ ہو تو کوئی اسٹیج پر نہیں ناچا جا سکتا۔ اس لیے بعض وقت توڑی کوششوں سے جیل جانا پڑتا ہے۔"

"چہ بے کار ہیں!"

"جی ہاں بے کار کا ڈھکوسلا، بات یہ ہے کہ ہمارے لیڈروں کے پاس سوائے جیل جانے کے کوئی عملی ثبوت ہی بھی تو نہیں قوم پرستی کا، بس لکھ تیں دو چار مہینے کی جیل نہ کاٹ آئیں تو عوام ان کو کیسے بنیں اور ان پر پھول ہار کی بارش کیسے ہو"

"مگر سب تو لکھتے نہیں"

"ہاں اور ان کے پاس کوئی حربہ بھی تو نہیں جسے استعمال کریں سوائے سڑک پر چل جانے کے اور اس کی سزا میں "اماں جان" کو کھڑکی میں بند کر دیتی ہیں۔ ارے یہ باتیں زبانی نہیں سمجھی جاتیں سمجھنا ہے تو آجاؤ میدان میں۔ پر کھدر پہننا ہو گا یہ ململ نہیں چلے گی" وہ اس کی ساڑھی کے آنچل کو جھٹکنے لگا "آبلے پڑ جائیں گے"

آبلوں کے ذکر سے اُسے مس بوگا یاد آگئیں۔

"یہ مس بوگا نرس کیوں بن رہی ہیں؟"

"دل کی بھڑاس نکالنے کو، میاں اور بچے نہ سہی مریض ہی سہی"

"ہٹیئے، وہ تو پاک محبت کی ہمیشہ سے قائل ہیں"

"پاک محبت سے تمہارا کیا مطلب؟ ماں اور بیٹے کی محبت" آج افتخار لکچر بازی پر تلا ہوا تھا۔

"نہیں بلکہ دوستی، ایک دوسرے سے ہمدردی!"

"دوستی کوئی چیز نہیں، ایک عورت اور مرد کی صرف ایک مقصد کے لیے دوستی ہو سکتی ہے اور وہ..."

"اور نہ جانے کیا کچھ۔ دنیا میں ہر عورت کو بیوی نہیں بنایا جا سکتا!"

"تم سچ کہتی ہو...... ہر عورت کو بیوی تو نہیں بنایا جا سکتا...... مگر......" وہ الفاظ ڈھونڈنے کے لیے بالوں کو انگلیوں سے سلجھانے لگا۔ "مگر مس بوگا کی محبت ہی نہیں نہ تو اس میں ماں کا سا معصوم پیار ہے اور نہ محبوبہ کی پُرجوش گرمی وہ تو ایک بجھے ہوئے شعلے کی بے حقیقت گرمی بھی نہیں برف کی طرح ٹھنڈی اور مٹی کی طرح بے جان۔ سب کچھ بوسیدہ اور گھسی ہوئی سی وحشت ہے۔" وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

"اور میری...... میری محبت کس قسم کی ہے؟" اس نے سرگوشی میں خود سے پوچھا "میں کس قسم کی محبت کرتا ہوں؟ یہاں کس قدر حسین اندھیرا ہے، تم ہو اور میری صدیوں کی پیاسی روح مگر ایک لمحے کو بھی میں یہ گوارا نہ کر سکوں گا کہ تم کو اس بلندی پر سے گھسیٹ کر نیچے لے آؤں جہاں میرے تخیل نے تمہیں بٹھا رکھا ہے کیا میں اتنا شریف ہوں؟ "نہ" اس نے لفظ شریف کو حقارت سے ٹھوکا۔

"یہ آپ اپنی ہر خوبی کو کمزوری اور طاقتوں کو غلطیاں کہہ کر گویا بڑی بھاری الفاظ کرتے ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ، مگر میں شرافت کو اپنے لیے تو نہیں سمجھتا ہوں۔ کیا سمجھتی ہو میں تم سے اپنی پارسائی کا سارٹیفکیٹ لینا چاہتا ہوں۔" وہ واقعی جھلا اٹھا۔ "ابھی یہاں اس سنسان کونے میں اگر میں چاہوں تو......"

"آپ کچھ نہیں کر سکتے۔"

"کیوں؟" افتخار کا منہ اتر گیا۔

"اس لیے کہ آپ اتنے بُرے نہیں جتنا آپ کے وہم نے بنا رکھا ہے۔"

"کیوں؟"

"اطمینان قلب کے لیے آپ اُن لوگوں میں سے ہیں جنہیں خود پر تھوک کر اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس طرح اُن کے گناہ دُھل گئے۔"

"گناہ؟ مگر کون بے وقوف گناہ و ثواب کا قائل ہے؟"

"آپ کا ضمیر!"

"ہشت غلط ضمیر ایک غلط فہمی ہے اور کچھ نہیں میں جو کچھ کرتا ہوں۔۔۔۔"

"بُرا سمجھ کر کرتے ہیں اور اچھا ہوتا ہے۔"

"ایں؟" وہ چونکا۔

"آپ مانیں یا نہ مانیں مگر آپ دل کے بُرے نہیں۔"

"یعنی زبردستی۔"

"جی ہاں، اگر مجھے اس کا یقین نہ ہوتا تو اس وقت میں آپ کے ساتھ کبھی نہ بیٹھتی۔"

"بڑی تنگ خیال ہو!"

"جو کچھ بھی سمجھ لیجیے! چلیے اب خنکی بڑھ رہی ہے آپ کو کچھ ہو گیا تو۔۔۔۔"

"تمہاری بلا سے!"

"جی نہیں۔ آپ کی زندگی میری نظروں میں اتنی سستی نہیں جتنی آپ نے بنا رکھی ہے، ابھی آپ کو دُنیا میں بہت کچھ کرنا ہے، اور دُنیا کے لیے مجھے آپ کو زندہ رکھنا ہے۔"

"ہوں، دنیا کے لیے؟ اور کسی کے لیے نہیں" وہ مردہ دل ہو گیا۔ "دنیا کے لیے جیتے جیتے تو اب دل اچاٹ ہو چکا ہے تمہیں کیا غرض مجھے دُنیا کے لیے جلانے کی؟"

"میں بھی تو دُنیا ہی میں ہوں" شمن کو اپنی ہمت پر سخت حیرت ہوئی۔

"اوہ!" وہ دیر تک خاموش سر جھکائے کچھ سوچتے اور یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

شمن چلا گیا تو وہ دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ اس نے امتحان کے دو پرچوں میں بیٹھنا اور سیتل کو ٹٹولنا شروع کیا۔ ایک بجلی سی چمکی تھی کہ وہ کٹا لگتا تھا اور درد ایک مست کن غبار کی طرح چاروں طرف سے اسے محسوس کرتا جا رہا تھا۔ اتنی دیر ساتھ بیٹھا مگر ایک مرتبہ بھی تو اُسے وہ نیم وحشیانہ احساس نہ ہوا جو آخری مرتبہ سینے سے لگ کر ہوا تھا۔ یہ کیا؟ جس نے اس کی زندگی پر آخری خاموشی کی چادر بچھا رکھی تھی۔ نیا معلوم ہی بے چین کرنے کی ہیبت ناک تیز بھی تھی اور تلخ بھی۔ وہ اس کے ہر شانے پر سب کچھ دے ڈالنے کی زبردست آرزو۔ اس کا لفظ بھوکے کی پکار بن کر دماغ میں پہنچ گیا۔ لیکن ہر سانس فقیر کی صدا بن کر گونج اٹھتا۔ یہ سب کیوں؟ کیوں؟ وہ کوئی جواب نہ پا سکی!

۳۳

اسکول کے بکھرے ہوئے شیرازے کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے کی کوشش میں وہ پاگل پاگل ہوگئی۔ دوپہر کو جو لڑکیوں کے گھروں سے کھانا آتا اس میں سے ایک آدھ آلو یا بوٹی چپراسنیں نکال کر اڑا جاتیں باقی میں استانیاں حصہ لگاتیں۔ بے چاری بچیاں بھوکی مرتیں پہلے تو چپراسنوں نے سختی ان سنی کردی پھر جو سختی کی گئی تو ایک اور چال چلی۔ لڑکیوں سے کہہ دیا "خبردار جو پورا کھانا کھایا، ہمارا حصہ ضرور چھوڑنا" لیکن یہ بات بھی زیادہ دن نہ چھپ سکی اور ایک دن چپراسنوں کے مظالم کی پھر کسی نے شکایت کی۔ بازپرس پر چپراسنوں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"کیا کریں مس صاحب چھ روپیہ اور تین بچے ایک اپاہج ماں اور نکھٹو بھائی کیسے گزر ہو یہ اللہ مارا پیٹ بھی نہیں مارا جاتا۔"

"جیسے تیسے تو ہم پڑھا رہے ہیں اپنی بچیوں کو اپنے ہی پیٹ کو نہیں تو ان چپراسنوں کا کہاں سے کلہ گرم کریں" یہ لڑکیوں کے والدین نے دہائی مچائی۔

"بیس روپے میں مکان کا کرایہ دوں یا اور چار بندوں کا کھانا کپڑا کیسے پورا کریں" استانیاں چیخیں۔ شمن کو ایسا معلوم ہوا اسکول میں نہیں کسی لنگر خانے میں کھڑی ہے دنیا نہیں بھوکے ننگوں کا ایک مستقل یتیم خانہ ہے جہاں اوپر سے لے کر نیچے تک ہر ایک بھوکا ہے اس لئے دونوں چپراسنوں کو اپنے پاس سے دو دو روپیہ دینا شروع کیے جب کبھی ممکن ہوتا استانیوں کی دعوت کر دیتی ہر ماہ دو چار غریب لڑکیوں کی فیس بھی ادا کر دیتی۔ مگر اُسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جتنا جتنا وہ پیٹ بھرنے کی کوشش کرتی بھوک بڑھتی جاتی۔ ایک فقیر کو پیسہ دے دو تو دس اور ٹوٹ پڑتے ہیں جو نہ دو تو بعض شوقین مزاج گالیوں پر بھی اتر آتے ہیں۔ غرض اس دریا دلی کے بدلے میں بجائے سرخروئی کے جوتیاں ملیں۔ ہر جمعرات کو چپراسنیں محلے ٹولے میں بھیک بھی مانگ لاتیں استانیاں

نہ بے چاری بھیک مانگنے کی ہمت اور نہ عمر زندگی کے پیشے کے لائق گھر نہ بار سوائے سکول کی تنخواہ کے اور کیا وسیلہ زندگی گزارنے کا ہوتا ہر وقت ایسے لرزتیں جیسے فصل کاٹی گئی ہو مگر رضیہ بیگم بالکل چنگیزی پالیسی کی قائل تھیں۔ باوجود کوششوں کے انھوں نے لڑکیوں کو ایک لفظ بھی پڑھا کر نہ دیا بس ہر وقت بیٹھی منیجر صاحب کے لیے کشیدہ کاری کا جال تیار کیا کرتیں۔ شمن نے ان کی رپورٹ میں شکایت کی مگر وہ رپورٹ انسپکٹرس کے پاس بھیجنے سے پہلے منیجر صاحب نظر ثانی کو لے گئے اور ان کی شکایت ہی گول مال کر دی۔ رضیہ بیگم شدت سے حاوی ہوتی گئیں۔ شمن کا پلہ اٹھا دیکھ کر وہ استانیوں پر تاؤ جما بیٹھیں۔ بحالی اور ترقی کی کامیاب سفارشیں ہونے لگیں۔ آموں کی چٹنی کے ساتھ انھوں نے سکول کی بھی چٹنی بنانی شروع کر دی۔ شمن کو معلوم ہوا کہ ہوا اور وہ منیجر کی آڑ لے کر اس کی پیٹھ میں ڈنک مارنے لگیں۔ اس کے ملنے جلنے والوں کی رپورٹ۔۔۔ اور منیجر صاحب توہم پرستی پر تل گئے۔ اس کے لباس اور طرز رہائش سے انھیں شریف خاندانوں کی لڑکیوں کا اسکول سے ہٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ وہ ذرا ذرا سی بات کی خبر پا جاتے کہ نیچے اٹھتی ہے کب سوتی ہے، کیا کھاتی ہے اور کیوں کھاتی ہے۔

"کس نے کہا آپ سے" وہ حیرت زدہ ہو کر پوچھتی۔

"مجھے ہر بات کی خبر رکھنا پڑتی ہے صاحب" وہ نہایت پُر اسرار مسکراہٹ چہرے پر طاری کر کے کہتے۔ گویا اسکول کے منیجر کو سی آئی ڈی کا کام بھی کرنا پڑتا ہے "مجھے عوام کے قومی جذبے کو ابھار کر چندہ جمع کرنا ہے لہٰذا استانیوں کا چال چلن......"

لفظ چال چلن پر شمن جل کر رہ گئی۔ پتا نہیں لوگ چال چلن کو کیا سمجھتے ہیں۔ چال چلن بھی کوئی مقدس مقبرہ ہے کہ اس کے آگے ماتھا ٹیک کر نجات کی امیدیں لگا بیٹھیں اگر ایک استانی زمانے بھر کی آوارہ ہے مگر کام ٹھیک کرتی ہے تو اس مقدس مٹی کی بنی ہوئی معلمہ سے ہزار درجہ غنیمت ہے جو خود تو مجبوراً نیک چلن ہے مگر لڑکیوں کا حال اور مستقبل تباہ کرنے میں مصروف ہے۔

"دیکھیے صاحب سنا ہے لڑکیوں کے پاس چٹھیاں آتی ہیں"

"کیسی چٹھیاں؟" شمن نے ضبط سے کام لیا۔

"اجی یہی خرافات پرچے، غنڈے بھیجتے ہیں۔ آپ ایک کام کیجیے۔ ایسی سب لڑکیاں جن کے پاس خطوط آتے ہیں جمع کر کے انھیں ڈانٹیے۔"

"مگر یہ کیسے معلوم ہو کہ چٹھیاں کس کے پاس آتی ہیں۔ پکڑی جائے تب نا؟"

"تو صاحب پکڑ لیجیے،" گویا چٹھیاں بھی کبوتر ہیں کہ چھاپہ مار کر پکڑی جائیں۔ دوسرے یہ چڑی ماری تجربے سے آتی ہے۔ ایسے خط ڈاک سے نہیں آتے بلکہ لڑکیاں ہی ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں۔ اپنے بھائی بندوں کی پرچہ بازیاں جاری کرنا ایک عام بات ہے۔ بیس روپیہ پانے والی استانیاں اور پچیس روپے میں گذر کرنے پر مجبور چپراسنیں اگر اپنی تمباکو کا خرچہ اس پرچہ بازی سے نہ نکالیں تو اور کیا کریں۔ اگر لڑکیوں کو ڈانٹو تو والدین چڑھ دوڑتے ہیں۔ بھلا اُن کی معصوم بچیاں یہ ہتھکنڈے کیا جانیں۔ اور ان معصوم بچیوں کا پکڑنا بھی معمولی کام نہیں۔ حد درجہ کی ہوشیار ہوتی ہیں۔ کم از کم وہ گروہ جن کی وہ نمائی میں یہ فعل کرتی ہیں معصوم نہیں ہوتے۔ ہزاروں چالیں چل کر خط لائے جاتے ہیں۔ عموماً تو لڑکی کی طرف سے لڑکی کے نام ہوتے ہیں جن پر باز پرس کرنے کے لیے غیب داں ہونا ہوتا ہے۔

ساتھ ہی امتحان آ گئے بنچیں لگوانا اس چالاکی سے کہ لڑکیاں ایک دوسرے کی نقل نہ کر سکیں۔ کاپیاں لگوانا اور پھر سارے دن چوکیداری کرنا۔ انسپکشن کا زمانہ بھی آ گیا اب یہ دیکھنا کہ سارے رجسٹر چھوٹی بچی کیسی بھی فضول معلومات سے پُر ہیں یا نہیں لائبریری کی کتابوں اور رشیدہ کاری کے نام سے روپیہ نکال کر جو منیجر صاحب نے اپنی سالوں کا قرضہ اتار دیا اس رقم کی لیپا پوتی ہیں کون سے گر استعمال کیے جائیں۔ منیجر صاحب بھی کچھ مکدر سے رہ گئے۔

"اچھا صاحب یہ کیجیے کہ لکھ دیجیے رجسٹر میں ...... کھلے اور پودوں کے بیج خرید لیے گئے چلیے چھٹی ہوئی،" رائے دینے لگے۔

"مگر ہیں کہاں گملے اور بیج۔ انسپکٹرس نے معائنہ کیا تو؟"

"کہہ دیجیے گا کچھ بچیوں نے توڑ ڈالے اور کچھ میں جنگی کے افسر سے کہہ کر خالی ٹوٹے گملے منگوا لوں گا۔ باغ عام میں بہت بے کار پڑے ہیں کچھ میرے یہاں ہیں وہ بھیج دوں گا۔ اور

آپ ......آپ نے بھی تو کچھ لگا رکھے ہیں؟"

"اپنے تو میں نے تقسیم کر دیے کون چھیٹیوں میں رکھوالی کرتا۔"

"اسے لیجیے غضب کر دیا اپنے تو ...... خیر کوئی مضائقہ نہیں۔"

اور بیج؟"

"اوہ لکھ دیجیے اُگے نہیں، خراب تھے اور یہ کم بخت ہوتے بھی ہیں گھنے گھنائے، واہیات کہیے تو میں کچھ پنساری کے یہاں سے منگوا دوں۔"

"مگر یہ پورے دو پیے کا تو حساب نہ ہوا۔"

"کچھ قینچی کاڑھنے کا سامان میں مکان سے بھجوا دوں گا۔"

"بہت اچھا۔"

"اور کچھ کتابیں بک اسٹال سے منگوائے دیتا ہوں، خراب نہ ہونے پائیں تہائے احتیاط سے واپس کرتا ہوں گی کچھ چائے پانی کا انتظام؟"

"وہ تو خیر ہو جائے گا، مگر وہ بورڈنگ اُس کا کیا ہوگا۔ اس کے لیے باقاعدہ تم ملتی ہے"

"آپ فکر نہ کیجیے ایسا ہے کہ اس کا تو میں نے پہلے سے انتظام کر لیا ہے، وہ جو مشرقی بازو کے تین کمرے ہیں اس میں پندرہ بیس چارپائیاں ڈلوا دوں گا...... بستروں کا بھی انتظام گھر میں سے کر دیں گی کچھ فاضل چادریں اور تکیے ہوں تو آپ دے دیجیے گا۔"

"مگر یہ تو سراسر دھوکا دینا ہے۔ اس طرح فریب دے کر انسپکٹرس کی نظروں میں کیا وقعت رہ جائے گی۔ اگر اسے کسی طرح پتہ چل گیا۔"

"اب صاحب پتہ چلنے کی کوئی راہ تو ہے نہیں سوائے ...... خیر ...... آپ اسکول کی مائی باپ ہیں، مجھے امید ہے کہ اسکول کی بہتری کے لیے آپ کو خود فکر لگی رہتی ہے۔ کیا کیا جائے صاحب مجبوری ہے۔ یہ دیکھیے آپ کو اگر گورنمنٹ سے گرانٹ لینی ہے تو سبھی کچھ کرنا پڑے گا آپ پریشان نہ ہوں میں سب کچھ بھگت لوں گا بس جس وقت آئیں تو آپ ...... ارے ہاں وہ نظم؟!"

"نظم"

"جی ہاں نظم ..... تیار کی آپ نے؟"

"میں نے؟ کیوں؟"

"لیجیے صاحب۔ اجی وہی انسپکٹرس کی شان میں ..... بخدا بھول گیا۔ دیکھیے جب وہ آکر بیٹھ جائیں تو کسی پیاری سی بچی سے گلے میں ہار ڈلوا دیجیے گا عمدہ صاف کپڑے ہوں سپرنٹنڈنٹ صاحب کی نواسی ٹھیک رہے گی ہیں اُسے صبح ہی سے بلوا لوں گا"

"مگر وہ تو یہاں پڑھتی نہیں"

"اجی سب چلتا ہے، کوئی نام بر نام کھوڑی ایک ایک لڑکی دیکھی جاتی ہے آپ یہ کیجیے گا کہ صبح سے بلوا لیجیے گا..... ہاں"

"جیسی آپ کی مرضی!"

"اور ہاں پھر ہار وغیرہ پہنا کر لڑکی پڑھے نظم ..... چہ لاحول ولا قوۃ آپ نے نظم تو تیار نہیں فرمائی۔"

"میں نے عرض کیا نا کہ مجھے نظم لکھنی نہیں آتی"

"چہ تو یہ ایسی مشکل ہی کیا ہے پچھلی مرتبہ رضیہ بیگم نے بنادی تھی، اگر مل جائے تو وہی چلا دیجیے۔ دو چار لفظوں کا ہیر پھیر کرنا ہو گا..... ورنہ ٹھہریے میں ہی کچھ سوچوں گا"

اور وہ چہرے پر شاعرانہ جذبات طاری کرنے کی کوشش کرنے لگے "ایں؟..... ہیں؟" انھیں سوجھ ہی گئی "وہ دیکھیے پاس جو قومی ہائی اسکول ہے اس میں جو جلسے ہوتے رہے ہیں وہاں ہزاروں نظمیں پڑی ہیں۔ منگوا تا ہوں میں ..... ابے نھّے ..... او ..... سالے ..... اوہ معاف کیجیے گا ..... دیکھ بے ذرا مسعود صاحب کے پاس تو جا لپک کر کہنا منیجر صاحب نے سلام کہا ہے اور نظمیں مانگی ہیں"

"سمجھیں؟"

"ابے ہاں گدھے ..... کہیو ..... چہ الّو ہے تو ..... معاف کیجیے گا ..... خیر میں خود ہی لے آؤں گا ..... اور کل تک پہنچ جائے گی آپ اس میں رد و بدل کروا لیجیے گا۔ اسکول میں ایک دن پہلے سے سجوا دوں گا۔ اور امتحان پرسے شروع کروا دیجیے گا اسی روز پرچہ رکھ دیجیے گا۔" انسپکٹرس کو اردو نہیں آتی تھی تعلیمی ایکس سے بچنے کی یہی ایک صورت تھی۔

انسپکٹرس کی آمد کی خوشی میں پاس پڑوس کے جتنے گملے تھے آ گئے، کسی میں پودے تو کسی میں ہری مرچیں مگر برآمدہ ہرا بھرا ہو گیا۔ کتب فروش نے دس روپیہ کرایہ لے کر پانچ سو کتابیں بھیج دیں۔ آننا دیکھنے کی کسے فرصت یا فکر تھی کہ اس میں زیادہ تعداد ایسی کتابوں کی تھی جو لڑکیاں چھوڑ کسی کے بھی پڑھنے کے قابل نہ تھیں زیادہ تر سستے بازاری ناول "میاں بیوی" "شادی کی راتیں" "مستند کوک شاستر" تھے جنھیں بڑی شان سے الماری میں چن دیا گیا۔ ساتھ ساتھ اور ادھر ادھر کا کوڑا جمع کر دیا گیا۔ پہلے پرانے میگزین جنتریاں ٹیلیفون ڈائریاں اور پرانی فہرستیں نہایت صفائی سے کاغذ چڑھا کر ایسے مقام پر رکھ دی گئی تھیں جہاں سے دیکھنے والا کتاب کی ضخامت سے بھرا کر رہ جائے نیز اس کاغذ چڑھانے والی چال کو سلیقہ سمجھے کواڑوں اور کھڑکیوں پر تیل اور پانی چیڑا گیا جگہ جگہ تصویریں اور کیلنڈر وغیرہ چپکا کر دیواروں کی مفلسی پر پیوند لگائے گئے۔ لڑکیوں سے کہہ دیا تھا کہ صاف اور ثابت کپڑے نہیں کرآتا تو وہ بری کے جوڑے نکال کر پہن آئیں۔ جھانجن اور چوڑیوں کی جھنکار سے اسکول اندر سبھا کا اکھاڑا بن گیا۔

ایک اور ہوشیاری کی گئی وہ یہ کہ امتحان کی کاپیوں پر آدھا پرچہ استانیوں نے بورڈ پر لکھ کر پہلے سے کروا دیا تھا کہ اگر انسپکٹرس لڑکیوں کی قابلیت کا اندازہ لگانے پر تلی ہوں اور کسی کو ساتھ لے آئیں تو ان میں ادیب فاضل کی لیاقت کے جوابات حل کیے ہوئے پائیں ان انسپکٹرسوں کے سارے ہتھکنڈوں سے اسکول والیوں کو واقف رہنا پڑتا ہے کوئی چال ان کی نہیں چل سکتی۔

اس کے علاوہ میزوں اور الماریوں میں "لڑکیوں کی کشیدہ کاری" کے نام سے کچھ بازار سے خریدی ہوئی چیزیں اور کچھ مانگے تانگے کے جہیزوں کے میز پوش پاندان کے کور سلے کا بنا ہوا تاج محل اور قریب قریب سارے لمبے رضیہ بیگم کے کاڑھے ہوئے "سویٹ ڈریم" اور "گڈ نائٹ" سجا دیے گئے۔ ان میں سے بعض چیزیں تو مشین کی بنی ہوئی اور ریشم نجات کی صنعت گری کا نمونہ تھیں مگر ایسے پینترے سے یہ سب سامان رکھا گیا کہ صرف چیزوں کی تعداد بڑھا رہا تھا۔ مگر پہنچ سے دور تھا، یہی نہیں کچھ

نامکمل چیزیں بھی تھیں جو پاس کے اسکول سے منگا کر سجا دی گئی تھیں۔

بورڈنگ بھی لیس تھا۔ چار پائیوں پر خالی غلافوں میں الابلا ٹھونس کر تکیے لگا دیے گئے اوپر سے چادریں اور پلنگ پوش ڈال دیے گئے۔ پاس دو چار میزوں پر کتابیں سجا دی گئیں لیجیے کمرے سج گئے۔ دس لڑکیاں تو وہ تین چار کلاسوں سے چن کر مقرر کر دیں کہ جب انھیں بلایا جائے تو حاضر ہو کر انسپکٹرس کو سلام کریں

خدا خدا کر کے برات کی طرح زور شور سے انسپکٹرس اتریں، گیٹ کے پاس جہاں لمبا چوڑا خوش آمدید اور جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں منیجر، ہیڈ مسٹرس نے مع چپراسی اور دو عیسائی استانیوں کے خوش آمدید کہا۔ یہ انسپکٹرس بھی دنیائے تعلیم میں خدا کا سا درجہ رکھتی ہیں جو شان لاٹ صاحب کی سو اُن کی۔ ان کا کام صرف دھوم دھڑکے سے آنا اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا ہے۔

"یہ جالا کیوں؟..... یہ اینٹ کیسی؟ یہ گڑھا کس لیے؟" اب ان سے کوئی پوچھے سال میں دو مرتبہ اگر آئیں اور جالے اور گڑھوں میں پھنس گئیں تو کون سی قیامت آگئی۔ سیدھی طرح آؤ، ہار پھول پہنو، تعریفی نظمیں سنو، تازہ تازہ پھل اور مٹھائیاں کیبنٹ کے لیے منگا رکھی ہیں وہ کچھ تمہارے ساتھ چپکے سے باندھ کر گھر پہنچا دیں گے وہاں اطمینان سے چکھنا۔ اس سے زیادہ دخل در معقولات کی فہرست میں داخل! کیا فائدہ۔ بُری رپورٹ سے چھینا انسپکٹرس کب کب آتی ہے اور کتنی دیر کو آتی ہے اس سرسری معائنے کی سرسری ہی رپورٹ ہو ورنہ خواہ مخواہ تمہارا ہی حلقہ بدنام ہو جائے گا۔ اول تو ہم ہندوستانی ہیں بدانتظامی، دھوکا جعل سازی ہمارا پیدائشی حق، دوسرے ہمارا شمار پست اقوام میں ہے اب تو چپڑی اور دو دو۔ تم بے کار مغز پاشی کر رہی ہو تمہاری بلا سے جو رسیدوں پر جھوٹے دستخط ہیں جو منیجر صاحب نے خود اُلٹے ہاتھ سے کر لیے ہیں اور فرضی انگوٹھے تنخواہ کے رجسٹر میں لڑکیوں اور چپراسنوں سے لگوا لیے ہیں۔ تم کیوں پڑتی ہو ان جھگڑوں میں

اس پر بھی جو تم نہ مانیں تو مقامی قومی اخبار کے ذریعے تمہارے چال چلن خفیہ رشتوں اور سیر دن کا پول کھول کر رکھ دیا جائے گا تم فرقہ پرست الگ مشہور کر دی جاؤ گی۔

زیادہ نہیں۔ چار پانچ روپے کا خرچ ہے۔ سحر البیان ایڈیٹر تمہاری سات پشتوں نمک کی ڈلیاں بکھیر کر پھینک دیں گے۔ ہم جو جہالت تم کو دے رہے ہیں بس غنیمت ہے، لے کر اپنے افسروں کے سامنے رکھ دو۔ ایسی معاشرت کے اچھے شکریے کے انعام میں جو ہم یہ چاندی کا بکس علاوہ مٹھائی کے دے رہے ہیں، اس میں سے کچھ اپنے افسر کے بکس میں پہنچا دو۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب کی تو اسی کے ہاتھوں ہاتھ بھول بھین کر انسپکٹرس نے ذرا ٹیڑھا راستہ اختیار کیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" پیار سے پوچھا۔

"اوں، ہٹ!" لاڈلی نے اسی لے جواب دیا اور منیجر صاحب کی روح قبض۔

"او ہو ہو.... شرماتی ہے.... بولو.... بیٹے نام بتاؤ.... بولو" سب چمچے مدد کو دوڑے۔ اصل میں وہ خود بچی کا نام بھول گئے تھے۔

"وحیدہ!" کسی نے سہارا دیا۔

"کس کلاس میں پڑھتی ہو وحیدہ!"

"بولو.... بولو بیٹی وحیدہ.... بچی.... ہاں ڈرو مت.... ڈرتی کیوں ہو"

حالانکہ بچی نہایت گستاخی سے انسپکٹرس سے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہی تھی اور ادھر مارے خوف کے دراصل منیجر صاحب پیلے ہوئے جا رہے تھے مگر بچی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"ابھی یوں ہی آتی ہے۔ کلاس والاس میں تو کچھ نہیں.... بڑے آدمی کی لڑکی ہے یہ اسکول آتی ہے تو عوام کی ہمت افزائی ہوتی ہے" منیجر کو تمام گر یاد تھے۔

چائے اور ناشتے سے صاف انکار! یا خدا! ضرور کسی نے کان بھر دیے ہیں۔ گذشتہ سال جو انسپکٹرس آئی تھی بے چاری کتنی اچھی تھی مزے سے بیٹھی نظم سن کر گائے کی طرح چارہ سانی کرتی رہی، پر یہ تو پوری ڈائن تھی۔

"میں میں میں، آپ کو پسند ہوں تو بنگلے پر پہنچوا دوں.... جی...." منیجر اپنے سوکھے ہاتھوں کو دھونے کی نقل میں ایک دوسرے کے گرد لپیٹنے لگے۔

"یہ چنگی کے ملے ہیں" صاف تاڑ گئی۔

"ہیں جنیگی!....... جنیگی واللہ!...... منیجر صاحب مصنوعی حیرت اور خوف کے ملے جلے حملے سے اور بھی زرد اور نڈھال ہو گئے اور بوکھلاہٹ چھپانے کو گملے کے چندے میں لگے ہوئے نمبر کو بغور پڑھنے لگے۔ کم بخت چپراسی نمبر مٹانا بھول گیا!

"اوہ! جی ہاں جنیگی کے تو ہیں ہی" وہ اطمینان کا سانس بھر کر بولے: "سکتر صاحب نے امداد کے طور پر عطا فرمائے ہیں" لیجیے ایک مد او ر رجسٹر سے کم ہو گئی دوسری مفت کی رہی۔

شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ نہ جانے کس پُراسرار طریقے سے رجسٹر میں گملوں کی مد کے آگے لکھا تھا۔ ابھی آئے نہیں ادائیگی پیشگی ہو گئی۔ مگر انسپکٹرس نو آج خون پینے کے منصوبے گانٹھ کر آئی تھی۔

"یہ گملے کافی سے زیادہ ہیں' ان ضرورت نہیں —— ان یہ واپس لے لیا جائے"

اُس نے گملوں کی باڑ پر چھری پھیر دی۔

یہ ہوتا ہے کہ اگر پہلے ہی وار میں انسپکٹرس کو گھیر کر بدحواس کر لو تو بھیگی بلی کی طرح ہر بات پر میاؤں کروالو اگر ہاتھ اوچھا پڑا اور نکل گئی چٹکی سے تو بس مست ہاتھی کی طرح گرجتی برستی سب چمن روند کر کھلیان کر دے گی اور یہ نئی انسپکٹرس تو بالکل تازی گھوڑے کی طرح چاروں طرف ٹاپیں پڑ رہی تھیں مگر منیجر صاحب بے دردی ٹلائی دے چکے تھے نہ جانے کدھر سے کتابیں اڑا دیں کچھ رہ گئیں وہ ایسی کہ وہ قیمت کا اندازہ ہی نہ کر سکی، دست کاری اس لئے باوجود شدت سے التجا کرنے کے نہ دیکھی۔ امتحان کا وار بھی کچھ اوچھا پڑا۔ پہلے تو دو چار کاپیاں دیکھیں، منتی سے کھُسر پھسر کی پھر کہہ دیا کہ چونکہ امتحان ہو رہا ہے تعلیمی معائنہ پھر ہو گا۔ کس دن؟ یہ مقرر نہیں ہے کبھی گولہ آن گرے گا۔

اس کے بعد اس نے قطعی ہلاکو خاں والی پالیسی اختیار کی بجائے لڑکیوں کے فی الحال استانیوں کا امتحان لے لیا جائے تو خوب رہے گا۔ منیجر صاحب کے پیروں تلے کی زمین سرک گئی اور سر پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔ مارے بوکھلاہٹ کے بدکے ہوئے اونٹ کی طرح چاروں طرف دوڑنے لگے۔ اس گھبراہٹ میں کئی گملے جو سجاوٹ کے خیال سے نہایت خطرناک جگہوں پہ نازک سے سہارے سے ٹکا دیئے تھے پھسل پڑے اور "ویلکم" مع تمام بانسوں اور تختوں کے اُن پر سے بچھا در ہو گیا۔ رضیہ بیگم کا پیٹ کی خرابی کا پُرانا

مرض ابھر آیا اور وہ نڈھال ہو کر اپنی پلنگڑی پر جا پڑیں۔ دوسری استانیاں بھی از سر نو رانڈ ہو گئیں صرف عیسائی استانیاں بچ نکلیں مگر وہ تھیں بھی غنیمت۔

اسی عرصے میں گھر گھاٹ کے منیجر صاحب نظم خوانی کے لیے لڑکیاں بلا لائے شاید ڈھول تاشے سے معاملے کی ٹریجڈی کچھ کم ہو جائے۔ کہتے ہیں سنگیت میں بلا کی طاقت اور جادو ہے بجھی ہوئی شمعیں جل اٹھتی ہیں۔ بدمست ہاتھی ماتھا ٹیک دیتے ہیں مگر غضب ہو گیا نظم کے بند بغیر تبدیلی کیے لڑکیوں کے سپرد کر دیے گئے اور تعلیمی جلوس کا ہاتھی اپنے بدلے صیغے کی کشتی کی شان میں نظم سن کر اور بھی بدمست ہو گیا۔ مگر بجائے غصے ہونے کے وہ بڑے زور شور سے قہقہے لگانے لگی منیجر صاحب جو اب تک بے قابو ٹانگوں کو صرف قوت متخیلہ کے ذریعے روکے ہوئے تھے بے طرح لرزنے لگے اور خود بھی بدحواس ہو کر ہنسنے لگے۔

"کوئی دوسری چیز گاؤ" انسانیت سے حکم ملا۔

"ہاں ہاں کوئی دوسری چیز سناؤ...... وہ گاؤ لب پہ آتی ہے...... چلو کم بختو منہ کیا دیکھ رہی ہو...... شروع کرو" منیجر صاحب لڑکیوں کی صف کے آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر ہدایات دینے لگے "گاؤ...... ہاں لب پہ؟" مگر لڑکیاں بہوت اور شرمائی ایک دوسرے کی پیٹھ میں گھسنے کی کوشش کرتی رہیں۔

"یہ...... یہ دیکھیے مس صاحب میں تو ہار گیا ان سے، آپ کو نہیں معلوم، آپ نہیں جانتیں، ہماری قوم کس قدر پستی میں گری ہوئی ہے یہ سب غریب اور نچلے طبقے کی بچیاں ہیں جن کے گھروں میں کوئی الف کے نام بے نہیں جانتا میں تو تھک گیا سمجھاتے سمجھاتے اوہ...... ارے خدا کے واسطے!...... لڑکیوں نے ان کی رقت آمیز آواز سے ڈر کر "لب پہ آتی ہے" شروع کی مگر باوجود کوششوں کے کچھ بھی لب پہ نہ لا سکیں۔

"اچھا وہی گا دو، سارے جہاں سے اچھا...... چلو شروع کرو"

بڑے جوش سے ایک لڑکی نے پنجم سر کو گھسیٹ کر تار سرگی رے پر گلے کی آخری جھنجھناہٹ ختم کر دی۔ سُر بہت اونچا تھا ایسا معلوم ہوا چیل انڈا چھوڑ کر اڑی اور منڈلا کر واپس گر پڑی۔ پھر لاکھ خوشامدوں کے بعد ایک دو سرے کے کہنیاں مار کر دو ٹول

میں نمکین چھپا کر ایک لڑکی نے از سرِ نو تان کھینچی اور طرح طرح سُروں میں ہندوستان کے سارے جہان سے اچھے ہونے کا عملی ثبوت دینا شروع کیا۔ دم بولا اٹھا۔

,,بس کرو" انسپکٹرس اٹھ کر چلنے لگی۔ دل شکستہ اور شرمندہ لڑکیاں چوٹ کھائی ہرنیوں کی طرح بنچوں میں الجھتی گرتی بھاگیں۔

,,ہم جانتے ہیں آپ کا یہ اسکول کیا ہے اور کیوں قائم ہے لیکن ہمیں جان بوجھ کر پست اقوام کے ساتھ رعایت کرنی پڑتی ہے۔ سرکار کی یہی پالیسی ہے۔ ورنہ یہ اسکول دو دن بھی قائم رہنے کا حقدار نہیں" رپورٹ پر اس نے ,,اطمینان بخش" لکھ کر حقارت سے کہا۔ اور منیجر صاحب نے کھل کر سانس لی۔ خیر سے بلا ٹلی اور بُری نہیں ٹلی۔ جلدی سے انھوں نے گلاب جامنوں کی پوٹلی سنبھال لی جو انسپکٹرس نے چھوئی بھی نہ تھی۔

,,اجی یہ اجڈ کیا جانیں ان لقموں کا مزہ؟" انھوں نے پیار بھری نظروں سے مٹھائی کو دیکھا اور چل دیے۔

شمن سارا دن کچھ مردہ دل رہی۔ رعایت؟ آخر کیوں؟ ان نیچے لوگوں کے ساتھ ہر ایک کو دیا ہی سوجھتی ہے کم ذہن ہیں جاہل ہیں ناکارہ ہیں اس لیے خیرات کے حقدار ہیں تو پھر ان پست قوموں کو دنیا پر سیاہی اور عفونت پھیلائے رکھنے کا حق ہی کیا ہے، کیوں نہیں انھیں بھی ملک کے پیڑ کی جڑ میں لگے ہوئے خطرناک کیڑے کی طرح سپرٹ ڈال کر جلا دیتے یوں بچا رکھ کر اور پستی میں گرانے جانا تو سراسر حیوانیت ہے۔ کہتے ہیں گر بھاری طوفان اور آندھیاں آئیں تو وہ سارے کوڑے کرکٹ کا خاتمہ کر جاتی ہیں یا خدا تو پھر یہاں وہ طوفان کب اٹھے گا جو ساری پستیوں کو کچے رنگ کی طرح دھو کر کیچڑ کے ساتھ بہا لے جائے گا۔ پھر لوگ یوں پستی کو اور پستی کی طرف ڈھکیلنا تو چھوڑ دیں گے۔

۳۴

انسپکٹرس نے رپورٹ تو نہایت معصوم دے دی۔ مگر کچھ زبانی گفتگو ہوگئی کہ گرانٹ ملنے میں مہینے لگ گئے۔ نئے معائنوں کی آئے دن دھمکیاں آنے لگیں۔ منیجر صاحب کا دوڑتے دوڑتے برا حال ہوگیا۔ اس سال جڑاول بھی بچوں کی نہ تھی۔ بیوی نے لاکھ خوشامد کی کہ چولھے میں ڈالو یہ قومی خدمت اور دیکھو اپنی پرانی دکان سنبھالو جو کچھ آئے گا۔ تنگی ترشی سے گذر تو ہو جائے گی یہ تو نہیں کہ اپنے بچے ویران سو الگ۔ دوسرے لوگ چاروں طرف سے بوٹیاں نوچ رہے ہیں۔ استانیوں کی چار ماہ کی تنخواہ چڑھ گئی۔ چپڑاسی نے ایک قسم کی بغاوت کر کے استعفا دے دیا اور پیشہ ہی بدل کر اینٹیں ڈھونے پر نوکر ہو گیا۔ جو جمعدار اور دوسرے چھوٹے موٹے کام کرنے والا نوکر بھاگ ہی نہیں گیا بلکہ کچھ فرنیچر بھی غائب کر گیا۔ دو ایک دن تو یہ بیچارے منیجر صاحب بے چارے ہکا بکا چاروں طرف منہ پھاڑ پھاڑ کر لپکنے لگے جیسے جنگلی چڑیوں کی ٹکٹکی یکایک کھل جائے تو چڑیمار کبھی ادھر اور کبھی ادھر جھپٹتا ہے اور جب ایک بھی چڑیا ہاتھ نہیں آتی تو تھک کر نہایت اطمینان سے پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے اور مزے سے ان کی پرواز دیکھتا ہے "اڑو میری بلا سے جہاں جی چاہے اڑ جاؤ اور مجھے بھی اڑا لے جاؤ"

منیجر صاحب بھی تھک کر رضیہ بیگم کی پلنگڑی پر لیٹ گئے اور مزے سے اسکول کی بربادی دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر تو شمن اس طوفان کی بدحواسی پر بھیگی گھڑی سمت ٹٹولتی رہی گو اس کے لیے اس سے بہتر اسکول بہتر مشاہرہ لیے موجود تھے مگر جہاں ایک ہی بار سرائے ہی کی طرح تھوڑی دیر کو قدم رکھا وہاں سے آگ لگتے ہی بھاگ نکلنا انتہائی بزدلی معلوم ہوئی۔ اسے کچھ معلوم بھی نہ تھا کہ کیا کرنا چاہیے اور کیونکر کرنا چاہیے بغیر سوچے سمجھے وہ الٰہ آباد ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ چل دی۔

محکمۂ تعلیم کی عظیم الشان عمارت سے ذرا سی بھی علم کی ضو پاشی نظر نہ آئی تعلیمی کلب ہے کوئی کاروباری ڈیپارٹمنٹ ہے ایک حصّے پر اسپتال کا شبہ ہوتا تھا گیلری میں ایک قطار سہمی ہوئی عورتوں کی بیٹھی تھی جو کسی نوکری یا وظیفے کی امیدواری میں آئی تھیں سب کی سب نہایت لاغر بیمار دکھیا اور نادار نظر آرہی تھیں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر شعبے میں ناکام ہونے کے بعد پیٹ پالنے کا آخری سہارا محکمۂ تعلیم ہی میں ملتا ہے یا تو بدصورتی اور غربت کی وجہ سے میاں نہ ملا یا بیوہ ہوگئیں اور جن پر جا کے پڑیں انھوں نے نکال دیا۔ بال بچوں کی خاطر یہ پیشہ کر رہی ہیں۔ چاہے تعلیم کا رتی بھر شوق نہیں دماغ گوڈر ہے پڑھانا تو درکنار پڑھنے ہی کی طاقت نہیں مگر چلی آرہی ہیں۔ ادھر محکمۂ تعلیم کو بھی کسی نہ کسی طرح تعلیم نسواں کو ترقی دینا ہے۔ پہلے گھان میں یہ انسانی میل کچیل اور کوڑا ہی سہی اچھا مال بھی آنے لگے گا۔

ان میں سے ایک بیٹھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھیں اور اونچی آواز میں اپنے سسرال والوں کے دُکھڑے سنا رہی تھیں جنھوں نے انھیں کچھ کہے دے کر اس کام پر مجبور کیا۔ دوسری بیٹھی اپنے بچے کی اصلاح کر رہی تھیں اور پاس بیٹھی ہوئی تیسری عورت سے زمانے کی تنگیوں کا دکھڑا رو رہی تھیں۔ تین چار اونچی آواز میں ملنے والی نوکری میں مین میکھ نکال رہی تھیں۔ اور یہ سب استانیاں بننے آئی تھیں اور دوسرے معنوں میں آنے والی نسل کا نقشہ کھینچا ہوا تھا کچھ ہو جائے کیسی ہی تعلیم دی جائے۔ برسوں ٹریننگ پلائی جائے۔ یہ گھٹّی میں پڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی کمزوریاں نسلاً بعد نسلاً چلتی جائیں گی۔ شمن کا جی چاہا ایسی تعلیم کے لیے کوشش کرنے سے تو بہتر ہے کہ لوٹ چلے، گھر جائے اور شادی کر کے ننھے بچوں کی گود اور پھیلانے لگے جو ان کا توئی ورثہ ہے کیا حاصل اس مغز پاشی سے جب بیج ہی گھنا ہوا ہے تو پودے کے اُگنے اور پھل دینے کی آس لگانا فضول ہے ... مگر۔

وہ اتنا ہی سوچنے پائی تھی کہ چپراسی نے آکر اس سے ملنے کو کہا گھنٹے کی مغز ماری کے بعد یہ طے ہوا کہ اسکول کو گورنمنٹ اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے۔ ہیڈ مسٹرس وہی رہے باقی اسٹاف بدل دیا جائے سوال یہ تھا کہ منیجر صاحب جو اپنا روپیہ

قومی اسکول کی ترقی کے لیے لگا چکے تھے۔ اس کا کیا کیا جائے۔ رسیدوں سے تو ان کا کافی روپیہ نکلتا تھا خیر یہ سوال بعد کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ اسکول پر سے قومی ٹھپہ ہٹا کر گورنمنٹ کا بنا دیا گیا۔

اسکول نیا چولا پہن کر جو اٹھا تو تھوڑی ہی دیر میں لوگوں کی توجہ بھی اس کی طرف مبذول ہوئی داخلہ بڑھا، منیجر صاحب عرصے تک اپنا روپیہ وصول کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرتے رہے عجیب کش مکش میں پڑ گئے۔ معلوم ہوتا تھا ان سے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ بیوی لانے اور زندگی تلخ کرنا شروع کی۔ اسی مد و جزر کی زد میں گڑبڑا کر انھوں نے رضیہ بیگم سے نکاح کر کے دو مستقل محاذ قائم کر لیے جہاں انھیں آم کی گٹھلی سے بھی زیادہ چپٹ کر زندگی سے دست و گریباں ہونا پڑتا۔ پھر سنا ان پر مالیخولیا کے مرض کے خفیف سے حملے ہونے شروع ہو گئے۔

اسکول میں ہندو اور عیسائی لڑکیوں کی تعداد بڑھی مگر مسلمان لڑکیاں اور کم ہو گئیں۔ اسکول جب تک اسلامی ہے یہ اسلامی پانی کی طرح اس کی طہارت پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

استانیوں کا نیا گروہ کچھ اس شان سے وارد ہوا کہ پہلے تو سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کاہل ہیں یا چست اچھا پڑھاتی ہیں یا برا کیونکہ یہ استانیاں گرگ باراں دیدہ تھیں ایک ایک محکمے میں بیس بیس سال سے جمی ہوئی تھیں۔ ایک گھٹی ہوئی رقمیں جن کا بیس سال کا ریکارڈ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ کسی اسکول میں گزارہ نہ ہو سکا چونکہ گورنمنٹ کا معاملہ دھیٹ ہی ہوتا ہے بس ایک اسکول سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں اور جو وہاں بھی بہت جوتم پیزار ہوئی تو چوتھے اور پانچویں میں ایک جگہ جم کر رہنے کی نہ تو عادت اور نہ شوق باقی رہ گیا تھا جب ایک اسکول میں ہیڈ مسٹریس سے لے کر چپراسن تک سے لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی اور مفت سودا دینے والے مارے تقاضوں کے جینا دوبھر کر دیتے تو یہ روتی پیٹتی انسپکٹرس کے پاس جاتیں اور تبادلہ کروا لیتیں بھلا وہ شمن کو کس گنتی میں رکھتیں۔

ان میں سے ایک ماتری بیگم تو بس معلوم ہوتا تھا کہ جھگڑا اور بکھیڑیں عمر کی بنی تھیں اور کئی انسپکٹریسیں بھگتا چکی تھیں کسی کا کہنا ماننا ہتک سمجھتی تھیں اور پانچوں کو نیچے کا رکی

زیادتیاں بہت جلد انھوں نے کتابوں اور اشاروں سے جتا دیا کہ اگر ذرا بھی چوں چرا کی تو انسپکٹرس سے جڑ دیں گی۔ انھیں اپنی قسم پر بڑا ناز تھا اور جس کو تہس نہس کرنے کی قسم کھائی پوری ہو گئی۔

دوسری مسز سارکس عجیب پٹی ہوئی روئی سی ادھیڑ عمر عورت تھیں۔ ذرا سی بات پر پھوٹ کر رو دیتیں اور پھر گھنٹوں منائے کرتیں۔ ایک دوست مسز شرما ہر اسکول میں اُن کے ساتھ رہنے کی خدمت انجام دیتی تھیں۔ مسز شرما اُتری ہوئی عمر کی مریل شکل غصہ ور عورت تھیں۔ یہ دونوں ہمیشہ انگریزی میں ایک دوسرے سے پیار محبت کی باتیں کرتیں اور لڑتیں بھی انگریزی میں۔ جونہی لڑائی شروع ہوتی مسز شرما مفت رہنے کا طعنہ دے کر فوراً کھانے پینے کا خرچہ دینے کی دھمکیاں دیتیں اور مسز سارکس روتیں۔ دنیا میں معلوم ہوتا تھا ان دونوں کا کوئی اور نہ تھا ساری محبت اور غصہ ایک دوسرے پر اتارتیں ان کی لڑائیوں کے چرچے دور دور پھیلے ہوئے تھے اور محبت بھی کچھ کم مشہور نہ تھی۔ باوجود ان تمام باتوں کے اسکول کا رہٹ رواں دواں ایک لطیف نغمے کی روانی سے چل رہا تھا۔ داخلہ اطمینان بخش، نتیجہ اطمینان بخش، تعلیم اطمینان بخش اس اطمینان بخش فضا نے دل میں ایک نہایت ناقابلِ اطمینان تھکان سستی اور مردہ پن پیدا کر دیا۔ معلوم ہوتا جیسے پرشور ندی دوڑتے دوڑتے سیدھے اور سپاٹ میدان میں رینگنے لگی۔ اِن گھٹی ہوئی دنیا میں سب آنکھ بند کیے عمر کی لکیر پر خاموش چلتے جا رہے ہیں، ایک دوسرے سے ٹکر ہو گئی تو بھی کاندھا بچا کر آگے گھسٹ گئے۔ زندگی دھیرے دھیرے کھسک رہی ہے وہی نیم خفتہ ٹن ٹن گھنٹہ وقت مقررہ پر جاگ کر انگڑائی لیتا ہے اور پھر اونگھ جاتا ہے اس کی ہر کروٹ دو قدم آگے یا دو قدم پیچھے گھسیٹ لاتی ہے وہ اداس سویا ہوا زنجیر جس پر جا بجا لپٹی ہوئی تھی جن کا بس نہیں چلتا کہ اس سست رفتار گھنٹے کو جھنجھوڑ کر جلدی جلدی دوڑنے پر مجبور کر دیں یہ منٹ کی سوئی اتنی بوجھل کیوں ہے کیا عاقبت کا توشہ ساتھ لے جانا ہے اور اگر یہ سکنڈ کی سوئی ذرا لپک کر چلے تو شاید دنیا ان سخت ہلکوروں سے جاگ اٹھے۔ یہ وقت اس قدر ہولے ہولے چوری چھپے نہ چلتا تو انسان اتنا کاہل کبھی نہ ہوتا ٹک ٹک وہ بھی جلدی جلدی

مشین کے پرزوں کی طرح چلنا۔

اور فضا بھی تو بھاری بھاری لگتی ہے! جیسے کوئی خوفناک طوفان تلا کھڑا ہے جیسے لگی اور بند ٹوٹا، پھر کوئی نہیں جانتا کہ امرت برسے گا یا شعلے مگر ایک خاموش بے اختیار سے انتظار نے ہر ایک کو تھکا رکھا ہے ایک نا معلوم بوجھ سے کندھے ٹوٹے جا رہے ہیں کیا ہوگا؟ کب ہوگا؟ اور کیوں ہوگا؟ یہ کسی کو نہیں معلوم! مگر ہوگا ضرور کچھ نہ کچھ! کپڑا سستا، اناج کوڑیوں کے مول مگر کوڑیاں خون کے مول بھی نہیں! یہ آخر دنیا میں پیسہ اتنا کم کیوں بنایا جاتا ہے۔ یہ جو گھروں میں ناچنے کی پتلیاں ہیں انھیں گلا کر پیسہ بنایا جا سکتا ہے

دنیا سستی، انسانیت سستی، حیوانیت سستی، پھر بھی یہ کنگالوں کی تعداد میں کمی کیوں نہیں آتی معلوم ہوتا ہے اناج کے ہر دانے کے ساتھ دس بھوکے لپٹے ہوئے زمین ہی سے اُگتے ہیں اور ان کی ساری عمر اسی ایک دانے کی چھین جھپٹ میں بیت جاتی ہے اتنا وقت کہاں جو کسی اور چیز کے لیے بھی ہاتھ پیر ہلائیں۔ کہتے ہیں اور لوگ لوٹ کھسوٹ زر و جواہر اور عزت کی خاطر خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں مگر یہاں تو عزت جیسا کوئی جھگڑا بھی نہیں جس کے لیے یہ بھوکے بھی کسی سے لڑیں۔

فضا کی گھٹن اور بڑھ گئی لوگ ہوا کو سونگھ سونگھ کر معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگے جیسے طوفان کی بو پا کر کھڑے گھوڑے پناہ گاہوں کو بھاگ نکلتے ہیں اسی طرح بازار میں بھگدڑ سی پڑ گئی۔ بنیوں نے سونا چاندی سمیٹ کر دھرتی ماتا کی چھاتی میں چھپانا شروع کر دیا طوفان کا دھماکا اتنا گہرا نہیں ہوگا کہ ماتا ان کی امانت کبھی اگل دے

آسمان پر سرخ ستارہ بجائے تازہ زخم کی طرح پھوٹ نکلا اور لوگوں نے اس میں سے لہو ٹپکتا دیکھا پھر چاروں طرف سے غیر مرئی گھٹائیں امڈنے لگیں اور خاموش گرج نے دل و دماغ ہلا دیے

یکایک پھوڑا پھوٹا اور مواد کا ریلا بہہ نکلا۔ دیکھنا ہے اپنی رو میں کس کس کو گھسیٹتا ہے اور کون بچ نکلتا ہے جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ بنیوں نے جلدی جلدی رنگ اور سونا سمیٹنا شروع کر دیا کچھ کہا نہ سنا یونہی بیٹھے بٹھائے جرمنی کے دانتوں میں کیوں کھجلی اٹھ کھڑی ہوئی فرانس اور انگلینڈ، کمزوروں کے طرفدار، صلح کے پرچم لے کر دوڑ پڑے۔

"آج سے ہماری تمہاری کٹی" جرمنی کو صاف بتا دیا۔ مگر وہ تو مچلے ہوئے بچے کی طرح بکھر تا ہی چلا گیا۔ ادھر روس کی بھی پسلی پھڑکی اور خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہو گیا۔ میاں ہٹلر کو موقع مل گیا اور بلا کسی اتمام حجت کے پولینڈ میں اپنا راج کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے دو ندیدے بچوں نے پولینڈ کو بھی ٹکیا کی طرح بانٹ کھایا۔ جلیبی پھٹی ہوئی۔

جرمنی نے پولینڈ پر قبضہ کر لیا، اور یہ تو بڑی بری بات کی دُنیا بھر کا نقصان ہو گیا یہ لوگ قبضہ کرنے کے اتنے کیوں شوقین ہیں حالانکہ یہ بالکل اچھی بات نہیں۔ گلوب پر کتنا حصہ گلابی ہے جیسے تازہ تازہ کوڑھ ابھرا ہو اب یہ جرمنی کو لتا ڑ کا ڈبہ لے کر چلا ہے نہ جانے یہ لوگ لیپ پوت کر اس گول مول نارنگی کا کیا حال کریں گے۔

اور پھر کیا ہو گا؟ پولینڈ بھی غلام بن جائے گا۔ ہندوستانی تو خیر صدیوں سے غلامی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ بھوکے رہنے سے روح بڑھتی ہے اور موسم کے اثرات جسم کو توانائی بخشتے ہیں یہ پھٹی پھٹی آنکھوں والے سڑک کے کتے جنھیں ہر راہ گیر کی ٹھوکروں اور فاقہ کشی کی چٹکیوں نے گیانی بنا دیا ہے۔ یہ تو اسی میں مگن ہیں۔ گوشت پوست تو بے کار کا فضلہ ہے اصل چیز ہے ہڈی اور اسے سمیٹے رہنے کے لیے اوپر سے کھال کا غلاف یہ انسانی پنجر سیاہ اور ٹیڑھے بینگے کھمبی اور جھریوں سے لدے ہوئے مرقعے جنھیں قدرت نے اپنے دست خاص سے گڑھا ہے اور پھر جلتی دھوپ اور لو کے تھپیڑوں سے دہکا کر خاک اور دھول میں لتھیڑ کر پکی کھرنجا اینٹ کی طرح مضبوط کر دیا ہے۔ ان پر غلامی بھی اثر نہیں کر سکتی مگر یورپ کے وہ کومل بدن جو تیز نگاہ سے بھی کمھلا جاتے ہیں، وہ کیسے تاب لائیں گے ان مظالم کی۔

دفتر کے بے کار کاموں سے سر مارتے وقت دشمن کے خیالات دور دور بھٹک جاتے کھڑکی میں نیلی ریں کا پردہ لٹکا ہوا سڑک پر چلنے والوں کی نظر بازیوں سے پناہ میں لیے ہوئے تھا مگر اس سے نچلے حصے سے چلنے والوں کی ٹانگیں نظر آتیں اور وہ گھنٹوں بیٹھی ان ٹانگوں کی رفتار دیکھا کرتی۔ کالی پتلی ٹیڑھی اور خشک ٹانگیں کچھ مسلی کچلی دھوتیوں میں الجھی ہوئی مرگھلی ٹانگیں کیچڑ اور میل میں لتھڑی ہوئی کمزور ٹانگیں اور کبھی بھاری

توند کے وزن سے کراہتی ہوئی مجروح ٹانگیں اس کی کھڑکی کے نیچے سے گزرا کرتیں کبھی کبھی چکنے پتلون اور اُجلے موزوں میں لپٹی ہوئی اجلی ٹانگوں کی ایک آدھ جوڑی گزر جاتی۔ مگر بہت کم۔ بیٹھے بیٹھے وہ اکتا جاتی۔ دنیا مجسّم ٹانگیں بن کر اسی کھڑکی کے نیچے چلتی رہتی۔ اُسے ان پر ترس آتا۔ تھک نہیں جاتیں؟ کب سے چل رہی ہیں اور نہ جانے کتنے دن اور چلیں گی۔ انہیں ٹھنڈ میں بھی کوئی نہیں ڈھکتا، پالے سے کوئی نہیں بچاتا، دھوپ کی آنچ سے کوئی نہیں ہٹاتا.... یورپ میں تو شوقین مزاجوں نے ننگے کلب نکالے ہیں اور یہاں تین چوتھائی مخلوق جنم سے ہی برہنہ رہنے کا بندوبست کر کے آئی ہے۔ ایسے بھی ملک ہیں جہاں مفید خوراک مہیا کرنے والے محکمے قائم ہیں۔ پنیر، مکھن، دودھ اور گھی نے جو انسانوں کو چربی کی پوٹلیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس کا کچھ تو علاج ہونا چاہیے۔ دولت کا کتنا حصّہ گوشت اور چربی گھٹانے میں صرف ہوتا ہے۔ کم از کم اس کا نصف تو ایسی مشینیں ایجاد کرنے میں صرف ہونا چاہیے جو موٹاپے سے عاجز بے چاروں کو ذرا ہلکا کر دیں۔ کتنے مزے کی بات ہے جب کہ دنیا کے ایک حصے میں گوشت اور پوست کی اس قدر قلت ہے دوسرے حصوں میں ذہنی عناصر کی زیادتیوں کو کل پرزوں سے چھیل چھیل کر دور کیا جاتا ہے کاش ان خوش نصیب انسانوں کے جسم کی چھیلن ہی ان انسانی ڈھانچوں پر منڈھ دی جائے جو یہاں گھوم رہے ہیں تو ترازو کے دو پلڑوں میں کچھ تو توازن پیدا ہو جائے۔

روز دوپہر کے بعد ٹانگوں کا نیا طوفان بہنا شروع ہو جاتا۔ یہ طوفان پاس کی مل سے ٹھاکرتا تھا اور شہر کی طرف برس جاتا۔ یہ بدبودار شیرے اور سڑی ہوئی رال میں لپٹی ہوئی ٹانگوں کا تھکا ہوا ریلا اپنی ان تھک ڈھال روانی سے روز بہا کرتا۔ چھٹی بجے سے ذرا پہلے ایک بیکس تنہا ٹانگ ایک لکڑی کی ہمراہی میں ٹکتی ٹھکتی کانپتی تھرتھراتی گزر جاتی شمن کا معمول تھا کہ وہ اس ٹانگ کی ہمدم لکڑی کی مسلسل ٹھک ٹھک کو قریب آتا سن کر ایک پیسہ کھڑکی سے نیچے ٹپکا دیتی اور منتظر رہتی کہ ایک سوکھے ہوئے مردے

ہوتی ہیں یہ بھیانک لمبی ٹانگیں اور کالے سیاہ ڈھانچے۔ پھر اسے خیال آتا اگر یہ ڈھانچے اتنے سوکھے نہ ہوتے تو تاج محل دنیا کا آٹھواں عجوبہ کیسے نظر آتا۔ اگر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اتنے فقیر اور مکھیاں نہ بھنبھناتیں تو شاہانِ مغلیہ کی شان و شوکت کا ثبوت کیسے ملے؟

اگر خدانخواستہ جرمنوں کا داؤ چل نکلے اور وہ پولینڈ کی طرح ہندوستان پر بھی ناخون تیز کرنے لگیں تو شاندار عمارتیں یہ نادر الوقت مقبرے اور یہ مقدس مٹی جہاں ہم صرف بولنے کے شوق کو پورا کرنے کے لیے ہری بھری کھیتیاں سجاتے ہیں۔ یہ لمبی لمبی سڑکیں جنھیں ہم موٹروں کی دھول پھانکنے کے لیے خون پسینے کی ندی بہا کر کوٹتے ہیں کہاں جائیں گے۔ کارخانے سے نکل کر گرما گرم کباب اڑانے کے لیے یہ جامع مسجد کی سیڑھیاں کہاں نصیب ہوں گی اور جب بادل امڈ گھمڈ کر آئیں گے ابر رحمت رم جھم برسنے لگے گا، کوئلیں پکار اٹھیں گی اور پپیہے ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگیں گے تو نر ناری پریم کی پیاس بجھانے انہیں عظیم الشان مقبروں کی کچھ آغوش میں چھپ جائیں گے لیکن یہ فاشسٹ ہماری ان جشن گاہوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیں گے ہمارے باپ دادا کی مقدس ہڈیاں اکھاڑ کر لے جائیں گے، وہ ہڈیاں جن کی خاطر ہم جنم جنم سے خون کی ندیاں بہاتے آئے ہیں، وہ مانک موتی سے بھی زیادہ انمول ہڈیاں جن پر ہند کو ناز ہے۔ ہر ہندی کا فرض ہے کہ ان کی حفاظت میں خون اور پانی ایک کر دے۔

یہ ہڈیوں کا پجاری خود بھی تو ہڈیوں کی ایک مالا ہے اور ورثے میں یہی مالا اپنے بچوں کو بخش جاتا ہے۔ جیتے جی تو کچھ نہیں مگر مرنے کے بعد اس میں اتنی شکتی پیدا ہو جاتی ہے کہ بانجھ کو بیٹا اور مردے کو زندگی بانٹنے لگتا ہے۔ گو زندگی بھر جسم کا کوئی کونہ مستور نہ رہ سکا مگر مرنے کے بعد اطلس و کمخواب کی چادریں چڑھائی جاتی ہیں اور صندل مل کر عرق گلاب و کیوڑے سے غسل کرتا ہے۔ زندگی بھر جو میل کی پپڑیاں اور جوئیں اس پر چھائی رہیں ان کا کچھ تو بدلہ مل ہی جاتا ہے، زندگی میں جسم کو نہ سہی مرنے کے بعد ہڈیوں کو ہی سہی!

یہ ہڈیاں! کیا مرنے کے بعد ان ہڈیوں میں دل نہیں رہتا۔ کاش دل بھی ہڈی کا

یقین زندگی کا کوئی مصرف نہیں۔

پولینڈ کا لقمہ تر ادنٹے کی داڑھ میں زیرہ ہو کر رہ گیا اور فرانس کی حسینہ بھی جھپٹ میں آ گئی۔ شرم نہیں آتی ان حیوانوں کو عورت ذات پر ہاتھ اٹھاتے۔ رانی جھانسی بھی تو عورت تھی۔ کس قدر نسوانیت تھی اس جی دار حسینہ میں بجھی ہوئی چتا کی آخری چنگاری......
مگر ابر رحمت نے ایک بار ہی برس کر اُسے بھی ٹھنڈا کر دیا۔ اس ہڈیوں کے ڈھیر میں ان چنگاریوں کا کیا کام؟

گھٹائیں گرجیں اور خوب برسیں۔ بند کھل گئے سوتے جاری ہو گئے لیکن یہ ہندوستان کیوں خشک پڑا ہے کیا ہندوستانی خون کی بو ابھی تک اتنے ہی کی ناک میں نہیں پہنچی؟ یہ سیاہ خون ہے بھی بہت پسماندہ گو سفید ذات نے مل کر کچھ خاکی حسن پیدا تو کر دیا ہے مگر ابھی اسے بہت سے انجکشنوں کی ضرورت ہے۔ "یہ سارے جہاں سے اچھا" ہندوستاں سو اسنکا ہو کے چکا ہے کیوں بچا ہوا ہے۔ ہر قوم کو اس پر پیار آ چکا ہے۔ سب ہی کو اس کے سدھارنے کی فکر نے ستایا۔ سیاہ دراوڑوں کو انسانیت سکھانے آریہ آئے۔ سکندر تک کی پسلی پھڑکی، ایران و افغانستان کو محبت چرائی تاتاریوں نے ذہانت کچلنا کر بوسے لیے۔ مغلوں نے عشق و محبت کے میدان گرم کیے اور پھر یورپ کے بنیوں کے ترازو کے پلڑے جھولنے لگے۔ ہندوستان کی مہمان نوازی ہر ایک کی خدمت میں خوان نعمت بچھائے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ "یہ سب کچھ حاضر ہے کھاؤ پیو اور بھوڑے کا حصہ باندھ کے لے جاؤ، ہم بھوکے سو رہیں گے پر تمہاری کھتی بھر جائے! ہمیں تو بس اتنی اجازت دے دو کہ تمہارے سیرے اور آیا کا عہدہ پا کر تمہاری سفیدی کے آگے اپنی سیاہی کا ماتھا ٹیک دیں۔

موسم بدلنے لگا شمن کے جی پر خفقان سا اٹھنے لگا۔ ابھی ابھی تو تھا جس نے دم گھونٹ رکھا تھا کچھ اور بھی غلیظ ہوتی جا رہی تھی۔ جی بُری طرح گھبراتا۔ غصہ آتا۔ کس پر؟ یہ اُسے نہ معلوم تھا۔ ہندستانیوں کی سستی پریشانی میں بدل گئی تھی۔ کون جانے کیسی ہوا چلے کدھر سے چلے اور

کس کس کو اڑا لے جائے۔ بے چینی بھاگم بھاگ شروع ہو گئی تھی۔ جنگ کوسوں دور تھی۔ مگر خطرہ دلوں میں چھپا ہوا تھا۔

پھر اگر اس نے پندرہ دن کی چھٹی لی اور کہیں دور جانے کا ارادہ کر لیا؟ کہاں؟ یہ اس نے اسٹیشن پر پہونچ کر بھی فیصلہ نہ کیا۔ سب سے پہلی ٹرین مدراس کلکتہ تھی اس نے وہی پکڑ لی۔ کہاں جا رہی ہے؟ کس کے پاس؟ یہ اس نے سوچنے کی ضرورت ہی نہ محسوس کی۔ کیا ضرورت تھی کسی منزل کی، جب جانا ہی ٹھیرا تو پھر کیا حاجت ہے کسی مقررہ لکیر پر چلنے کی۔ اس کے پاس تیسرے درجے کا ٹکٹ تھا ایک ہندوستانی کے نقطۂ نظر سے سفر کو مکمل کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ کافی سامان ہے۔ ریل کی افراتفری نے تھوڑی ہی دیر میں سفر آخرت کا مزا چکھا دیا۔ بیمار ٹوٹے پھوٹے بے ہنگم انسان میلے اور بدبودار چیتھڑوں میں الجھے ہوئے پتہ نہیں کہاں اور کیوں جا رہے تھے؟ شاید انھیں بھی اپنی منزل کا پتہ نہ تھا اسے غصہ بھی آ رہا تھا اور ہنسی بھی، کیا حماقت ہے سفر کرنا اور وہ بھی تھرڈ کلاس میں! جی تو اکتا کر جی چاہتا کہ کود پڑے۔ یا اتر کر ریل کی پٹڑی پر لیٹ جائے تاکہ ایک بار ہی یہ لمبا چوڑا تھکا دینے والا سفر ختم ہو جائے..... مگر پھر سوچتی اس میں بات ہی کیا ہے؟ آواگون کا کیا ٹھیک عجیب الٹا پلٹا سا سلسلہ ہے دنیا میں بار بار تھوڑی ریل کے دھکے یہ بھیڑ یہ سڑے لیے کھانے اور بدبو سونگھنے کو آنا نصیب ہو گا جو کچھ بھی ہے جیسا بھی ہے اسی زندگی میں دونوں ہاتھوں سے لپک لو۔

گاڑی بدلنے میں بھی ایک دنیا سے دوسری دنیا میں جانے کا لطف آ گیا کیونکہ تھرڈ کلاس والی کے لیے بیلوں کے باڑے سے بھی بدتر جگہ مشکل سے ملتی ہے اُسے پلیٹ فارم پر بستر سے لگ کر چار لیے آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے گھنٹے گذارنے پڑے سیکنڈ کلاس کے مسافر خانے میں تالا پڑا ہوا تھا اور فرسٹ میں کوئی انگریز ٹھیرا ہوا تھا سوائے اسی ایک سفید انسان کے باقی سارے کالے پیلے نیلے جانور تلے اوپر پلیٹ فارم پر بکھرے ہوئے تھے یہ پلیٹ فارم بھی ایک قسم کی گورنمنٹ ہوتی ہے جہاں چند فرسٹ کلاس انسانوں کے علاوہ ساری رعایا گودڑ ہی نظر آتی ہے حالانکہ آمدنی اسی تیسرے درجے والے سے ہوتی ہے مگر آرام کبھی کبھی مجبوراً سفر کرنے والا اول نمبری لے جاتا ہے ہر سودے والا سارا سودا اسی کے ہاتھ بیچنے پر تُل گیا منع کرتے کرتے بھی تو تھک گئی

فقیروں کے علاوہ یتیم خانوں بیوہ آشرموں اور گئو رکھشا کا پوتر کام کرنے والوں نے بھی ہڑبڑا دیا۔ وہ جب اچھی یتیم خانوں میں جاؤ تو یتیم آنکھ میں کھٹکنے کو کرائے پر بھی نہیں ملتے۔ اور بیوہ آشرم اتنے مردوں کی موجودگی میں مدناشی سے زیادہ نہیں اور ان پناہ گاہوں کی ضرورت بھی کیا ہے جب تک بیٹیوں کے لیے سڑک اور عورتوں کے لیے کوٹھے موجود ہیں ان لیے کا جھگڑا ہی میں پڑنا ہی حماقت ہے رہیں یہ گائیں تو جب بچوں کے لیے مائیں اور مٹھائی میں ڈالنے کے لیے گھی کا گھی اور سنگھاڑے کا آٹا موجود ہے تو پھر یہ گائیں کس کی چربی بڑھانے کو پالی جائیں۔

بار بار اس کی نظر ایک بچے کی طرف بہک جاتی جو بڑے غور سے کبھی ان کیلوں کو تک رہا تھا جو اس کی ٹوکری سے دل کش بیسواؤں کی طرح جھانک کر لبھا رہے تھے اور کبھی اُن کتوں کو جو بیاطرف نہایت ضروری کام سے دوڑتے پھر رہے تھے۔ بچہ نہایت چلبلا تھا اس کی بوڑھی آیا قابو میں کرنے کے لیے برابر اس سے کشتی لڑ رہی تھی۔ بار بار اس کی ممی سے ڈرا رہی تھی جو نہ جانے کس کام کو گئی ہوئی تھی مگر بچے میں بلا کی پرواز تھی بیٹھے بیٹھے اچھل کر لوٹ لگاتا اور پاس رکھی ہوئی ہر چیز کو جھنجھوڑ ڈالتا۔

"بری بات بابا" آیا کہتی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جاتا۔ مگر پھر اُس کے جسم میں روانی کی لہریں اٹھتیں پہلے ٹانگوں کو لسنر سے ٹکراتا پھر ہتھیلیاں تسموں سے چھونے لگتیں۔ سر کو کٹھپتلی کھلونے کی طرح آگے پیچھے دائیں بائیں مٹکنے لگتا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ ننھا سا جیتا جاگتا بھونچال بن جاتا۔

کیلوں کو وہ پیار بھری حسرت سے تکتا "بری بات" کی مہر نے انھیں اور بھی دل کش اور جاذب نظر بنا دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے شیریں اور لذیذ کیلوں کی پاک خواہش میں "بری بات" جیسی تلخی کہاں سے آسکتی ہے۔ وہ جانتا تھا آیا سدا کی جھوٹی ہے اور ہمیشہ اُسے ایسی ناگوار قسم کے جھانسے دیا کرتی ہے کیتنی ہی بار وہ دوڑ دوڑ کر انجن کی طرف گیا یہ کوکرتا دیوہیکل بھوت اتنی بہت سی گاڑیوں کو گھسیٹ لے جاتا ہے اُسے وہ نیا بیاہتا جوڑا بھی بہت جاذب نظر معلوم ہو رہا تھا آگے آگے دولھا اور اس کے پیچھے دوپٹے کے کونے سے بندھی ہوئی عورت۔ اگر آیا اجازت دیتی تو وہ ایک بار ذرا

اُن دو پٹے کے جھولے میں دو ایک ہینگیں لے کر دیکھتا۔ آپا نے اُسے وزن کرنے کی مشین پر بھی ہنیں کودنے دیا۔ اور صندوقوں کی قطار پر پلیٹ فارم رائٹ کرنے پر بھی معترض ہوئی۔ ہار تھک کر کبھی وہ ساکت ہو کر آنے جانے والوں کے مُنہ تکنے لگتا اور بے خبری میں اس کا مُنہ اُن کی نقل میں نئی نئی شکلیں بناتا۔

"کیلا لوگے؟" شمن نے تنہائی سے اکتا کر بچے سے پوچھا۔

"نہیں!" اُس نے چپکے سے آپا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "پرائی چیز بُری ہوتی ہے' ہیں نا آپا" وہ جوش سے بولا اور کیلوں کی طرف چبھتی ہوئی نظر ڈال کر فوراً اپنی توجہ پاس رکھے ہوئے سامان کو بکھیرنے میں لگا دی۔

کتنی ہی دیر سے کئی زرق برق مارے نوجوان گن گناتے لطیف اشارے کرتے شمن کے سامنے سے گذر رہے تھے دبی کچلی خواہشات ننگی ہو ہو کر اُن کے چہروں پر ناچ رہی تھی۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے وہ ایک دوسرے کو قطعی ناممکن العمل گالیاں دے رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر کئی برقع پوش گٹھریاں بیٹھی ان کے مفلوج دماغوں سے فٹ بال کھیل رہی تھیں پاس ہی ایک قبول صورت چنچل سی دلہن گھونگھٹ کاڑھے ان پر بم باری میں مصروف تھی۔ ایک مجروح شکل لڑکا ایک انگریزی کا کوک شاستر اس رخ سے لیے بیٹھا تھا کہ شمن کی نظر بار بار اس کے بالتصویر عنوان پر پڑتی۔ گھنٹہ بھر سے وہ اسی ایک تصویر کو حفظ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پاس بیٹھی ہوئی عورتوں کو وہ یہ تصویر نہایت انجان طریقے پر دکھاتا اور جونہی کسی سے نظر مل جاتی عجیب برہنہ سی مسکراہٹ آنکھوں میں پیدا کر کے نہال ہو جاتا۔ اسی خاموش لاسلکی پیغام کے ذریعے وہ ساری گٹھریوں سے بھی راز و نیاز میں مشغول تھا جواب بھی مل رہے تھے۔ کچھ پریشان کچھ نفرت میں ڈوبے اور کچھ حد درجہ متحیر! اس چلبلی دلہن کا مُنہ تو چھپا ہوا تھا مگر ہتھیلی سے مُنڈھی اُنگلیاں تو ڈرتی تھی۔ بچے کی معصوم آنکھیں جو کیلوں سے عشق لڑانے میں مشغول تھیں اُن نوجوانوں جیسی گستاخ اور گستاخ ہوتی جا رہی تھیں وہ جھنجھلا جھنجھلا کر پیر پٹخ رہا تھا اور غصے سے زمین پر تھوک رہا تھا کئی بار اُس نے آپا پر بھی تھوکا اور پھر اُسے چلانے کے لیے خوب ناک میں انگلیاں

گھنگھولیں سوٹ کے بٹن چوسے اور جوتے کے بند کھول ڈالے۔

من چلے نوجوانوں میں کسی بات پر کشتم کشتا شروع ہو گئی۔ گالیوں کی جدت میں ترقی ہو گئی۔ کیلوں کی ٹوکری اور کئی صراحیاں لپیٹ میں آگئیں اور بدجو ان ٹانگیں مختلف زاویہ میں پھیلنے لگیں بچے یہ ہنگامہ دیکھ کر پہلے تو ششدر رہ گیا پھر اُس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں گال سرخ ہو گئے اور چیخ چیخ کر ہنسنے لگا۔

"کیلے کیلے...... آم کیلے...... !" وہ کچلے ہوئے کیلے دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور کشتی میں حصہ لینے دوڑا مگر آیا نے اُسے پکڑ کر بستر پر بٹھا دیا۔

جب ذرا سکون ہوا اور بچہ بستر پر اندھا ہو کر لیٹ گیا تو پلیٹ فارم بھی سونا ہو گیا۔ شمن نے ڈبہ کھول کر کچھ چاکلیٹ اور بسکٹ نکالے۔

"بری بات!" بچہ بغیر بلائے ہی چلایا۔

"آیا بچے کو میرے پاس لے آؤ" شمن نے حکم دیا۔

"میم صاحب بڑا ناٹی ہے۔ اس کا ممی شاپنگ گیا۔ بولا دو کلاک سے آئے گا پن کون جانے کبھی آئے گا" جبراً آیا نے بچے کو آنے دیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" شمن نے بہت سے چاکلیٹ اس کے دونوں ہاتھوں میں کر دیئے۔

"میم صاب اکھا دن مستی کرتا...... پڑھنا کچھ نئیں...... ناٹی...... ویری ناٹی"

بچے نے چاکلیٹ کھائے نہیں بلکہ انھیں صندوق پر قطار میں جما کر تالیاں بجانے لگا۔ آیا اس کی شرارتوں کا رونا روتی رہی شمن بغور بچے کو دیکھتی رہی۔ چاکلیٹ کی ریل بنا کر زور سے ایک تھپڑ مار کر بکھیر دیا اور اپنی اس فاتحانہ تخریب پر قہقہے لگانے لگا۔

"جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو کیا بنو گے؟" شمن نے ایک بچے کا مرغوب ترین سوال بچے سے پوچھ ہی لیا۔

"ہم...... ہم سپاہی بنیں گے!" اس نے کانسٹبل کی طرف دیکھ کر کہا۔ جو تھوڑی دیر ہوئی فساد فرو کر کے مزے سے کھمبے سے پیٹھ لگائے دوسرے فساد کے انتظار میں کھڑا تھا اگر یہ فساد نہ ہوں تو دنیا کتنی سونی ہو جائے۔ پھر کانسٹبل سوائے کھمبے سے پیٹھ لگا کر

اونگھنے کے کیا کریں گے۔ اگر بچہ چاکلیٹ کی برچیاں بنا کر نہ ڈھلنے تو سوائے ایاب کی نوکری چھوڑ اور آیا پر تھوکنے کے اور کیا تھے۔ کاش ان کا نسٹبلوں اور بچوں کو بھی کچھ کام ہوتا۔
"تمہیں ممی مارتی تو نہیں"۔ نہ جانے اُسے کیوں خیال آیا کہ بچے کو پٹنے کی اشد ضرورت ہوتی ہوگی کیونکہ بار اس کا تو جی چاہا اس کے پیارے پیارے سرخ گالوں میں چٹکی بھرے اور بے اختیار اسے بھینچ ڈالے یقیناً وہ بڑا گدگدا اور گرم ہوگا۔ اس کی آغوش میں اسے جکڑنے کی ناقابل بیان تھکی ہوئی سی خواہش جاگ اٹھی۔ بچے نے ممی کے نام پر فکر مند ہو کر تیوریاں چڑھالیں۔
"وہ بڑی نانی ہے.... ممی!" بچے نے جھلا کر کہا تو اُسے ایسا معلوم ہوا وہ اس بچے کو بہت دن سے جانتی ہے اس نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہے۔ اس کے ہونٹ کتنے شگفتہ تھے۔ بعض انسان پھلوں اور مٹھائیوں سے کتنے مشابہ ہوتے ہیں! دیکھتے ہی بھنے ہوئے چنوں جیسی سوندھی سوندھی خوشبو نتھنوں میں آنے لگتی ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو تازہ انگوروں اور اناس کی قاشوں کی طرح مہکتے رہتے ہیں۔ یہ دلکش گوشت کا لطیف کھلونا جسے دیکھ کر بے اختیار تازگی کی پھانک کی طرح چکھنے کو جی چاہنے لگا۔
"ہمارے پاس بندوق ہے بستر میں لپیٹی ہوئی آپانے دیکھو گی؟" بچے نے مستعدی سے بستر پر حملہ کیا۔
"نا نہیں۔ نا نہیں بابا بیٹھنگ کیسے کر کے کھولنے کا"۔ انگلش تھپڑ لگی ہوئی آیا نے بغاوت کا
"ہم پھاڑ ڈالیں گے"۔ بچے نے آنکھیں نکالیں۔
"کیسا پھاڑے گا؟..... ممی تم کو اتنا کھ کے مارے گا کہ بس!"
"ہم ممی کو گولی سے مار دیں گے..... ٹھائیں"۔ شکست خوردہ سپاہی نے سرخ گالوں کو پھلا کر کہا۔
"چہ...... بری بات!" دشمن نے چمکار ا بچے نے اس پر بھی ایک بے اختیاری کی نگاہ ڈالی۔
"تم بھی نانی ہو..... ممی اور آیا سب نانی...... ہم سب کو ٹھائیں ٹھائیں

مار دیں گے۔ بچے کے غصے پر شمن کو پیار آ گیا۔ اتنا سا بچہ اور اتنے دشمن ... چہ چہ چہ ...... کاش یہ ٹھائیں ٹھائیں ٹھائیں مارنے کی دھمکی میں کچھ اصلیت رہے اور یہ جذبہ پروان چڑھ سکے۔

"آئی ایم سوری!" بچے کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ آنے والی خاتون کو اس نے ڈانٹ کر کہا اور غصہ اور لیاقت کا ننھا منا ریوالور پر سر ملیہ ہو کر رہ گیا۔

"ہیں! تم!" بھرے پلیٹ فارم پر دو بدحواس سہیلیاں شنٹ کیے ہوئے ریل کے ڈبوں کی طرح ایک دوسرے کی آغوش سے ٹکرا گئیں۔

"ایلما ...... تم!"

"تم کہاں جا رہی ہو" دونوں نے ایک ساتھ پوچھا

"چھٹی گذارنے، اور تم؟" شمن نے پوچھا۔

"گھر جا رہی ہوں ...... تو چلو میرے ساتھ ......"

"میرے خطوں کا جواب ...... اتنے میں ریل آ گئی اور لشتم پشتم دوڑ کر اور ایک گارڈ سے کہہ کر شمن ایلما کے ساتھ انٹر میں بیٹھ گئی۔

بچھڑی ہوئی سہیلیوں نے بالکل ننھی بچیوں کی طرح بہت سا وقت ایک دوسرے سے سوال پر سوال کرنے میں صرف کر دیا جواب سننے کی کسے مہلت تھی ایلما ناگپور جا رہی تھی شمن نے چھٹیاں وہیں گذارنے کا فیصلہ کر لیا۔ ریل میں نہ اتنی فرصت اور نہ کہانیاں اتنی مختصر کہ سنانے والا سنائے اور سننے والا جی بھر کر جی سے سنے ایلما نے بچے کے گال پر تھپڑ ملکایا، وہ کپڑے بدلتے ہوئے پریشان کر رہا تھا۔ ایک بار زور سے اس نے منہ پھاڑ کر دہاڑ نکالی اور چپ ہو گیا ایک آنسو بھی نہ نکلا سرخ انگاروں جیسی دہکتی ہوئی آنکھوں سے اس نے ایک بار نہایت گستاخ آنکھوں سے کچھ کہا شدت جذبات سے نتھنے پھڑکے، کان سرخ ہو گئے۔ مگر دودھ ابلتے ابلتے تھم گیا۔ خاموش اس نے کپڑے اتروائے گویا کوئی اس کی کھال اتار رہا ہو۔ شاید کھال اتارتے میں بھی اتنی شدت سے

جذبات نہ دُکھتے ہوں گے۔

"ہمیں بھوک لگی ہے،" بچے نے ڈانٹ بتائی۔

"آپا بسکٹ دے دو۔"

"ہم بسکٹ پھینک دیں گے، چاول کھائیں گے۔" دانت کچکچا کر ایلما نے پھر تھپڑ اٹھایا۔ مگر شمن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں مارتی ہو؟"

"تم...... تم نہیں جانتیں...........۔" ایلما کا گلا گھٹ گیا اور وہ پیٹے ہوئے بچے کی طرح بسورنے لگی۔ شمن نے کچھ نہ کہا۔ خاموش سر موڑے کچھ سوچتی رہی اور دل میں فراٹے بھرتی رہی!

۳۵

"تم کہتی ہو میں اُسے کیوں مارتی ہوں؟" ایلما نے سونے سے پہلے اپنے مختصر کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ بچہ آیا کے پاس سوتا تھا گھر صاف ستھرا تھا مگر نہ جانے کیوں قید خانے کا سا حبس تھا کمرے کچھ پرانے اور برسوں سے بند پڑے تھے۔

"میں اسے مار ڈالنا چاہتی ہوں...... جانتی ہو میں نے اُسے ختم کر دینے کی پوری کوشش کی۔ اسے پھینکنے کی کوشش میں اپنے آپ کو کئی بار موت کے کنویں میں دھکیل دیا مگر میری تندرستی سخت جانی بن کر آڑے آگئی میں نے ایک گھناؤنے مرض کی طرح اُسے شکم میں برداشت کیا ہر لحظہ میں نے اس کے وجود پر پھٹکار دی اور بدبختی کی قے سمجھ کر جنم دیا" وہ بڑے جوش سے بکتی رہی۔ اس کی آنکھیں اب بھی اتنی ہی دہکتی ہوئی اور سیاہ تھیں مگر ان پر ہلکا سا تکان کا پردہ پڑا تھا جو بہت غور سے کبھی کبھی ایک جھلک سی دکھا جاتا تھا جسم ذرا بھاری ہو گیا تھا اور چہرے جیسے کھنچی ہوئی مگر بھدی پڑ گئی تھی وہ سبک شاخ گل اب پھل اتری ڈالی ہو گئی تھی۔ وہ بے رونقی کے دھندلے نقوش جو مٹ کر بھی لکیریں چھوڑ جاتے ہیں پھر بھی اس کا دماغ ابھی کنوارا تھا اور کنوارا رہنا چاہتا تھا گو جسم ماں بن چکا تھا۔

"میں نے اس نخمہ ہر کے پودے کو سینچنے سے انکار کر دیا۔ مگر دودھ کی زیادتی سے اندیشہ پیدا ہو گیا اور جبراً...... اوہ......" وہ سہم کر شمن کے بالکل قریب آ بیٹھی جیسے اس کی آغوش میں پناہ لینا چاہتی ہو۔ "یقین مانو شمن میں نے زرک کے ڈکھ بھوگ لیے جیسے سانپ کو چھاتی سے لگا لیا کہتے ہیں کہ جب بچے کے پُر ہونٹ ماں کے جسم کو چھوتے ہیں تو سور گ کی اپسرائیں رشک کی آگ میں جل مرتی ہیں کہ وہ ماں نہیں بن سکتیں...... مگر شمن لوگ بڑے جھوٹے ہیں جیسے اس سپولیے کے پیٹ کی آگ میں نے بجھائی میں ہی جانتی ہوں جتنے دن یہ میرا خون چوستا رہا میری آتما جنم میں تھوکتی رہی۔

"اتنی پریشان نہ ہو پگلی!" شمن نے پیار سے اُسے پاس گھسیٹ لیا۔

"تم نہیں جانتیں....... اوہ تم نہیں جانتیں!"

"ایلما تم اتنی پریشان ہو....... کیا یہ سب کچھ اس لیے کہ وہ ناجائز ہے؟"

"حشمت علی! اگر سبتل کا بچہ دیوتاؤں کے اپنے ہردے کی جلائی ہوئی آگ سے بھی پوتر ہو کر آتا تب بھی مجھے سُولی جیسا دکھ دیتا....... کوئی منتر کوئی پوجا اسے پاک نہیں کر سکتی....... جب میرا ضمیر ایک چھوا کن جسم سے چوٹ کھا گیا تو......."

"مگر اس میں اس معصوم کا کیا قصور ہے؟"

"قصور؟...... ہنہ تم نے دیکھا نہیں، یہ وہی ہے!" وہ اور خوف زدہ ہو گئی "وہی بالکل وہی سانپ!" اور حشمت کو یاد آیا کہ بچے کو دیکھ کر جو اُسے دھوکا ہوا تھا کہ وہ اُسے کہیں دیکھ چکی ہے وہ وہم نہیں تھا۔ بچہ بالکل چھوٹا سا سبتل تھا وہی تنومند جسم اور مستانہ چال وہی زندہ دلی اور جوش! تو پھر ایلما حق بجانب تھی۔ قدرت اُسے چڑا رہی تھی۔ اگر بچہ ایلما سے مشابہ ہوتا تو شاید خود دیوتی آڑے آ جاتی۔ مگر وہی شخص جو ہمیشہ اس کی نفرت کی آماجگاہ بنا رہا بغیر اختیاری طور پر ایسا چھا یا کہ اُس کے خون میں بھی رچ گیا محبت اور نفرت اپنی بلندی پر پہنچ کر ایسی صورت اختیار کر لیتی ہیں کہ انھیں پہچاننا مشکل ہے دیوتا اور شیطان دونوں کی پرستش ایک نکتے پر جا کر ٹک جاتی ہے۔ کتنا باریک ہے یہ نکتہ کہ تخیل کی نگاہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔

"لیکن ایلما، تم تو بڑی ترقی پسند ہو اور اگر سماج ایک ایسے بچے کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے تو تم اُسے ظالم کہو گی؟"

"سماج ایسے بچے کو صرف اس لیے برا سمجھتا ہے کہ وہ بیاہ کے منتروں کے چھینٹوں میں نہائے بغیر دنیا میں آ جاتا ہے اور میں......."

"نہیں...... سوسائٹی کی اجازت بغیر دنیا میں آ جاتا ہے...... تمہیں ردّ کی سے اس لیے نفرت ہے کہ وہ تمہارے حکم بغیر دنیا میں آیا۔ اسی طرح سوسائٹی کو بھی......."

"مگر کیوں؟ سوسائٹی کو کیا مطلب؟"

"اس لیے کہ ایسے انسانوں کی تعداد دنیا میں نہ بڑھے جو بن داشت کے ہوں......"

تم جانتی ہو عورت ہی تنہا ذمہ دار رہ جاتی ہے۔ باپ کے منہ پر کوئی مہر نہیں پڑتی..... اب ذرا سوچو اگر شادی کا اسٹامپ نہ لکھا جائے تو عورت جس کی اقتصادی حیثیت صفر کے برابر ہے کیا کرے.....؟"

"ہوں تو تمہاری رائے میں ناجائز بچے صرف مالی مشکلات کی وجہ سے دوبھر معلوم ہوتے ہیں؟"

"اور کیا تم سوچو ایک ماں قدرت کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق آنے والے بچے سے کیوں نہ محبت کرے؟ کیا وہ اس کے جسم کا ایک ٹکڑا نہیں۔ دینے والے نے نعمت دی اور لینے والے نے پائی پھر باپ کیوں ڈرے اور ماں کیوں گھبرائے؟ صرف اس لیے کہ اس کا پالنا پوسنا دوبھر ہے"

"اور شادی کے بعد؟"

"تب مرد اسے اپنا فرض سمجھ کر برداشت کر لیتا ہے۔"

"سوسائٹی کا باندھا ہوا فرض۔"

"ہاں..... مگر اس کا اب وہ اس درجے تک عادی ہو چکا ہے کہ اس بار کو اپنا سمجھتا ہے۔ لفظ "اپنا" اس کی خود پرستی کے جذبے کو تسکین دینے کے لیے کافی ہے۔"

"اور ناجائز کو اپنا نہیں سمجھتا؟"

"مجبور نہیں..... قانوناً بھی تو وہ اس کا نہیں..... قانون کے بغیر اس کی ماں بھی غیر ہے"

"لیکن ماں؟ ماں کیوں نفرت کرے؟"

"کیونکہ وہ کوئی کمانے والا ساتھ نہیں لاتا۔ اس کی پرورش کا بار اس کی زندگی کے پیروں میں بیڑی بن کر الجھ جاتا ہے۔"

"وحشت یہ سب واہیات ہے۔ مائیں ایسے بچوں کو صرف ایک جرم تصور کر دینا چاہتی ہیں کہ وہ اس کے لانے والے سے نفرت کرتی ہیں اس نفرت کا انتقام وہ اس کی گردن مروڑ کر لیتی ہیں"

"توبہ توبہ میں تو ایسی عورت کو حیوان سمجھتی ہوں!"

"تم بے وقوف ہو..... حیوان اتنے بے رحم نہیں ہوتے اور نہ بے وقوف ان کے یہاں نہ بھی ڈولیاں پڑیں اور نہ بیاہ رچے..... سنا ہے تم نے کسی گدھے کو سہرا باندھے..؟"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ سیاہ بادل چھٹ گئے۔

"ایلما تم بھی اسٹرین ہی ہو...... وہ کسی کا ہو، ہے تو اتنا پیارا!"

"خاک! دماغ تو ہے ہی نہیں بس جیسے گوشت کا ڈھیر۔ میں تو اس کی پڑھائی کی طرف بھی نہیں دیکھتی نہ جانے کیا جھک مار کر آتا ہے۔

"کیا ارادہ ہے تمہارا اس کے مستقبل کے بارے میں؟"

"میرا ارادہ......" اس کی آنکھوں میں پھر آگ سلگی۔

ایک فلک شگاف چیخ بچے کے کمرے سے آئی اور پھر پے در پے آوازوں سے سنسان گھر گونج اٹھا۔ دونوں لپکیں، ایلما آگے اور شمن پیچھے!

"نہیں...... نانیں......" بچہ مسہری پر اوندھا لیٹا ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ تیزی سے ایلما نے اسے اٹھا لیا۔ تھوڑی دیر کو شمن کو شبہ ہوا کہ اس کی آنکھیں نرم نرم روشنی سے چمکیں۔ مگر فوراً ہی ایک درد ناک چیخ مار کر اس کے بازوؤں سے پھسل پڑا۔

"آئی ایم سوری...... سوری......" وہ ہیبت زدہ ہو کر چلانے لگا۔ ایک ہلکی سی پریشانی ایلما کے چہرے پر آئی اور غائب ہو گئی۔

"چپ...... خاموش...... چپ" اس نے تھپڑوں کی بارش کر دی اور اس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا اگر شمن اور آیا اسے دھکیل کر کمرے سے نہ لے جاتیں۔ شدتِ جذبات سے وہ دیر تک لرزا کی۔ معلوم ہوتا تھا ایک بچے سے نہیں کسی دیو سے کشتی لڑ کر آ رہی ہے۔

"میں ایک دن اسے ختم کر دوں گی...... میں موت سے نہیں ڈرتی مگر یہ عمر قید...... میری زندگی...... جھلائی ہوئی شیرنی کی طرح وہ بل کھا کھا کر مختصر سے کمرے میں ڈگ بھرنے لگی۔ بگڑ بگڑ کر وہ اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں جکڑ لیتی اور پھر خود ہی اس گرفت سے زور آزمائی شروع کر دیتی۔ معلوم ہوتا اس کے دماغ کے گرد بھی کسی نے جال بُن دیا ہے۔ ایسے کہ جتنا جتنا وہ زور لگاتی ہے بندش کستی ہی جاتی ہے

"مگر اس بچے کا......؟"

"یہ بچہ نہیں ہے......" اس نے بلند آواز سے کہا...... "یہ وہ خود ہے...... مجھے آزار پہنچانے اور تباہ کرنے کے لیے وہ خود جنم لے کر آیا ہے۔ اس نے اتنی ہی ذلت کو کافی نہ سمجھا

اور مجھے ایڑی تلے مسلنے......"

"تم پاگل ہو گئی ہو تم اس کی ماں ہو"

"نہیں، میں اس کی ماں نہیں۔ اگر جنم دینے سے ماں ہو جاتی ہے تو...لو... ہرگز نہیں اگر چنبیلی کی بیل سے تھوہر کا پودا لپٹ جائے تو تم اسے بھی تھوہر کہنے لگو گی؟ اگر اس گلدان میں کہیں سے سانپ گھس آئے تو وہ بانبی بن جائے گا؟......"

اس نے آتش دان پر رکھے ہوئے گلدان کو دونوں ہتھیلیوں سے بھینچا۔ "تم نہیں سمجھ سکتیں میرے دکھ کو" وہ زور سے مڑی اور گلدان ایک غمگین چھناکے سے زمین پر آ رہا۔ ایلما وحشت زدہ ہو کر ان پریشان کیڑوں کو دیکھنے لگی جو اس میں سے نکل کر چاروں طرف کونوں میں پناہ لینے بھاگ گئے۔

"نہیں، نہیں یہ نہ ہو گا۔ یہ نہیں ہو سکتا...... یہ کبھی نہیں ہو سکتا" اس کی حالت بالکل دیوانوں جیسی ہو گئی اور گھبرا کر گلدان کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے لگی شمن کو اس سے ڈر معلوم ہونے لگا۔ اس نے چاہا اسے گھسیٹ کر پلنگ پر بٹھائے مگر وہ بگڑ گئی۔

"اس طرح ریزہ ریزہ ہونے سے پہلے میں اسے خاک میں روند کر پھینک دوں گی" آہستہ آہستہ دانت پیس کر اس نے کہا۔ اس کی شکل بالکل مکار چڑیلوں جیسی ہو گئی شمن کو اس سے کراہت آنے لگی

"تم بن رہی ہو ایلما!" اس نے حقارت سے کہا۔

"ایں؟" وہ غصے سے مڑی۔

"ہاں، تمہیں ایکٹنگ میں مزا آ رہا ہے، تم جھوٹ بولتی ہو"

"نسیمن!"

"بس اترا ؤ مت، مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم اور میرے سامنے اتنی عجیب باتیں کرو گی۔ تمہیں اپنے بچے سے محبت ہے اور مجھے الّو بنا رہی ہو"

"کیا؟...... محبت؟ ایلما بپھری۔

"مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔ اتنی سی دیر میں مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا تمہیں روولف سے شدید محبت ہے۔ مگر اسے جھوٹی نفرت کے بھیانک روپ میں لپیٹ کر دکھانا چاہتی ہو"

"تم!"

"چپ رہو، میں تمہیں اتنا کم ہمّت نہ سمجھتی تھی، افسوس تم نے میرے سارے حسین خوابوں کو آج اس گلدان کے ریزوں کے ساتھ چکنا چور کر دیا۔ تم بزدل اور دھوکے باز بڑی روشن خیال ہو، ناجائز کو جائز کہہ تو دیا لیکن تخیل کے بنائے ہوئے ڈھکوسلے کی آڑ لینے لگیں مجھ سے جھوٹ بول بول کر اپنی عزّت اور رحم نہ کرو۔ سچ بتاؤ تم نے اپنی ماتا کو ہوا نہیں بنا ڈالا۔ بڑی آئیڈیل والی بنتی ہو۔ مگر یہ تمہارا آئیڈیل تمہارا...... تمہارا ضمیر تمہاری ذہانت تمہاری ماتا کے آگے مات کھا رہے ہیں یہ جھوٹ ہے کہ تمہیں کبھی بھی سیتل سے نفرت تھی!"

"شمشاد......"

"بکو مت تم اس کی پرستار تھیں...... لیکن تمہاری خود پرستی نے کبھی تمہیں اقبال نہ کرنے دیا۔ تمہارا یہ فلسفہ بالکل بے بنیاد اور پوچ ہے کہ جسم اور روح جدا جدا ہیں...... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سیتل کو تمہارے جسم نے چاہا اور روح نے نفرت کی۔ پگلی دل و دماغ دھوکا کھا سکتے ہیں مگر جسم دھوکے میں نہیں رہتا، وہ وقت آنے پر سچ بول دیتا ہے۔ مگر تم نہیں مانتیں کہ تم سیتل سے محبت کرتی تھیں۔ اور اب بھی تمہاری آتما اس کی خواہش میں تمہیں یہ سزا دے رہی ہے کیونکہ وہ تمہیں نہیں ملتا اس لیے اس فراق کی جلن تم اس کے بچے سے انتقام لے کر بجھانا چاہتی ہو اور یہ بھولنا چاہتی ہو کہ یہ تمہارا بھی ہے۔ ارے دیوانی ذرا غور تو کر اس طاقت کے مظاہرے میں کتنی کمزوریاں پوشیدہ ہیں۔"

"مجھے کسی کا ڈر تھا جو محبت کو چھپاتی؟" ایلما کی آواز شکست خوردہ ہو کر بھرّا گئی۔

"خود اپنا، ایلما جتنا تم اپنے آپ سے ڈرتی ہو کسی سے نہیں ڈرتیں۔ تم کو خود اپنے سامنے سچ بولنے کی ہمّت نہیں۔ اس کے علاوہ تمہاری ایک اور زبردست کمزوری ہے جسے تم کبھی تسلیم نہ کرو گی...... تم ویسے بڑی مضبوط بنتی ہو مگر...... تم سماج سے بھی ڈرتی ہو۔"

"یہ نہ تم کہو اور دنیا مان لے۔" ایلما نے وثوق سے کہا

"تم جھوٹ بہت بولنے لگی ہو زندگی کو جنتر منتر بنا رکھا ہے۔ سچ بتاؤ تم نے بچے کا کیا نام لکھایا ہے اسکول میں؟"

"روکف..... کیوں پوچھا تم نے؟"

"نہیں پورا نام بتاؤ۔"

"کیا کرو گی؟" ایلما کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"دیکھا باپ کے نام پر کھسیا گئیں!"

"مطلب کیا ہے؟ یہ میری نجی باتیں ہیں!"

"بالکل، اور مجھے دخل دینے کا کیا حق؟..... معافی چاہتی ہوں اب کچھ نہ کہوں گی۔"

"اس کا باپ اس لائق نہ تھا..... دوسرے....."

"دوسرے تمہارے پاس اُس کے نام کا سرٹیفکیٹ بھی تو نہیں تھا۔"

"ہاں!" ایلما کچھ خوفزدہ سی خاموش ہو گئی۔

"بس اسی کا سارا غصہ ہے۔ آ گئیں نا اپنی اصلیت پر۔ دیکھا اپنے آئیڈیل کا حشر؟"

تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی جس میں دو بے چین سہیلیوں کی تھکی ہوئی سانسیں گونج گئیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا دونوں تھک گئی ہیں۔ باہر دریچے میں سے چاند ایک بادل کے نیچے سے گھسٹ گھسٹ کر نکل رہا تھا اور ہوا ٹہنیوں میں سرسرا رہی تھی۔ رات کافی گذر چکی تھی۔ صرف دور بہت دور جنگلی سیاہ خواب آلودہ قہقہے لگا رہے تھے۔

"ہم ہمیشہ سے بزدل تھیں جبھی تو ہر ایک پر غرا کر جھپٹ پڑتی تھیں اور بچے کے متعلق جو تمہارے خیالات ہیں یہ کچھ نہیں سوائے تمہاری مفلوج ماستا کے انتقام کے تم اس جذبے سے زور آزمائی نہ کرو، بری طرح شکست کھاؤ گی۔"

پلنگ پر خاموش بیٹھی ایلما اپنے ہاتھوں سے کشتی لڑتی رہی۔ اس کے تھکے ہوئے چہرے پر کرب اور رلا چادر طاری ہو گئی۔ سادھو کی چھپی گیانی آنکھیں بسورتے ہوئے بچوں کی طرح رو پڑیں۔ سیاہ چھتے ہوئے گالوں پر سے لمبے لمبے خاموش آنسو جھلملاتی ندیوں کی طرح بہنے لگے عضلات کی کھینچ تان سے اُس کا بالائی ہونٹ دانتوں پر سے سرک گیا وہ اب بھی اتنے ہی دھار دار تھے مگر زہریلے نہیں!

"اس وہم کو دماغ سے نکال دو۔" ایلما کا سر تکیے سے لگا کر اُس نے کہنا شروع کیا....."

پاس ہیں شرم کی کیا بات ہے۔ روولف کتنا پیارا بچہ ہے میں تو کبھی سوچتی بھی نہیں کہ اس کی تخلیق میں کچھ سبتل کا بھی حصہ ہے مجھے تو وہ میری پیاری ایلما کا ننا منا کھلونا معلوم ہوتا ہے سنو ایلما۔"

مگر ایلما سننے والی دُنیا سے بہت دور گہری نیند میں غرق تھی شمن کی لوری نے اس کی برسوں کی اُچاٹ نیند کو بلا لیا اور وہ معصوم بچے کی طرح ایک ہی جھپکی میں غافل ہو گئی۔ مگر شمن کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ آہستہ سے اُس نے ایلما کے سر سیدھے کیے اور خود بھی جا کر دیوان پر لیٹ رہی۔ خیالات کے گھوڑے لگامیں تڑا کر بھاگ نکلے۔

ایک ہی بچے نے ایلما کو بوڑھا کر دیا تھا۔ ایک ہی پودے کی سینچائی میں وہ سب کچھ لٹا بیٹھی تھی، کمر کے وہ خم، جسم کا وہ ٹھوس پن مرجھا چکا تھا۔ شمن نے اپنے جسم پر نظر ڈالی مہکتے ہوئے تیار انگوروں کی تیز خوشبو اس کے نتھنوں میں بھر گئی۔ اور اُسے وہ انگور یاد آ گیا جو بہت دن ہوئے ایلما نے اس کے گال پر کھینچ مارا تھا تو اس کا سارا منہ نہا گیا تھا۔ اور ایلما! اُس نے گردن گھما کر دیکھا، جیسے چوسی ہوئی گٹھلی! اُس نے اپنی کیا گت بنائی تھی! دو چار انگڑائیاں لے کر اُس نے سونے کی کوشش کی مگر پکے انگوروں کی خوشبو نے اُسے بے چین رکھا۔

اُسے سبتل کا خیال آیا جب وہ پکنک میں سوکھی ہوئی پتیوں پر لیٹا رہا تھا اور پھر اُس نے ایلما کے مرجھائے ہوئے گالوں کو دیکھا۔ اس کا جی دکھ گیا۔ چاہا چپکے سے اٹھ کر ان شبنم میں ڈوبے اُداس گالوں کو چوم لے سوتے میں وہ ایلما کس قدر بھاتی ہوئی ایلما ہر وقت بھتنی کی طرح پیچھے لیے سوار رہتی تھی کتنی معصوم لگ رہی تھی۔ ابروؤں کا طنز آمیز کھنچاؤ ڈھیلا پڑ گیا تھا اور بجائے انوار کی دیوداسی کے وہ بالکل معمولی عورت لگ رہی تھی اس کا سیدھا سادا سینہ معصوم ممتا سے دھڑک رہا تھا شاید وہ خواب میں اس بچے کو چوم رہی تھی جس پر بیداری میں خود اس نے اپنے وہم کا پاسبان بٹھا رکھا تھا۔

صبح اٹھ کر شمن نے روولف سے دوستی شروع کر دی۔ بچہ بلا کا ذہین تھا اور شاید ایلما کو جلانے کے لیے اُس نے سبتل کی ذہانت چرائی تھی۔ بات کہتے میں وہ بالکل اس کی طرح

بھویں چڑھا کر گہری گہری آنکھوں سے دیکھنے لگتا۔ ماں کا ٹھکرایا ہوا بچہ شمن سے پورے جوش سے لپٹ پڑا۔ ایلما کی طرح وہ بھی جھکی تھا۔ اور جس بات کے پیچھے پڑ جاتا عاجز کر دیتا ایلما خاموش کن انکھیوں سے اُسے دیکھتی مگر محبت جتاتے ایسی شرماتی جیسے بھرے بازار میں ننگی ہو گئی ہو۔ چار سال کی دبی ہوئی کونپل زرد اور بے جان ہو چکی تھی۔

آہستہ آہستہ شرم بھی ٹوٹی۔ بچہ پہلے پہلے اعتبار ی سے بھڑکا او رغصے ہوا پھر منتجم ہو کر مانوس ہو گیا۔ ندی کا بند ٹوٹ چکا تھا۔ اُمڈے ہوئے طوفان کو جیسے برسوں کی اُدک نے اور بھی شہ زور بنا دیا ہو روکنا آسان کام نہیں۔ دن بھر ایلما کی آنکھیں چھپے چوری رولف کے پیچھے بھاگتیں اور ذرا دور جاتا تو اس کی تلاش میں بھٹکنے لگتیں۔

جب شمن دو دن چھٹیوں کے علاوہ رہ کر چلنے لگی تو ایلما اس سے لپٹ کر رو دی وہ بڑی نرم دل ہو چلی تھی۔ ندی کا دھارا جب خشک زمین پر پورے زور سے گرتا ہے تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکھیر دیتا ہے۔ ایلما کی پیاسی مامتا پر بھی یہ محبت کا دھارا اس شان سے گرا کہ کنواں بن گیا۔ اور وہ اُس کی گہرائیوں میں ڈبکیاں لگانے لگی۔ ماں بیٹے اسٹیشن تک اُسے الوداع کہنے آئے۔ جب ریل چل دی تو شمن نے اطمینان سے سانس بھری۔ وہ خوش تھی اُس نے دو روٹھے ہوئے بچوں کا میل کرا دیا تھا۔

۳۶

گرمی شباب پر تھی معلوم ہوتا تھا سورج گھومتے گھومتے راستہ بھول کر قریب آتا جا رہا ہے دنیا چکرائی جا رہی ہے۔ جرمنی نے فرانس کو بھون کر رکھ دیا۔ صدیوں سے آزادی کا جھنڈا لے کر بڑھنے والی حسینہ کان میں کوڑی ڈال کر جھک گئی۔ ادب اور فن کی دیوی پر نازی عقاب پنجہ پھیلا کر ٹوٹ پڑا۔ یہ کیسی مجنونانہ تھی کہ الٹی اپنے پیروں میں بیڑی بن کر الجھ گئی وہ تکیہ جس سے پیٹھ لگائے مزے سے لیٹے تھے الٹا دم گھوٹنے لگا۔ غلام فرانس کو نازی چنگل سے سکتا چھڑا کر آزاد فرانس انگلستان میں جا بیٹھا جتنے ملک نازیوں کے پنجے کے نیچے دبتے گئے اُن کے آزاد دماغ انگلستان میں جمع ہوتے گئے کیا ہی اچھا ہو جو یہ فرزند دلبند دولت انگلشیہ ہندستان بھی ایک بار اس جان چھڑکنے والی ماں کی گود سے چھوٹ کر آزادی کی انگڑائی لے سکے اور اس کے کسی کونے میں آزاد ہندستان پیدا ہو جائے۔

اسکول کے رہٹ سے جا جر آ کر اس نے کلب جانا شروع کر دیا مگر وہاں بھی جی کچھ اکھڑا سا رہتا۔ یہ کون قلب نہ جانے کہاں جا کر سو رہا تھا۔ عمر اونگھتی کھیلتی چلی جا رہی تھی اُسی زمانے میں اس کی ملاقات منصور صاحب سے ہو گئی۔ منصور کھاتے پیتے رئیس تھے۔ مگر دل میں قوم کا درد بھرا تھا۔ کھدر پہنتے تھے اور شہر میں کئی کھدر کی دکانیں تھیں۔

اُن کے ساتھ کچھ گاؤں سدھار کے سلسلے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ پُر لطف پکنک کا مزا آ گیا۔ زمیندار صاحب خود ترقی پسند تھے اور منصور کے پکے دوست گو شکار کی دھت دیوانگی کی حد تک پہونچی ہوئی تھی۔ گاؤں والے متحیر آنکھیں پھاڑے اپنے مکتی دلانے والوں کو جوق در جوق دیکھنے آنے لگے۔ مارے عقیدت کے بدحواس ہو گئے تھے۔ جیسے انھیں یقین نہ آ رہا ہو کہ سدھار بھی کوئی چیز ہے اس کی ضرورت انھیں کسی طرح محسوس ہی نہ ہوتی تھی۔ جیسے سانپ کی کچھ ایسی عادت پڑ چکی تھی کہ احساس بھی سُن ہو گیا تھا۔ یہ کسان جن کی دولت ہل ہے اور بیل، جو دھرتی کا سینہ چیر کر اناج نکالتے آئے ہیں اپنے پیٹوں کے لیے نہیں ملک والوں کا پیٹ بھرنے کے لیے یہ تو بس ہونے کے قائل ہیں اور دیوتاؤں کو خوش

دیکھنے ہی میں لگتی ہے۔

لیکن یہ بھولے بھالے گنوار بھی عجیب خصلت رکھتے ہیں یا یہ بہت جلد ایک مالک سے اکتا جاتے ہیں اور جب ایک رخ سے ناک رگڑتے رگڑتے گھس جاتی ہے تو سانس لینے کو دوسرے دیوتا کے آگے دوسرے رخ سے ناک گھسنے لگتے ہیں تبھی تو ان کی ناکوں میں اتنی گھر ملی دھار ہے۔ انہیں رتی بھر بھی تو احساس نہیں کہ جرمن بھٹے کا جگر کھودا تو کیا، جم کا لپتے رہنے کی عادت نے انہیں بالکل نڈر بنا دیا ہے انہیں ذرا بھی تو نہیں معلوم کہ جرمنو نے انگلستان پر بم باری شروع کر دی ہے۔ یہ کچھ چین کے عادی نازک طبع کیسے جھیلیں گے اس آگ کی بارش کو؟ کیا حال ہوگا ان کا جب انہیں معلوم ہوگا کہ دنیا میں آرام دہ کمرے ہی نہیں سورج کی تپش برف کی ٹھنڈک اور ہوا کے بگولے بھی رہتے ہیں۔

مگر یہ ننگے بھوکے فقیر کسی کے نہیں، ہندوستان کی دولت اور دولت مند فتح کیے جا سکتے ہیں۔ مگر اس کے سسکتے ہوئے گداگر اور ان کے خاموش منتفر دل کوئی نہیں جیت سکتا۔

شام کو سرکار کی طرف سے سارے گاؤں کو سرکار کی جیت کی دعائیں مانگنے کا حکم ملا مندروں میں گھڑیال جھنجھنا اٹھے اور مسجدوں میں اذانیں گونجیں مگر ان مردہ دل کسانوں کے دل خاموش رہے وہ کبھی کے دشمن کو کوسیں جو خود اپنے دشمنوں کی درازیِ عمر کی دعائیں مانگتے آئے ہوں۔ رات کا کھانا پُر لطف رہا۔ زمیندار صاحب نے شکار کھلوا لیا تھا اور تازہ گھی لگی روٹیاں موجود تھیں رات گئے تک گراموفون بجتا رہا اور صبح ہوتے ہی واپس لوٹ آئے پہلی قسط قوم سدھار کی پُری نہ رہی۔

تنہائی نے اخبار کو رفیق بنا دیا۔ ویسے اخبار ہو بھی تو گئے تھے دلچسپ۔ یورپ میں جو اکھاڑ جمنا جا رہا تھا اس کے بارے میں چھوٹی سی خبر بھی ہلچل مچا دیتی جرمنی کے لمبے چوڑے دہانے میں ملک پر ملک پھسلتے جا رہے تھے۔ سرکار کی گلابی افشاں پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے ہٹلر کی ہوس بڑھتی جا رہی تھی۔ دنیا کی بہی خواہ سرکار گھبرا چلی تھی اتنے برسوں میں جو کچھ کیا دھرا تھا اس پر پانی پھرتا نظر آ رہا تھا کسی کا بھروسہ نہیں۔ یہی جرمنی جس سے

بیس بائیس سال پہلے حق پرستوں نے ناک گردوانی تھی آج مست ہاتھی کی طرح روندتا چلا آرہا تھا۔ سہ ماہی امتحان سر پر آ گئے۔ نہ جانے یہ امتحانوں کا سلسلہ کس نے شروع کیا۔ طالب علم اور ممتحن دونوں کو بندھی مار دینے کا آسان طریقہ اور کچھ نہیں بس پندرہ بیس دن کی پڑھائی اور کاغذ کی ڈھیریوں کا ستیاناس لگ جاتا ہے۔ کیل بلو بچے کچھ نہ کچھ لکھنا ان کا فرض اور اس پر نمبر دینا ممتحن کا کام، نہ جانے ان نمبروں کی لین دین کا مقصد کیا ہے۔

امتحان کے کمرے میں چکر لگاتے لگاتے پھر سوچ گئے۔ اسے پانی پلاؤ تو اسے سیاہی لا کر دو۔ ایک قلم بھول آئی تو دوسری کا نب ٹیڑھا ہو گیا سارے وقت مسطر چاتو چاہئے ادھر سے ادھر بھاد۔ یہ مارنگا مانگنے کی عادت بھی خوب ہے تعجب ہے لوگ قلم دوات کاغذ پنسل کے ساتھ ساتھ آنکھ کان ناک ادھار نہیں مانگ لیتے۔

دسمبر کی چھٹیوں میں گھر جانے کا فیصلہ کر لیا شام کو اپنا سامان درست کر کے آرام کرسی پر جماہیاں لینے بیٹھ گئی کہ کب شام ہو اور کب چڑیا بسیرا لینے اڑ جائے۔ اس دفعہ گھر کی یاد کچھ زیادہ ستا رہی تھی۔ پورا سال گذر گیا تھا۔ نہ جانے گھر کا کیا حال ہوگا، اماں کے کتنے دانت اور ٹوٹ گئے ہوں گے؟ مصنوعی لگ جائیں تو چھٹی ہو۔ منجھو بی کے کتنے بچے ہوں گے کوئی؟ چھٹا تو شاید لڑکا تھا یا لڑکی..... چار سال کی بات ہے کیسے یاد اور نہ جانے اتنے دن میں تعداد کہاں سے کہاں پہنچی ہو۔ منجھو تھی بھی تو بلا کی زرخیز۔ جھلی نے کتنے جتن کر ڈالے جب ہے کا بچہ بھی نہ جی سکی۔ اب تو اس کا میاں بھی سوکھ کر کانٹا بن گیا ہے۔ بھاوجیں بھی کسی سے کم نہیں میاں سے گھڑی بھر کو نہیں بنتی پر بچوں کا سلسلہ ذرا دیر کو نہیں رکتا! خیر آج کل تو بچوں کی ضرورت بھی ہے جنگ کا زمانہ ہے لڑکے سپاہی بن کر گھایل تیار کریں گے اور لڑکیاں ان گھایلوں کی مرہم پٹی کریں گی۔ نہ جانے اس توڑ پھوڑ اور مرمت میں کیا لطف آتا ہے انسان کو۔

چپراسی نے ایک تار لا کر دیا۔ اور شمن کے خیالات منتشر ہو گئے۔

"آن ملو افتخار"

بے اختیار دل دھڑکا۔ دو لفظوں نے دفتر کے دفتر کھول کر سامنے بکھیر دیے۔

کئی بار پڑھا کہ کوئی لکیر کوئی نقطہ نظر انداز تو نہیں کر دیا جی جل گیا پیاسے کے منہ پر چھینٹا اور وہ بھی اس بخل کے ساتھ کہ اور پیاس بھڑک اٹھی۔ اسی شام کو وہ بھوالی روانہ ہو گئی۔

وہ کہاں جا رہی ہے؟ یہ وہ بہت جلد بھول گئی پتنگ کی ڈور کھنچ رہی ہے اور قدرت کے ہاتھ کی ٹھمکیوں پر لہراتی وہ چرخی سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے چھپی ہوئی آرزوئیں اور بندھے ہوئے خواب رسیاں تڑا کر طرارے بھرنے لگے۔ ان چند سالوں کی خشک زندگی نے اس کے جذبات پر کاروباری سیمنٹ کی ایک تہ چڑھا دی تھی۔ سوائے سادہ کھدی ساری اور بدوضع جمپر کے اس نے لباس بھی تو کوئی نہیں رکھا تھا۔ لڑکیوں کی اخلاقی حالت کو برقرار رکھنے کے لیے وہ فیشن سے پرہیز کرنے لگی تھی۔ اس کی زندگی مسلسل اداسی اور خشکی میں دب گئی تھی۔ مگر آج اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سیمنٹ کی تہہ کو توڑ کر ایک دبا دبایا کلہ سر اٹھا رہا تھا مرجھائی ہوئی زرد زرد کونپل ایک نئی حرارت کے احساس سے چونک رہی تھی۔

گذشتہ چند ماہ میں اس نے افتخار کو کچھ رقم اور گرم کپڑے بھیجے تھے کچھ طاقت کی دوائیں جن کا ذکر اس کے خط میں بے خیالی سے کر دیا گیا تھا اور اپنے ہاتھ کا بنا ہوا سوئیٹر تو حال ہی میں بھیجا تھا۔ اسے وہ وقت یاد تھا جب افتخار کی کھانسی کے دھماکے اس کے دماغ میں گونج اٹھے تھے اس کے مرجھائے ہوئے جسم کو گرم کرنے کے لیے اگر ممکن ہوتا تو وہ اپنی کھال اتار کر دے دیتی۔ اب تو ایک جسم کا خون دوسرے جسم میں آسانی سے پہنچایا جا سکتا ہے اس نے طے کر لیا کہ اس مرتبہ وہ پوری کوشش کرے گی کہ تھوڑا سا اپنا خون اس کے جسم میں پہنچا دے اور آنکھیں بند کر کے تخیل میں افتخار کی نسوں میں خون بن کر بہنے لگی۔ شرمائی ہوئی سرخ سرخ دلہن! وہاں کس آزادی سے وہ یک جان ہو سکتی تھی۔ یہ خونی جوڑا پہنے دلہن دبے پیر اس کے دل میں رینگ جاتی پھیپھڑوں میں پھیل جاتی اور گالوں کو چومتی ہوئی ہونٹوں پر ناچ اٹھتی! افتخار کتنا مہذب تھا اس نے کبھی اس کا ہاتھ بھی تو نہ چھوا۔ ایک مقناطیسی کشش سے وہ اپنی طرف کھینچتا ضرور تھا مگر صرف اتنے قریب کہ دھیمی دھیمی مدہوش کن آنچ لگے پر داغ نہ پڑے...... اور پھر ڈھیل دے دیتا ایسے کہ کھینچنے والا دھکا کھا کر پرے جا گرتا۔ اگر وہ بھی ذرا تندرست ہوتا اور خون کی طرح اس کا جسم بھی طاعون بن کر چھا جاتا تو وہ گردن پھیر کر

بھی اس کی طرف نہ دیکھتی۔ یہ مدھ بھرا امرت کا گھڑا اس کے اوپر الٹ دیا جاتا تو پھر یہ خمار کہاں سے آتا!

کتنا مقدس تھا ان دونوں کا ناتا! اس دن الہ آباد کے کیمپ میں جب نئی ریشمی رضائی افتخار کو سونپی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ اپنے خوابوں کی دنیا کو بھی لپیٹ دیا تھا۔ تنہائی کی اتنی لمبی راتوں میں چاروں طرف سے مہیب آوازیں پکار پکار کر قہقہے لگاتیں اور کہتیں ...... "اکیلی ...... اکیلی" تو وہ اپنی ٹھٹھرتی ہوئی لاوارث روح کو چپکے سے دور اس رضائی میں سرکا دیتی۔

اس کے پاس افتخار کی ایک پیاری سی تصویر تھی جس میں وہ دور کہیں غیر فانی بلندیوں کی طرف گھور رہا تھا۔ بالائی نصف حصہ روشن تھا اور داہنا رخ تاریکی میں تھا۔ اس کے ہونٹوں پر استقلال ناچ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا تاریکی کا تھپیڑا اس کا منہ موڑنا چاہتا ہے مگر وہ استقلال سے دھارے کے بہاؤ سے مقابلہ کر رہا تھا۔ یہ تصویر ہمیشہ اس کے بہت قریب ہوتی تھی۔

ابھی حال ہی میں افتخار نے اسے چند اشعار بھیجے تھے۔ چلتے چلتے باغیانہ اشعار کے ساتھ اس کا دل محبت کے شیریں نغمے بھی گا اٹھا تھا۔ ان رنگین اشعار میں اس نے تمتن کی اس بسنتی ساری کو لہراتا دیکھا تھا جو اس کے دل و دماغ پر ایک رنگین خواب بن کر چھا گئی تھی جس پر مصور نے قوسِ قزح کو بکھیر کر واپس ایک نقطے پر سمیٹ دیا تھا اور اس دن سے سونی سونی راتوں میں وہ اپنے غمگین دل سے باتیں کیا کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ اس کے خوابوں میں نور برساتی آ چکی تھی۔ یہ گیت اس نے اتنی مرتبہ گنگنائے تھے کہ لوحِ دماغ پر گہری گہری لکیروں کی طرح کھنچ گئے۔ کتنے کاغذ اس کے دھڑکتے ہوئے سینے کی نمی سے بھر بھرے ہو گئے تھے۔ اسکول کی اس خشک اور چٹیل فضا میں یہ آبِ حیات کے چند چھینٹے اس کونپل کو تازہ دم کرتے رہے جو ناقدری سے مرجھا چلی تھی۔ افتخار کے خطوں نے اس کی نسوانیت کو جلا دے رکھی ورنہ وہ تو کبھی کی ایک کامیاب معلمہ بن چکی ہوتی جس طرح دوسری استانیاں لڑتیں اور لڑکیاں کانپتیں کامیاب معلمہ وہی ہے جو مؤنث اور مذکر کے سوال بھول کر لکیریں کرنے کا مسطر بن جائے اتنی سخت کہ اس غیر شاعرانہ تنے کو دیکھ کر ہنسی لڑکھڑا جائے، چہرے نو دبک جائیں اور کندھے نہ جھکیں، قدم دوڑنے لگیں اور کاپیاں سیدھی ہو جائیں، ہر چہار طرف فوجی نظام قائم ہو جائے اور قواعد حکمراں ہو جائیں مگر ان گیتوں کی دھیمی دھیمی پھوار نے پودے کو سوکھنے سے بچا لیا۔

کسی تہوار یا میلے کی وجہ سے ریل کھچا کھچ بھری ہوئی تھی تیسرے درجے میں قیامت جیسی بھیڑ اور غل تھا لوگ شہد کی مکھیوں کی طرح چھتے کے چھتے بنا کر لٹکے ہوئے تھے۔ ریل ڈیڑھ گھنٹے لیٹ تھی اور بالکل گھریلو حساب کتاب سے چل رہی تھی۔

سیتی ٹوریم کے روشن برآمدے میں افتخار اس کی دی ہوئی رضائی پیروں پر ڈالے اور اس کا ہی بُنا ہوا سویٹر پہنے بیٹھا تھا۔ اور بہت سے کاغذ اس کے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ نہایت تکلف سے اس نے شمن سے ہاتھ ملایا یہ پہلی گستاخی تھی جو بڑھ جانے آج کس رَو میں اُس نے جائز سمجھی۔ جلدی سے اس سے ہاتھ چھڑا کر وہ پاس ہی بیٹھ گئی اور کاغذ دیکھنے لگی۔

"تمہارے کام کے نہیں" شمن نے دیکھا وہ ہسپتال کے بل اور نسخے ہیں۔

"کیوں؟"

"کہتے ہیں عورتیں چوہوں تک سے ڈر جاتی ہیں"

"میں اُن عورتوں میں سے نہیں"

"مگر ان میں چوہیاں نہیں اژدھے ہیں" مگر شمن نے نہ سُنا۔

"ہاں بھئی وہ نیا بل اور تو آ چکا ہم ابھی بچارے پُرانے دوست کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں" افتخار نے پیار سے بل اوور کو سہلایا یہ وہی تو سویٹر تھا جس کے ایک ایک پھندے کے ساتھ شمن نے اپنے ہزاروں سپنوں کو بُن دیا تھا۔ کس شان سے اس کے سینے سے چپاں تھا۔ وہی سوکھا نازک خیف سینہ، پیار اور لطیف جذبات کا لبالب خزانہ جس کے قرب کے وہم سے ہی اس پر کپکپاہٹ طاری ہو جاتی تھی۔

"تھوڑا اُون کم ہو گیا ہے...... یہاں سے جا کر پارسل کروں گی۔

"دق کے مریض کی چھوئی ہوئی چیزیں کھانا نہیں چاہئیں مگر یہ پھل بالکل تازہ ہیں تم خود اٹھا لو...... مجھے بھی دو۔ چاقو دراز میں ہو گا"

"میں اس قدر وہمی نہیں اگر آپ کو مہمانوں کی خاطر کرنی نہیں آتی تو رہنے دیجئے۔

"اچھا تو آپ مہمان ہیں!"

"جی"

"ہنہ! اُس نے اٹھ کر میز سے چاقو نکالا اور نہایت دھیمی آواز میں کہنے لگا" جو ہر لمحہ دل و دماغ پر سوار رہیں، خوابوں میں بھی پیچھا نہ چھوڑیں نیندیں اُڑا دیں۔ موقع ملے تو کمامرے سے مہمان بن بیٹھتے ہیں ...... نفرت ہے مجھے ایسے مہمانوں سے!" افتخار نے مصنوعی غصّے سے کہا اور دشمن کا دل اُچھل پڑا۔

"میں نے ایک کہانی میں پڑھا تھا کہ تازہ پھل کھانے کا مزہ تو جب ہے کہ انھیں دانتوں سے بھنبھوڑا جائے، دو کے بجائے چار ہونٹ ایک ساتھ رس چوسیں" افتخار آج شاعری پر تلا ہوا تھا۔

"سُنا کچھ؟"

"کیا"

"ہٹلر نے کتنے ملک ہپٹ لیے، اب ان کی باری آنے والی ہے"

"توبہ ہے انسان انسان کو چبائے ڈالتا ہے"

"یہی ہوگا، اگر شیر کو بھوکا رکھا جائے گا تو موقع ملتے ہی پہلے اپنے سدھانے والے کو چبائے گا۔ یہ نازی شیر ہٹلر ڈھیلا پڑنے کے انتظار میں تھا اب موقع مل گیا ہے!"

"مگر بے چارہ پولینڈ"

"گیہوں کے ساتھ گھن کو بھی پسنا پڑتا ہے مگر اب ان کا وقت آ گیا ہے ان کو مجھونا یا اُٹھی کا لڈو وہ نہ بنانے تو بات نہیں۔ بہت سی ایسے گناہوں کو اب ذرا آپ کے دو دو گرملے خود بھی آزمائیں۔ وہ پھول جو سالہا سال سے یادوروں پر برسائے آئے تھے قدرت نے جمع کر کے آتشیں گولوں کی صورت میں انھیں کو لوٹا دینے کا فیصلہ کر لیا تو بزدل کیڑوں کی طرح بلوں میں گھسے جا رہے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ ہمیں دکھ ہو، ان سے ہمدردی ہو، اُن کے دشمنوں کو کوسیں ارے ہم اپنے ہی دشمنوں کی درازی عمر کی دعا مانگتے آئے ہیں تمہارے دشمنوں کو کیا کوسیں گے۔ مگر نہیں ہمیں کوئی نہیں جانتا.. ہم بہت جلدی ایک مالک سے گھبرا جاتے ہیں اور اب ہٹلری نے زبان بنا رہا ہے نئے سرے

سے جھتے بلنے جائیں گے جو بویا ہے اس کا نتیجہ بھوگنا پڑے گا اور وں کے خون سے ہولی کھیلنے والے ذرا خود اپنے خون کی سرخی بھی تو دیکھ لیں اس مغرور سر کو بھی تھوڑی سی بھینٹ دینی پڑے گی

"مگر یہ کم بخت بڑے طاقتور ہیں!"

"خاک نہیں ۔ شیخی خورے خالی ڈینگیں مارتے ہیں۔ ننگے ہیں سر پیر سے۔ جبھی تو چچا جی کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ دیکھ لینا تاکیں رگڑیں گے ایک ایک ڈالر پر۔ اور چچا بھی معصوم نہیں، چچا بھتیجے کی ملی بھگت سے تو یہ راج قائم ہیں اور جب تک یہ زندہ ہیں بھوکے اور لکھ پتی رہیں گے۔"

"اب کے یہ مدد نہیں کریں گے۔"

"ارے کریں گے کیسے نہیں آخر کو بنیئے ہیں روپئی کا بیوپار نہیں لاشوں کا ہی سہی دوسرے چیتھڑے کے خون سے تو ان کی ستی کم ہے۔"

"ہٹیئے کیا رکھا ہے جاپان میں کم بخت کوئی چیز بھی تو ڈھنگ کی نہیں بناتے۔"

"ارے تو تم اس جاپانی مال سے ان کی طاقت کا اندازہ لگا رہی ہو۔ دیوانی یہ تو ہندوستانیوں کے لیے ہے اور بہت ہے ان بیچاروں کے لیے تم نہیں جانتیں۔ کیا حال ہے" وہ چاقو سے سیب کے چھلکے کا قیمہ کرنے لگا۔

"اور تم دیکھنا آخر میں مزدور کا پھاوڑا ہی جیتے گا۔ اور یہ پھاوڑا اس جھوٹے نظام کو چکنا چور کر دے گا بے گناہوں کا خون ضائع نہیں ہوا۔ اس خون سے اگی ہوئی روٹی کھا کر سرخ قوم پیدا ہوگی۔ سکون کا دامن چاک ہو جائے گا۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گا۔ سینۂ گیتی شق ہو جائے گا! پھر کیا ہو گا؟ پھر کیا ہو گا؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں لیکن شاید کبھی میں اس کا جواب دے سکوں" جوش کی شدت سے افتخار کا زرد چہرہ جی اٹھا

"ظلم کے علمبردار آج تہذیب اور انصاف کی حفاظت کو چلے ہیں یہی جذبہ ۱۹۳۵ء میں کسی حسینہ کی گود میں سو رہا تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے!..... اور ہٹلر فولاد ہے۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے اس کی طاقت....."

"شیر کے آگے گیدڑ کی بھبکیاں صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے یہ۔ تم خود دیکھ لو گی"

"مگر ہندوستان کو کیا واسطہ ان باتوں سے یورپ والے تو ہمیشہ ہی بات بے بات جوتی پیزار میں مشغول رہتے ہیں ہمیں کیا ہم تو ویسے ہی غلام کے غلام۔"

"ٹھیک کہتی ہو ہمیں کیا ہم کیوں پھڈے میں پیر اڑائیں، لیکن تم بھول رہی ہو ہم غلام ہیں اور آقا کے ساتھ بلکہ آقا سے پہلے ہمیں اپنے خون کی بھینٹ چڑھانی ہوگی...... لیکن وہ دن جلد آنے والا ہے جب لفظ غلامی تمہیں لغت میں بھی نہ ملے گا۔ میں نے تمہیں کس لیے بلایا ہے۔ یاد ہے وہ کیمپ والا معاہدہ یا بھول گئیں!"

"اتنی کند ذہن نہیں ہوں۔"

"معلوم ہے مجھے جبھی میں نے سب سے پہلے تم ہی کو چنا تھا۔ تم نہیں جانتیں کہ تمہاری قربانی کی ملک کو کتنی ضرورت ہے اور تم میں ہمت بھی ہے اور ذہانت بھی۔ تم مضبوط دل و دماغ کی مالک ہو۔ تو تو کیا دے سکتی ہو؟"

"میرے پاس ہے کیا؟"

"جو کچھ بھی ہے ایک پیسہ ایک پھوٹی کوڑی، سنو ہماری جماعت کو فنڈ کی ضرورت ہے چاروں طرف سے نرغے میں ہے۔ کام جو تیزی سے جاری تھا بکھرتا جا رہا ہے، مگر ڈر ہے کہ رک نہ جائے۔ کانپور سنٹر سخت مصیبت میں ہے۔ تمام کاغذات ضبط کر لیے گئے ہیں ہمارے بہت سے کام کرنے والے جیل میں سڑ رہے ہیں۔ مگر پھر بھی جو آزاد ہیں چمگادڑوں کی طرح کھنڈروں کھدروں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ جانتی ہو سب سے بہتر پناہ گاہیں کہاں قائم ہیں؟"

"نہیں!"

"رنڈیوں کے کوٹھوں پر۔ تم بڑی متحیر ہو رہی ہو۔ کسی شریف عورت میں نہ ایسے ملزموں کو چھپانے کا سلیقہ اور نہ ہمت۔ رنڈی کے کوٹھے پر شراب میں دھت انسان کو کون پہچان سکتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں غنڈا ہے چھٹے درجے کا!"

"لیکن نقشہ کیا ہوگا۔ آپ کے کام کا؟"

"یہ ایک شدید راز ہے میں جو یہاں چھپا بیٹھا ہوں کس لیے؟ یہاں کسی کی نگاہ نہیں پڑتی۔ میری خیریت پوچھنے میرے ساتھی بہ آسانی آ سکتے ہیں بھیرے رشتہ دار......

معاف کرنا میں نے تمہارا نام بھی رشتہ داروں میں لکھا دیا ہے۔ گستاخی تو نہیں ہوئی!؟"

"بس بنیئے مت۔"

"شکریہ' اور فنڈ کی قلت کی وجہ سے یہ بل...." وہ ایک دم چپ ہو کر کاغذات چھپانے لگا۔"

"آپ میری ہتک کر رہے ہیں!"

"کون میں؟"

"جی!"

"تو یہ ہے' چہ..... ارے بابا کھال ادھیڑ دو مگر ایسی ٹیڑھی نظروں سے نہ دیکھو" شمن ہنس پڑی۔

"تو لائیے وہ کاغذات۔"

"تمہارے کام کے نہیں۔" افتخار نے ٹالنا چاہا مگر شمن نے چھین لیے پورے دو سو پچھتر روپے کا بل اگر ادا نہ ہوا تو چوبیس گھنٹے کا نوٹس۔

"اب پتہ چلا آپ مجھے کیسا رشتہ دار سمجھتے ہیں۔"

"تو بھئی....."

"رہنے دیجیے، مجھے آپ کے اوپر اعتبار نہیں۔"

"کیا یہ آخری فیصلہ ہے؟"

"جی" شمن نے اس کی دھیمی آواز کی تپش سے پگھل کر زبردستی کہا۔

"کچھ جرمانہ نہیں ادا کیا جا سکتا۔ کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک"

"جی نہیں۔"

"تو پھر ہم نے بھی فیصلہ کر لیا پوچھو کیا؟"

"نہیں پوچھتی۔"

"چہ.... جی چاہتا ہے مالش کی دوا پی کر اس جھگڑے ہی کو ختم کر دیں۔"

"بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں بچے بنتے!"

"تم مذاق سمجھ رہی ہو۔ مجھ سے دنیا خفا ہو چکی ہے اور اب ۔۔۔۔ اب اس نئی دنیا کی خفگی نہیں۔ تمہیں بتاؤ ایک بے کار انسان لوگوں کی نفرت کی آماجگاہ بن کر کیوں ٹھوس ٹھاس جیسے جائے۔"

"تو ۔۔۔۔ پھر آپ نے مجھ سے کیوں چھپایا؟"

"غلطی ہوئی ۔۔۔۔ بس" کان کی لو اینٹھ کر کہا "معاف کر دو۔"

"ایک شرط پر۔"

"ادھو کوئی شرط ابھی بھی رہ گئی ہے تمہاری جیسے ماننے نہ ماننے کا اختیار ہیں تو غصب کر رکھا ہے!"

"جی ہاں ورنہ یہ کاغذ میرے تجسس سے چھپائے نہ جاتے بلکہ اگر آپ مجھے اپنا سمجھتے ہیں تو آپ کو چاہیے تھا مجھے بل پکڑا کر حکم دیتے کہ انہیں ادا کر دو۔"

"اوہ" افتخار نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ اس کا سر جھک گیا اور باوجود ضبط کے آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی "لیکن ۔۔۔۔۔"

"پیر انشیحت؟"

"سنو تو۔"

"جی نہیں ۔۔۔۔۔ آداب عرض" شمن جل کر اٹھی اور جانے کو مڑی۔

"بیٹھو ۔۔۔۔ بخدا اس تیکھے پن پر کہیں کوئی گستاخی نہ ہو جائے ۔۔۔۔" افتخار نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا "تم آگ سے کھیلنے کی کیوں اتنی شوقین ہو کہیں خود ایک آدھ چرکا نہ کھا جاؤ" افتخار نے جلدی سے اس کا بازو چھوڑ دیا شمن بے سہارا ہو کر واپس کرسی پر گر پڑی۔ ایک دم بے تکی خاموشی چھا گئی جیسے دو دلوں کی دھڑکن توڑتی رہی۔

نوٹ نوٹ کے چند نوٹ شمن نے لفافے میں ڈال کر میز پر سرکا دیئے۔

"میرا قرض رہا ۔۔۔۔۔ مع سود واپس کر دیجئے گا۔"

"اچھا تو یہ سلسلہ بھی چلتا ہے؟"

"کیوں نہیں، آپ جیسوں کو کیوں چھوڑا جائے۔"

"جو نہ ادا کر سکا تو؟"

"تو حشر کے دن ایک کے ستر وصول کروں گی۔"

"مذاق نہ کرو..... میرا کام اور پھر یہ بیماری!"

"اللہ اس کم بخت بے چاری کو چھوڑ دیجیے۔"

"میں اسے بہت چھوڑنا چاہتا ہوں پر یہ بھی مجھے چھوڑے..... ہوٹلوں کے کھانوں اور فٹ پاتھ پر سونے کا اس سے زیادہ حسین تحفہ اور کیا مل سکتا ہے۔" اس کی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں پھر وہ ہی سلگتی ہوئی بغاوت چھا گئی۔ "انتقام انتقام" اس کے چہرے کی کرخت سلوٹیں پکار اٹھیں سنبھل کر اس نے دوا پی اور سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"یہ کم بخت جراثیم، قدم قدم پر بیڑیاں......" اس نے حسرت سے شمن کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اب کب آؤ گی؟ ویسے تو مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ تمہاری عنایت کا محتاج نہیں......" شمن کا منہ اتر گیا۔ "کیونکہ جب چاہوں تخیل کے زور سے گھسیٹ لاتا ہوں اور اس وقت نہ تم اتنا جھجکتی ہو اور نہ مجھے جراثیم کا خطرہ ہوتا ہے۔"

وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔

۳۷

واپسی پر اُسے ایک تار ملا "فوراً آؤ" ایلما نے لکھا تھا کیونکہ وہ اپنی ڈاک کے متعلق کوئی ہدایت نہیں دے گئی تھی۔ ارادہ تھا بھوالی سے لوٹ کر سامان لیتی ہوئی گھر روانہ ہو جائے گی۔ تار کئی دن دیر سے ملا۔ پھر بھی وہ فوراً روانہ ہو گئی۔ روکن کے لیے اس نے ایک بندوق، ربڑ کی گولیوں کا ڈبہ اور کھوڑے سے چاکلیٹ لے لیے۔

وہ برآمدے ہی میں تھی کہ بوڑھی آیا نے اُسے دونوں شانوں سے پکڑ کر روک لیا۔

"اندر جانے کا نہیں! ابھی کر کے سویا ہے"۔

"سویا ہے تو سونے دو میں اسے جگاؤں گی نہیں میم صاحب کہاں ہیں؟"

"ادھر ہی سوتا...... اکھا دن ایسا ایسا کرتا" آیا غم کا مجسمہ بن گئی۔ یقیناً بڑھیا سٹھیا گئی تھی۔ ایلما سے کہہ کر نئی آیا کا انتظام ہونا چاہیے وہ آگے بڑھی۔

"بولتا کہ بابا نہیں جانے کا"

"کیوں؟"

"کیوں؟ اوہ کیوں؟" اندر سے مردہ آہوں میں ڈوبی ہوئی آواز آئی "کیوں؟ یہ سب آخر کیوں؟" پردہ ہٹا کر ایلما باہر آ گئی عجیب حبشیوں کی سی حالت۔ آنکھیں پھٹی ہوئی بال بکھرے مردے سے بدتر اپنا ذہن چل رہا تھا۔

"ایلما کیا ہوا؟" پہلے تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی لیکن شاید اب بھی دماغ کی کوئی رگ سلامت تھی۔

"تم!...... تم آ گئیں؟ اُسے بھی لے آئیں...... میں نے اُس کے لیے دودھ ابال دیا ہے اور......"

"کیا ہے ایلما!"

"چپ چپ...... بولا تمارے کو...... کیسا پھر نیڈ ہے...... ڈاکٹر آ رہے تبھی بولے گا۔

ہم اُس کو......" ایلا نے پھر ڈانٹنا شروع کیا۔ بابی کو شوک لگ گیا.... "اس نے کان میں چپکے سے کہا۔

"تم کیوں لے گئیں میرے رولی کو...... چلو ادھر لاؤ.... بڑی شریر ہو تم۔"

ایلا شرما کر مسکرائی۔

"ایں؟" شمن چکرائی۔

"اوہو..... بندوق بھی لے آئیں اس کی..... اچھا کیا.. بچا دادا تا...."

"ڈیتھ ہو گیا بے بی کا.....!" ایلا نے روہانسی آواز سے کہا اور سر ہلانے لگی۔

"کیا اول لغو!"

"جھوٹ..... بالکل جھوٹ..... یہ سب جھوٹے ہیں... دھوکا دیتے ہیں مجھے.... میں ان سب پر کیس چلا دوں گی.... ٹھائیں ٹھائیں..... وہ مارا" ہوائی بندوق داغ کے وہ کلکاریاں مارنے لگی۔

لمونیا ہو گئے..... تین روز میں..... کھلاس! "چندھی بچہ جیسی آنکھوں والی بڑھیا اپنی سکڑی ہوئی ناک چڑھا کر بسورنے لگی۔" ادھر بیگم صاب ایکدم پاگل سری کا ہو گیا۔ ہم بولا کوئی کا زبردستی نہیں لیمبو سی کا بھیٹر... اُو نے بلا لیا۔ پن ہم کو تو دھکا مارتے! بولتے جاؤ نہیں مانگتا ہم کو ملنے کو.... ہم بولا کہاں چلی جائے... پن مانتا ہی نہیں ایں؟..... بولو کون دُسرا اچھا نیا..... صاب بھی مر گیا....."

"ادھر جو باجو میں صاب رہتا... بولا اسپتال میں لگی.... ایکدم کر کے ان لگی!

"اونہہ..... ذرا جا کر اسباب اتروا لو.... آیا" شمن نے آیا کی بکواس سے بوکھلا کر کہا اور ایلا کو گھسیٹ کر اندر لے گئی۔

"لاؤ نا..... کہاں چھپا دیا ہے اُسے!" اُس نے شرارت سے مسکرا کر کہا۔

"ایلیا....." شمن کا جی چاہا اُسے کلیجے سے لگا کر جی بھر کے روئے۔

"تم بولتی کیوں نہیں...... دیکھو مجھ سے کوئی چال مت چلنا..... ورنہ یاد رکھو میں نے وکیل کر لیا ہے اور سب کے اوپر کیس چلا نا..... اوہ....."

وہ کچھ سوچ کر رک گئی اور منہ پر ہاتھوں کا کٹورا ڈھک کر پکارا۔

”آ..... یو..... آیو“

”آتا میم صاب!“

”آیا..... ہوٹ واٹر مانگتا۔ بے بی کے واسطے ایک دم اچھا ہونا..... گسل ہونا۔

”کیا میم صاب بولتا ابھی یکا گسل کر لیا! اب.....“ اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

”اس کو اینجل ہولی واٹر کا گسل دیتا۔ لیبو مسی.....“

”غارت ہو کم بخت..... چلو یہاں سے“ ایلما نے ڈانٹا اور جھپٹی اُدھر، مگر آیا نہایت لاپروائی سے کھڑی بکتی رہی ”ایسا ایسا کیا چلاتا میم صاب..... ہم ڈاکٹر کو بولنے مانگتا“

”چپ رہو آیا..... ایلما صبر کرو، یہ کیا حال بنا لیا ہے“ وہ پیار سے اس کے بال سنوارنے لگی۔

”تو پھر لاؤ اُسے“ ایلما نے بچے کی طرح آس بھری آواز میں التجا کی۔

”کون مانتا..... ہم کتنا کتنا بولتا ہیں..... جب بے بی مرگیا تو کیا ہونا، ہیں اکھا دن مارا ماری کرتا.....“

”جھوٹ جھوٹ!“

”اب لیبو مسی کی بات کو جھوٹا بولتا..... کیا ہونا ایسے!“

”آیا.....“

”لیسو کا گستہ.......“

”باہر چلو..... نکلو.....“ شمن نے اُسے زبردستی باہر گھسیٹا۔

”جانا بابا جاتا تو..... ہیں یہ دیکھنے کا کہ اپنے کو لیبو ملا دے تو..... اور میم صاب کھانا پینا کو کچھ نہیں..... کھڈا باپ گستہ ہوتا“ شمن نے دروازہ بند کر لیا۔

”یہ تمہیں اور لو کھلائے دیتی ہے۔ یہ کیا حال بنا لیا ہے تم نے.....“

"سب کہتے ہیں وہ چلا گیا.... تم لے گئی ہو؟"

"نہیں"

"ایمان سے!" ایلما سہم گئی۔

"یہ دوائی بے بی پینے کا..... پن ہم بولتا ڈیتھ کا کوئی دوائی بی نیئں" آیا دوا کی شیشی لے کے بہلانے پھر اندر آ گئی۔ بڑھیا کو وحشت ہو رہی تھی اور تنہائی سے خوف زدہ ہو رہی تھی۔

"کیسی دوا ہے؟"

"ڈاکٹر دیتا..... فرسٹ کلاس ڈاکٹر..... ہم ٹیڈ الف کا کام کیا اس کے انڈر میں پیچھے آنکھ بگڑا! ہم بولا ہمارے کو دیکھتا بی نیئں..... بولا آیا تم اب کوئی اور کام کرو۔ ہم بولا ڈاکٹر کیسا کام کرتا..... بولا نرس کا کام ہونا..... بے بی کا نرس..... ہم بولا کوئی بات نیئں جر درسے کرتا۔ بولا لیو یہ بے بی..... جو ڈیتھ ہوانا..... ہسپتال میں دو روز جیسے ہوا... ایسا .... ایسا بلکل لکڑی کے مافک ٹیڑھا بے بی۔" آیا اپنے چپکے ہوئے پیٹ پر آٹھ نے بچے کا نقشہ کھینچنے لگی۔ "اکھا نائٹ کھلاس۔ ایک دم ڈس چارج!"

"اے ہے چپ رہ کم بخت بڑھیا..... چلو باہر بیٹھو میں دوا پلا دوں گی" دوا پلا کر شمن نے ایلما کو کمبل اڑھا دیا اور وہ بخار سے بے ہوش ہو کر سو گئی۔

آٹھ دن ایلما موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار رہی۔ نویں روز بخار ٹوٹا مگر بڑی دیر تک قائفس رہی۔ دونوں نے بیتے ہوئے حادثے کا جان بوجھ کر ذکر نہ کیا حالانکہ سارے وقت انھیں احساس رہتا کہ وہ دونوں ایک ہی چیز کے متعلق سوچ رہی ہیں۔ ایلما نے اسے جو میں لا کر پالا پوسا تھا، مگر شمن کو بھی اس سے کچھ کم محبت نہ تھی۔ گذشتہ دسہرے کی چھٹیوں میں دونوں نے بڑے جوش و خروش سے مل کر اس کے لیے تعلیمی کھلونے خریدے تھے۔

"ہوں..... آنٹی کہو" ایلما اسے ڈانٹتی۔

"نئیں..... چمن!" وہ شرارت سے آنکھیں جھپکاتا اور دور بھاگ جاتا اس کے ہونٹوں سے "چمن" سن کر اسے رائے صاحب یاد آ جاتے..... وہ بھی تو ایسے ہی وجیہہ تھے اور شریر بھی..... یہ چلبلے انسانوں سے خدا کو کیوں اتنا بیر ہے!

جب سے ماں بیٹے میں ملاپ ہوا تھا ایلما نے اس کی پرستش شروع کر دی تھی بیچ کی غلاظت کو بھول کر پودے کی سیوا میں مست تھی۔ اس کی ہزاروں تصویریں خود کھینچی اور کھنچوائی تھیں جن کی ایک کاپی شمن کو ملی تھی۔ دور رہ کر بھی وہ اس کی پرورش میں حصّہ لے رہی تھی جہاں کوئی مفید کتاب یا کھلونا نظر آجاتا فوراً خرید کر پارسل کر دیتی۔ خاص اس کی خاطر بچوں کی نفسیات پر کتابیں پڑھیں۔ دونوں گھنٹوں بیٹھی اُسے دلچسپ پہیلی کی طرح بوجھنے کی کوشش کر کے لطف اندوز ہوتیں۔

اور جب تک اس کھلونے کو مٹا دینے کی کوشش کی، بال بھی بیکا نہ ہوا لیکن جونہی اپنے چاہنا شروع کیا۔ اس کی ممتا کا خون کرنے کے لیے وہ روٹھ گیا۔ بخار اترا تو ایلما کی وحشت بھی کچھ دب گئی۔ رولف کی زندگی سے ناامید ہو کر اس نے شمن کو پکارا تھا۔ اسی لیے تو رولف سے ملایا تھا کہ شاید وہ اُسے موت کے چنگل سے بھی چھین لے گی کہتے ہیں ناجائز بچے بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔ تو پھر رولف کیوں ہوا کے ایک جھونکے کی طرح آیا اور گم ہو گیا۔ کوئی دوسری ماں ہوتی تو تسلّی دی جاتی کہ صبر کرو خدا اور دے گا۔ مگر ناجائز بچے کی ماں کے لیے تو گالی ہوتی۔

"ایلما شادی کر ڈالو" شمن نے سمجھانے کی کوشش کی

"ہنہ، نئے رولف پیدا کرنے کے لیے۔۔۔ تم کیا جانو۔۔۔ اپنے جسم سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر یوں پھینک دینا مذاق نہیں۔ اور شمن وہ دکھ جو اُسے جنم دینے میں میں نے سہا آج اس کی موت سے دس گنا ہو گیا۔ اُف وہ موت سے بڑھ کر دم گھونٹنے والا دکھ۔"

"شاید تمہارا دکھ اس لیے بہت معلوم ہوا کہ تمہاری پوزیشن اور ماؤں سے مختلف تھی۔ اگر کسی کا بچہ محبت بھری نگرانی میں جنم لے تو شاید اتنا دشوار نہ ہو۔۔۔"

"ہو سکتا ہے ممکن ہے ایسا وقت آئے اور میں اتنا نہ ڈروں۔ یہاں ایک پروفیسر میرے پیچھے بہت دن سے پڑے ہیں انہیں رولف کا حال معلوم ہے بیچارے اُسے بہت پیار کرتے تھے اور بڑے روشن خیال ہیں۔ ویسے میں ایسی بزدل نہیں ہوں طعنہ نہ سہار سکوں اور نہ ہی اب مجھے رولف کی ماں بننے میں شرم آتی تھی۔۔۔" وہ پھر خاموش ہو گئی۔

"تو پھر کیوں شادی نہیں کر لیتیں؟"

"اس لیے کہ مجھے ڈر تھا کہ میں رو لف کے ساتھ پھر نا انصافی نہ کرنے لگوں۔ ماں بن کر میں نے ڈائن کے سے سلوک کیے مگر بقول تمہارے اپنے کو بھول کر اب دوبارہ میں یہ بھول نہیں کرنا چاہتی تھی میں نے پھر بھی اُسے اتنا نہیں دیا جتنا اس کا حق تھا۔"

ایلما سے رخصت ہو کر وہ سیدھی گھر روانہ ہو گئی۔ اتنے دن دور رہنے کی وجہ سے وہ بالکل غیر ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی آنے والے مہمانوں کی طرح اس کی بھی آؤ بھگت کی جاتی مگر کوئی خاص جگہ اس کی مقرر نہ تھی۔ یہ دو مہینے کی چھٹیاں وہ اٹھنے بیٹھنے کے کمرے میں گزار دیتی۔ وہ جو گھر کی سہولتیں ہوتی ہیں وہ نہ مل سکتیں اپنے حسابوں تو وہ بیاہی جا چکی تھی۔

یہ کمرہ بھی بالکل ویٹنگ روم معلوم ہوتا اس کی چیزیں عجائب گھر کا سمجھ کر دیکھی جاتیں اور بالکل شارعِ عام پہ رہنے کا لطف آجاتا۔ ہزار بندشوں کے بعد بھی وہ خلوت نہ نصیب ہوتی جس کی وہ عادی ہو چکی تھی۔ لوگ بھی اسے عارضی ارکاٹ سمجھ کر اپنے دلوں پر جبر کرتے اور اپنی عادتوں کی لگامیں روکنے کی کوشش کرتے اس کا وجود بار بھی گزرتا تو بالکل مہمان سمجھ کر برداشت کر لیتے۔ قدرتی طور پر اُس کا کمرہ گھر بھر میں سب سے غنیمت ہوتا لہٰذا بچوں کی ساری دلچسپی اسی طرف مبذول رہتی۔ کوئی مہمان آتا تو اسی کے کمرے میں مہمان نوازی کی جاتی اسی کے پیڈ لفافوں اور قلم سے گھر بھر کی حاجتیں پوری کی جاتیں۔ دُنیا اتنی ترقی کر گئی تھی مگر اس کے گھر میں وہی افراتفری مچی تھی۔ قسمت سے سب بھاوجیں بھی ایسے ہی گھرانوں کی تھیں۔ جہاں کھانے کی میز پہ بچوں کے پوتڑے سکھائے جاتے ہیں اور کھانا یا تو باورچی خانے میں اکڑوں بیٹھ کر کھایا جاتا ہے غسل خانوں میں اناج کے مٹکے رکھے جاتے ہیں اور لگنی پہ پردہ ڈال کر غسل لیے جاتے ہیں لہٰذا بہ درخواست کا کمرہ اس کی غیر موجودگی میں ٹوٹی چارپائی ردّی کرسیوں بے کار مونڈھوں اور ڈگمگاتے اسٹول رکھنے کے کام آتا۔ الماریوں میں چینی کے برتن اور چاندنیاں وغیرہ بھی یہیں رکھی جاتیں جب وہ آتی تو جھاڑ پونچھ کر دو چار تخت کرسیاں بیٹھنے کے قابل بنا لیتی۔

جب سے باوا کی پنشن ہو گئی تھی گھر کی ہر چیز صرف استعمال کے لیے رہ گئی تھی۔

جونہی بے کار ہو جاتی کوئی مرمت نہ کرانا اور لاوارث بنا کر کوٹھے میں جمع کر دی جاتی۔ سات پشتوں کی چیزوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ سانجھے کا گھر کوڑا خانہ بنا ہوا تھا۔ ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر اُسے ہندوستان کی عام حالت کا اندازہ ہونے لگا جیسے سرکاری راج میں دفتروں میں جا بجا پان ڈالے افسر پیک مارا کرتے ہیں میزوں پر دہی بڑے کی چاٹ پکوڑیاں اور چلتے ہوئے جوں رینگتے ہیں۔ سالن اور گھی کے دھبے لگے اوٹ پٹانگ رجسٹر سوکھی ہوئی دواتیں الٹے تب مڑے ہوئے ہولڈر جن سے لکھنے سے زیادہ ازار بند ڈالنے کی خدمت لی جاتی ہے۔

اُدھر جرمنی نے دنیا کو خون سے نہلا کر پوتر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پولینڈ کا بٹوارہ تو ہو گیا۔ رہی باقی کی دُنیا تو کتنے دن کی ہے۔ یہ مثلث بھی پرکار کے ایک چکر میں سوستکا بنا جاتا ہے۔ بڑے بڑے لوگ کلابازیاں کرتے رہ جائیں گے۔ ہندوستان ٹوٹے یا سالم رہے بات ہی کیا ہے۔ اس سالم دُنیا میں کیا کم پھوٹ ہے۔ کبھی تو جی چاہتا کوئی بڑی سی موگری لے کر اس کو توڑنے کے پرخچے اڑا دے اور اس کے بھی ایسے ہی ذرے بکھر جائیں جیسے برطانی جزائر اور جاپان کے۔

خود اُس کے گھر کو ایک زبردست چوٹ کی ضرورت تھی۔ یہ ایک انوکھا خاندان تھا جہاں کھانے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی اور کمانے والے تھک کر بوڑھے ہوتے جا رہے تھے۔ سامان روز بروز ڈھیلا اور بے کار ہوتا جا رہا تھا۔ سیڑھیاں خطرناک حد تک ٹوٹ گئی تھیں اور سیمنٹ جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ کاش اس کھنڈر کے کاہل باسیوں کو کوئی سانحہ گھسیٹ کر لق و دق صحرا میں لے جا پٹختا جہاں اس گھر کی اندھیری پناہ سے آزاد ہو کر وہ خود اپنے ہاتھوں سے نئی پناہ گاہیں بنانے پر مجبور ہو جاتے۔ ہر چیز کو تخریب کی ضرورت تھی۔

جرمنی نے لندن پر آگ برسانی شروع کر دی جن بھوکوں کا خون نچوڑ کر یہ شاندار شہر سجایا گیا تھا اُن کے کچلے ہوئے دلوں میں مسرت کی لہر آگ کے شعلوں کی طرح دوڑ گئی۔ آہا کیا مزا آ رہا ہوگا۔ یہ جو پریت جیسی اونچی اور جنت جیسی حسین عمارتیں نظر آتی ہیں بھوسے کی گٹھریوں کی طرح بکھر جائیں گی۔ نازک اندام میمیں اور پھول جیسے بابا لوگ قصائی کی دوکان سے پھینکا ہوا ملغوبہ بن جائیں گے جنہیں کتے بھنبھوڑیں گے اور گدھ نوچیں گے آسمان سے خدا کا قہر برسے گا اور زمین لاوا اگلے گی بڑی بڑی سڑکیں ریگستان اور ہوٹل کھنڈر

بن جائیں گے۔ ۱۸۵۷ء کا خون چھلکے گا، اور یہ سیاہ خون اندھیرا بن کر چھا جائے گا۔

ہٹلر بھی تو آرین ہے! وہی آرین جنھوں نے ہندوستان بنایا۔ اب پھر وہی آریہ یہاں آئیں گے جیسے ہنومان جی دُم میں آگ لگا کر لنکا کو پھونکنے گئے تھے اسی طرح یہاں بھی آگ برسے گا جس میں راکشس بھسم ہو جائیں گے اور دیوتا سونے کی مورتیوں کی طرح تپائے ہوئے نکل آئیں گے پھر ہندو مسلمان ایک دوسرے کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالیں گے۔ ہندو مسجدوں کو پوجیں گے اور مسلمان مندروں کو سجدہ کریں گے دو بھائی گلے مل کر جی کا غبار نکالیں گے۔

اس بمباری سے گھبرانا کیسا؟ قحط اور بیماریوں کے ساتھ مفلسی اور لاچاری کی مار سہے ہوئے کیڑوں کے سامنے ان پٹاخوں کی کیا حقیقت ہے آئے دن موٹروں ہی سے اتنے کچل کر خاکِ راہ میں گم ہو جاتے ہیں۔ مگر آہ مردہ نہیں بگولے بن بن کر ایک بے قرار روح کی طرح برسوں رقصاں رہے گی اور دُنیا کی آنکھ میں کھٹکے جائے گی کتنی بار یہ ہندوستان کا مثلث فتح ہوا لیکن اس کے دکھے ہوئے مفلس دل کسی کے نہ ہو سکے یہ دل اُن جی حضوریوں کے سینے میں نہیں جو حاکموں کے دربار میں اُن کی اُترن پہنے عجائب روزگار بنے بیٹھے ہیں یہ دل اُن سڑی بسی جھونپڑیوں میں ہیں جو آریوں کے راج میں پھٹکتی رہیں، مغلوں کی حکومت میں بھی رو یا کیں اور اب بھی اُن میں اتنے سوراخ ہیں اِن چھلنیوں میں کوئی چھال نہیں لگا سکا یہ دل کیا متاثر ہوں گے کسی چوٹ سے جنہیں صدیوں کی "ٹھوکر خوری" نے بے حس چٹان بنا دیا ہے اب تو انھیں یہ بھی فکر نہیں کہ ٹھوکر سلیم شاہی جوتی سے زیادہ لگتی ہے یا فرنگی بوٹ سے دکھ کا اثر ہی زائل ہو چکا ہے۔

سیاسی الجھنیں زندگی پر خاموش جنگ بن کر چھا گئیں۔ مگر اس شدت سے نہیں کہ برسوں کی رچی ہوئی عصبی غنودگی سے جگا سکیں جب مغرب ٹینکوں کی جھنکار اور توپوں کی گرج سے گونج اٹھا ہندوستان نے اہنسا کا ڈرامہ کھیل دیا جی جلانے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے کہ کوئی گلا پھاڑ پھاڑ کر جگائے اور سونے والے افیم کا انٹا نگل کر کروٹ بدل لیں۔

اسکول کا میدان بھی سیاسی اکھاڑہ بن گیا۔ آپس میں بحث مباحثے ہوتے پھر بیٹھ کر ایک دوسرے کو کوسا جاتا اور آنسو بہائے جاتے ہندو لڑکیاں دل و جان سے اہنسا کی قائل عیسائی البتہ پریشان گویا اسلام اور ہندو دھرم کے ساتھ ساتھ اب اُن کی صلیب کو بھی

خطرے میں پڑ جاتا گیا۔ اگر سرکار کا ساتھ نہ دیا اور یہ سفید راج اُڑ گیا تو کیا ہوگا صرف رنگ ہی کا تو فرق ہے ورنہ یہ کالی پیلی بھی یسوع مسیح کی بھیڑیں ہیں اور ویسے بھی لباس، رہن سہن کے ساتھ ساتھ بچے ماما پاپا، آنٹی اور سسٹر کتنی شستہ زبان میں بول لیتے ہیں۔ ہندوستانی کسی کو آتی کب ہے خواہ تھیلوں کی شکل کی ہوں مگر ہیں تو فراکیں، کالی بکری جیسی ٹانگوں میں پھنسے ہوئے نیلام کے جوتے ہیں مگر اونچی ایڑی موجود ہے۔ مانگیں ٹیڑھی اور بچے ہوئے گھونگریلین مین مغربی فرق ہی ہے اگر صاحب لوگ کو ہندوستان سے جانا پڑا تو پھر یہ بیرا لوگ اور آیا لوگ کیا کریں گے بھلا کالا آدمی اتنی اونچی تنخواہ دے سکتا ہے وہ تو باورچی خانے ہی میں پھسکڑا مار کر لنچ اور ڈنر نگل لیتا ہے اور بچے نانیاں، دادیاں پال لیتی ہیں دو چار برس ہیں سو وہ بھی ایسا جی کھول کر نہیں دیتے دوسرے جب یہ چلے جائیں گے تو نہ جانے کون اُسے پھر بیرے اور آیا کا پنشن دے یا نہ دے یہ چرخے کی بات، وہ بھی ٹیڑھی کھیر ہے کہتے ہیں گاندھی جی سب کو ایک ایک بکری اور چرخہ پکڑا کر کہہ دیں گے جاؤ سوت کاتو اور دودھ پیو۔ نہ ٹی نہ چاکلیٹ اور نہ بسکٹ!

مسلمان لڑکیوں کو نہ بکری سے دلچسپی اور نہ چرخہ کاتنے کا شوق اُن کا تو پاکستان الگ بننے والا تھا مع تاج محل، موتی محل اور لال قلعے کے ساری پاک نیارو پہلے چاند کے سائے میں مزے سے دونے نماز میں شوق جنت کی طرف کھسکتی چلی جائے گی۔ کوئی دم میں حصہ بخرہ ملنے ہی والا تھا چنتی کی "پی" (P) تو ہر پان والے کی دکان پر بکنے ہی لگی تھی بس خاموش بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔

مگر یہ کانگریسی حصہ دینے میں بخل کر رہے ہیں اگر پاکستان کی حرص میں سکھستان بہاجستان بھی بن گئے تو چاند سے بھارت ورش کے ٹکڑے ہو جائیں گے اور یہ ہمالیہ کے ماتھے پر ٹیکا ہوا تکونا جھومر سوتی موتی ہو کر بکھر جائے گا اور پھر کہیں پاکستانی ادھر سے خان بھائیوں کی دعوت کر کے پھر محمود غزنوی جیسی چڑھائیاں نہ شروع کر دیں۔

زمانہ تیزی سے ترقی کا پرچم لے کر آگے دوڑنے لگا جلسوں میں نیا جوش پیدا ہو گیا پروگرام بنے پر جوش نظمیں پڑھی گئیں کھانے اور شرابیں اڑیں ترقی پسند اخبار، ترقی پسند انجمنیں ترقی پسند مضمون نگار اور شاعر پیدا ہوئے اور پورے زور شور سے انقلاب مچنے لگا۔ آزاد زندگی اور

آزاد محبت، آزاد موت اور آزاد پیدائش کے حقوق کی حمایت ہونے لگی۔ پرانے بندھنوں کو توڑ کر نئی راہیں اور نئے زاویے کھینچے گئے۔ ہر وہ انسان ترقی پسند بن گیا جس کے بال بے تکے اور آنکھیں دہشت انگیز ہوں، لباس ذرا انوکھا اور ملگجا ہو، ہاتھ میں اٹیچی کیس جس میں بھڑکتی ہوئی نظمیں اور سلگتے ہوئے افسانے، دہکتے ہوئے مضامین اور لطیف فوٹو، کچھ معصوم یادگاریں اور شیریں خطوط ہوں۔ بات کہتے میں کچھ کھویا جائے۔ لڑکیوں سے انتہائی بے تکلفی قدرے لاپروائی اور سختی سے بات کرے، چھوٹتے ہی پیار کا نام لینے لگے۔ بھولے سے زنانہ کپڑوں پر ہاتھ ڈال دے پھر ان کو ایسے دیکھے گویا عمر میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہے۔ پھر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جھینپ جائے اُن کی ساخت اور ماہیت پر گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کرے۔ اس کے علاوہ ہر قابل ذکر لڑکی کا ذکر کرتے وقت اس کی جنسی کشش اور جسمانی ساخت پر روشنی ڈالے۔ اس کی لطیف جنبشوں پر گہری نظر رکھتا ہو۔ اُس کے تمام گذشتہ سے پیوستہ عاشقوں کی تعداد، اس کے جائز و ناجائز تعلقات اور اس کے ادھورے اور سالم بچوں کی تفصیل جانتا ہو۔ تمام انقلابی روسی فرانسیسی امریکی ادیبوں کے نام اور اُن کے تراجم ازبر ہوں، اُن کے تراجم پیش کر کے ادب کی خدمت بھی کر چکا ہو۔ لازم ہے کہ وہ خود بھی فن کار ہو یعنی شاعر یا مضمون نگار ہو تو ہو تمام کو جوڑ توڑ سے گھما پھرا کے لکھتا ہو۔ احساس کمتری جس نے نپولین اور ہٹلر جیسے مدبر پیدا کیے بخوبی رکھتا ہو ساتھ ساتھ لازمی طور پر دھوکا کھا ہو کا احساس ہو۔ دوستوں کے خرچ سے پیٹ بھر شراب اور نفیس کپڑے پہنتا ہو۔ ڈھٹائی سے میزبانی پر مجبور کرتا ہو اور ان حسابوں اشتراکی ہو کہ "جو کچھ تمہارا وہ میرا اور جو کچھ میرا وہ تمہارا۔۔۔ نہیں!"

یہی نہیں ملکہ گاؤں کی لڑکیوں کے بھولپن اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی مکاری کا بھی تجربہ رکھتا ہو۔ مٹی ہوئی عورت جو بیویوں میں سلی ہوئی رنڈی کا طرفدار ہو دولت مند شریف زادیوں کے جسم میں کھو کے مگر انھیں رئیس زادیوں کے عشق میں ناکام رہ کر مجذوب بن کر رہ جا چکا ہو والدین کی ناسمجھی اور غلط طریقۂ تعلیم کی وجہ سے کوئی ڈگری نہ حاصل کر سکا ہو زندگی کی تلخیوں سے تنگ آ کر مفت کی پینے اور نالیوں میں گرنے کا عادی ہو چکا ہو۔

ایک اور شاخ بھی ترقی پسندوں کی ہو سکتی ہے وہ بے چارے جو مجبوراً لمبی چوڑی

جائدادوں کے مالک بنا دیے گئے ہوں تمام مقابلوں اور انتخابوں میں باوجود دیگی سفارش کے ناکام رہ گئے ہوں سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کیا کریں کیسے وقت کاٹیں باپ دادا کے بنائے ہوئے محلوں میں جیسا رہنا پڑے، اعلیٰ قسم کا فرنیچر استعمال کرنا پڑے بڑے بڑے سرکاری اور غیر سرکاری جلسوں کی شرکت لازمی ہو جس کے لیے دیش کے لباس کو چھوڑ کر مغربی درزیوں کے ہاتھ کا سلا ہوا سوٹ پہننا پڑے وقتاً فوقتاً عالیشان ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اٹلی کے چائے کے سیٹ میں چائے پی کر انتہائی انقلابی ادب سے ادیبوں اور شعراء کی پرورش کرتا ہو ان کی ضیافت کرے ان کی تحریروں سے لطف اٹھائے مشاعروں اور ادبی جلسوں میں حسین لڑکیوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لائے اور انقلاب کے برسنے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔

زندگی کی دوسری گاڑیوں کی طرح یہ انقلاب کا چھکڑا بھی اکیلے میں سے نہیں گھسٹتا صنف نازک کا وجود لازمی ہے۔ کوئی آزاد خود مختار خاتون جو دنیا کی بکواس کا خیال نہ کرے۔

یہی وجہ تھی کہ شمن پر ہر چہار طرف سے ترقی پسند برس پڑے۔ گو اس نے اب تک کوئی کارہائے نمایاں نہیں کیے تھے۔ پر نہ جانے کیوں اس کی قوم پرستی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی جیسے چیونٹیاں مٹھاس کی خوشبو سونگھ کر پہنچ جاتی ہیں۔ اسی طرح قومی جذبے کی مہک چھپائے نہیں چھپتی اور لوگ ڈھونڈھ ہی لاتے ہیں۔ پہلے روز نواب زادہ صمد مع چند جوشیلے کارکنوں کے تشریف لائے۔ دیر تک چائے کا بے تکلف دور چلا اور پرجوش مباحثے ہوئے پھر چند روز بعد ہونے والے جلسے میں شرکت کا وعدہ لے کر رخصت ہو گئے نواب زادہ صمد نہایت جوشیلے اور سجیلے جوان تھے۔ بے چارے کو مجبوراً یہ غیر انقلابی لفظ اپنے نام کے ساتھ لگانا پڑتا تھا ورنہ اپنے بے تکلف دوستوں کے حلقے میں تو کامریڈ صمد ہی کہلاتے تھے دوسرے کوئی انقلابی شاعر تھے جنھوں نے فرسودہ روش کو چھوڑ کر لیلیٰ مجنوں کے بجائے نرس ڈاکٹرنی اور اسکول مسٹرس سے ناکام محبتیں کی تھیں اور بجائے گھوڑے دوڑنے کے ریل اور موٹر کی شان میں قصیدہ خوانی کی تھی۔

تیسرے ایک پروفیسر تھے جن کی تحریریں حکومت نے مخرب اخلاق قرار دی تھیں وہ نہایت فخریہ بتاتے تھے کہ ان کے مضامین پڑھ کر لوگ لرز اٹھتے ہیں۔ عریانی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی

اُن کا کہنا تھا کہ عورت پر نظر ڈالتے ہی اُن کے تخیل میں اس کے کپڑے دھواں بن کر غائب ہو جاتے ہیں اور نگاہیں سات پردوں کو چیر کر آر پار تیر جاتی ہیں تسمن کو بھی یہ سن کر پھریری آگئی اور اس کا جی چاہا کاش اس کے کپڑے ذرا موٹے اور مضبوط تاروں سے بنے ہوئے ہوتے۔

ایک انجنیر تھے سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے بے چارے چھپ کر انقلاب لاتے تھے۔ جدی گاؤں کی آمدنی سے عاجز تھے۔ جب تک انگلستان میں رہے برابر وہاں کے قومی مظاہروں میں کھدر پہن کر اور جھنڈا لے کر نکلتے رہے خاص طور پر وہ ہندوستان سے کھدر کی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ لے گئے تھے جو اُن پر بے طرح سجتا تھا۔ گو جلوس لمبے ہوتے اور ان کی روح تک سردی کے مارے گنگ ہو جاتی مگر اس دن وہ بدیسی چیسٹر نہ پہنتے واپسی پر اُن کی لینڈ لیڈی گرم پانی کی بوتلیں اور چائے تیار رکھتی وہ خود بے چاری ان انگریزوں کو گالیاں دیتی تھی جو بے چارے ہندوستانیوں کو ذرا سے سوراج کے لیے اتنی تکلیفیں دے رہے تھے اُسے اُن لڑکوں سے خاص ہمدردی تھی جن کی بدولت اس کی تین لڑکیاں ماما گیری سے نجات پا کر ہندوستانی رانیاں بن گئی تھیں اُسے کتنا ارمان تھا کہ ان کالے داماداں کے کالے ملک میں جا کر ہاتھیوں پر سوار ہو کر اژدہوں اور ببر شیروں کا شکار کھیلے سونے چاندی کی رکابیوں میں پلاؤ اور کباب کھائے اور کوٹھریوں میں بھرے ہوئے ہیرے جواہرات اپنے ہاتھوں سے چھوئے۔

جلسے کے دن کامریڈ صمد مع چند چیلیوں کے آکر اپنی موٹر میں اُسے لے گئے مجمع خاصہ تھا اور بڑی دلچسپ انقلابی عشق کی پر زور نظمیں پڑھی گئیں ترقی پسند انقلابی شاعر نشے میں دُھت ذہانت اور فن کاری کا مجسمہ بنا چہک رہا تھا نظم کا ایک ایک بند شعلہ بن کر لپک رہا تھا زوردار مضامین پڑھے گئے جن میں ظاہر کیا گیا کہ موجودہ ادبی عریانی قدیم عریان نگاروں کی تحریر کے آگے صفر کی حیثیت رکھتی ہے جب باپ دادا اتنے "گلچھر" تھے تو کیا وجہ ہے کہ سپوت پیچھے رہ جائیں اس ادبی ورثے کی قدر نہ کرنا حد سے زیادہ نامعقولیت کا ثبوت ہوتا۔ اگر کوڑھ بھی باپ دادا سے ورثے میں ملے تو کلیجے سے لگا کر رکھنا چاہیے۔

ویسے تو کئی خواتین موجود تھیں مگر ان میں سے ایک قوم پرستی میں بلند مرتبہ رکھتی تھیں

اور کوئی نقصان ہی اُن کی ناک تراشنے کی فکر میں تھے جس پر بجائے خوف زدہ ہونے کے اُنھیں اور فخر تھا نواب زادے کی شمع محبت کا خاص شعلہ تھیں کچھ رسنائی نہ پڑا کہ انھوں نے کیا کہا کیونکہ پولیس ہال بھر کا شور پھر گونج رہا تھا لوگ ان کے متعلق اُڑی ہوئی افواہوں پر ناقدانہ مباحثے کرنے میں مشغول تھے۔ اُن کے بعد دوسری خاتون آئیں۔ مگر یہ پھیکی پھیکی سی رہیں۔ بیچاری اس شعلے کے سامنے صورت شکل کے لحاظ سے بھی مٹی کے تیل کی کپی معلوم ہو رہی تھیں۔ اُلجھے ہوئے پریشان بال اور بہکی بہکی نظریں۔ انتہائی چوٹ کھائی اور دکھی سی صورت نہ جانے انھوں نے کیا کہا مگر ہو یقیناً انقلابی تھا۔ نہ وہ ہاں کی طرفدار تھیں اور نہ نہیں کی۔ ایک سرے سے انھوں نے ہر چیز کی مخالفت کی۔ یہاں تک کہ خود اپنی مخالفت کی مخالفت کر دی۔ لوگ انھیں جھکی اور بدحواس سمجھتے

جلسے کے بعد انجم صاحب اور کامریڈ عصمت کی طرف سے پر تکلف ڈنر ملا۔ گھونپ گھونپ پی جانے بس شمشاد کی ہوئی ہونٹوں پر شکن بن گئیں۔ کامریڈ عصمت نے تو کئی مرتبہ اس طرح اس کے کانوں میں کچھ کہا کہ اُن کے جلتے ہوئے ہونٹ اُس کے کانوں کی لو سے چھو گئے۔ انقلابی شاعر مع اپنے بدبودار کپڑوں اور عقاب جیسی بھوؤں کی آنکھوں کے اُس کے قریب تر آ گیا۔

جلسے کی تھکن نے جلد ہی تھپک تھپک کر سلا دیا۔ مگر قریب ایک بجے اس کی آنکھ کسی نامعلوم کھٹکے سے خود بخود کھل گئی۔ چوروں سے اُسے ڈر نہیں لگتا تھا مگر اس وقت نو ساہوکار دن سے بھی کلیجہ کانپ اٹھا۔ ہمت کر کے اس نے زور سے پکارا کون! کوئی جواب نہ ملا۔ خاموش لیٹ کر بغور سننے کی کوشش کرنے لگی۔ دماغ پر زور ڈالنے سے جسم بھی تن کر معلق سا ہو گیا۔ ایک ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا جیسے کوئی بھٹکی ہوئی روح شیشے پر سرسرا رہی ہو۔

"شمشن!" ہوا سرگوشیاں کرتی اُس کے کانوں کے پاس رینگی۔ جیسے کسی کی جانی پہچانی سی آواز اُسے پکار رہی ہو۔ مگر یہ آواز تو اُسے بار بار دھوکے دے چکی تھی۔

"شمشن" اس بار شبہ مٹ گیا۔ واقعی کوئی کھڑکی کے ادھر سے اُسے پکار رہا تھا۔

"کون!"

"میں!... ڈرو نہیں میں ہوں مختار۔ کھڑکی کھولو۔"

"ایں!" شمتن نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی کھولی مگر اس کا وہم جسمانی صورت میں موجود تھا۔
"آپ؟"
"اندر آسکتا ہوں؟"
"آئیے" وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی۔
"مگر سوچ لو...... میرے پیچھے خطرہ ہے؟"
"خطرہ!"
"جلدی بولو..... تاکہ میں اور کہیں"
"آئیے اندر!" اس نے جھلا کر کہا اور کھڑکی کے پٹ پھیلا دیے۔

"پھر بھیا نامت!" اس نے کھڑکی کی چوکھٹ پر رک کر کہا۔ مگر پھر اندر آگیا۔
"کیا بات ہے؟" شمتن نے مضبوطی سے کھڑکی بند کر کے کہا۔
"ذرا سانس لینے دو" وہ خاموش کوچ پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ شمتن لبادہ اوڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئی"
"کمبخت پیچھے پڑے ہیں!" اس نے کلیجہ بھینچ کر کہا۔ "دو قدم نہیں چلنے دیتے۔ بال بال بچا؟"
"کیا ہوا!؟"
"وہی، وہی..... اور کون اس بُری طرح بھگانے کا شوقین ہے زندگی ایک مسلسل دوڑ بن کر رہ گئی ہے"
"پولیس؟"
"ایں؟...... وہ چونکا مگر پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔
"تمہیں میں نے آج تک نہیں بتایا...... اور فائدہ بھی کیا۔ تم گرلز سکول کی ہیڈ مسٹریس ہو تمہیں"
"میں ڈرتی نہیں ہوں کسی سے نوکر ہوں غلام نہیں!؟"
"مگر ــــ"
"رہنے دیجیے یہ بتائیے کچھ کھائیں گے؟ جواب میں افتخار نے اسے ایک بار دیکھا۔ اور

خاموشی سے جیب میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ شمن باورچی خانہ ٹٹولنے چلی گئی۔

"جانتی ہو یہ کیا ہو رہا ہے" اس نے جلدی جلدی لقمے چباتے ہوئے کہا۔ "روس کو کچلنے کی ترکیبیں ہو رہی ہیں۔ یہ ہنس کیوں کود رہے ہیں؟ روس فن لینڈ سے ڈبک گیا نا...... کم بخت یہ دانت نکلوانے بڑیں گے بیکار ہو گئے...... یہ امپیریلسٹ مل کر روس کو نگلنا چاہتے ہیں۔ اگر کہیں پانسہ پڑ گیا تو بس!" وہ تخیل میں بھیانک شکلیں دیکھ کر پھریریاں لینے لگا۔

"مگر جرمنی...... جرمنی اتنا تو نہیں کہ ان کے ہتھے میں آجائے" اس نے جیسے خود کو سمجھایا۔

"مگر ہمیں؟ اس ہمیں کیا کریں گے؟" شمن خود اپنے بچوں جیسے سوال پر جھینپ گئی۔ "یہ سیاست ہے بھی تو عجب کھیل، گھڑی میں بڑی بڑی اہم سرگرمیاں اور گھڑی میں بچوں جیسی شرارتیں!"

"میں جا رہا ہوں...... شمن...... مجھے یاد رکھنے کی کوشش کرنا اگر بھول بھی جاؤ تو مجھے نہ بتانا میں برداشت نہ کر سکوں گا نہ جانے کیوں میرا یقین ہے کہ تمہارے جلائے سے جی رہا ہوں۔ نامرادیوں میں تمہارا ہی خیال سہارا دیتا ہے اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے میں نے تمہاری ہی آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیا ہے...... اوہ یہ میں کیا بک رہا ہوں" اس نے نگاہیں زمین پر گاڑ دیں۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"کئی سال کے لیے شاہی مہمانداری......"

"مگر کس قصور میں؟"

"اخبار میں پڑھ لینا وہی پرانا کیس ہے...... کانپور کی اسٹرائیک کے بعد کا چھوڑو ان ناگوار باتوں کو...... میں ان لغویات سے تمہیں پریشان کرنے نہیں آیا بلکہ......"

وہ خاموش ہو گیا۔

"جانے سے پہلے مضبوطی اور ہمت مانگنے آیا ہوں...... دعا کرنا کہ کہیں بدھیا راستے ہی میں نہ بیٹھ جائے" شمن کا گلا گھٹنے لگا۔

"ذرا سی چھالیا دو"

"اچھا تو میں جاؤں؟ مگر وہ کھڑا اپس و پیش میں ہاتھ ملتا رہا۔

"خدا حافظ؟" مگر وہ پھر بھی غیر فیصلہ کن انداز میں پریشان کھڑا رہا۔ شمن کا دل بے ترتیبی سے دھڑک رہا تھا۔
"اچھا خدا حافظ!" وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف مڑا اور سست ہاتھوں سے پٹ کھولے۔
"میں جا رہا ہوں...... تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ...... ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہے۔ اب میرا مرض خطرناک نہیں رہا...... اب خدا حافظ......" وہ بُری طرح لڑکھڑا گیا۔ اور ایک دم کھڑکی میں سے غوطہ مار کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ شمن نے ایک جھلک اس کے تمتمائے ہوئے چہرے کی دیکھی۔ وہ آنسو روکنے کے لیے ہونٹ چبا رہا تھا۔ اس کے نتھنے چوڑے ہو گئے تھے اور گردن کی رگیں شدتِ ضبط سے تنی ہوئی تھیں۔

دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے وہ خاموش کھڑی رہی پھر پلنگ پر اوندھی گر کر گہری گہری سسکیاں لینے لگی۔

۳۸

انقلابی جلسوں کی غیر انقلابی حرکتوں سے وہ جلد ہی عاجز آ گئی دو چار جلسوں کی صدارت بھی کی اور نہایت جوش سے کام میں حصہ لیا لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جاتا تو اس کا حصہ بس نام کا تھا۔ عام قاعدہ تھا کہ خواتین کے لیے منتظمین خود ہی تقریریں لکھتے ریزولیوشن تجویز کرتے اور تمام کاغذات تیار کر دیتے اور یہ وہاں جا کر کٹھ پتلیوں کی طرح تتلاتی ہوئی اٹکتی پڑھنے کی کوشش کرتیں وہ بھی ایسے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے کہ عین وقت پر مددگار کو آ کر پنسل اور کھویا ہوا اشد ضروری پرچہ مہیا کرنا پڑتا۔ یہ عورت ذات بھی کس قدر غیر ذمہ دار جنس ہے وہ کچھ دینے کا وعدہ کر کے بالکل بھول جاتی عین وقت پر لوگ اسے لینے بھاگتے اور یاد آتا کہ جو اسپیچ اسے تیار کرنے کو دی گئی تھی اس کا سرسری طور پر بھی مطالعہ نہیں کیا۔

"کیا بتاؤں بالکل بھول گئی" بڑی سے بڑی غلطی کر لینے کے بعد مسکرا کر کہہ دینا ایک جنسی حق تھا جس کا استعمال نہ کرنا حماقت تھی۔ کتنی ہی ضروری مرحلہ ہو ان کا رویہ نہیں بدلے گا بس یہ سمجھیں گی باورچی کا گھر ہے مزے سے بیٹھی ہیں کھانا دیر میں پھیکا سیٹھا پکے تو درزی کا قصور گھر میلا ہو تو نوکروں کا قصور کپڑے گندے ہوں دھوبی کا قصور کسی بات میں بھی تو ان کا اپنا قصور نہیں، رنڈی بن جائیں سماج کا قصور دھوکا کھا جائیں نسوانیت اور بھولپن کا تصور لٹ جائیں چوری چلی جائیں بھگائی جائیں لونڈی بنا کر بیچ دی جائیں سب ظالموں کا قصور

کئی صاحب نے اس کے نام سے مضامین اور نظمیں لکھ کر چھپوائیں۔ کتابیں چھپوانے پر تیار ہو گئے۔ مگر اس خشک تحفے کی طرف اس نے اتنی بھی توجہ نہ دی جتنی چاندی کے بندے یا کنگن کی چمک پر ہوتی۔ نئے زمانے کے الجھے لوگوں کے پاس دھرا ہی کیا ہے سوائے حسّاس دلوں اور بے چین دماغوں کے۔ پہلے لوگ ساڑھیاں، بندے، جھومر، ٹیکہ تحفے میں دیا کرتے تھے اب اشعار، مضامین اور افسانے حاضر ہیں۔ دولت سے مطلب سودا پٹانے کے لیے کچھ تو چاہیے کبھی ان سب پر ترس آ جاتا۔ وہ بھی تو انسان تھے جوان تھے خواب دیکھنا جانتے تھے قصور یہ تھا

کرتوتوں کے وقت اُن کے حصے میں احساس زیادہ اور سہولتیں کم پڑی تھیں۔ اگر ہیر پھیر کے زور سے دس عورتیں رکھ سکتا ہے تو قلم دار القلم کو کیوں زنگ لگائے۔ قلم بھی تو ویسے شمشیر کا توام بھائی ہے وہ کیوں نہ ملک گیری کرے؟

چھٹی کا دن تھا اور فرصت تھی۔ ویسے ہیڈ مسٹرس کو کام کرنے کی ضرورت نہیں اس میں تو صرف ذمہ داری کا مادہ ہونا چاہیے اگر وہ چار استانیوں سے کام لے کر آٹھ کا کام لے سکے تو وہ صحیح معنوں میں محکمۂ تعلیم کی بہی خواہ ہے۔ مختلف قیودیاں چپکا کر اُلّو بنا کر زیادہ سے زیادہ بیگار لینا وقت مقررہ کے بعد بھی کام کرانا اور پھر بھی استانیوں میں انتہائی درجہ کا احساس کمتری پیدا کر دینا کہ انھیں اپنے دماغ اور قوت متخیلہ پر بھی بھروسہ نہ رہے اور بالکل ہی اپاہج ہو کر رہ جائیں مگر اُف نہ کریں سارے الزامات اُن کے سر تھوپنا اور سُرخ روئی اپنے لیے رکھ لینا۔ بدانتظامی جھلی لڑکیوں اور نالائق استانیوں کے حصے میں۔ قبرستان جیسی خاموشی اور سرکس کے جانوروں جیسی سدھائی ہوئی طالبات ہیڈ مسٹرس کی محنت اور جانفشانی کا نتیجہ!

چپراسی نے آکر اطلاع دی کہ کوئی عورت ملنا چاہتی ہے۔ کہلوا دیا نہیں مل سکتی۔ ان عورتوں کی آمد بھی کسی قسم کی آفتیں لاتی ہے۔ کہیں دشمن کی جاسوس تو نہیں کہ جا کر لگائی بجھائی کر دیں۔ کسی لڑکی کی ماں یا بہن ہوئی تو یا تو فیس معاف کر دلیے گی یا زبردستی درجہ چڑھانے کو کہے گی۔ نہ جانے یہ جاہل مائیں درجوں کو بانس کی سیڑھیاں کیوں سمجھتی ہیں جنھیں پار کرانا ہیڈ مسٹرس کا کام ہے۔ جہاں سالانہ امتحان شروع ہوئے اور کمزور اور بدشوق لڑکیوں کی ماؤں کو ہیڈ مسٹرس کی محبت چرائی۔ مٹھائیاں چلی آرہی ہیں۔ تحفے نذر ہو رہے ہیں۔ ہاتھ پیر جوڑے جا رہے ہیں۔ اگر نہیں مانتیں تو دھمکیاں اور گالیاں بھی موجود ہیں۔

چپراسی نے آکر کہا عجیب ٹیڑھے قسم کی عورت ہے نہیں مانتی۔ ساتھ ساتھ وہ خود ہی آگئی مجبوراً ملنا پڑا۔ برقعہ اتار کر گھر کی طرح ہو بیٹھی۔

"آپ مس گپتا ہیں؟" چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"نہیں!"

"نہیں تو شاید مسز نوری!"
"جی نہیں!" ذرا سختی سے کہا گیا۔
"کامنی دیوی؟"
"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہیں...."
"تو آپ یقیناً زہرہ ہونگی.....کیوں؟"
"جی.....نہیں! مطلب کیا ہے آپ کا؟" جل کر کہا۔
"یا اللہ تو پھر آپ کون ہیں؟"
"آپ کی بلا سے آپ کو کچھ کہنا ہو تو......"
"اری کچھ تو کہنا تو بہتر ہے۔ پر یہ بھی تو معلوم ہو کہ کون سی ہو.....جی.....اچھا آپ.....اوں.....وہ.....وہی.....ابے وہ کیا بھلا سا نام ہے اللہ مارا.......جی ہاں تسنیم.....تسنیم.....خدا کی مار اس یاد پر۔"
"جی نہیں میں نے کہا نا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی....."
"نہیں جی۔ ایسی بھی کیا غلط فہمی۔ اس حلقے میں تو.....یہی نام ہیں۔ اچھا جانے دو یہ بتاؤ کوئی سن تو نہیں رہا ہے۔"
"جی نہیں۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہے جلدی کہیے اور براہِ کرم تشریف لے جائیے۔"
"ہاں ہاں پھر اُدمت تشریف بھی لے ہی جاؤں گی۔ مگر.....خیر جو کچھ بھی ہو تمہارا نام خاک پڑے مجھے کیا، تم اُسے تو جانتی ہو گی۔ افتخار احمد کو۔"
"ایں؟" شمن سٹپٹا گئی۔ آج ٹی ڈی سے پالا پڑا۔ مگر وہ بچہ نہ تھی۔
"مگر نام مت لیجیئے قرآن پاک کی قسم.....پاک پنجتن کا واسطہ.....دیکھو بہن خدا کو بھی مُنہ دکھانا ہے.......اپنے پیاروں کی قسم!"
"کیا مطلب ہے تمہارا.....فوراً چلی جاؤ ورنہ....."
"بیوی کیا مجھے ان گیدڑ بھبکیوں سے تو دھمکاؤ مت۔ تم سے زیادہ زمانہ دیکھا ہے اور بھگتا بھی ہے۔ جو ان جلے نصیبوں میں لکھا تھا پھر کیا فائدہ۔ یہ تو بتاؤ اس نے تمہیں ماں بنایا تھا یا بہن یا معشوقہ!"

"تم دیوانی معلوم ہوتی ہو...جاتی ہو کر پھر......؟"

"انداز سے تو یہی معلوم پڑتا ہے کہ......کہ......بہن خوبصورت نہیں ہاں غنیمت ہو"

"تم نہیں جاؤ گی؟"

"جاؤں گی کیوں نہیں پر اپنی کہہ کر اور تمہاری سُن کر......تو میرے خیال میں معشوقہ ہی ہو گی......ڈھنگ بھی بتاتے ہیں۔ اللہ رکھے شرم آ گئی!" وہ طنز سے مسکرائی۔

"تمہیں ان باتوں سے کیا واسطہ؟"

"کچھ بھی نہیں مجھ اُجڑی کو کیا واسطہ ہوتا......بس یہی کہ میں اس بدذات کی بیوی ہوں"

"تم......تم"

"ہاں میں یقین نہ آئے تو یہ سرٹیفکیٹ دیکھ لو......میں جانتی تھی کہ تم یہی کہو گی جھوٹ تو لو یہ......حسین بی زوجہ افتخار احمد......تو تم سمجھیں..."

"تم کیا چاہتی ہو؟" آنکھیں جھک گئیں۔

"یوں کہو......ہاں تو بن بیاہی ہو یا ماشاء اللہ......"

"تم اپنی کہو...کیا کہنا ہے؟"

"تو ماشاء اللہ کنواری ہو۔ منہ سے تو یہی لگتا ہے، غیب کا حال اللہ جانے۔ آج کل کنواری بیاہی میں اللہ مارا فرق ہی کیا رہ گیا ہے......"

"بکواس بند کر کے اپنا مطلب بیان کرو۔"

"تو بہن مطلب یہ کہ تمہیں اس کیڑوں بھرے کباب میں کیا دکھائی دیا جو ریجھ گئیں، بُرا نہ ماننا۔ اگر منہ سے کوئی بات نکل جائے تو چودہ برس کی عمر سے تو میں اُسے بھگت رہی ہوں۔ ایک گھڑی بھی سکھ چین کی گذاری ہو تو بارہ اماموں کی مار......دیدار الغیب نہ ہو۔ تین بچے ہیں...تیرے میرے گھر اپنی عمر گذاری......باپ کے جیتے جی بھرے بھتیجو ( ) کے گو موت کیے بھاوجوں کی پھٹکار سہیں۔ اللہ نے جیسا کچھ بھی ڈالا بھگتا......پر اب جو یہ موئی......" دشمن کے ہاتھ پیر پھول گئے اس کی ہچکیوں نے آنے جو اس غائب کر دیے!

"میں ہار گئی، پر تم ماشاء اللہ پڑھی لکھیاں اُسے بھگت رہی ہو۔ تمہارا اس میں قصور نہیں

دمہے ہی ایسا خدا کی پھٹکار اس پر صورت نہ شکل اللہ جلے نہ یہ عورتیں اس پر کیوں لٹو ہوئی جاتی ہیں اے اور تو اور بوڑھی بوڑھی ڈھونڈو کوئی بیٹا بنا کر کلیجے سے لگائے لیتی ہے کسی کا بیرن بنا ہوا ہے سنتی ہوں کہیں نکاح بھی کر رہا تھا۔"

"تم یہ کس افتخار کا ذکر کر رہی ہو؟"

"ایسا دیوانہ نہ سمجھو میں خوب سمجھتی ہوں، کالج میں پڑھتا تھا لمبا سے رنگ ......

شمشاد دیکھ نا تمہارا نام...... خوب یاد آیا...... تو تم بھی ہو اس کے پاس اور......

جھوٹ نہ سمجھو میں پکا ثبوت دے دوں گی۔ پہلے سن لو۔ یہ جو تو آپ...... میں تو ان کی بیوی کا بھائی بنا ہوا ہے اور میں بھی نادان نہیں کہ ان بہنوں اور اماؤں کے چھل بٹے نہ پہچانوں، اللہ ماریاں اماں بھیا کے رشتے کو شرماتی ہیں ارے کام کرو تو ٹھلے بند دن کرو جب جانیں۔"

"خیر...... آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"یہ بتائیے آپ اسے روپیہ دیتی رہی ہیں؟"

"نہیں!"

"جھوٹ نہ بولو...... میرے پاس آپ کے خط موجود ہیں جن میں حوالے دیے گئے ہیں بیبی نہیں بہن معاف کرنا۔ آپ نے اس کے لیے بیٹھ کر سویٹر بنے ہیں ہاتھ جلا جلا کر حلوے تیار کیے ہیں۔

...... اور......"

"میرے خط دکھا سکتی ہو......"

"مجھے پہچان تو نہیں مگر آپ کے شہر کی مہر ہے شاید......" وہ مداری کی طرح تھیلے میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔ اور خطوں کے بنڈل نکال کر گود میں رکھ لیے......

"میں...... آپ چھیننے کی کوشش نہ کرنا......" اس نے بے اعتباری سے ایک طرف مڑ کر کہا اور شمشاد شرم سے پانی پانی ہو گئی کیونکہ ایک ثانیے کو اس کے دل میں یہ خیال ضرور آیا تھا کہ کہیں نہ جھپٹا مار کر ظالم سے اپنی بے دتوقیاں چھین لے اور......

"یہ...... نیلے لفافوں میں...... آپ خود دیکھ لیجیے" شمشاد نے کپکپاتی انگلیوں سے لفافہ لے لیا۔ کھول کر دیکھنے کی ضرورت نہ تھی حقیقت ننگی ہو کر ناچ رہی تھی۔

"خاطر جمع رکھو...... میں نے کوئی خط نہیں پڑھا۔ میرے بھیجے میں کہاں آتا تو تم کے پچھلے کے محبت نامے پڑھوں اور منّو شروع شروع میں چرائے بھی، پڑھے بھی، جلائے بھی پر اب تو سب چیزوں پر خاک ڈال دی...... ایسے لکھنے والیاں نہ تھکیں پر میں تو ہار گئی۔"

"آپ کیا چاہتی ہیں؟" شمّن نے بھیگی بلی کی سی میاؤں کی۔

"اری بہنیا میں کیا چاہوں گی۔ تم خود سوچ لو۔" پلنگ پر ہاتھ مار کر کہا

"یہ دیکھو کہ نکھٹو کو تو آنکھ کا تارا بنا کر رکھا ہے ادھر دکھیاری کو لوگ گھر میں نہیں گھسنے دیتے۔ "چلو چلو منّی کٹنی بھیک مانگتی ہی ہو"، ابھی جیسے ہمیں شوق ہی تو ہے در در ٹھوکریں کھانے کا۔ لوگوں کے آگے ہاتھ پسارنے کا۔ کبھی ہمارا بھی زمانہ تھا لاکھ کا گھر خاک ہو گیا۔ سسر کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ کواری کوڑی پھونک دی۔ اور یہ کنگال بیٹا میکے میں بیچ، خود نکل کھڑا ہوا۔ ویسے بچے دلانے نہیں کے برس پہنچ جائے ابھی گئے مہینے تمہارے پاس آیا تھا۔ آرٹ گئے میں نے اسٹیشن پر پکڑا اور وہ ویٹنگ روم میں سے ہوا ہو گیا۔ پر میں بھلا چھوڑنے والی تھی پھاٹک کے پاس چھپ گئی جیسے ہی باہر نکلا میں ساتھ چلی کہ پتہ تو لگاؤں اس کے ٹھکانوں کا جب وہ تمہاری کھڑکی میں کودا تو میں سنک گئی وہ تو میں اسی وقت آجاتی پر فائدہ کیا تھا۔ دوسرے سنا ہے یار کے ساتھ مل کے عورتیں کام تمام کرنے سے بھی نہیں چوکتیں۔ وہ تو خاک بچاتا مجھے اس کا بس نہیں جو گلا گھونٹ دے خود۔ مگر بہن جب تک میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا پر اب معلوم ہوا۔ اگر اندازہ غلط نہیں تو شریف گھرانے کی بیٹی معلوم ہوتی ہو آنکھوں میں شرم ہے"

شمّن کا جی چاہا کاش وہ اندھی ہوتی اور کان بھی پھوٹے ہوئے ہوتے!

"تم کیا جانو اس کے کتنے سلسلے چلتے ہیں۔ زمانے بھر کی عورتوں نے وظیفے باندھ رکھے ہیں۔ حکومت کو الگ تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ یہ جو بھوالی گیا تھا یہ بھی کوئی چال تھی۔ میں خوش ہو گئی تھی کہ اللہ مارا اب تو مرے گا۔ بلا سے رانڈ ہو جاؤں تو خیر خیرات کی تو حقدار ہو جاؤں بچوں کا پیٹ تو پلے۔"

"آپ فرمائیے بھی کچھ......" شمّن نے سہمی ہوئی آواز نکالی۔

"یا اللہ آنا جو فرمایا تو کچھ بھی نہیں ماشاء اللہ اتنے دن باپ کو بھرا تھوڑا بہت

بچوں کا حق بھی سمجھ لو۔ اگر نہیں تو تمہاری مرضی۔ تم سے مل بی جی خوش ہو گیا۔ شریف ہو شرافت کو ہاتھ سے نہ دو گی۔ یہ نہیں کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی بیوی کی طرح لگیں غرے ڈبے دکھانے میں نے کہا ہوش میں رہ کر بات کرو بیگم کس بھلاوے میں ہو۔ پرائے مرد سے آنکھ لگاتے شرم نہیں آتی، اپنا چھ ہاتھ کا اچھا بھلا چھوڑ کر اس قبر بجو پر جی دے بیٹھیں پھر اوپر سے اینٹھو تو بندی بھی ایسی ویسی نہیں صاف کہہ دیا کہ خطوں کا بنڈل جاتا ہے سپرنٹنڈنٹ کے پاس کہ میاں دوسروں کے بیچ کڑیاں جوڑ ڈالتے پھرتے ہو، گھر میں کیا مرے سے خود اپنی عزت پر ڈاکہ ڈلوا رہے ہو۔ آستین میں سانپ پال رہے ہو بس نکل گئی ساری ہیکڑی۔ جھٹ ہاتھ کے کڑے اتار کے دینے لگیں میں نے کہا بیوی ایسی کچی گولیاں کسی اور کو کھلوانا، اللو نہیں ہوں ایسا بھی کیا کڑے لے جاؤں جو کل کو خصم سے کہہ کر جیل میں دھر دو گیسی ہو ــــ ذرا پانی منگوا دو..... خدا کی پھٹکار حلق بھی تو سوکھ گیا۔" شمن نے پانی انڈیل کر برف ڈالی اور پیش کیا۔

"جگ جگ جیو بہن، دکھیاری کی خاطرداری کا اجر ملے گا۔"

"یہ میری بنک کی کتاب ہے، یہ بندے اور چوڑیاں..... اس کے علاوہ جو کچھ بھی آپ کو نظر آ رہا ہے..... آپ کو جو کچھ چاہیے لے جائیے۔ دیر تک حسین بی بیٹھی کتاب کے ورق الٹا کیں۔

"کچھ تم نے جمع ہی نہیں کیا۔"

"جو کچھ بھی ہے یہی ہے۔"

"ہوں وہ سوچنے لگی۔ گھر میں تو کل جا رہی ہوں۔"

"آج تو چھٹی کی وجہ سے پوسٹ آفس بند ہے۔" شمن نے سوکھی آواز سے کہا

"یہ بندے تو بھی دضع کے ہیں۔ یہی لوں کان بوچے لگتے ہیں۔ چوڑیاں دلی کی ہی معلوم ہوتی ہیں کیوں؟"

"ہاں" شمن نے جبراً کہا۔

"اچھی ہیں قدسیہ کے لیے ایسی ہی بنواؤں گی۔ ماں باپ کی بچی ہے۔ پر دیکھ لینا

جو کچھ بھی کمی رہ جائے۔ اُسے تو وہ خدائی خوار بھی جاہو رہے ہے۔ پار سال سو روپے دے گیا تھا۔ دے کیا جاتا میں نے! اینٹھ لیے وہ زندگی اجیرن کی کہ اگلنا ہی پڑے دو سو پیڑھی دیئے تھے کہ اُدھیڑ کر بچوں کے بنا لے تو میں نے جتنے اماں سلمیٰ کے لیے بنا دیئے۔ اتنا سا اُدن بچ گیا۔ خدا کی سنوار ان عورتوں پر کیا دریا دلی سے اس بدنصیب کے لیے قمیضیں ہیں۔ اُدن بھی تو مہنگا ہے۔" شمن خاموش سنتی رہی۔

"اچھا بہن تو میں چلی..... یہ لو اپنے خط پتر گن لو سنبھال کر۔"

"اندر لند بیبہ۔"

"اب جانے بھی دو روپے میرے آگے بھی کنواری بیٹی ہے، بیری کی طرح بڑھ رہی ہے، بیوی دنیا نہیں دیکھی تم نے، ایسا ہی ہے تو کچھ اوپر پڑا ہو تو دے دو۔" شمن نے بٹوہ جھاڑ کر ایک سو چالیس روپے گنا دیئے۔

"اللہ تمہارا بھلا کرے۔ تم بھی بیاہ کر ڈالو بٹو، باپ دادا کا نام اچھالنے سے کیا فائدہ، یہ منہ پہ جھاسے نکل رہے ہیں سرسوں دودھ میں گھس کر لگاؤ۔ اللہ نے چاہا چٹی کھال نکل آئے گی..... تو میں چلی ــــ"

دروازہ کھلا اور وہ تیز قدم مارتی نکل گئی..... شمن مٹی کے ڈھیر کی طرح بے جان میلے خطوں کے لاوارث بنڈل کو تکتی رہی تو یہ بھی اس کے گلشن محبت کی عمر بھر کی کمائی۔

چپراسی نے آ کر بتایا کہ جلسے کی طلبا انتظار کر رہی ہے۔ اُسے آج ایک ضروری لیکچر دینا تھا۔

"کہہ دو نہیں ہیں!"

اور واقعی اس وقت اس کی حقیقت "نہیں" سے بھی کم ہو رہی تھی۔

۳۹

چونک کر اُس نے دیکھا تو شام کی دھندلی سیاہی کمرے کو منتشر بنائی جا رہی تھی۔ دہشت زدہ ہو کر وہ پیچھے سمٹ گئی۔ یہ اتنی دیر وہ کہاں رہی؟ جب حسین بی اُسے چھوڑ کر گئی تو خاصی دھوپ تھی۔ تو پھر یہ تین چار گھنٹے اس کے وجود نے کس طبقے میں ڈوب کر گذارے۔ احساسات کے ساتھ اس کا دماغ بھی سُن ہو گیا تھا! نہ ہلی نہ جلی مگر دل دھڑکتا رہا۔ پھیپھڑے پھولتے پچکتے رہے خون کا دوران قائم رہا، مگر تو وہ نہ سوئی نہ جاگی۔ نہ ہی اتنی دیر کچھ سُنا دیکھا۔ نہ سوچا، نہ ہی کوئی خواب دیکھا، تو پھر کیا کرتی رہی؟

ضبط کے تناؤ سے جیسے حواس معدوم ہو کر کسی نامعلوم گہرائی میں غوطہ مار گئے اور اب دھیان سے آہستہ آہستہ ابھر رہے تھے، دفعتاً اُن کی رفتار تیز ہوئی جیسے سطح کی کشش بڑھ گئی اور وہ اوپر کی طرف دوڑنے لگے، سڑک پر اٹیلنیں چل رہی تھیں تانگے آگے پیچھے دوڑنے لگے۔ دور کہیں ریل کی سیٹی بھی گونجی۔ کنکر کوٹنے کا انجن دن بھر کی جانفشانی کے بعد بھاری قدموں سے اڈے کی طرف لوٹ رہا تھا اس کی پھولی ہوئی سانس دھونکنی کی طرح ہانپ رہی تھی پاس کے قصبوں کی طرف چلنے والی ٹھسا ٹھس لاریاں ہاتھیوں کی طرح جھومتی چلی جا رہی تھیں ننھے ننھے سُر اور نغمے کانوں میں پشتم پشتم گھسنے لگے اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ زمین کی سانسوں کو آج پہلی بار سُن رہی ہے۔ اتنی دیر مردہ رہنے کے بعد کانوں کے پردے ان آوازوں سے نا آشنا ہو چکے تھے۔ اور بالکل غیروں کی طرح پراگندہ ہو کر ہر نئی آواز پر چوٹ کھا کر چونک اٹھتے۔

تو دنیا موجود تھی! ایسی ہی جاندار اور مہکتی ہوئی صرف وہ گم ہو گئی تھی اسے بڑا دکھ ہوا اس کی غیر موجودگی سے کچھ بھی تو نظام درہم برہم نہ ہوا۔ مشین کے لکھو کھا پرزوں میں سے اگر ایک ننھا سا بے حقیقت پیچ تھوڑی دیر کو ڈھیلا ہو کر گر گیا تو سفر رک نہیں گیا۔ کچھ بھی تو نہ ہوا۔ جیتے عناصر کی موجودگی میں صرف اس کی خاطر یہ کاروانِ حیات کیوں تھم نہ پڑ جاتا۔ اور زمرد کا بھیانک انجن تو اسی طرح سیٹی بجاتا پٹریاں بدلتا دندناتا رہا۔

وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ امتحان کے لیے دو چار قدم اٹھائے۔ ہاتھ پیر ہلا کر دیکھے ہر شکر ہے سالم تھا، پیر نیچے چل رہے تھے، کلیں درست تھیں۔ کھوتے وقت تو پتہ نہ چلا کھٹ سے بجلی کا بٹن دب گیا ہوگا۔ مگر پلٹتے وقت وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی کس طرح اس کی بھٹکی ہوئی ہستی جھجکتی شرماتی واپس لوٹ رہی تھی۔ کسی نے کمرے میں روشنی بھی نہیں کی تھی ادب کی وجہ سے کوئی اس کے کمرے میں آ بھی نہ سکتا تھا اور جو اسی طرح وہ بالکل ہی کھو جاتی تو یہ مؤدب خادم اُسے ڈھونڈھنے بھی نہ آتے اور شاید ڈھونڈھتے بھی تو اتنی دیر سے کہ پلٹنے کا وقت گذر چکا ہوتا۔ یہیں اس بستر پہ وہ کھو جاتی کیڑے مکوڑے اپنا حصہ بٹورنے آ پہونچتے۔

مارے دہشت کے وہ کانپنے لگی جی چاہا اُس گھٹے ہوئے ننھے سے ڈبے میں سے بھاگ کر جسم خود سے لپٹ جائے۔ انہیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ لے اور کہے "مجھے خود میں جذب کر لو۔ چھپا لو چاروں طرف سے گھیر کر اس ڈراونے اکیلے پن کو مار بھگاؤ۔۔۔۔ اور اب مجھے نہ کھونے دینا!" اور پھر شاید ان کی زندگی کے مس سے یہ مردنی چھٹ جائے گی۔ جو اس پر برسوں کی پڑی خاک کی طرح ذرہ ذرہ گر کر جمع ہو گئی تھی۔

یہ اس کے کمرے میں قبرستان جیسی ویرانی اور ٹھنڈک کیسی؟ جیسے برسوں سے بند پڑا ہو چپراسی نے آج لوبان بھی تو نہیں جلایا۔ مگر پھر اُسے ایک دم لوبان کی خوشبو سے ڈر لگنے لگا اُس کی مردہ خوشبو سے تو یہ کمرہ بالکل پرانی قبر ہی بن جائے گا۔ وہ کیا کرے؟۔۔۔۔ کیا کہے؟۔۔۔ کہاں جائے۔۔۔؟ کس کے پاس؟ دیر تک وہ یہی سوچتی رہی کہ اب اپنے اِس ٹوٹے پھوٹے وجود کا کیا کرے کس طرح اُن بکھرے ہوئے ذرّوں کو سمیٹ کر جوڑ ڈالے۔

"ماں۔۔۔۔ ماں" وہ خاموشی سے پکارنے لگی۔ اس کا جی چاہا چیخ چیخ کر ماں کو پکارے اُس ماں کو نہیں جو اُس کے باپ کے گھر میں بیٹھی اس کی خواہشات کو تسکین پہنچایا کرتی تھی اور جس نے اُسے جنم دے کر دوسرا ہی پیٹ میں ڈال لیا تھا۔ پھر اُسے فراموش کر دیا تھا بلکہ وہ ماں جس کی پیار بھری گرم آغوش میں گول مول ہو کر وہ روح کی اس تھکن کو دور کر سکے جس کے نرم و نازک ہاتھ اس کی تھکی ہوئی کمر کو سہلائیں اور دکھتی ہوئی آنکھوں کو بھینچ کر

اُن آنسوؤں کو نکال دیں جو مئی جون کے بادلوں کی طرح اس کی کنپٹیوں میں پھنسے ہوئے تھے گرم گرم لو جیسے تھپیڑے کانوں کے پیچھے سے اٹھ کر انھیں جھلا رہے تھے۔ پر برسنے نہیں دیتے تھے

"ٹھہرو۔۔۔۔۔۔ ٹھہرو، ذرا دیر ٹھہرو" اس نے خود کو نرمی سے چمکارا۔ "ذرا سی دیر ٹھہرو، سب کچھ گذر جائے گا۔۔۔۔۔۔ یہ دھول بھری آندھی بیٹھ جائے گی۔ طوفان اُتر جائے گا۔۔۔۔۔۔ ایک گلاس پانی پی لو۔۔۔۔۔۔ ٹھنڈا ٹھنڈا!"

فرمانبردار بچے کی طرح چل کر اُس نے احتیاط سے تھرماس کھولا، برف کے ٹکڑے ہیروں کی طرح پانی میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔ کھڑکی میں سے آتی ہوئی کمزور روشنی انھیں آبگینوں کی طرح چمکا رہی تھی۔ خود اس کی سانس تھرماس کے خالی حصے سے ٹکرا کر ہیروں کو چھوتی ہوئی واپس اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ چہرے کے عضلات خود بخود مسکراہٹ میں ڈوب کر ڈھیلے پڑ گئے۔ جان بوجھ کر اس نے تھرماس سے مُنہ لگا کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنا شروع کیں۔ ٹھنڈی ہوا کی چادریں سی حلق سے سینے میں اُتر کر تیرتے ڈرتے تہ کرتے اس نے ایک چمکیلی شفاف ڈلی کو چھوا ارے! ایک ٹھنڈا لوسہ سارے جسم میں بچھّو کے زہر کی طرح چڑھ گیا، اور ہمّت بڑھی، انگلی لپکا کر اُس نے ایک ڈلی کو پکڑ لیا جو پھسلتی مچھلی کی طرح زور مارنے لگی مگر جھٹ سے اس نے ہتھیلی پر ڈال دیا جلد میں سے ہوتی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی گدگدی کہنی تک پھیل گئی۔ شفاف ڈلی آنسوؤں میں تیرنے لگی۔ ہتھیلی کی گرمی سے بے چین ہو کر وہ اِدھر اُدھر مچلنے لگی نہ جانے کیا خیال آیا کہ اُس نے برسوں کے پیاسے ہونٹ اُس پر چپکا دیے۔ اتنی دیر بے کار پڑے رہنے سے زبان بے مزہ ہو گئی تھی۔ سارا مُنہ کڑوا ہو گیا۔ جیسے کسی نے کچا کچا خون لے کر حلق میں لوٹ دیا۔ ہاتھ ڈال کر اُس نے بھاگتے ہوئے ٹکڑوں کو مٹھی میں بھینچ لیا اور مُنہ میں بھر کر چبا ڈالا۔ یہاں تک کہ اس کا حلق، زبان اور خوراک کی نالی یخ ہو گئی۔ مگر وہ برفیلے چنے چباتی رہی۔ ڈلیاں ختم کر کے اُس نے گدلا پانی گلاس میں انڈیلا۔ ندیدے شرابی کی طرح وہ ایک ایک گھونٹ نچوڑ لینا چاہتی تھی تھرماس چھوڑ کر اس نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ذرا دھچکا پڑا اور ــــــ گلاس ایک شیریں چھناکے سے اچھل کر زمین پر گرا۔ ٹکڑے بالکل جاندار پرندوں کی طرح پھڑپھڑانے لگے۔

وہ سچ مچ لبسوڑی جیسے کسی لے نے نھے سے بچے کا دودھ لنڈھا دیا ہو اور وہ اس وقت

بہت حساس اور ننھی بن گئی تھی بچپن اور ماضی کے سارے جذبات گڈمڈ ہو کر نہ جانے کیا بن گئے تھے غم و غصے کا جوش سوڈے کی اُبال کی طرح فوراً بجھ گیا۔ ایک بار بے اختیار جی تڑپا کہ گلاس کے بلوریں ٹکڑوں کو بھی ٹھنڈے چنوں کی طرح چبا کر نگل جائے۔ مگر "بری بات" کسی نے اندر سے ٹوکا اور وہ چڑے ہوئے بچے کی طرح بگڑ کھڑی ہوئی۔ دانت پیس کر اس نے پوری طاقت سے ٹکڑوں میں ٹھوکر مار کر انہیں سارے کمرے میں بکھیر دیا۔ چمکیلے ذرّے ہوا میں نیم مردہ چنگاریوں کی طرح چیخ کر تیر گئے۔

بڑا لطف آیا۔ عجیب کنپٹیوں میں اڑے ہوئے بادل ڈھیلے ہو کر بہہ گئے میز پر سے اس نے دوسرا گلاس اٹھایا۔ پہلے روشنی کی طرف کر کے اس کے آر پار جھانکا بلوروں کے چاروں طرف قوس قزح کی گوٹ، آگے پیچھے دوڑتے ہوئے رنگوں کے ڈورے دور رکھی ہوئی میز...... کتنی ننھی سی بالشتیوں جیسی لگ رہی تھی۔ پلنگ اور کرسی بھی...... ارے وہ خود بھی تو اتنی ہی منی سی ہو گئی جیسی تو ان چھوٹی چھوٹی کھلونوں جیسی چیزوں پر سوتی اور بیٹھتی ہے اور یہ ساری دنیا اس گلاس میں آ کر بس گئی ہے...... وہ خربوزے کے بیجوں برابر کتابیں بٹن برابر اسٹول اور کپڑوں کی کھونٹی کیا اچھا ہوتا جو وہ خود بھی ننھی سی گڑیا کی طرح کرسی پر دراز نظر آتی یہ باریک دنیا اس کی رسائی سے کیوں دور تھی وہ کس دروازے سے گھسے اندر؟
جل کر اس نے گلاس چھوڑ دیا۔ الماری کھول کر جلدی سے نیا سیٹ نکالا، ہلکے آسمانی رنگ کے گلاس اس نے ایک ایک کر کے روپہلے قہقہوں میں غرق کر دیے۔

"تو کیا ہوا وہ کل اور نیا سیٹ لے آئے گی نیلا پیلا گلابی ہر رنگ کا گلاس اور پھر اس کے ٹکڑوں کے ساتھ خود بھی قہقہے لگائے گی" کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ڈر کر وہ ٹکڑوں کو چھپانے لگی

"ستار ماسٹر آئے ہیں!" چپراسی نے کہا

"بھگا دو کم بخت کو!" اس نے کہنا چاہا مگر خیال بدل دیا۔

"آتی ہوں" اس نے اپنے کھوئے ہوئے رعب کو ڈھونڈھ کر کہا۔

جلدی جلدی ساڑھی کی شکنوں کو ہاتھوں سے دور کیا چپل پہن کر آئینے کے پاس گئی روئے ہوئے شریر بچے جیسے چہرے کو جلدی سے پاؤڈر تھوپ کر دھندلا کر دیا۔ زا

پاؤڈر تولیے سے پونچھ کر اُس نے بال کنگھی سے اونچے کیے۔ بائیں آنکھ کے پپوٹے پر سے پاؤڈر رگڑ کر وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی۔

ستارہ رجے دتنی کی نئی گت کے توڑے لیتے وقت اس کی نظر پیر کے انگوٹھے پر پڑی خون سے ڈر کر اس نے ہاتھ نہیں روکا۔

"ٹھوکر لگتے وقت مضبوط ٹوکا جوتا پہننا چاہیے اُس نے خون کو قالین پر رگڑ دیا۔

سونے سے پہلے اُس نے دونوں دروازے احتیاط سے بند کر کے چٹخنی چڑھا دی کھڑکی کا پردہ بھی کھینچ دیا۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کر وہ دبے پیر پلنگ کے پاس آئی آہستہ سے بستر گھسیٹ کر زمین پر ڈال دیا چھت کا پنکھا کھول کر چت لیٹ گئی۔ ریڑھ کی ہڈی خاص خموں میں جھکنے کی عادی سیدھے فرش پر لیٹنے لگی۔

"نہیں... نہیں یہ خم مٹا دیا جائے گا۔ اس لہریے کو سیدھا ہونا پڑے گا" اس نے حکم دیا اور ایسی گہری نیند میں ڈوب گئی جو برسوں سے حسرت آرزو بن کر رہ گئی تھی

۴۰

سو کر اٹھی تو معلوم ہوا دن بہت چڑھ آیا ہے۔ خبروں کا وقت نکل چکا تھا۔ ریڈیو پر کوئی دھیمے سروں میں کسی تازہ دم راگ کا الاپ کر رہا تھا۔ اطمینان سے چائے کی پیالی ختم کی اور صبح کا اخبار اٹھایا۔

"جرمنی نے روس پر حملہ بول دیا"

وہ جلدی سے تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئی اور دوبارہ ان موٹے موٹے حرفوں کو پڑھا جو تاریخ کے ماتھے پر خونیں لکیروں کی طرح کھنچ چکے تھے۔ اُسے حسین جی کو دیکھ کر اتنا تعجب ہوا تھا جتنا اس خبر کو پڑھ کر ہوا۔ مگر نہ جانے وہ کیوں مسکرا دی۔ خبریں اگر نئی صورتیں اختیار کر کے آئیں تو انسان مسکرا ہی پڑتا ہے۔ کل تک روس اور جرمنی گلے میں باہیں ڈالے ایک دوسرے کو چمکار رہے تھے اور آج یہ جوتم پیزار شروع ہو گئی۔ شبہ تو تھا مگر اتنا قریب نہیں۔ ۲۲ جون بھی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ کسی کو معلوم ہی نہیں کہ روس کے علاوہ کسی اور کی سلطنت کو بھی تاراج کر دیا گیا تھا۔ آنے والی نسلیں خود اس تاریخ کو رٹتے وقت اس سلطنت کی شکست خوردہ رانی کے خواب سے بھی واقف نہ ہوں گی مگر پھر بھی یہ دن کسی نہ کسی صورت میں دنیا کے دماغ میں بسا رہے گا اور اس خیال سے اُسے ایک گونہ تسلی ہو گئی۔ جو کچھ بھی کیا ہٹلر نے ٹھیک کیا ورنہ یادداشت کے لیے اُسے اپنی ڈائری خراب کرنی پڑتی۔ ان حسین خوابوں کی ڈائری میں یہ دھبہ کتنا بدنما معلوم ہوتا!

ارے اُسے اٹھنا چاہیے۔ دکانیں کھل گئی ہوں گی۔ جنگ کا یہ نیا رخ قیمتوں پر اثر ڈالے گا۔ جاڑے کا سامان بھی اگر خرید لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ ضروری کام کا بہانہ کر کے وہ فوراً اسکول کی لاری میں بازار چل دی۔

آج اُسے ذرا شوخ رنگ پسند آ رہے تھے۔ اس دن نہ جانے کس نے کہا تھا، آپ سا تو رنگ... پیلا سبز رنگ بہت زیب دیتا ہے۔ کاسنی افسردگی کا پتہ دیتا ہے اور سنہری کہتا ہے... پہننے سے تو ضرور مہنگے ہو جائیں گے۔ [illegible] بھی جچتا رہتا ہے۔ دو کوٹ پہلے ہی بیکار

ہوجائیں گے۔ ہر چیز دگنی خریدنی چاہیے۔ نصف سے زیادہ پونجی کپڑوں میں تبدیل ہو گئی باقی کچھ نئے سیٹ کٹلری اور چیٹ پٹ میں اڑ گئی۔ اس نے ایک خاتون کو روپہلی روغن ناخونوں پر چڑھائے دیکھا تھا۔ کالے سیاہ ہاتھ راون کی بہن جیسے خونخوار لگ رہے تھے جبر باقی کے چار پانچ رنگ اسے پسند آئے۔ بیٹی زردی ہوتی ہے۔ بلیک میجک کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر میکس فیکٹر کا پورا اسٹ کیا بُرا رہے گا۔ عمر میں پہلی مرتبہ ایک ماہ کے کل خرچ کے برابر روپیہ اس نے انھیں لوازمات میں جھونک دیا۔ سنگھار میں دیسی بدیسی سب چلتا ہے اور کپڑوں میں بھی کون پوچھتا ہے۔ کہہ سکتی ہے کہ پہلے کا خریدا ہوا پڑا ہے ترقی پسند بننے سے پہلے کا ہے۔ چلانا ہی ہوتی ہے مجبوراً پہن ہی ڈالا جائے۔

بغیر آستین کے بلاؤز میں کتنے ہی فائدے ہیں۔ کپڑا کم گرمی کم اور آرام زیادہ جاڑوں میں بھی کوٹ کے نیچے پہن لو تو کندھے بہت نہیں بھولتے بازوؤں کی عادت نہیں اور جلد بھی دو رنگی ہے یعنی کہیں گہری اور جہاں چھپی رہی وہاں ہلکی ٹھیک ہو جائے گی۔ لوگ سمجھ جائیں گے کہ نیا نیا سیکھا ہے تو بلاسٹے کر لیا بس گے؟

وہی کامریڈ صمد کی پانچ سیٹ جس میں ہمیشہ دم گھٹتا تھا آج ضرورت سے زیادہ وسیع معلوم ہوئی ایک طرف کامریڈ اور دوسری طرف شاعر انقلاب پھر بھی کافی جگہ تھی اور اسے ذرا بھی اعتراض نہ ہوا جب وہ دونوں بار بار ایک دوسرے کی سگرٹ جلانے یا کسی اور بہانے سے اس دونوں طرف کھینچنے لگتے ان کی گرم سانس گردن اور بازوؤں کو سینکتیں یا ان کی بیکل پنڈلیاں اس کی ساری سے ٹکراتیں تو وہ بالکل انجان بن کر باہر دیکھنے لگتی ایسے کہ اس کے دونوں رخ حسین زاویے پیش کر سکیں۔

سیاہ فام کی صدری میں یہ بڑا عیب ہے کہ آج کل بہت پھسلتی ہے اور انقلابی شاعر کی آنکھیں لٹّو کی طرح ناچتی ہیں۔ صمد کی گردن میں بار بار کیا چیز رینگتی ہے کہ جسے ہٹانے کے لیے اسے یہی کہنی عثمن کے پہلو میں اڑانا پڑتی ہے اور شاعر کی رانوں میں کھجلی ہوتی ہے تو وہ اپنے جسم سے زیادہ قریب بیٹھنے والے کے جسم کو کھجا

ڈالتا ہے۔ آگے جھک کر نرہ پروفیسر رحمان سے وقت پوچھنے لگی کہ کامریڈ اور شاعر دونوں گھڑیاں باندھے تھے۔ مگر رحمان کے سر پر جا کر نرسے قدموں سے دوڑ رہی تھی۔

جلسے میں زور و شور کا مباحثہ رہا۔ مگر سب کچھ بوکھلائے سے تھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسے بُرا کہیں اور کسے اچھا۔ جتنے منہ اتنے بول۔

"بے وقوف ہے روس کو چاہیے تھا جرمنی سے مل کر امپیریلزم کا خاتمہ کرتا۔"

"دکھاوے کی ہے لڑائی اڑا دی ہے دشمنوں نے۔"

"نہیں جی خبر سچی ہے، ٹرڈوں میں رات بھر گورے خوشی سے ناچتے رہے۔ اپنی بلا دشمن کے سر، سب سے پُرانا دشمن ہے۔ اب دیکھو جرمنی کے ساتھ مل کر خود بیلیں گے اسے۔"

"ارے آج تو یہ ان کے ٹھیکہ دار دُونی چڑھائیں گے۔ برسوں کی مراد بر آئی۔"

"نہیں جی روس کا ساتھ دیں گے عملاً نہ سہی زبانی ہی سہی۔ اور خود جھگڑا ڈالنے کی طرح دور کھڑے جیتنے والی پارٹی کا انتظار کریں گے۔"

"آخر میں پٹے ہوئے روس اور جرمنی کو سب مل کر بانٹ کھائیں گے۔"

"فی الحال تو یہ روس کی طرف داری کریں گے اور کرنا بھی چاہیے۔ روس کی موت انسانیت کی موت ہوگی اور معلوم ہوتا ہے انسانیت کا بُڑھاپا آن پہنچا۔"

"زیادہ سے زیادہ دو ماہ لگیں گے روس کو پٹنے میں۔"

ادھر سواستکا لٹو کی طرح گھومتا اپنا دائرہ بڑھاتا رہا ادھر شمشاد نے پیٹربازی شروع کر دی۔ آج کامریڈ صمد کی موٹر میں کل انجینیئر صاحب کے ساتھ ایک دن شاعر کے شعروں میں رچ کر کسی بوسیدہ رسٹوران میں تو دوسرے دن پروفیسر رحمان کی نیم تاریک لائبریری میں! ایک ہفتہ سپرنٹنڈنٹ کے خیمے میں تیتروں کا شکار تو دوسرے ہفتے نہر کے کنارے ننھی سی چھولداری میں کمائی کے گھونٹوں کے ساتھ اونچے اونچے قہقہے وہ بڑی ڈرپک ہوگئی تھی۔ کم خوری سے جسم بھی ہلکا ہوگیا تھا۔ انگلیاں دراز اور پیچ دار ہوگئی تھیں اور پیروں کے جوڑ نازک، ذرا سی دور چلنے سے ٹخنوں میں ٹیسیں اٹھنے لگتیں اور مسلنے سے اتنی گدگدی ہوتی کہ وہ اپنے رنگین ناخنوں سے مسیحا کے ہاتھ کی کھال اتار لیتی۔ کامریڈ

صمدان گہرے نشانوں کو تنہائی میں جو نتے تھے انقلابی شاعر نے ان ننھے ننھے گڑھوں کو کنویں سے تشبیہ دی تھی جہاں اُن کا اداس دل شام کی تنہائیوں میں ڈوبا اچھلا کرتا تھا۔ انجنیر صاحب کا خیال تھا کہ یہ نشان، بہت دن بعد جب زندگی انھیں ایک دوسرے سے بہت دور دھکیل لے جائے گی تو صحرا میں گرے ہوئے ٹیڑھے بچوں کی طرح کسی شان دار دنوں کی یاد دلائیں گے۔ پروفیسر ادیب تھے اور ان کے ہر جملے سے ادب ٹپکتا تھا۔ وہ انھیں ایسے گمراہ روحوں کے قدموں کے نشانوں سے تعبیر کرتے تھے کہاں کہاں پہنچ چکے تھے یہ اچھوتے چھالے۔ انکا تخیل بھی تو ان کا پیچھا کرتے کرتے بھٹک جاتی تھی۔ دورانِ خون بھی اتنی گرمی سے انھیں نہیں پگھلا سکتا یہی اسارے کو دیکھے ان کے دل ودماغ پر بھی تو کھنچے ہوئے تھے مرنے بعد ان کی ہڈیاں بھی ان داغوں کی گواہی دیں گی۔ وہ ان سب سے بے تکلف تھی وہ ان کے کمرے میں بغیر اجازت گھس آتے وہ اس کی پریشانی پر جھینپ جاتے اس کے بستر کی طرح کلیلیں کرتے۔ مذاق میں اس کی ساڑھیاں اوڑھتے، اس کی چوڑیوں سے جوا کھیلتے ایک ایک چوڑی دس دس روپے کا نوٹ بن کر ایک جیب سے دوسری جیب میں جاتی۔ اس کے کپڑے ناکوں سے بھینچ کر اس کی مخصوص خوشبو دماغوں میں محفوظ کرتے جاتے۔ تاکہ اس سے بچھڑ جانے کے بعد وہی خوشبو سونگھ کر اس کی یاد میں بے چین ہو سکیں اور گذرے زمانے کی یاد تازہ ہو جائے۔

اپنی کھن دار پیچیدہ کاکلیں اس نے کتنی ہی تراش کر ان کے سینے کے تعویذوں کے لیے دے دیں یہاں تک کہ اسے بالوں کے لنڈورے ہو جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا جہاں کہیں اس کی چوڑی ٹوٹ جاتی تبرک کی طرح بانٹ لی جاتی۔ اشعار میں آمد کے لیے شاعر انھیں ہونٹوں پر لپسٹک کی طرح بسایا کرتے اور گو ہونٹ بے رنگ رہتے دل و دماغ قوس قزح کے رنگوں میں ڈوب جاتے جوڑے کے پھولوں کی آوارہ پنکھڑیاں میلے رومال اور ایسی ہی ایک غیر شاعرانہ دماغ کو واہیات نظر آنے والی چیزیں کتابوں میں نشانی کے طور پہ رکھی جاتیں۔ نہ جانے اس نے کتنے ہی لال سفید اور پیلے پھول لوگوں کو اپنا گنوار اتحفہ بنا کر دے دیے۔ کتنے ہی سیب اور شربت کے گلاس ساتھ مل کر چار ہونٹوں نے چومے...

مگر وہ پھر بھی پیاسی ہی رہی۔

انتخاب نے اُسے ایک نایاب نسخہ سکھا دیا تھا۔ اگر شوہر کو سدھانا ہو تو بھوکا رکھو۔ حکومت کرنا ہو تو بھوکا رکھو، یہ جو گنتی کے سفید کروڑوں کالوں پر راج کر رہے ہیں یہ سب بھوک کی پالیسی کی بدولت۔ نتھنوں میں خوشبو آئے، رال ٹپک پڑے، زبان باہر نکل آئے مگر کھانا مت دو۔ پیٹ بھر جاتا ہے تو کھلانے والے لقموں کا مزہ دوبارہ نہیں یاد رکھتا۔ حلق سے اُترا سو گیا۔ بس ہونٹوں تک بات کر، حلق سے دور!

وہ اُن سے اوندھے سیدھے کام لینے سے بھی نہ چوکتی۔ رات کو دس گیارہ بجے اُسے یکایک ناریل کے خوشبودار تیل کی ضرورت ہوتی۔ موجودہ تیل یا تو بدبو دینے لگتا یا جلد سے اُتر جاتا۔ وہ اسی وقت انہیں موٹر میں دوڑاتی۔ پٹرول کی قلت کے باوجود اگر جوہی کی خوشبو کا ناپسند ہوتا تو واپس کروا کے مولسری کی مہک کو لاتے اور گورنمنٹ سے "ضروری کاموں" کے نام سے پٹرول لیتے یا پھر کالا بازار چوپٹ کھلا تھا۔ نئے نئے رنگوں کی جارجٹ کی تلاش میں انہیں دِلّی، کلکتے تک ہلکان کر دیتی۔ اس کے علاوہ اُن سے تکیوں کے غلاف بدلواتی۔ گدّے جھٹکواتی، پردے ٹنگواتی، ٹخنے سے ہیئر پن سے شلوار میں کمر بند ڈلواتی اور اُلجھا ہوا اون سلجھانے کو دے دیتی۔

سر میں تیل سوائے شاعر کے کسی سے نہ ڈلواتی کیونکہ انہیں چمپی کرنی بہت مزے کی آتی تھی۔ ساتھ ساتھ کندھے بازو اور کمر بھی بڑی اچھی دبلتے تھے وہ انہیں اس معاملے میں چھوٹی موٹی محدود رعایتیں دے دیتی، اور کنگھی کرتے میں جب وہ ہر بال کی شان میں فی البدیہہ آزاد نظم کہتے تو وہ حیرت زدہ ہو کر دائیں گال کے تل کے قریب چھنگلیا کا دہنی ناخن رکھ کر بیٹھ جاتی۔ اُسے آئینے میں بغیر دیکھے اس تل کے پاس ناخون پہنچانے کی مشق ہو گئی تھی اس صفائی سے کہ چھپ نہ جائے اور یہ حرکت بالکل غیر ارادی معلوم ہو۔

اگر وہ کسی سے جل اُٹھتی تو۔ شاعر پر اپنے لاڈ کی بارش شروع کر دیتی۔ وہ بے چارا سب سے کمتر سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا اُس کو یوں چڑھتا دیکھ کر لوگ ضبط کے دائرے سے پھسل پڑتے لیکن اگر سنٹر بہت زور سے پڑ جاتا تو وہ فوراً لبسوٹنے والے کو منا لیتی۔

باوجود ان مظالم کے اس نے ہر ایک کو یہی یقین دلا رکھا تھا کہ وہ انتہائی درجے کا بے رحم

سخت دل اور غصہ ور ہے، جب چاہے بے چاری کا دل توڑ کر رلا سکتا ہے۔ لہٰذا وہ سب یہی سمجھی مارا کرتے تھے کہ جب چاہیں اُسے تڑپا تڑپا کر رُلا سکتے ہیں اور یہ تھا بھی ٹھیک ذرا سا کنپٹیوں پر زور ڈالتی اور آنسو چھلک پڑتے۔ سب کا یہی قول تھا کہ اس کی آنسوؤں میں تیرتی ہوئی آنکھیں بالکل جل پریاں معلوم ہوتی ہیں اور جب رونے رونے اس کا بُرا حال ہو جاتا تو وہ خود بھی رو پڑتے پھر دو محبت بھرے دلوں کے آنسو ایک ہی رومال میں جذب ہو جاتے۔

جو اصول اُس نے بنا رکھے تھے اگر کسی بے صبرے نے توڑنے کی ہمت کی تو وہ ایک دم باسی ہار کی طرح اتار کر پھینک دیا گیا۔ اگر چاہتے ہو تو جتنا ملتا ہے کلیجے سے لگاؤ اور صبر کرو، نہیں چاہتے تو...... ٹھنڈے ٹھنڈے گھر سدھارو۔

کون کہتا ہے کہ بے پیے نشہ نہیں ہوتا۔ بعض ایسے بھی ہیں جو صرف سونگھ کر مست ہو جاتے ہیں، بعض اوروں کو پیتا دیکھ کر جھوم لیتے ہیں کچھ ایسے ہیں کہ شراب و کباب کے اشتہار پڑھ کر ہی مدہوش ہو لیتے ہیں۔ یہی حال جنسی زندگی کا ہے۔ بعض ایسے ہیں جنہیں قصہ کہانیوں ہی سے چین پڑ جاتا ہے۔ چند کند ذہنوں کو تصویروں اور فلموں سے مدد لینی پڑتی ہے اور اچھے بھلے بگڑ کر بھی ان چیزوں کو دیکھ کر نہ جانے کون سی بھی ہوئی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ تو بس یہ لوگ بھی ان طبقے کے تھے جو پانے کی امید میں کمنڈل لیے دروازے پر ڈٹے ہوئے تھے۔ یہ وہ خوب جانتی تھی کہ وہ خواہ انہیں کتنا بھی اُلو بنائے آج یا پھر کبھی وہ خود اپنے ضمیر سے بھی اپنی بے وقوفیوں کا اعتراف نہ کریں گے۔

مگر ایسے لوگوں کو ٹھکرا دینا بڑی حماقت ہے، نا امید ہو کر تو وہ فوراً ہی جو کچھ نہ پا سکے تخیل میں پا لیں گے اور وقت آنے پر اصل جیسی نقل کر کے ڈینگیں ماریں گے ہزار باتیں دل سے جوڑ کر لگا دیں گے۔

وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اُن کی مجال نہیں جو وہ جدا ہو کر اُسے بھول سکیں کم از کم اس کا خیال اُن کے اکیلے پن کو تو دولکی ہی دیا کرے گا۔ اس کا ذکر کر کے وہ بیوی اور دوسری معشوقاؤں کو حسد کی آگ میں جلایا کریں گے جب جی چاہا معشوق پولیس کے ڈنڈے کی طرح بیوی کی چاند پر دے مارا موقع بے موقع کسی کی یاد میں ایک کھولتی ہوئی پھنکار مار کر نیم غنودگی میں لُڑھک گئے

دُکھ بھری رنگین مسکراہٹ کے ساتھ سب کو چھوڑ کر دور رومان کی گودمیں اُڑ گئے

"آہ کیا ساڑی پہنی تھی اس رنگین شام کو رگ رگ مہک رہی تھی بالوں میں نہ جانے کیا انشہ آور عطر چھڑک رکھا تھا کہ دل مچلا جاتا تھا۔ کبھی بار میں نے چپکے سے جھک کر بالوں میں ناک گڑو دی۔۔! بس کافی ہے ایک بدبودار اور بدشکل بیوی کو جلا کر بھسم کر دینے کے لیے۔

وہ ان سب پر یہ بھی ظاہر کیے رہتی تھی کہ اوروں سے تو صرف مروّت کی وجہ سے ملتی ہے۔ اصل چوٹ تو آپ ہی نے لگائی ہے۔ اگر ایک سے بے تکلف ہوتی تو چاہتی دوسرا بھی دیکھ لے کہ ایک چوٹ پر کھانا پکے تو اُپلے کی آنچ بیکار نہ جائے۔ کچھ نہ کچھ وہاں بھی کھنتا رہے یہ بڑا کارگر حربہ تھا اور اس کی فتح کا سب سے بڑا راز۔

وہ اب کبھی کہیں نہ جاتی "ان پناہ گاہوں" کے بغیر اس پر وحشت طاری ہو جاتی بار اگر کبھی جاتی تو انھیں کی موٹروں میں وہ مخبر یہ پیچھے پیچھے خرید و فروخت کی پوٹلیاں ——
جوتوں کے بنڈل لپکٹوں کے ڈبے، تازہ ترکاریوں کی گٹھیاں لاد کر چلتے مہینے کی جنس موٹر میں پہنچا جاتے۔ دھنیا گھٹا ہوتا تو دوسرے پھیرے میں بدلوا لاتے۔ یہی نہیں وہ سیکڑوں ایسے کام کرتے جن کا اگر ان کی بیویاں ذکر بھی کر دیتیں تو مارے شرم کے ڈوب مرنا بہتر سمجھتے۔

شاعر بے چارے کے پاس اپنے شعروں کے سوائے اور رکھا ہی کیا تھا جو اس کے قدموں پر نچھاور کر دیتا۔ لہٰذا انھوں نے اپنی نئی تصنیف اس کے نام معنون کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس انوکھے تحفے میں اُسے بڑی دلچسپی نظر آئی اور بڑے سوچ بچار کے بعد اس نے خود نہایت رسیلے اور چٹ پٹے جملے ڈھونڈ کر نکالے۔

"اس کے نام جس کا نام میں نہیں لے سکتا۔"

"شرارت بھری آنکھوں کے نام۔"

"اُس برق صفت کے نام جس کی نگاہوں کے تازیانے میں برداشت نہ کر سکا۔"

یا

"اُس برق صفت کے نام جس کی نگاہوں کے تازیانوں نے میرے دل پہ گہری لکیریں کھینچ دیں۔"

"اُس شعلۂ رخ کے نام جس نے میری زندگی کے تاروں کو اپنے حُسن کی مضراب سے لرزا دیا۔"

"اس سیماب وش کے نام جس نے میری رگوں میں پارہ بھر دیا"

گو اُسے قطعی یقین تھا کہ وہ نہ ہی برق صفت ہے اور نہ ہی سیماب وش پھر بھی اُسے بڑا لطف آیا مگر آخری جملے سے نہ جانے کیوں وہ خود ہی چڑ بیٹھی ایسا معلوم ہوا وہ کسی مشتہر دوا کا بھونڈا اشتہار ہے۔ اُسے شاعر سے خواہ مخواہ کا بیر ہونے لگا وہ ان سے اکتا چکی تھی اور سمجھ میں نہ آتا تھا اب اُن سے کس رُخ نمٹے سوائے نہ وہ اِن سب کو جلد از جلد سوکھے پتوں کی طرح جھاڑ دینا چاہتی تھی مگر اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اُسے بھول نہ جائیں پھر یہ ہنٹر کوڑے سب فراموش ہو جائیں گے یہ گہری لکیریں دھندلا پڑ جائیں گی اور رگوں میں بھرا ہوا پارہ ٹھنڈا پڑ جائے گا پھر وہ لوگوں سے اس کا ذکر بالکل بیوا کی طرح کریں گے ناکامیاں انہیں گندہ ذہن اور دروغ گو بنا دیں گے۔

پروفیسر سے اس کی عموماً گھٹی چھنتی رہتی تھی وہ بے رحمی کی حد تک صاف گو اور پھکڑ انسان تھا کبھی کبھی تو شیطان کو شبہ ہونے لگتا کہ وہ شکار ہے یا خود شکاری بھیس بدلے ہوئے ہے۔ نہ جانے کیوں جب وہ خاموشی سے اُسے گھورتا تو اس کا جی چاہتا وہ لوہے کی چادر میں لپٹ جائے بارہا اس نے بھولے سے اس پر تیر اندازی کی مگر معلوم ہوتا تھا تیروں کی نوکیں کسی چٹان سے ٹکرا کر لوٹ پڑتی تھیں اس پر پروفیسر کی عقابی آنکھوں کی طنزیہ مسکراہٹ۔ وہ چراغ پا ہو کر پلٹ آتی اور پہلے سے زیادہ محتاط ہو جاتی۔

مگر اس نے ہار تو نہ مانی غنیم کی کمزور رگ ٹٹولتی رہی۔ ایک بار دلپوراتا نہ داؤں پر لگانے کی ٹھان لی۔ جی دھک دھک کرتا تھا کہ اگر اس نے اس تھال میں ٹھوکر مار دی تو؟ دو چار چکنی چپڑی باتیں کر کے ایک دن پروفیسر کو ٹٹولا۔

"آپ اپنی نئی کتاب کس کے نام معنون کریں گے" مگر پروفیسر نے بدک کر دیکھا۔ گویا کھانے سے پہلے سونگھتا ہے۔

"جو بھی امتحان میں پورا اترے"

"کیا فیس داخلہ ہے؟"

"کچھ بھی نہیں اور بہت کچھ"

"اور نہ بھی آپ لوگوں سے کون جیتے گا بھلا یہ جواب مجذوب کی بڑ ہے کوڑ مغزوں کے

کیا سمجھ میں آئے۔"

"پھر وہی بنانے کی ....."

"تو یہ ہے آپ تو بڑے بے اعتبار ہیں" پروفیسر نے ایک گہری سی نگاہ اس پر ڈالی اور شمن جلدی سے کھسک کر شاعر کے پہلو میں ہو رہی۔ تایا یا یہ سانپ کھیلنے کا نہیں۔ مگر تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ پروفیسر بھی کندھے پر آن کھڑے ہوئے۔

"کیا بگڑ گئیں" انھوں نے اس کے پیر میں چٹکی بھر کر پوچھا۔

"نہیں تو"

"پھر اس طنطنے کا مطلب کتاب تو واقعی چھپ رہی ہے اور معنون ....."

"کس کے نام معنون کریں گے، اپنی مری ہوئی ماں کے نام؟" جل کر پوچھا۔

"میری والدہ زندہ ہیں!" پروفیسر مالن گئے۔

"اوہ معاف کیجیے گا، تو باپ کے نام؟"

"وہ مر چکے۔"

"یہ کیا مصیبت ہے جسے مردہ سمجھو وہ زندہ اور جسے زندہ سمجھو وہ مرجاتا ہے تو پھر اپنی بیوی کے نام۔"

"بیوی نصیب ہی نہیں۔"

"ورنہ کرتے ضرور آپ یہ حماقت"

"سننے سے پہلے بولنے سے کیا حاصل، میں کہتا ہوں بیوی ہی سراسر حماقت ہے۔ اگر ہو تو پھر کتاب کیا انسان عقل و خرد سب ہی اس کے نام سے معنون کر دیتا ہے۔"

"اونہہ شوق سے کیجیے، بیوی چھوڑ ساس کے نام کر دیجیے۔"

"بگڑتی کیوں ہو محبوبہ کے نام کیوں نہ کر دوں۔"

"ہیٹھیے" اُسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

"مگر بھئی میں شاعر جیسے جملے سخت ناپسند کرتا ہوں۔"

"آپ بڑے گودڑ ہیں۔"

"ہو سکتا ہوں مگر بھئی نہ تو میری خشک اور اجڑی زندگی میں تال اور نہ ان پہ کوئی مضراب ہیں مارے۔ معاف کرنا اگر برا لگے تو......" وہ مکاری سے مسکرایا۔

"مجھے کیوں برا لگتا" حالانکہ اسے سخت برا لگ رہا تھا اور جی چاہتا تھا اس کا منہ کھسوٹ ڈالے "اچھا وہ دوسرا "چھلانگ" اس کا ڈیڈی کیشن" وہ تو لیپہ ہے"

"اجی لاحول ولا قوۃ...... خورشید تاباں فرسودہ اور تازہ زبانے.. بخط ندی"

"جانیے میں آپ سے نہیں بوتی کیا بگاڑا ہے اس لئے آپ ہر وقت بے چارے کا مذاق اڑاتے ہیں مانا کہ وہ آپ جیسا مکار نہیں"

"میں مکار ہوں" پروفیسر نے چہک کر کہا۔

"اور کیا آپ تو سیدھا ہے"

"تم نہیں جانتیں کتنا چلتا ہوا ہے۔ جانتی ہو نواب...... کی بیگم صاحبہ کا کتنا منہ چڑھا ہے۔ چار جگہ سے وظیفہ بیٹھا ہے۔ ایک دھکے کے ساتھ چند گذرے ہوئے واقعات آگے بڑھے مگر شمن نے دونوں ہاتھوں سے انہیں دور جھٹک دیا۔ شکر خدا کا اس نے شاعر پر کبھی رحم نہیں کھایا تھا۔

"وہ دن یاد ہے جب آپ نے میری ساری چوڑیاں توڑ دی تھیں" وہ تیزی سے بات ٹال کر بولی۔

"یاد ہے" پروفیسر نے برا مان کر کہا گویا ایسے اہم واقعات کو بھول جانا جرم تھا۔

"آپ کو رنج ہوا تھا؟"

"تمہارے آنسو دیکھ کر خود کتنے بہائے تھے۔ وہ سب موتی میرے رومال پر جمع ہیں"

"اب تو دھل گیا ہو گا"

"نہیں دوسرے پانی میں تو اتنی طاقت نہیں کہ ان موتیوں کو بہا سکے"

"خیر تو...... سنیے آپ کسی نئے مجموعہ کو دیکھیے اور ایسے لکھیے تو کیا معلوم ہو اُن ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام"...... نہیں صرف ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام"

وہ تیار بیٹھی تھی کہ اگر پروفیسر کچھ کہے گا تو فوراً مذاق کی طرف بات پلٹ دے گی۔ مگر نہ جانے آج وہ کس موڈ میں تھا۔

"بڑی تیز ہو تم۔"

"اور خاک پوش پر ٹوٹی ہوئی چوڑیاں بکھری ہوں..... کیوں؟"

"اوہو، مصوری میں بھی دخل ہے؟"

"کیوں نہیں۔" اس نے بات بنتے دیکھ کر لہو۔۔ بے زور سے ہلّہ بول دیا۔

"لائیے آپ کی تصویر بنا دوں۔" اس نے پروفیسر کی کلائی پکڑ کر اس میں اپنے لمبے ناخن گڑو دیے اور قبل اس کے کہ اُن کا بلبلاتا ہوا ہاتھ اُسے پکڑتا وہ تڑپ کر باہر روش پر نکل آئی۔ جہاں عام نوکروں کے سامنے انھیں نہایت تہذیب کے ساتھ اونچی آواز میں موسم اور ریاست کے متعلق گفتگو کرنی پڑی۔ بے چارے دیر تک پیاسے پلّا کی طرح ہانپتے رہے پھر چل دیے۔

"ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام" چھپ کر آ ہی گئی۔ مگر واقعات نے دوسری ہی کروٹ لے لی۔ شاعر فوراً کھٹک گیا۔ کچھ دن سے پروفیسر بڑے بے وقت ضروری باتیں کرنے آنے لگے تھے۔ وہ غریب اور کوئی تحفہ نہ دے سکتا تھا تو یہ گیتوں کی مالا ہی اپنی دیوی کے چرنوں پر چڑھا دی تھی۔ مگر سب ہی ایرے غیرے نتھو خیرے دماغی بننے لگے تو یہ تو یاد ہی بھیجتا تا ہوا آیا۔ تھوڑی دیر تو خاموش ضبط کیے بیٹھی رہی پھر چل اٹھی۔

"مگر اس میں آپ کا کیا نقصان؟"

"نقصان تو نہیں مگر تم کو ہر ایک کو ایسے سر نہ چڑھانا چاہیے۔ گویا گویا....."

"کچھ نہیں گویا گویا۔ اونہہ جل گئے آپ کہ باریکی خیال میں وہ آپ سے بہت آگے نکل گئے "ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام" اوہ کتنا حسین تخیّل!"

"شہ، بالکل نکما اور بے معنی، جی!"

"اونہہ، آپ خود نکمے اور بے معنی، جی!"

"آپ کا یہ حسنِ ظن ہے میرے متعلق... چوٹی کے شعرا میں میرا نام ہے۔"

"اُونہہ سب الّو ہیں چوٹی کے شاعر......"

"مس شمشاد!"

"مسٹر شاعر!"

"آپ کو میری ہتک کرنے کا کوئی حق نہیں......"

"اور آپ کو میرا بھیجا چاٹنے کا کوئی حق نہیں۔ دماغ پک گیا آپ کے اوندھے سیدھے شعر سنتے سنتے......"

"میں......تیا......آپ......"

"کیا میں......آپ......کچھ نہیں......کوئی بات بھی ہو......اچھی عاشقی ٹھہری گز گز بھر لمبی غزلیں سنو......سلام ایسی محبت کو......ہم للہ ورے ہی بھلے!"

"میں آپ کو ادب پرست اور......"

"جی معاف کیجیے میں کچھ ادب پرست نہیں۔ یونہی آپ کو الو بنانے کے لیے سُن لیتی تھی......تشریف لے جائیے اور آئندہ گرلز کالج کی چہار دیواری میں قدم رکھنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ شریفوں کی لڑکیاں پڑھتی ہیں کوئی چکلہ نہیں یہ......"

"اور اب تک......"

"اب تک میری مرضی!"

"میں نے......میں نے خود اپنا گلا گھونٹ لیا......"

"بہت اچھا کیا آپ جیئیے خود اپنے آپ کو دشمن بھی کر دیجیے......جائیے......"

"جا رہا ہوں......مگر آپ کو اتنا اختلاط پسند نہیں سمجھتا تھا......مگر......"

"جائیے بھی، اور اس اگر مگر کو میری طرف سے گھورے پر ڈال دیجیے گا۔ جائیے اور دنیا والوں سے کہہ دیجیے کہ میں بدمعاش اور آوارہ تھی......اور آپ کی داشتہ رہی......جائیے......"

شاعر کے چلے جانے کے بعد منی کا دورہ پڑ گیا۔ شکر ہے اس دن اور کوئی ... ورنہ وہ تو تشنہ مزا سی بیٹھی تھی۔ ویسے فرصت بھی لوگوں کو نہ تھی۔ کام پڑا تھا

کی ریاست میں سپاہیوں کی بھرتی شروع ہو گئی تھی لہٰذا وہ کامریڈی چھوڑ کر نئے سرے سے نواب زادہ بن کر خان بہادری کا پودا سینچنے لگے۔ ادبی اور ترقی پسند جلسے بھی پھیکے پڑ کر درہم برہم ہو چلے تھے۔ دو چار کو جیل میں بھرا اور پالیسی بدل گئی۔ زیادہ تر قومی جنگ کے متعلق "کام" کرنے لگے۔ روس کی جنگ دنیا بھر کی جنگ بن گئی۔ اور اس لیے انسان کی جنگ ہو گئی تھی۔ انجینئر صاحب بیرون چوگنی تنخواہ پر سدھار گئے۔ دنیا کچھ سونی ہو گئی۔ ہٹلر چھلانگیں مارتا دوڑنے لگا۔ ادھر جاپان کو بھی چھینکیں آنے لگیں۔ مشرقی جزائر میں جنگ کا بڑھ رہی تھی الاؤ کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

یہ بات چلی آ رہی تھی۔ پروفیسر آن پہنچے۔ وہ کچھ حدود سے بڑھنے لگے تھے اور ٹنڈی شاخ کی طرح یہی رہ گئے تھے۔ یہ شاید چھٹی بار اس کی زلف کے بال یا اور کوئی دوسری نشانی مانگنے آئے تھے۔ اصل میں راز و نیاز کے سب کل پرزے گھس گھسا چکے تھے ایک ہی رومان دس دس بار دہرائے جانے کی وجہ سے سڑ چکا تھا۔ جتنے چھپا اٹھے تھے سیاسی گرمی بھی کچھ مردہ ہو چکی تھی۔ بھوک کا سوال تیزی سے اٹھتا جا رہا تھا۔ فوجی بھرتی اندھے لولے لنگڑے کالے سب سمیٹ کر ہڑپ کیے جا رہی تھی۔ جو کل تک کوڑی کوڑی کو محتاج تھے آج وردی پہنے رعب گانٹھتے پھرتے تھے جیسے دیکھو لفٹننٹ بنا اکڑ رہا ہے اور جب بھوک کم ہو گئی تو تناؤ بھی ڈھیلا پڑ گیا اور یہ زندگی کی دوڑ بھاگ ہے بھی تو اس پیٹ کے بھاڑ ہی کی خاطر ہے زیادہ سے زیادہ پیٹ بھر دو اور ان پیٹ بھرے ہوئے پٹھوں کو توپ کے آگے دھر دو چیں بھی نہ کریں گے اس کے باوجود ایک بے غرضی اور لاپرواہی چھائی ہوئی جیسے لڑائی نہیں سٹے کا بازار لگا ہوا ہے جتنا ہو سکے پیسہ گھسیٹ کر لے جاؤ موقع ہے لوگوں کو ضرورت ہے خرید لینے کو پیسہ ہے۔ کوڑا کرکٹ بھر دو ان کی جیبوں میں ویسے وار فنڈ بھی جمع ہو رہے ہیں ناچ تماشے کے ذریعے پیسہ بھی جمع کیا جا رہا ہے...... سب کچھ حاضر ہے مگر دل حاضر نہیں۔ کیوں دل لگائیں؟ کس کی خاطر لگائیں؟ اتنی بار جو خون کی ندیاں بہائیں تو اس کا کیا اجر ملا؟ یہاں تو بھوک اور برہنگی ویسی کی ویسی ہی جا رہی۔ جہالت ایک قدم پیچھے نہ ہٹی۔ مرض ایک انچ دور نہ ہوئے۔ جرمنی مرے یا روس، جاپان مرے یا فرانس، ان ادھ مرے سسکتے انسانوں کو کسی کے دکھ کا کیا احساس! دکھ سے

گھبرانا کیسا؛ یہاں دکھ بھوگ لو تو وہاں جنت ملے گی۔ خیر ویسے جو آقا کا حکم، اپنے بس نہیں ہوک کے ڈنڈے کے بس ہی سہی۔

پروفیسر کے لاڈ ضرورت سے زیادہ ہو چکے تھے ہر چیز سے جی کبھی کا اکتا چکا تھا سب مل گئے تھے مگر نہ جانے کس آس میں پر تعینات تھے۔

"نئی کتاب کے لیے کوئی نام تجویز کرو"، ایک دن اٹھلا کر بولے۔

"نام؟..... کیا ضرورت ہے نام کی؟ کیا بے نام کے کتاب نہیں چھپ سکتی!" جلی تو بیٹھی ہی تھی۔

"نام سے میرا مطلب ہے ٹائیٹل!"

"جی اتنی اردو جانتی ہوں کچھ بھی ہو ایک ہی بات ہوئی!"

"تمہارا مطلب ہے بے نام....."

"ہاں کیا حرج ہے ایسی گمنام رہنے والی کتاب کا نام رکھنا بے کار!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ لوگ چرائے ہوئے خیالات لفاظی میں ڈبو کر مصنف بننے کی کوشش کریں تو..."

"یہ کس کے متعلق کہہ رہی ہو، میرے خیالات تجربات پر مبنی ہیں!"

"ضرور..... ذرا بتایئے تو کتنے گاؤں دیکھے ہیں جا کر لستی پی ہے اور چنے کا ساگ کھا کر آک کے ڈنڈے سونگھے ہیں؟ کتنی معصوم دیہاتنوں کی عزت لوٹی اور حرام کے بچے پیدا کر ڈالے ہیں؟ سب یکوا س بیٹھے بیٹھے بڑ ہانکنے لگے بڑے قوم کو سدھارنے چلے ہیں، ہنہ!"

"میں قوم سدھار کا قطعی قائل نہیں میں لیڈر نہیں ہوں!"

"تو پھر ناحق کاغذ کالے کرنے ہوئے سوائے رنڈی کی حمایت کے اور منظور ہی کیا ہے آپ یہ آپ رنڈیوں کے کیوں اس شدت سے طرف دار ہیں؟"

"میں......"

"آپ وہاں جانے میں تو طبیعت مکدر ہو جاتی ہے اور چاہتے ہیں گورنمنٹ بجائے جنگ سے سر مارنے کے رنڈیوں کے کمرے سجائے وہاں ٹمٹماتی لالٹین کے بجائے بجلی کے ہنڈے لگا

سسنے تیل کی جگہ ایوننگ اِن پیرس کے کنستر لنڈھائے"۔

"کیوں نہیں ......"

"مگر آپ کو اپنا گھر بھول کر رنڈیوں کی بہتری کی کیوں پڑ گئی دنیا میں اور بھی دکھ ہیں سب کو چھوڑ کر بس ان بے چاریوں پر رحم آ گیا ہے"۔

"کچھ بھی ہو وہ دنیا کے جسم کا ایک حصہ ہیں اور کسی عضو کو سڑتے دیکھ کر میری حساس طبیعت"

"کچھ نہیں، بڑی بے چاریاں! ہنہ نہ جانے کتنی ان سے بدتر بے چاریاں گھروں میں پڑی سڑ رہی ہیں"۔

"بھلا ان کے بارے میں کیا لکھ یا جان سکتا ہوں۔ مجھے کیا معلوم پردے کے پیچھے کتنے زنداں خانے قائم ہیں اور کیا ہو رہا ہے دوسرے بھی نہ ہی مجھے اس گھریلو عورت سے کوئی دلچسپی ......"

"کیوں ہو گی، بس آپ کی ساری دلچسپی رنڈی میں جذب ہو گئی"۔

"بے شک وہ میرے کام کی ہے ...... وہ میری ہے ...... یہ پردے میں چھپی ہوئی پری یا وہ عورت جسے ہم غلطی سے تعلیم یافتہ کہتے ہیں ...... ان سے مجھے کیا ملتا ہے"۔

"خیر یہ بھی مانا مگر آپ تو حقیقت نگار بنتے ہیں"۔

"پھر؟ کوئی اعتراض ہے؟"

"جی مجھے اعتراض کا حق تو نہیں مگر پوچھتی ہوں اِن رنڈیوں کی تو آپ رگ رگ سے واقف ہیں۔ کیا مرد ایسے ہی نہیں ہوتے ذرا انھیں بھی تو ڈھونڈھ کر سامنے گھسیٹ لایئے۔ بس انھیں ہمیشہ ظالم، بے رحم، دغا باز، حرام کے بچے پیدا کرانے والا ہی دکھانے میں یہ بڑے روشن خیال بنتے ہیں مگر آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ عزت اور عصمت صرف عورت ہی کی ہوتی ہے مرد اِن فضولیات سے پاک ہے ..."

"ایں؟"

"جی اور آپ اسی حالت میں عورت کی حمایت کرتے ہیں یعنی اسے یقین دلاتے رہنا کہ وہ چیز جو مرد کے لیے باعث فخر ہے اس کے لیے گناہ ہے بس یہی ہے آپ کا انصاف اور ترقی پسندی ......"

"ہر بات کو الٹا دیتی ہو، سنتی کم ہو"۔

"کیونکہ سننے کو کوئی بات بھی ہو سننے کے لیے کچھ نہیں سب زبان کے چٹخارے کے لیے

ہے کیوں صاحب آپ کی عریانی عورت کے سینے تک کیوں رہ جاتی ہے"۔

"ایں؟......" پروفیسر زور سے ہنسے۔

"نہیں مگر کبھی اپنی عریانی پر بھی تو نظر ڈالیے...... بس بھبک گئے کتوں کی طرح......"

"آج بڑا مزاج گرم ہو رہا ہے...... پانی پی لو غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا"۔

"میں بتاؤں کیوں لکھتے ہیں یہ عریاں چیزیں؟"

"میرے منع کرنے سے کیا مان جاؤ گی...... بتاؤ"۔

"سینہ مرکز جنس ہے بس اس سے کھیل کر جی ٹھنڈا کرتے ہیں......"

"اچھا بابا، کیا بات تھی اور کہاں پہنچ گئیں...... معلوم ہوتا ہے......"

"کیا......؟"

"کوئی تازہ چوٹ کھائی ہے؟"

"چوٹ! ہنہ آپ نے کیسے جانا"۔

"تمہاری کھسیانی صورت اور روتی ہوئی باتوں سے یہ نمی کے جلے پھپھولے میرے سر کیوں پھوڑ رہی ہو۔ کیا میری جنس کا بدلہ تم مجھ سے لینے کا ارادہ کر لیا ہے مجھے تو بہت شناچیں، کچھ سننے کی بھی ہمت ہے یا صنفِ نازک کی ڈھال آگے کر دو گی"۔

"میں بزدل نہیں دوسرے آپ سے تو......"

"تو سنو مجھے تمہارے اوپر رحم آتا ہے"۔

"شکریہ! مگر وجہ اس دریا دلی کی؟"

"رحم بعض وقت بے وجہ بھی آتا ہے......"

"تو مجھے آپ کی عقل پہ......"

"ہاں، شاید ہم دونوں قابلِ رحم ہیں۔ تم اپنے آپ کو ڈھونڈھنے کی کوشش میں کھو بیٹھی ہو اور میں نے تمہیں پہچاننے کی کشمکش میں اپنا بہت سا قیمتی وقت برباد کر دیا۔ ایک بار بازاری عورت کو چھوڑ کر بقول تمہارے شریف عورت کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی تو قدم قدم پر آنکھوں میں خاک جھونکی گئی...... اور اتنے دن جھک

مارنے کے بعد پتہ چلا کہ عورت خواہ وہ کوئی بھی کہیں بھی ہو اُسے سمجھنے کی کوشش کرنا حماقت ہے وہ سمجھنے کے لیے نہیں استعمال کے لیے ہے۔ ہاں اتنا اندازہ ہو گیا کہ تم معمولی قسم کی عورت نہیں مگر بڑے رنگین مغالطوں میں مبتلا ہو اپنے آپ کو انتہائی ذہین سمجھتی ہو، حالانکہ قطعی نہیں صرف ضرورت سے زیادہ چرب زبان ہو، بڑے بچھے دادیاں کرتی ہو۔

"دیکھو ...... اندر ......"

"اور زیادہ حساس بننے کی کوشش نہ کرو۔ میرے خیال میں جتنے دکھ سہہ کر تم ڈھٹائی سے ہنس سکتی ہو قابل داد ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم بہادر اور مضبوط ہو۔ انتہائی بزدل ہو بیوی کے زخم کو پالا بنا لیتی ہو تم سمجھتی ہو کہ یہ تمہارا رویہ جو ہم سب کے ساتھ رہا ہے بہ طاقت کا ثبوت ہے؟ قطعی نہیں بے وقوف، یہ تمہارا اپنی نسائیت کو چھوئی موئی بنا کر رکھنا یہ تمہاری سب سے بڑی بزدلی ہے۔

"اچھا بے وقوفیوں کو میری بزدلی بتا رہے ہو۔"

"بے وقوفیاں؟ تم اپنے لیے بے وقوفی کہتی ہو تم جیسی دہکتی ہوئی آنچ کے سامنے سے برف کے ٹکڑے کی طرح صحیح و سالم نکل آنا بزدلی اور بے وقوفی نہیں بلکہ بہادری کی انتہا ہے اور یہ جو ہم نے تمہارے کالج کے کلاس کی قدر کی اپنے جی پر پتھر رکھ کر تو تم سمجھتی ہو تم ہمیں اُلو بناتی رہی حالانکہ ہم جان بوجھ کر اُلو بننے میں بڑا لطف اٹھاتے ہیں۔ ہم جو کچھ تم سے لینے آتے تھے مل جاتا تھا بخدا میرے دل میں ایک بار بھی اس سے آگے قدم بڑھانے کی خواہش پیدا نہ ہوئی اور کیوں ہوتی۔ کوئی نایاب شے تم ہمیں بہانے سے دیتیں جو ہمیں بازار سے سستی نہ ملتی۔ تب جیسے تم خود جانتی ہو کہ تمہاری کشش اتنی [illegible] ہیں کہ مثلاً صمد کو خان بہادری کے خطاب سے زیادہ نہ ہو۔ نہیں۔ اچھے تمہیں چھوڑ کر بیروت چلا گیا۔ کیا تم سمجھتی ہو تم اُسے روک سکتی تھیں۔ تم جیسی ہزاروں دیتا ہے وہ بیروت میں کتنی چھوڑ گیا ہو گا۔ تمہیں!

رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا جو اُس کی جاہل اور بے وقوف بیوی کو ہے۔ تم شعلہ ہو۔ مگر ماں کے سینے جیسی پُرسکون گرمی تمہارے پاس نہیں۔ تم جلا سکتی ہو، مرہم نہیں لگانا جانتیں توڑ سکتی ہو بنانا نہیں آتا...... ہا ہا ہا... سچ بتاؤ تمہارے ماں باپ تمہیں بہت ہی چاہتے ہیں؟"

"ماں دونوں گھٹنا چھوٹے آنکھ......"

"مجھے یقین ہے بالکل نہیں چاہتے" پروفیسر نے سختی سے بات کاٹی "یقیناً تم اُن کی چھوٹی آنکھ کا تارا نہیں۔ جبھی تو ملک میں اتنا خطرہ پھیل رہا ہے لوگ اپنے پیاروں کو دور لے جا کر چھپا رہے ہیں، مگر کسی کو معلوم بھی نہیں...... کہ تم بھی جان دار ہو، تمہیں بھی حفاظت کی ضرورت ہے۔"

"میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔"

"ہاں، ہاں، یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ تم اتنی ہوشیار ہو کہ اپنے ساتھ اور جارج کو بچا لے جاؤ گی۔ ناقدری اور دوسروں کی بے مروتی کی تم اچھی طرح عادی ہو چکی ہو۔ دنیا نے تمہارے زخم دکھا دکھا کر بے حس بنا دیا ہے اسی لیے تمہارا وار زیادہ خطرناک ہوتا ہے ضرور شاعر سے تم نے اپنے کسی عاشق کا بدلا لیا ہے جو تمہیں نامراد سسکتا چھوڑ گیا۔"

"بڑے عقل مند معلوم ہوتے ہیں!" جیسے شمن کی زبان سوکھ گئی تھی۔

"چھوڑو میری عقل کو۔ اور مجھے تمہاری تنہائی پر ترس آتا ہے۔ بالکل اس سڑک کی طرح جس کے سینے پر رات دن راہ گیر چلتے ہیں پھر بھی وہ خود اکیلی خاموش اور بے جان ہے...... معاف کرنا میں نے بارہا تمہارے چہرے پر مجمع میں تنہائی کا کرب دیکھا ہے جب تمہیں دکھ ہوتا ہے قہقہے لگاتی ہو، جب خوشی ہوتی ہے تو آنسو بہاتی ہو۔ ہر چیز کو تم نے دھوکا بنا رکھا ہے۔ خیر دنیا کو دھوکا دینے میں کوئی ہرج نہیں لیکن اپنے آپ کو دھوکا دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔"

"جی، شاید ابھی نئی کہانی کا پلاٹ بنا رہے ہیں۔"

"میری کہانیوں میں انسان نہیں مُردے بستے ہیں زندہ یا قدرتی موت مرے ہوؤں پر لکھ سکتا ہوں مگر تمہارے جیسے خودکشی کیے ہوئے غیر انسانی ذہن کے متعلق میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہاں اتنا ضرور مانتا ہوں کہ تم جیسے ہنستے کھیلتے مُردے بہت کم دیکھے ..... بُرا نہ ماننا جو کچھ کہا ہے جذبۂ رحم سے مجبور ہو کر ...... کل جا رہا ہوں بی بی سی سے دعوت نامہ آیا ہے ..... کاش میں اس سے قبل تم سے سچ بول سکتا"

"تو آپ مانتے ہیں کہ آپ جھوٹے ہیں"

"اور کیا ..... جھوٹے کے سامنے سچا ہمیشہ ماند پڑ جاتا ہے۔ اس لیے جھوٹ ہی چمکایا پر آج جب تم سچ بولنے لگیں تو میرا حجاب بھی ٹوٹ گیا ... اچھا ہی ہوا ویسے سچ بات تو یہ ہے کہ ....."

"کہیے کہیے۔ آپ لوگوں کی دروغ بافی نے اکتا دیا ہے اور جی چاہتا ہے کسی کے ہونٹوں سے سچ سنوں، کہیے خواہ وہ سچ میرے مُنہ پر جوتا بن کر ہی لگے"

"تو سنو ..... بات یہ ہے کہ ..... میں نے ..... معاف کرنا تمہاری توہین ہوتی ہو تو ..... تم سے کبھی شادی کی درخواست تو نہیں کی، اور نہ ہی ایسے بے اصول کھکڑ انسان سے کوئی لمبا چوڑا معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ کم از کم اپنے ہوش و حواس میں تو تم جیسی غیر مستقل مزاج عورت سے سوائے وقتی دل چسپی کے کوئی گہرا تعلق قائم کرنے کی کوشش کروں گا نہیں۔ شادی تو بڑی چیز ہے۔ میں تو تمہارے پڑوس میں بھی نہیں رہ سکتا ..... دیکھتی ہو ہماری ایک منٹ نہیں بنتی ہم ایک دوسرے کو خطرناک حد تک تاڑ چکے ہیں"

"اچھا تو یہی تھی آپ کی صاف گوئی جس سے مجھے نقصان پہنچنے کا ڈر تھا"

"ہاں مگر نہ تو تمہیں نقصان پہنچا اور نہ ہی دکھ ہوا۔ میں جانتا ہوں تم احساس کی حدوں سے باہر ہو چکی ہو۔ تمہاری خودداری کو اتنی ٹھوکریں لگی ہیں کہ وہ ایک بے حیا گتیا بن گئی ہے۔ تم سے اتنا چھینا گیا ہے کہ اب تم خود ہی سب کچھ اٹھا کر پھینک دیتی ہو"

"کوڑا جمع کرنے سے فائدہ؟"

"ہیرے بھی تمہاری نظروں میں پتھر بن چکے ہیں۔"

"ان میں سے ایک درخشاں ہیرا تو شاید آپ ہیں....." شمن نے انتقام بھرا قہقہہ لگایا۔

"میرا ذکر چھوڑو۔ ہم تم ایک دوسرے کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ مگر تم نے شاعر کو ٹھکرا دیا، تمہیں کیا معلوم ہے وہ چھ سو روپے پر وار پروپیگنڈے کے سلسلے میں نوکر ہو گیا ہے۔" پروفیسر شرارت سے مسکرایا۔

"تو آپ کا خیال ہے چھ سو روپے نے اُن کی ساری کثافتوں کو دھو ڈالا ہے۔"

"کثافتیں صرف غربت سے ہوتی ہیں ورنہ تم کیا جانو اِن لونڈوں میں لپسے ہوئے سینوں میں کیا کیا گھناؤنی گندگیاں پوشیدہ ہیں۔ میں تو اتنا کہنا چاہتا تھا کہ جنگ ہمارا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے۔ ہر چیز مہنگی اور انمول ہوتی جا رہی ہے۔ اچھا ہے ایک کارندہ پھانس لو وقت بے وقت کام آئے گا..... میں تو بے کار انسان ہوں ویسے میں تو شدت سے طوائفوں کا حامی ہوں۔"

"کبھی ان کے ہمدرد بن کر....."

"ہاں ہمدرد بن کر ہی تو چاہتا ہوں کہ اُن کی حالت پیرس کی طوائفوں جیسی ہو جائے جیسے تم تعلیم نسواں کو ضروری سمجھتی ہو میں......"

"تو آپ اُن کے وجود پر مُصر ہیں!" شمن نے بات کاٹی۔

"میں بے چارا کون مُصر ہونے والا۔ دنیا مُصر ہے اور رہے گی۔ انھیں دنیا سے مٹانے کی کوشش کر کے تو دیکھ لیا۔ مرض مٹا نہیں دب کر پہلے سے زیادہ سڑاند چھوڑ رہا ہے اور ناسور کی جڑ میں چھپ رہا ہے جس کی لپیٹ میں صدہا آ چکے ہیں اور آتے رہیں گے ہمارا فرض ہے کہ اس زخم کو کم سے کم کھول کر مرہم پٹی تو کریں شاید صاف ہوا سے عفونت کچھ کم ہو جائے۔"

"ایک طرف اشتراکی بنتے ہیں دوسری طرف طوائفوں کے پیغمبر!"

"اشتراکی دنیا میں اِن باتوں کا جھگڑا ہی نہ ہو گا۔ ہر ایک کو حسبِ ضرورت راشن..." پروفیسر مسکرایا۔

"غلط، بالکل غلط یہ آپ نے نہ جانے اشتراک کو کیا سمجھ رکھا ہے..... توبہ آپ کا خیال ہے۔ وہاں عورتیں مفت دال چاول کی طرح بٹا کریں گی، غلط آپ لوگ کتنے زبردست

مغالطے میں ہیں۔ سمجھتے ہیں جیسے جنت میں حوریں ملیں گی۔ ویسے ہی اشتراک عورتیں بخشنے لگے گا۔ ہنہ بس تھیوری پڑھ لی اور اشتراکی بن گئے۔ ایسے اشتراکی ہندوستانی اشتراکی بےشک ہو سکتے ہیں مگر اصل مقصد اشتراک کا کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ ہی کس بات کا یقین کیا جائے اتنے بڑے اشتراکی بنتے ہیں اور اتنی زبردست تنخواہ سمیٹنے جا رہے ہیں۔"

"یہ میری قابلیت کے دام ہیں۔"

"جب آپ سے زیادہ قابل اور محنتی آپ کی تنخواہ کا پچاسواں حصّہ بھی نہیں پاتے آپ نے اس بےہودہ نظام میں شرکت ہی کیوں قبول کی۔"

"مصلحت وقت ہے..... دیکھنا کیا ہوتا ہے!"

"کچھ نہیں بڑے بڑے دعوے دار روپوں کی ڈھیریوں میں دب کر گم ہو گئے تو آپ کی کیا حقیقت ہے۔ اپنے کام سے کب فرصت ملے گی جو کچھ سوچیں۔ یاد ہیں وہ دن جب آپ گورنمنٹ افسروں کو گالیاں دیا کرتے تھے انہیں غدار کہتے تھے اور گورنمنٹ کی نوکری کی شیخی پر سر پیٹتے آئے ہیں تا یہی کہ جب تک آپ کو چالیس روپے کی نوکری ملی آپ غصے رہے جونہی یاروں کی دولت ملی حکومت کے پیارے بن بیٹھے ہنہ یہ ہے ہمارے نوجوانوں کی ذہنیت کا خلاصہ۔ یہ ساری ہائے ہائے یہ کسان پرستی یہ گاؤں سدھار اپنی نوکری تک ہے اب تو ہر طرف آپ کو شانتی نظر آتی ہے کوئی خون آشام آندھیاں نہیں اٹھاتا، کوئی سرخ بارش نہیں برساتا، یہ نئی سرخی اتنی زرد کیوں پڑ گئی روس کو مار کھاتا دیکھ کر سب کے منہ اتر گئے۔ ابھی روس جیتنے لگے دانت نکال کر ہنسنا شروع کر دیں۔"

"روس نے حماقت کی..... جو ہٹلر سے لڑ بیٹھا..... جانے دو سیاست میں ٹانگ اڑانا عورتوں کو نہیں بھاتا مرغی اذان دینے لگے تو ذبح کر دینا ٹھیک ہے..... ہاں تو میرے خیال میں سارے کام چھوڑ کر تم جیسے معمے حل کرنا چاہییں۔ تم جیسی عورتیں ہی اس بستی کی ذمہ دار ہیں۔ جب پیٹ سے ہی بچہ تمہارے جیسے توڑ پھوڑ اور خودغرضی کے منصوبے باندھ کر آئے گا تو دنیا میں اس کے علاوہ اور کیا کرے گا۔ مگر تم کیا کرو..... تمہارا قصور نہیں، قصور ہی پچھلے نظام کا ہے جہاں تم جیسے بچے پیدا ہونے پر مجبور ہیں بھلا سوچو اس ذہنیت کے ساتھ تمہیں کیا احساس ہو سکتا ہے کہ ہمارا ملک خطرے میں ہے اس سے شل کر دو ہر ہے اس کا

قید کریں ہم خود ہی مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ہم کیوں اپنے ملک کو ہمیشہ غیروں کے ہاتھ بیچتے آئے؟ اس لیے کہ ہم جانتے ہیں یہ ہمارا نہیں ہمارے مالکوں کا ہے اور ہم نسلی ازلی خادم ہیں پھر مالکوں کی چیز سے محبت کیسی اور اس کی تباہی پر دکھ کیسا؟ کیوں نہ اسے بہتر داموں اٹھا دیں۔ بھلا فرق ہی کیا ہے۔ کالے نہیں پیلے، پیلے نہیں سفید کیسے ہی ہوں ہمیں تو آقا سے مطلب ہے' ہمارے ملک کی حیثیت ہماری نظروں میں کبھی بھی ایک بیسوا سے زیادہ نہ رہی خود غرض فریبی کے ہاتھ ہمیشہ بکتا رہا۔ مال گائے اور زمین کی جتنی بے قدری یہاں ہے کہیں نہ ہوگی پھر بھی ہم ان کی پوجا کی ڈینگیں مارتے ہیں خیر تو مجھے اعجاز مسیحائی کا یقین نہیں مگر سوچتا ہوں شاید جڑ کا ایک آدھ تار زندہ رہ گیا ہو اور بارش سے جاگ اٹھے..... اور وہ پودا جسے ایندھن سمجھ لیا گیا ہے.....''

''ایندھن؟''

''ہاں..... تم جیسی ہستیاں دنیا کی بھٹی کو گرم رکھنے کے لیے سوائے ایندھن کے اور کس کام آسکتی ہیں یہی نا کہ مرنے سے پہلے دو چار سو لولے کیوں کو جوڑیوں کے جوڑ ملانا اور ساڑھی باندھنا سکھا جاؤ گی۔ یہی ہو گی تمہاری قومی خدمت..... لیکن شاید..... ایک بات پوچھوں؟''

''جلدی سے پوچھیے اور.....''

''تمہیں کبھی کسی نے پیار کیا..... اوہ جواب دینے کی ضرورت نہیں تمہارے مقدس ہونٹ تمہاری پارسائی کی گواہی دے رہے ہیں..... میں سوچتا ہوں..... تمہارے اوپر تجربہ کیا جائے تو کیسا رہے'' پروفیسر نے سگرٹ پھینک دیا اور عجیب نظروں سے شمن کو دیکھا اور اس سے قبل کہ وہ کچھ سوچ سکے انھوں نے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر نرمی سے اس کے باغی ہونٹوں کو چوم لیا۔

''ہٹیے..... بدتمیز..... جنگلی..... مگر وہ کسے دھکا دے رہی تھی۔ لمبے لمبے قدم رکھتے وہ باہر ہی سائیکل لے کر سڑک کے موڑ پر غائب ہو گئے'' ٹھہرو..... ٹھہرو.....''

اس نے اپنے دماغ کے اندر کسی باغی گھوڑے کو ٹاپیں مارتے پاکر چمکارا سب ٹھیک ہو جائے گا ..... کوئی بات نہیں..... ایسی کوئی بڑی بات نہیں تھا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر

اب کیا ہو؟..... کیا ہو؟ بگڑے ہوئے رہوار نے لگامیں تڑاتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں...... اس وقت جانے دو..... سوچنے کی بالکل گنجائش نہیں۔ رگیں بہت زور سے تن رہی ہیں..... ذرا دباؤ ڈالا تو چٹاخ سے ٹوٹ جائیں گی..... چلو چپکے سے پلنگ پر لیٹ جاؤ..... نیند پاس ہی کھڑی ہے۔ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا۔"

پھر اچھی بیٹی کی طرح وہ پیر اٹھاتی پلنگ کے پاس پہنچی۔ سر سنبھال کر تکیے پر رکھا اور آنکھیں پپوٹوں سے ڈھک لیں۔

"آج تو اس نے کہنا مان لیا اور جو آئندہ نہ مانا تو؟ مشکل ہو جائے گا۔ اس بگڑے ہوئے دماغ کو منانا!" اس نے سونے سے پہلے فکرمند ہو کر سوچا۔

ہاتھ پیر آرام سے غنودگی میں ڈوب گئے۔ مگر دماغ سوتے میں بھی اچھی ہوئی سسکیاں بھر رہا..... دور اپنے پیچھے اس نے گھوم کر دیکھا وہ لمبی چوڑی سڑک جس پر معلوم ہوتا تھا کسی اژدھے کے گھسٹنے کے لہریے کھنچے ہوئے ہیں..... اس کے پیچھے دوڑتی چلی آ رہی تھی۔ دہشت زدہ ہو کر اس نے چاہا لوٹ پڑے اور اس بھیانک نشان کو مٹا کر صاف ستھری سیدھی لکیر کھینچ دے..... مگر یہ خم تو فولاد کے تار کی طرح ضدی ہو چکے تھے، ایک ہی چوٹ میں کیسے چنچ جائیں گے! منہ پھیر کر اس نے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر دوڑنا شروع کیا، اور ناک کی سیدھ میں آنکھیں بند کیے بھاگتی چلی گئی۔

الٹا

"یہ الٹا، یہ سیدھا!" اُس نے لڑکیوں کو کشیدہ کاری سکھاتے وقت کپڑا فرش پر پھیلا کر بغور دیکھا، مگر وہ فیصلہ نہ کرسکی! کاش اُسے معلوم ہوجاتا کوئی ایسی طاقت جو کبھی جھوٹ نہیں بولتی، کبھی دھوکا نہیں دیتی اس کے کان میں آ کر بتا دیتی کہ کپڑے کا رُخ کون سا سیدھا ہے۔ اگر غلط رخ پر کشیدہ بن گیا تو پھر کیا ہوگا؟ جنگ کی امداد کے سلسلے میں جو مینا بازار لگایا جانے والا تھا اس میں یہ چیزیں بے کار ہو جائیں گی۔

ویسے ہی اس کا کام کتنا سست پڑ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا مشین میں ہولے ہولے زنگ لگتا جا رہا ہے۔ پیچ اڑ گئے ہیں اور ہینڈل نہیں گھومتے۔ لائبریری کی نئی کتابوں پر ابھی نمبر درج نہیں ہوسکے تھے۔ رجسٹر ادھورے پڑے تھے۔ حاضریوں کو جوڑ کر میزان نکالنا اس کا دم گھٹا جاتا تھا۔ اس جمع تفریق سے رسید کی کتابیں بغیر دستخطوں کے جمع ہوتی جا رہی تھیں اور فرنیچر کی سالانہ جانچ نہیں ہوئی تھی...... کیا ہوگا؟ یہ مشین کیسے گھسیٹی جائے گی؟

اور اوپر سے یہ کپڑا! صبح سے کئی بار وہ کام رکوا کر اسی غور میں ڈوب گئی کہ کپڑا سیدھا ہے یا الٹا۔ کئی استانیوں نے ایک رُخ کے بارے میں رائے دی اور کسی نے دوسرے رخ کو سیدھا بتایا..... مگر وہ رائے عامّہ کے اوپر اس وقت بھروسہ نہیں کرسکتی۔ عوام کچھ نہیں جانتے۔ آنکھ بند کر کے ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔

کئی بار اس نے سب سے چھپ کر بذریعہ قرعہ بھی صحیح رخ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ چپکے سے دو پرچیاں لکھ کر موں کے ڈبوں میں ڈالیں۔ ہیڈ ٹیل کیا۔ اونگ۔ اطمینان نہیں ہوا۔ اتنی بار دھوکہ کھانے کے بعد اُسے کسی پر یقین نہ آتا تھا۔ کیا پتہ جو یہ قرعہ بھی جھوٹ بول رہا ہو اُسے پھنسانے کے لیے کوئی چال چل رہا ہو۔ اور اتنی باریک کشیدہ کاری غلط رخ پر کڑھ گئی تو کیسے ادھیڑی جائے گی۔ تمام کپڑے کا قیمہ ہو کر سوراخ ہو جائیں گے اور پھر اُن گڑھوں کو کیسے پُر کیا جائے گا؟ یہ ننھے ننھے سے آنکھوں میں کھٹکیں گے اور اس کی نیندیں تلخ کر دیں گے!

یہ اتنا گھچر پچر کام ہندوستان میں کیوں پسند کیا جاتا ہے؟ یورپ والے کیسے بڑے بڑے پھول کاڑھتے ہیں! دلکش بھی آسان بھی اور صوفیانہ بھی! لیکن یہاں تو ہر چیز ایک پیچ سے چپکی ہوئی، ایسے کہ سانس بھی نہ لی جائے ایک جان اور اس کے ساتھ یہ مینا کاری! ہر چیز الجھی جاتی ہے۔ الجھے ہوئے دماغ سے نکلی ہوئی ساری چیزیں آپس میں گتھم گتھا ہوئی جاتی ہیں کوئی آنکھیں کیسے بکھیرے!

جوں جوں رخصت کا دن قریب آتا گیا اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ غارت ہو۔ یہ دار فنڈ اور مینا بازار! کیا ہو گا اس پیسے سے لڑائی میں جائے گا اور مرہم پٹی کے کام آئے گا ایک طرف زخمی کرنے کے لیے نئے نئے آلے ایجاد ہوں گے دوسری طرف ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ریسیں دوڑیں گی۔ یہ خوبصورت کشیدہ کاری لاکھوں ٹینکوں اور بموں کی صورت میں انسان کی طرف سے انسان پر برسائی جائے گی جسم لیسیں گے، خون کے دھارے بہیں گے ظالم اور مظلوم سب ہی ایک ہی دلدل میں منھ دیئے جائیں گے!

اور یہ بھولے بھالے سپاہی، جنگ شروع ہوئی اور ان کے دام بڑھے۔ پھر تو سب ہی کچھ ان کا ہے ملک ان کا۔۔۔۔۔ عالیشان عمارتیں ان کی قوم خطرے میں۔۔۔۔ ان کے باپ دادا کی ہڈیاں خطرے میں۔۔۔۔ شاندار عمارتیں یہ مندر اور مسجدیں سب ان کی جب تک سکھ چین رہا انھیں بے موسم کا پھل سمجھ کر کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور آج جنگ کے بھوکے دیو کا منہ بھاڑ کی طرح کھلا ہوا ہے۔ جھونکے جاؤ گھان پر گھان! اس کے بعد؟ جب کھیل ختم تو پیسہ ہضم۔ توپیں پگھلا کر ریل کی پٹریاں بنائی جائیں گی اور بندوقوں کے فراٹے بھرتے موٹر بنیں گے۔۔۔۔ تھوڑی سی دھات ان کے حصے میں بھی تمغوں کی صورت میں آجائے گی جن سے آنے والے بچوں کے جھنجھنے بنائے جائیں گے جب کٹتے مرتے انسان تھک جائیں گے۔ ملا یہ ہو جائے گا سپاہی اپنا کٹا ہاتھ یا پیر لے کر گھر جا بیٹھے گا اور جب تک من چلے پھر نہ لڑ دیں وہ کبھی کبھی استعمال ہونے والے ہتھیار کی طرح پڑا زنگ کھایا کرے گا۔

جب لڑائی ختم ہو جائے گی، اسکی بدلی میں چھٹیاں ہوں گی دھرم یاترائیاں

ہوں گی اور سپاہی؟ اس سپاہی کا کیا ہو گا۔ اسے بھلا کر چور اچکے اور ننگے بھوکے فقیر ڈھالے جائیں گے۔

کوئی ان سے پوچھو کیوں لڑتے ہو کمبختو؟ مانا کہ آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور تمہیں کچھ سوجھتا نہیں ذرا یہ بھی تو سوچو کہ جن ماؤں نے جنم دیا ہے ان کے جی پر کیا گذرتی ہو گی۔ خوش قسمت ہیں وہ مائیں جو بانجھ رہیں یہ سب ان مردوں کا کیا دھرا ہے انھیں یہ سپاہی جننا پڑتے تو پتہ چلتا کیا بیتتی ہے جی پر!

بینا بازار کی کامیابی کا سہرا باندھنے سے پہلے ہی سر جھکرا اٹھا طاقت ضبط ہار گئی۔ توازن دماغ ڈگمگانے لگا۔ لہذا چھٹی لے کر گھر آرام کرنے کے ارادے سے چلی گئی۔ یہ جنگ کے زمانے میں اپنوں کی ضرورت کتنی بے رحمی سے محسوس ہوتی ہے جی چاہتا ہے کسی میں جذب ہو کر چھپ جاؤ اور پھر عمر میں ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھنا چاہیئے کہ اپنوں کی محبت کا کیا مزا ہے شاید یہاں ہی اسے وہ سب کچھ مل جائے جس کی تلاش میں وہ آتنا بھٹکی کہ کوئی کوچہ نا آشنا نہ رہا۔

یہ بھائی بہن! اس نے انھیں بھولنے کی کیوں کوشش کی تھی۔ ایک ہی شکم میں سب نے تکمیل پائی۔ ایک ہی گھر میں بڑھے پلے جیسے ایک ہی پیڑ کی بہت سی پتیاں مگر جب ڈال سے ٹوٹ کر ایک پتی گری تو زمانے کی ہوا اسے کتنی دور اڑا لے گئی۔ لڑھکتے لڑھکتے جب تھک گئے تو اس نے پھر ایک کر شاخ پکڑ لی۔ عادت نہیں رہی تھی نا! اس لیے بڑا زور لگانا پڑا کندھے کھنچ گئے، مگر واپس ماں کے گود میں کتنا سکون ملا نیند سی آ گئی۔

ہیں؟...... ساری دنیا تو اس کے گھر میں موجود تھی! ایسی ایک خاندان میں کچھ ولائیتیوں جیسے گورے بھبوکا کچھ حبشی نژاد، کسی میں منگولی خون کی کڑواہٹ تو کسی میں ایرانیوں جیسا تیکھا پن۔ اور یہ سب چار پانچ عورتوں کی محنت کی کمائی تھی۔ اگر جرمنی کی طرح ہندوستان کو بھی صحیح خون کی ضرورت محسوس ہو تو خالص دیسی مال کتنا رہ جائے گا یہ حبشی تل پہ سفیدی؟ یا شاید آتنا بھی نہیں۔ آریوں کا

حصہ، ایرانیوں کا حصہ، اور پھر افغانی منگولی اور عربی خون اور پھر یہ جو تازہ تازہ ولایتی خون سامان جنگ کے ساتھ ساتھ لال کنٹروں میں بھر بھر کر آ رہا ہے یہ؟ .... ہندوستانی مٹی ہر بیج کو نگل لیتی ہے

ان او دے پیلے رشتہ داروں سے اس نے مذہبی عقیدت کے ساتھ جٹ کر محبت کرنی شروع کر دی۔ اس نے کبھی بچوں کو چوما نہ تھا اس لیے پہلے پہلے سخت ابکائیاں آئیں اور جی گھبرایا۔ کیا ناک تھوک میں لتھڑے ہوئے نامکمل انسان ان سے تو کتے بدرجہا بہتر۔

اگر خزاں کی ماری پنجاد وبارہ پیڑ میں لٹکنے کی ضد کرے تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بار پھر سے بہار لوٹ آئے؟ گرا ہوا انجیل طشتری سے بھاگ کر ڈال میں لٹکنا چاہے تو کیا وہ کامیاب ہو سکتا ہے؟ مرغیاں ہی اگر اپنی ماں کے پوٹے کے نیچے گھسنے کی کوشش کریں تو کیا سما سکتی ہیں؟ لٹکے لٹکے اس کے شانے ٹوٹنے لگے جتنی جتنی گرفت مضبوط کی ہاتھ پھسلتے گئے اور جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ پیسہ خرچ کر کے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے جیسی بھوک مٹائی جا سکتی ہے، پیٹ ناک تک بھرا جا سکتا ہے۔ مگر ممتا کسی دام نہیں ملتی کسی بچے کو اپنانے کی کوشش ایسی ہی احمقانہ حرکت ہے جیسے کوا دم میں مور کے پر لگا کر مور بننے کی کوشش کرے۔ کوے ٹھونگیں مارتے ہیں سو الگ، مالئے مور موقع پا کر شامت بلا دیتے ہیں۔ ناجائز بچے کی ماں پھر ماں تو ہے ورنہ اگر کولر پھول لگا لے تو کیا ہو؟

سب سے پہلے اس نے بڑے چاؤ سے بڑی بہن کی بچی پر دست شفقت پھیرنا شروع کیا۔ ماں بننے کے بعد شاید ڈھلا کھیلنے کی تمیز بھی خود بخود آ جاتی ہے مگر شمن کو تو الٹے لٹکنے کا مزا آ گیا۔ منٹیں بچی دن اور رات رو رو، جی چاہتا اس کی جان دار ریڈیو کی ایک بار ہی ایسی کل مروڑ دے کہ سدا کے لیے چپ ہو جائے۔ ٹھٹکے لٹا کر بچے کو تھپکنا بھی ایک فن ہے۔ ایسی مشین جیسی رفتار ہو کہ سر جھٹکا نہ کھائے صرف جھومتا رہے اور پھر ساتھ ساتھ منہ اور تالو کی مدد سے انتہا سے زیادہ عجیب و غریب

بے معنی آوازیں نکالی جائیں تاکہ بچے کو بیک وقت انسان مرغی اور چڑیا کی گود میں سونے کا مزا آجائے۔ تھوڑی سی سانس منہ میں جمع کر کے لھلا ٹے رے، پہ چھوڑ دی جائے ایسے کہ ایک پھوار کی صورت میں "رے" ڈھلتے ہوئے سکوں کی قطار کی طرح دوڑتے چلے جائیں پھر تالو سے زبان لگا کر انگریزی کے لفظ کیو کو بار بار ایک خاص تناؤ سے نکالا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ بچے کی کنپٹیوں پر تھپکیاں بھی لگائی جائیں۔ اگر یہ تمام حربے بے کار ثابت ہوں تو دو چار آدمیوں کی مدد سے قریب رکھی ہوئی اشیاء کو ہلا کر جھنجوڑ کر جتنی بھی آوازیں مہیا ہو سکیں مع اوپر دی ہوئی ترکیب کے ایک شور قیامت کی صورت میں بچے کے دماغ پر نازل کی جائیں اگر تھپکیاں باقاعدہ ہیں گھٹنے کی رفتار سائنس کے مقرر کردہ اصول کی پیروی کر رہی ہے تو انشاء اللہ بچہ سو جائے گا۔ اور اس طرح سویا ہوا بچہ عموماً جاگتے میں بھی دماغی طور پر سوتا رہے گا۔

بچی کو صحیح و سالم واپس کر کے اسے ایک گو نہ اطمینان ہوا بھلے کو بچی عارضی تھی اگر خدانخواستہ کہیں خود اس کے وجود سے مستقل طور پر پھوڑے پھنسی یا گانٹھ کی طرح پھوٹ نکلی ہوتی تو کیا حال ہوتا؟ کچھ تعجب نہیں جو اس ہندوستان میں اس کثرت سے بچے مرتے ہیں جو اس کے دل میں کئی بار خیال آیا کہ اگر چپکے سے وہ بچی کی رضائی اتار کر کھڑکی کھول دے صبح تک نمونیا اور پھر شام تک جھگڑا ختم چین سے پیر پھیلا کر سوئے۔ جو ان بچوں کی مائیں آنے والے بچے کی خبر سنتے ہی پاس پڑوس کی دائیوں سے راز و نیاز شروع کر دیتیں۔ مرض تو نہ جانا الٹی سیدھی لینیں لگ جاتیں اور جب وہ نیا بچی جنم لیتا تو بھی ہر ممکن کوشش اسے ختم کرنے کی کرتیں۔ مگر آخر کو ماں ہوتیں نا۔ مارنا بھی چاہتیں تو نہ مارا جاتا۔ جونہی نزع کی حالت شروع ہوئی مامتا بے قابو کر دیتی۔ جاتی ہوئی روح واپس گھسیٹ لی جاتی ساری عمر گھٹنے کے لیے۔

جب پہلی بچی کی ہیبت ذرا ختم ہوئی تو اس نے پھر ایک بچے کی سرپرستی شروع

کی بہ بدقسمتی سے ذرا کم رو تھا صحت خراب تھی اور گندگی سے خاص انس رکھتا تھا۔ بہت دوا دارو کی مگر جملہ امراض اُس کے جسم میں جڑ پکڑ چکے تھے۔ کوئی ہی ایسا مرض ہو گا جو دائمی طور پر اس پر قابض نہ ہو چکا ہو۔ ویسے مرنے ورنے کا کوئی خاص ارادہ نہ تھا۔

مجبوراً منجھو بی کی ضدی کی گڑیا جیسی بچی کے نام قرعہ پڑھا۔ بڑی تیاریوں سے کپڑے بنے اور اب کے شمن نے سنجیدگی سے گود لینے کے مسئلے کو سوچا۔ جاتے وقت پھوپی ایسا روئی جیسے وہ بچی کو زندہ دفن کر چلی۔ ہزار دل تھپیں! "ماں زامت تمہارا عقدہ بہت تبر ہے!" وہ کہہ گئی۔ اللہ کی شان یہ وہی منجھو بی تھی جس نے ذرا سی عمر سے اُسے اتنا سے لے کر پالا تھا۔ یقیناً وہ منجھو بی کی بد ذات بچی سے تو ہزار گنا بہتر ہو گی جبھی تو پل بھی گئی۔ پر اسے تو دو دن پالنا دو بھر ہو گیا۔

اب نئی خبر کوؤں اور موروں نے وہ چونچیں دھار رکھ رکھ کر جائیں کہ مزا آگیا۔ بچی بھی سانپ کے منہ کی چھچوندر بن گئی نہ اُگلے بنے نہ نگلے۔

"چہ چہ ...... اے ہے اتنی سی جان کو ماں سے چھڑا لیا .... تو بہ"

"اے ہے پرائے بچوں پہ کیا چونچلا، ایسا بھی ظلم نہیں چاہیے" جتنی زبانیں اتنی بکواس۔ جلتی اور اس امید میں سر جھکا لیتی کہ شاید لوگ تھک کر چپ ہو جائیں گے۔

وہ طعنے بھی برداشت کر لیتی کیونکہ بچی غضب کی پیاری تھی مگر رات کو ظالم نے وہ ستم ڈھایا کہ جاڑوں کی رات میں اولا برف پانی سے نہلانا پڑا۔ دوسرے دن نمونیہ اور تو چار دن میں بچی ختم۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بچی اُسے شرمندہ کرنے کو شرط لگا کر مر گئی۔ رنج کو شرم اور غصے نے دبا لیا۔ جی چاہا کاش وہ دن واپس لوٹ آتے جب منجھو بی اُسے پال رہی تھی کیا کیا ظلم جو تا کرتی تھی۔ اگر اُسے معلوم ہوتا تو منجھو بی کے منہ پر طمانچہ مارنے کو ہی مر جاتی۔ دو دن بعد منجھو روتی پیٹتی کالک ملنے آ پہنچی۔

ایسی ایسی باتیں سنائیں جو کبھی وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ منجھو نے سارا الزام اس پر تھوپ دیا۔ بس نہ تھا جو وہ اُسے قتل عمد کے جرم میں گرفتار کرا دیتی۔ شمن نے جواب میں

ہوتا تو وہ ایسی ایسی دس بچیاں جن کر منجھو کے منہ پر کھینچ مارتی۔ تو یہ تنا چھوڑا نہ سمجھتی تھی منجھو کو اس کا دل رکھنے کو رونے کی بھی کوشش کی۔ بچی کے سارے نئے نئے کپڑے خیرات کر دیے اور دھوم دھام سے پھول چالیسواں کیا، گویا بچی نہیں گناہوں کی پوٹ مری تھی جس کی بخشش دشوار تھی۔

اور اس پر طرّہ یہ کہ لوگوں نے سمجھانے وقت صاف کہہ دیا کہ یہی بچی منجھو کو انگلی پکڑ کر سیدھی جنت میں لے جائے گی۔ یہ معصوم بچے جنتی ہی نہیں بلکہ زبردست سفارشی بھی ہوتے ہیں مگر یہ جو کچھ شمن نے پھول چالیسویں پہ روپیہ بہایا سب منجھو کے توشے خانے میں جمع ہو گیا پھر بھی منجھو کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر روتی رہی۔

ایک سر پھرا منہ زور بیج چٹان کے سپاٹ سینے سے چپک کر پھلنے پھولنے کی آس لگا بیٹھا لاکھوں موجیں آئیں کہ بہالے جائیں مگر چٹانوں سے سر پھوڑ کر لوٹ گئیں۔ پھر ایک دن وہ بیج بھی پتھر بن گیا۔ پروفیسر کا خط آیا "یہاں لڑکیاں اتنی نیامتیں ہیں کہ شادی فضول معلوم ہوتی ہے۔ اگر تم بطور مہمان (یاد رہے لفظ مہمان!) آنا چاہو تو مکان کافی بڑا ہے"

"پتھر بن جانے والا بیج اس تھوپڑ کے لیے چھاڑ سے بدرجہا غنیمت ہے جو گھُن بن کر سوکھے کی جڑ کاٹ رہا ہے وہ انسانی بھیڑیا جو کرسیاں توڑنے کا کرایہ ہزار روپے وصول کر رہا ہے۔ دوسروں کو کس منہ سے نصیحت کر رہا ہے؟" شمن نے جواب دیا "مہمان نوازی کا شکریہ۔ اگر ایسا وقت آن پڑا تو دیکھا جائے گا۔"

"وقت چھپر پھاڑ کر نہیں آپڑے گا تمہیں خود لانا پڑے گا۔ ورنہ یاد رہے یہ وقت آنے میں تو دیر کرتا ہے جانے میں ایسی تیزی دکھاتا ہے کہ سوائے ہاتھ ملنے کے کچھ نہیں رہ جاتا۔ ڈرو اس وقت سے جب تمہیں کہنا پڑے۔

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے؟

اس عرصے میں اس نے ایک اور بچے کو اپنانا چاہا مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ انسان یکسانیت سے کیوں اکتا جاتا ہے۔ جبھی اس نے پرورش کا بھی اندازہ ہوا کہ اس کی حیثیت بالکل

اس زمین جیسی تھی جس کی چھاتی پر چڑھ کر ہر ایک اپنا پیٹ بھر لیتا مگر پھر اُسے بنجر کہہ کر چھوڑ جاتا۔ یوں تو یہ بچہ بالکل سیدھا سادا تھا مگر باوجود کوششوں کے اُس نے اپنی ماں کے آنچل سے چھولنا نہ چھوڑا۔ شیمن سے اپنا خاطر کروا کر وہ سیدھا ماں کے کلیجے سے لگ بیٹھا۔

"پرایا...... پرایا" اس کے کانوں میں بار بار گرم سا خون کی طرح گھسنے لگا۔ ایک بار ہی اُس نے جھٹکا مار کر ساری بندشوں کو توڑ ڈالا...... کوئی نہیں اُس کا اور اُسے ضرورت بھی کس کی ہے؟ وہ خود کیا ناکافی ہے؟

دوسرے دن شام کی گاڑی سے اس بکھرے ہوئے "خود" کو سمیٹ کر روانہ ہو گئی کہاں؟...... وہ کہاں جا رہی ہے؟ یہ اُس نے بالکل نہ سوچا۔ اتنی لمبی چوڑی دنیا میں وہ جہاں چاہے جا سکتی ہے۔ اور کیوں نہ جائے؟ مانا کہ کوئی منزل نہیں۔ یا در کھی اچھا ہے کیوں ہو کوئی منزل؟ ان بادلوں کی بھی تو کوئی منزل نہیں۔ جہاں اور جدھر جی چاہا بغیر پروگرام بنائے چل نکلتے ہیں۔ جہاں جی چاہا برس گئے۔ جی چاہا تو بھیگے کو بھگو دیا اور جی نہ چاہا تو پیاسوں کو ترساتے نکل گئے۔ ان آندھیوں کا بھی تو کوئی گھر نہیں ادھر کا کوڑا اُدھر گھسیٹ لے جانا، سنسان غاروں میں چیخیں مار مار کر دوڑنا، چٹانوں پر سر پھوڑنا، دریا کی چنچل موجوں سے الجھنا اور یونہی اٹھتے گرتے رہنا لطف بھی تو ہے۔ اس خانہ بدوشی میں۔ شاید کبھی کہیں ساحل مل جائے! اور یہ بھٹکی ہوئی ناؤ پار لگ جائے جو نہ لگی تو بھی کیا ہے؟ کچھ ہرج ہے۔ اسی طرح بہتے چلے جانے میں نہ پتوار نہ بادبان اور نہ ناخدا کا احسان!

آگرہ!

وہ اتر پڑی۔ نہ جانے کیوں جی چاہا تاج محل کو دیکھے، شاید عشق و محبت کی اس عظیم الشان نشانی کو دیکھ کر دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ کیا لوگ تھے! بیوی کی محبت میں کیا کچھ بنا کر چھوڑ گئے کتنا مقدس رشتہ ہے یہ بھی مگر ایسی ہی یادگار کوئی دُنیا والوں کی محبت میں نہیں بنا جاتا جبکہ لاکھوں ہزاروں سڑک کے پتھروں پر سر رکھ کر زندگی گذارتے ہیں شہنشاہ اور ملکہ کی روحیں کیونکر چین سے پیر پھیلا کر سنگ مرمر کے سائبان تلے سو سکتی ہیں؟ باقی عمارت میں

چمگادڑیں اور الّو بستے ہیں۔ مزے ہیں ان کے ان الوؤں سے تو کوئی ٹیکس بھی نہیں وصول کرتا۔ بس یہاں تو مُردوں اور چمگادڑوں کے ہی ٹھاٹ ہیں۔ اگر سُکھ اٹھانا منظور ہو تو ایسے کرم کرو کہ دوسرے جنم میں چمگادڑ یا الّو کے روپ میں آ نا ملے یہی مکتی کا بلند ترین درجہ ہے

ہمیشہ سنا کرتی تھی کہ چاندنی رات میں تاج سچ مچ اندر کی پیشانی پر جگمگاتا ہوا ٹیکہ دکھائی پڑتا ہے۔ لیکن دن ہی میں اس کے اس عظیم الشان لاش کو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے شام ہوتے ہی شوقین مزاج کونے کھتروں میں دادِ عشق دینے کو آ موجود ہوئے۔ بسیتے مال سے آراستہ "حوریں" جن کے چہرے سفید پاؤڈر کی افراط سے کھنڈر میں دبائی ہوئی شکرقندی کی طرح مٹیالے ہو رہے تھے اور وہ اس جشنِ عیش میں جھینیوں کا کردار ادا کرنے کے لائق نہ تھیں۔

یہ مردے کے سینے پر بیٹھ کر جینے میں اُن لوگوں کو خاص لطف کیوں آتا ہے کیا کشش ہے اُن تیرہ سنگ توں میں جو زندگی کی ہر حسین انگڑائی اُن ہی کے سر پہ توڑنے کو جی چاہتا ہے شاید جذبۂ انتقام کچھ تسکین پا جاتا ہے "تم نے اپنی نام وری کے لیے صدیوں کا خون ان عمارتوں کی بنیادوں میں نچوڑ دیا ...... اور ہم ..... کسی فعل کے کرنے سے نہیں جھجکتے۔ کاش انتقام سیدھے راستے پر چل سکتا اور یوں نہ بھٹکتا۔

لاہو!

اس کا اور بھی جی گھبرایا۔ اگر اسے اختیار حاصل ہوتا تو شاید لیماراس سے زیادہ دلچسپ بنایا جا سکتا تھا۔ نورجہاں کے مقبرے کی عرصہ سے دھوم سنی تھی مگر اُسے یہ دیکھ کر ہنسی آ گئی کہ وہاں بھی گدھوں کو ہی سکون نصیب تھا۔

نورجہاں! دل کی گہرائیوں میں ایک عورت کی فتح دوسری عورت کے دل میں کچھ کھٹک سی پیدا کر دیتی ہے۔ آخر ایسی کونسی بات تھی جو نورجہاں سلیم کی ہستی پر یوں چھا گئی اور کون جانے اُسے شیر افگن سے زیادہ عشق تھا یا جہانگیر سے!..... یا پہلے شیر افگن سے اور پھر جہانگیر سے! اور ہو سکتا ہے ایک ہی وقت میں دونوں سے اہا ہو عورت کے دل میں محبت کی جدا جدا کوٹھریاں ہیں کسی میں ماتا کی، کسی میں شوہر کی محبت ...... اور کسی میں عاشق کی!

اور پھر اُس نے خود اپنے دل میں جھانک کر دیکھنا چاہا۔ یہ ان کوٹھریوں میں کیا ٹھنسا ہوا تھا۔ دھندا ور بادل کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ کاش وہ ان اُلجھے ہوئے ڈوروں کو سلجھا کر الگ الگ پنڈیاں بنا کر رکھ سکتی۔ عاشق محبوب اور دشمن سب ہی کے چہرے دھندلے ہو چکے تھے پنسل لے کر صرف ضروری نقوش گہرے کر دیتی اور باقی وقت کے گھسٹوں سے آپ ہی مٹ جاتے۔

دہلی!

اُسے ہر چیز بیمار اور بدنما نظر آئی۔ ٹوٹے مکان بنا جانے والوں کو کھڑے کوس رہے ہیں سڑتی ہوئی موریاں جو کسی کی ملکیت نہیں بھوکے کتے سڑک کے بدنصیب بیٹے، نہ جانے کس کی فرمانبرداری میں کس کی رکھوالی کر رہے ہیں۔ لمبے چوڑے دیواروں پر پھیلے ہوئے گھناؤنے امراض کے علاج جو بیکار کر لینے والوں کی مردانگی کی داد دے رہے ہیں مگر اس کی سوتیلی بہن نئی دہلی؟ صاف ستھری اجاڑ ہسپتال! معلوم ہوتا ہے چمگادڑیں یا روحیں بستی ہیں۔ بالکل جدید تاج محل کا نمونہ کبھی......

بہت اور نئے آقا آئیں گے تو اُسے اُن کے ابدی مالکوں کو سونپ کر نئے استھان بنائیں گے مگر یہ قطب مینار اتنی بلند مگر کتنی جلے کار، یہ اکیلا پاگل سا دروازہ اس کے کیا معنی یہ کیوں بھوت کی طرح ہاتھ پھیلائے کس کے لیے آغوش وا کیے ہوئے ہے؟

کہاں؟ کہاں؟ وہ کہاں جائے؟ اس بھول بھلیاں میں راستہ کیوں نہیں ملتا جی چاہا پردہ پھاڑ کر باہر نکل جائے پُرسکون خلا میں کچھ نہیں ہوگا اور کتنا سکون ہوگا روپیہ ختم ہو چلا تھا۔ واپس جا کر کہیں نوکری تلاش کر لینا مشکل کام نہ تھا۔ مگر کیوں؟ یہ وہ کس سے پوچھے ایلما اسے ایک دم یاد آ گئی۔ یقیناً اس نے اپنی "کیوں" کا جواب پا لیا ہو گا وہ اُسے ضرور تسکین پہنچائے گی۔ وہ سیدھی بانکی پور روانہ ہو گئی۔

ایلما کو دیکھ کر اُسے رشک ہوا۔ وہ کتنی سنبھل چکی تھی۔ وہ مسلسل تھکان کے آثار مٹ چکے تھے اور بڑی مستعد اور چست نظر آ رہی تھی۔ تھا ہی کیا ایک دوسرے کو بتانے کے لیے سوائے تنہا اور نہ گذرنے والی منحوس گھڑیوں کے۔ پھر بھی ایلما خوش تھی اپنے

حسا لیوں دور آلف کی بیوہ بنی زندگی کے دن گذار رہی تھی سسرال میکا، شوہر سب اُس ایک جان کے وجود سے ملا اور کھو گیا۔

پروفیسر ناتھن اب بھی اس پر مہربان تھے شام ہوتے ہی آجاتے اور رات گئے تک گپ شپ رہتی۔ کتابوں کے اس کیڑے کو اتنا زندہ دل دیکھ کر وہ متحیّر رہ جاتی۔ اُس کے ساتھ اور بھی چند پروفیسر آجاتے۔

"ان سے ملو شمن، روفی ٹیلر" ایلما نے اُسے ایک طرف بلا کر کہا اور شمن نے دیکھا وہ ایک چھوٹے سے سر اور شربتی بالوں والے گورے سے ہاتھ ملا رہی ہے اس نے مجبوراً رسمی تعارف کا جواب دیا۔ اسے ایلما کا یہ طریقہ قطعی پسند نہ آیا ٹیلر کو وہ اس قدر عزّت اور عقیدت سے دیکھ رہی تھی۔ گویا کوئی معمولی گورا انہیں بھگوان گھر میں پدھارے ہیں اُسے ان ہندوستانیوں سے ازلی نفرت تھی جو ان سفید چمڑی والوں کے ذرا سے منہ لگانے سے پھولے نہیں سماتے۔ اتنا نہیں جانتے کہ یہ لوگ جو ہم سے ملتے ہیں تو صرف اس لیے کہ واپس اپنے ملک جا کر لوگوں کو حیرت زدہ کریں کہ وہ ہم درندوں کے اتنے قریب پہنچ کر مطالعہ کرتے رہے پر نہ ہی ہم نے انہیں کاٹا اور نہ ہماری سیاہی نے اُن کی سفیدی کو گدلا کیا ہماری تصویریں دکھائیں گے کہ یہ ہیں وہ جنگلی بندر جنھیں ان کی تہذیب کی ہوا نے کپڑے پہننا سکھا دیے ہیں۔

ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں شمن کچھ اُداس ہو رہی تھی اس نے کئی بار گفتگو میں دلچسپی لینے کی کوشش کی مگر پھر دل کی اُلجھن میں کھو گئی۔ اکتا کر وہ کتابوں کی الماری ٹٹولنے لگی کہ کہیں لوگ اسے بالکل احمق نہ سمجھیں۔

"ضرور پڑھو...... لاجواب ہے۔" اس نے مُڑ کر دیکھا ٹیلر اس کتاب کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا جو شمن کے ہاتھ میں تھی۔

"شکریہ!" اُس نے بے توجہی سے کتاب رکھ دی اور دوسری اٹھالی۔

"ایک بات......" ٹیلر نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی "میں انگریز نہیں آئرش ہوں" سفید رنگ کا ہر آدمی انگریز ہی ہو سکتا ہے اس رنگ کی کچھ ایسی ہیبت بیٹھی ہوئی ہے کہ زیادہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، دوسرے اُسے آج تک کتنوں کو ٹٹولوں

اوہاں سفید انسانوں کی کبھی پہچان نہ مل سکی سب ہی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ گو بہت سے لوگ دانتوں کھروں اور چال سے نسل پہچان لیتے ہیں پر نہ جانے کیسے؟

"اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"اوہ میں خوب جانتا ہوں" اس نے شرارت سے اپنی لمبی پلکوں والی آنکھ ماری کہ بڑی آسانی سے شمن اسے اقدام جرم میں پکڑ دا سکتی تھی "تم لوگ سفید چمڑا دیکھ کر ہی بدظن ہو جاتے ہو۔ اور اس میں تمہارا قصور نہیں۔"

"بدقسمتی ہماری!" جل کر شمن پھر کتابوں کی طرف جھک گئی۔

"میرے پاس کچھ تازہ ترین کتابیں ہیں۔ اگر شوق ہے تو......" شمن کو بے اعتباری سے دیکھتا پا کر وہ کچھ کھسیانا سا ہو گیا "معاف کرنا اگر کوئی گستاخی ہو گئی ہو کہتے ہیں عورت کو سلام بھی کرو تو گالی سمجھتی ہے...... مگر میں سمجھا تھا تم ایلما کی دوست ہو...... شاید تم بھی اسی کی طرح......"

اتنے میں ایلما نے چائے کے لیے پکار لیا۔

"ارے تم ٹیلر سے نہیں ملیں شمن......"

"ہم مل چکے!" ٹیلر نے مسخری صورت بنا کر کہا۔

"ارے نہیں...... شمن یہ جرنلزم کے بہت شوقین ہیں۔ لڑائی میں شریک ہونے سے پہلے...... کیا لکھا کرتے تھے ٹیلر؟"

"ٹائمز سے خطے اخباروں کے" پروفیسر نا کھن بولے۔

"بڑا لائق آدمی ہے اور...... ہاں بھئی اکھٹو سینما نہیں ملے گا پھر" ایلما نے بے وقوفوں کی طرح سب کو گڑبڑانا شروع کیا۔

ٹیلر ردّی ہی نہیں انتہا سے زیادہ لچر تھا۔ چند گورے جنگلیوں کے بیچ میں داد طلب بہادری سخاوت اور انسانیت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ٹیلر چند سیٹیں چھوڑ کر بیٹھا تھا مگر کئی دفعہ جب شمن نے اس کی طرف دیکھا تو اُسے بھی اپنی طرف دیکھتا پایا اور کئی بار بے ساختہ دونوں کو ہنسی آ گئی۔

"اب یہ بھی میرے اعمال نامے میں لکھ لیا" کھیل کے ختم ہونے پر ٹیلر نے ملزمانہ صورت بنا کر کہا۔ اور شمن زور سے ہنس دی۔

رات کو ایلما نے ٹیلر کی بے انتہا تعریف کی۔

"تم بھول رہی ہو کہ یہ سفید چمڑی والے کیا ہوتے ہیں؟ یہی دیکھو یہ دنیا کے مارے دھتکارے یہودی پولش اور نہ جانے کون کون صرف اپنی چمڑی کے بل بوتے پر یہاں آ کر اینٹھنے لگے۔ آج کل تو جسے دیکھو شیر کی کھال اوڑھے شیر بنا پھرتا ہے۔ یہاں تو جو مہمان بن کر آتا ہے آقا بن بیٹھتا ہے۔"

"کچھ اس میں ہمارا بھی قصور ہے ذرا بازار میں جا کر دیکھو ہزاروں فقیر بھک منگے اور دوکان دار "صاحب" "سرکار" کہہ کر دوڑ پڑتے ہیں۔"

"وہ بے چارے کیا جانیں کون ہیں یہ، چاہے وہ انھیں کی طرح کنجر ملے چلے آئے ہوں مگر معلوم تو صاحب ہوتے ہیں اور رہتے بھی ٹھاٹ سے ہیں۔ ہم سے تو ہمارے مہمان ہی اچھے۔ ہم خود بھوکوں مر رہے ہیں مگر یہ دیکھو میزبانی میں فرق نہیں آتا۔ جب انھیں تمیز سے رہنا نہیں آتا تو پھر دھکا مار کر نکال دینے کو کیوں جی نہ چاہے۔"

"ارے یہ بھی مظلوم ہی تو ہیں ہٹلر کے مارے۔"

"ہٹلر کے مظلوم بھی ہمارے ظالم ہیں۔ ذرا سوچو بھئی ان سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے ہم ہٹلر سے بچ کر کہاں جائیں؟ ہمیں تو کوئی اپنی زمین پر قدم بھی نہ دھرنے دے گا۔" مگر ایلما اونگھ چکی تھی نہ جانے اس کو کیا ہوتا جا رہا تھا۔ کالج کی وہ جوشیلی ایلما مر چکی تھی اور اب یہ ہاری ہوئی ایلما ہر مجبوری کے آگے سر جھکانے لگی تھی۔

صبح اٹھ کر ایلما نے کہا کہ نوکر کو لے کر شہر سے جنس لے آئے کیونکہ اُسے کچھ حرارت معلوم ہوتی تھی۔ اناج کی قلت نے بُری طرح حیران کر رکھا تھا اور جگہ تو راشننگ ہو گئی تھی مگر اس حصے کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہا تھا۔ روز بروز اناج اپنی مرضی سے مہنگا ہوتا جا رہا تھا گھر میں جتنا پہلے بھی کا خرچ تھا اس سے چوگنا تو صرف گیہوں پر صرف ہو جاتا تھا اور گھی کا تو کیا پوچھنا۔ گھاس کا گھی بھی انمول ہوا جا رہا تھا۔

"ہیلو!" کسی نے پکارا شمن نے مڑ کر دیکھا تو ٹیلر اپنی چندھی آنکھوں میں جاذبیت پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تھک گیا ہوں ان رینگتے ہوئے شکست ہندوستان سے سوچا لاؤ کوئی مصیبت ہی مول لوں" وہ شرارت سے مسکرایا اور شمن کو بھی ہنسی آ گئی۔

"ارے مجھے سخت نا امیدی ہو رہی ہے؟"

"کیوں؟"

"میں سمجھا تھا گرج کر برس پڑو گی..... خیر فال اچھی رہی اس لیے دوسری ترکیب چلنا پڑے گی"

"وہ کیا؟"

"کہ چلو میرے ساتھ چائے پیو"

"مگر میں سامان خریدنے آئی ہوں"

"چلو پہلے سامان خریدیں پھر لوٹ کر کوچلنا کریں گے"

ہر دکان پر ٹیلر کو دیکھ کر دکان داروں نے چوگنے دام کر دیے چاروں طرف سے وہ لے دے مچی کہ شمن کو اسے رخصت کرنا پڑا"

"تم سامنے ہوٹل میں ٹھہرو میں سامان خرید کر آتی ہوں"

"کیوں؟" وہ بگڑا۔

"تمہاری موجودگی سے بھاؤ بگڑے جا رہے ہیں؟"

"ارے وہ کیسے؟ اچھا اب میں کچھ بولوں گا بھی نہیں"

"وہ تم کچھ بھی کرو۔ تم بھی تو شاہی خاندان سے ہو اس لیے۔

"میں کیوں ہوتا شاہی خاندان سے، ہشت!"

"یہاں والے ہر سفید چمڑی والے کو بادشاہ سلامت کا بھائی بھتیجا ہی سمجھتے ہیں..... انکساری ہماری گھٹی میں پڑ چکی ہے..... اور تم جانتے ہو یہ گھٹی قریب سو سال سے ہمیں کون پلا رہا ہے"

مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑاتا ٹیلر جا کر ہوٹل کے دروازے پر کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا شمن خوب بھاؤ تاؤ کر کے سامان خریدچکی تو گاڑی کرایہ کر کے روانہ ہو گئی۔ ٹیلر بالکل اس کے ذہن سے اتر گیا لیکن جونہی وہ گھر پہنچی اُسے فوراً یاد آیا اور جلدی سے سامان اُتروا کر اس نے اُسی گاڑی میں واپس بھاگنا مناسب سمجھا جونہی گاڑی مڑی پھاٹک میں داخل ہوتی ہوئی دوسری گاڑی سے قریب قریب ہم آغوش ہو گئی۔ گاڑی بان ایک دوسرے کو خوبصورت رشتوں سے نوازنے لگے۔ دیکھنے کے لیے سر باہر نکالا تو ٹیلر کو اترتا دیکھ کر سُن سے رہ گئی۔

"میں بالکل بھول گئی" اس نے لجاجت سے کہا "سامان کی گڑبڑ میں"

"یہ میری عزت افزائی ہے!" ٹیلر نے طنزیہ ادب سے جھک کر کہا "مجھے پتہ نہ تھا کہ ایک زندہ انسان سے تمہیں ہلدی دھنیا اور چاول زیادہ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں میں نے تمہارا وقت ضائع کرنے کی کوشش کی مگر میں داد دیتا ہوں کہ تم ناگوار چیزوں کو بڑی خوش اسلوبی سے ٹال دیتی ہو" وہ مڑ کر چلا۔

"مگر......" شمن کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ اور وہ پھر لوٹا۔

"کس گاڑی میں چلو گی؟..... اپنی میں یا یہ جو میں لایا ہوں" اس نے بالکل ایسے پوچھا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

جب گاڑی کافی دور نکل گئی تو ٹیلر ایک دم ہنسنے لگا۔

"اوفو...... یہ لڑکیاں!"

"تم دل ہی دل میں ہم ہندوستانی لڑکیوں کو جنگلی غیر مہذب اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہے ہو...... مگر......"

"مگر ہندوستان پر کیا موقوف ہے، دنیا بھر کی لڑکیاں ایسی ہی وحشی ہوتی ہیں۔" وہ شرارت سے مسکرایا "تم سمجھتی ہو گی ہماری لڑکیاں ادھر بلایا اور دوڑیں۔"

"کم از کم ہندوستانیوں کا تو یہی تجربہ ہے۔ دیکھو تو یہاں تک بندھی چلی آتی ہیں"

"غلط بالکل غلط جو ہندوستانی یہ کہتے ہیں وہ ایسی ویسی لڑکیوں سے ملتے ہوں گے وہاں کی اچھی تعلیم یافتہ لڑکیاں بڑی خشک ہوتی ہیں اور یہ ننگی بھوکی فقیرنیاں کہاں

نہیں کرتیں ۔"

"تو وہاں بھی لوگ ننگے بھوکے ہیں۔" شمن نے بن کر طعنہ دیا۔

"کیوں نہیں، تم سمجھتی ہو وہاں سب لارڈ اور بیرن ہی رہتے ہیں۔ تم جو مٹھی بھر انگریز دیکھتی ہو یہ تو ہندوستان کی قسمت سے ایسے نظر آتے ہیں ورنہ جب تک دنیا میں شیطان موجود ہیں لوگ ننگے بھی رہیں گے اور بھوکے بھی۔

"اس حد تک؟" گذرتی ہوئی گاڑی میں سے شمن نے مرجھائے ہوئے سڑاند فقیروں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"نہیں اس حد تک تو نہیں۔" ٹیلی نے پھر ہری لی "ہندوستان آنے سے پہلے نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا تھا......"

"یہی کہ بس نواب راجہ سونے ہیرے سے مرصّع ہاتھی......"

"بالکل یہ تو نہیں پر ہاں خیال تھا اتنے دن کی حکومت میں ان لوگوں نے کچھ تو کیا ہو گا۔ مگر یہاں آنے سے کچھ دن پہلے ہی میں نے ایک آدھ کتاب ہندوستان کے متعلق پڑھی تھی پھر بھی یہ دیکھنے کی امید نہ تھی۔

اور اب یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد سارا الزام ہمارے ہی سر دھرنا۔"

"سارا تو نہیں ... کچھ ضرور......"

"لیکن یہ بھی سوچا کہ وہ کچھ بھی ہمارے سر منڈھنے کا......"

"..... یہ تم لوگوں کی میں نے عجیب خصلت دیکھی ہے کہ تم اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ بے گناہ اور غیر ذمہ دار ظاہر کرنے میں فخر سمجھتے ہو آخر انسان ہو حیوان تو نہیں۔"

"حیوانوں کے ہاتھوں مجبور تو ہیں۔"

"اور جیسے ہندوستانیوں میں ایسے حیوان نہیں۔"

"ہیں انھیں کے پیچھو۔"

"تو یہ کہو یہاں کے اور وہاں کے حیوانوں کے جتھے نے ایک دوسرے کی

مدسے ملک کا یہ حال بنا رکھا ہے مگر سچ بتانا، اپنی ذات سے تم نے اب تک اس جہنم کو توڑنے کی کیا کوشش کی ہے؟ کونسی قربانی کی ہے؟"

"قربانی کرنے والوں کی گت دیکھی تم نے کیا حال کیا گیا اُن کا؟"

اور واقعہ بالکل تازہ تھا ملک کی سب سے بڑی جماعت نے علم بغاوت بلند کیا۔ یہ بغاوتیں ریل کے ڈبوں میں بولے زور شور سے رونما ہوئیں سفید قوم کو کھلا حکم "مل گیا کہ بھاگ جاؤ یہاں سے نہیں ملے گی تم کو ورنہ لبیں جلا ڈالیں گے۔ ریل کی پٹریاں اکھیڑ دیں گے۔ یہ تمہارے ہیٹ اور ٹائیاں جلا دیں گے مگر سفید بادشاہت اس بغاوت کے زکام کو بجائے گولہ بارود کے لاٹھیوں سے ہی راہِ راست پر لے آئی۔ جو ہے دان کا پٹ کھلا۔ اور بالائی غائب۔ دو چار ہی دن میں بے سری فوج کو حکومت کے ہاتھی نے روند کر صفحہ ہستی سے مٹا دیا اہنسا بھی اتنی بے ضرر تھی جتنی یہ بغاوت ثابت ہوئی ایسا معلوم ہوا چند نا سمجھ بچے مچل گئے تھے کہ ہم تو چاند لیں گے۔ ایسے بچوں کو تو بس دو طرح سے درست کیا جاسکتا ہے یا تو بچے کا چاند دے دو...... مگر یہ بچے بڑے ہوشیار ہیں صاف بتی کو پہچان گئے دوسری ترکیب یہ ہے کہ لگاؤ ایک تھپڑ اور کہہ دو جب ابا بازار سے آئیں گے تب چاند ملے گا۔ مگر کون جانے جب ابا بازار سے آئیں تو تھکے ہوئے ہوں یا ان سے سے چاند کی ضرورت ہی نہ سمجھیں "اتنا سلیقہ نہیں انھیں کہ چاند سچ مچ کا دے دیا جائے بھاڑ پھوڑ کر الگ کریں گے آپس میں بھائی بھائی جھگڑیں گے نوچ کھسوٹ کر پھینک دیں گے۔ ہمارے پاس سیف میں رکھا ہے چاند حفاظت سے جب بڑے ہو جاؤ گے تب ملے گا۔"

مگر کب بڑے ہوں گے یہ تو ابا ہی جانیں۔ کتنے ہی بڑے ہو جاؤ اطمینان دلاؤ مگر ماں باپ کے دل میں تو وہ کل کے بچے ہی رہیں گے۔ اور پھر جانے ابا بازار سے لوٹیں گے بھی یا وہیں مر رہ جائیں گے۔ ٹیلر تو کبڈی اڑا رہا ہے پہلے پہل لا مارنا جا رہا ہے کون جانے چاند بھی دہی ملنے جائے۔

"ہاں...... اور تاریخ ہمیشہ اُن کی اس حرکت پر لعنت بھیجے گی" ٹیلر نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر مؤرخ بھی تو یہ خود ہی ہیں ہم تو وہی پڑھیں گے جو آج تک پڑھتے آئے ہیں یعنی اُن کی

عقل مند یہاں اور یہی بے وقوفیاں.... پھر ملنے میں آنکھ کھول کر انہی کی شان میں قصیدے پڑھنے شروع کیے
"مگر اس مرتبہ امریکہ موجود ہے"

"امریکہ کب موجود نہ تھا مگر یہیں تک جہاں تک ایک ڈالر کے بس پہنچنے کا امید ہے لڑائی کا میدان نہیں جنگ کا ہی سہی اب ان کے گن اور گانے پڑیں گے۔ گرتوں کو سنبھالنا ہاروں کو جتانا، کمزوروں کو طاقت بخشنا ان ہی کا کام ہے۔ اب ہماری ٹوٹتی ہوئی سرکار کے سر پہ اپنا ہاتھ رکھا"

"نہیں ایسا نہ ہوگا.... ہم میں سے بہت سے نہ معلوم کن مغالطوں میں مبتلا رہے اب ہماری بھی آنکھیں کھلتی جا رہی ہیں..... میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ واقعی کچھ ہو ہی جائے گا ہم میں سے گنتی کے چند ہیں جو ایسی باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں ان میں سے نہ جانے کتنے تو واپس جا کر بھول بھال جائیں گے۔ شاید چند ایسے بھی ہوں جو کچھ یاد رکھیں۔"

کہیں کپلنگ کی طرح یاد نہ فرمانے لگیں یہ زمانہ کپلنگ پیدا کر سکتا.... تم دیکھنا اس جنگ میں انسانیت نئی روشنی لے کر پیدا ہوگی۔ ارے ہم کہاں نکل آئے..... گاڑی والے۔"

"باتوں باتوں میں پتہ بھی نہ چلا اور گاڑی کافی دور نکل گئی۔ گاڑی والا بھی کچھ متحیر ان دو مختلف عناصر کو ٹکراتا دیکھ کر کھو سا گیا تھا دونوں اتر کر ایک ہوٹل میں جا بیٹھے۔

ایلما کے بعد میں دوسری ہندوستانی لڑکی سے ملا ہوں..... اور مجھے ناامیدی نہیں ہوئی۔ نہ جانے کیوں ہم لوگوں سے اتنا پرہیز کیا جاتا ہے۔"

"اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ تم لوگوں کی لڑکیاں تو ہمارے لڑکوں کو قیمتی سمجھتی ہیں کیونکہ شوہر کی حیثیت سے وہ بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں انھیں وہ اپنے ہی رنگ میں سمو کر بہ آسانی زندگی گذار سکتی ہیں۔"

"تو کیا ہندوستانی لڑکیاں ایسا نہیں کر سکتیں وہ چاہیں تو یوروپین لڑکوں کو ہندوستانی بنا سکتی ہیں۔ ارے اس عورت ذات میں بڑے بڑے معجزے دکھانے کی طاقت پوشیدہ ہے وہ چاہے تو دنیا سے یہ قوم اور نسل کا فتنہ مٹا سکتی ہے۔"

"یہ میں ماننے کے لیے تیار نہیں۔ عام قاعدہ ہے کہ اونچی نسل کو بیٹی دے دیتے

ہیں۔مگر لیتے نہیں تاکہ دھبّا نہ آجائے۔"

"ہشت...... بالکل پُرانی باتیں تم سوچتی ہو گی ایسا میں تو بڑی خوشی سے ہندوستانی لڑکی سے شادی کر سکتا ہوں۔"

"قول سے فعل مشکل ہے۔"

"مگر میں یقین دلاتا ہوں۔" رات زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ لہٰذا لوٹ آئے دونوں۔ شمن جب گھر پہنچی تو ایلما دیکھ کر مسکرا اٹھی۔

"بڑی گاڑھی چھن رہی ہے......"

"صاحب لوگ جو ہوئے نا۔ سمجھتے ہیں اس طرح ہماری عزّت افزائی ہوتی ہے...... کہاں ہم خاک کے ذرّے اور کہاں وہ آفتابِ عالم تاب!"

"ٹیلر ایسا نہیں۔"

"ابھی سب ایک ہی مل کے نکلے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر کیوں گئی تھیں اس کے ساتھ۔"

"یہ دکھانے کہ ہم اتنے جاہل نہیں جتنا تمہارے میو یا دیوں نے بنا رکھا ہے.... ایلما جی اکتا گیا بھئی میرے لیے بھی کوئی کام ڈھونڈ دو۔"

"فوج کے دفتر میں......"

"بھئی یہ فوج دوج سے تو مجھے معاف رکھو۔ مجھے اس دوسروں کی جنگ لڑنے سے کیا دلچسپی۔"

"کیا مطلب ہے کیا جیپٹے کو آجانے دو گی۔"

"میری بلا سے جیپٹے آئیں یا چُند ھے۔"

"وہ لوٹ مار کریں گے کہ تو یہ بھلی۔"

"اور یہ کیا کم لوٹ رہے ہیں۔ دوسرے لوٹیں گے انھیں جن کے پاس کچھ ہے اور جو آپ ہی مر رہے ہوں انھیں وہ کیا ماریں گے؟ ان ننگے بھوکے کسانوں کا نہ کسی نے اب تک کچھ بگاڑا اور نہ کوئی بگاڑ سکتا ہے اچھا ہے یہ دولت مند لٹیں تو۔"

"ارے بھائی اپنے دولت مندوں کو خود لوٹو تو ایک بات بھی ہے دوسروں سے لٹوانے میں کیا عقل مندی ہے؟"

خود نہیں طاقت تو دوسروں کی مدد سے سہی؟"

"ارے کہیں بندر نے بلیوں میں بٹوارہ کیا ہے۔ دیکھ تو رہی ہو یہ باہر کی مدد کا نتیجہ تاریخ گواہ ہے کہ جس کی مدد مانگی وہی ظالم بن بیٹھا اب تو جب ہی کچھ ہو گا جب ہم خود کریں گے"

"تم دلّی کے چاول بہت کم لائیں؟" ایلما نے ایک دم ریاست کے میدان سے گھر کی چار دیواری میں چھلانگ لگائی۔

"ملے ہی نہیں؟"

"لالو نے تمہیں دوکان نہیں بتائی۔ ایک بنیا ہے پروفیسر کا جان پہچان وہ دے دیتا ہے جتنے بھی مانگو۔ یہ موٹے چاول سے تو گھن آتی ہے؟"

مگر یہ گھن آنے والے چاول بھی بازار سے اڑ کر نہ جانے کہاں روپوش ہونے لگے کچھ ایسا مرض پھیلا کہ اندر ہی اندر چاول چاٹ گیا گیہوں کو بھی گھن لگ گیا۔ گھن بھی ایسا دیا نہیں پھینا گھن!

"ارے اٹھو نا؟" ایلما نے جھنجھوڑ کر جگایا روز تو وہ اسے دن چڑھے تک سونے دیتی تھی۔

"کیوں؟" شمّن نے کروٹ بدل لی؟

"ارے وہ تمہارا صاحب بہادر کھڑا ہے؟"

"کون صاحب بہادر؟"

"ارے بنومت، وہی ٹیلر، اٹھو نا؟"

"لعنت، تمہارا ہو گا صاحب؟"

"دیکھنا ہے؟" ایلما چھیڑنے کو ہنسی۔

"کیا؟" شمّن اٹھ بیٹھی۔

"کچھ نہیں، تو پھر اٹھیں کیوں نہیں؟"

"چڑیل!" شمّن نے تکیہ کھینچ کر مارا۔

پروفیسر کو بھی لے لیا اور چاروں مل کر ٹیلر کی لائی ہوئی ٹیکسی میں روانہ ہو گئے پکنک کا ارادہ تھا

"ہم لوگ تو عموماً مقبروں میں پکنک مناتے ہیں" شمن نے کہا۔

"یا خدا، یہ کیوں؟" ٹیلر حیرت سے بولا۔

"تاکہ برکت ملتی رہے"

"بھئی ہمیں لائبریری میں ضروری کام ہے۔ تم اور ٹیلر چلے جاؤ....." پروفیسر اور ایلما شاید گھر ہی سے کوئی سازش کر کے آئے تھے۔

"تو میں بھی ساتھ چلوں" پروفیسر کو خاموش اور ایلما کو بے توجہی سے دوسری طرف دیکھتے پا کر اس نے جلدی سے بات پلٹی "میں گھر چلی جاؤں گی مجھے ذرا کام بھی ہے کپڑے وغیرہ ٹھیک کرنا ہیں"

"واقعی؟" جب پروفیسر اور ایلما چلے گئے تو ٹیلر نے پوچھا۔

"کیا؟"

"کہ تمہیں گھر جانا ہے۔ اور بہت ضروری کام ہے؟"

"ہاں کیا کچھ اعتراض ہے؟" شمن نے بھی مذاقیہ جواب دیا۔

"بہت سخت، کیونکہ......"

"کیا؟"

"میرے ساتھ کھانا کھاؤ گی؟"

"ابھی کھانے کا وقت دور ہے"

"کیا بھدا جواب ہے!" وہ برا مان گیا۔ شمن کو ہنسی آ گئی۔

"ہمارے یہاں ان باتوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ مجھے تمہارے ساتھ گھومتے دیکھ کر لوگ نہ جانے کیا کہیں گے!"

"چھوڑو ان لوگوں کو......... اگر تم جیسی لڑکیاں ہی لوگوں سے ڈرتی رہیں گی تو پھر مل چکی آزادی تم لوگوں کو"

"گویا اسی طرح گھوم پھر کر تو ہمیں آزادی جیتنا ہے؟"

"یقیناً۔۔۔ جتنے ملک "ان لوگوں" کی ہیبت سے پاک ہیں سب آزاد ہیں"

"بے شک تم چاہو تو سب ہی کچھ کہہ سکتے ہو۔ آزاد ہو نا"

"چھوڑو اس آزادی کے جھگڑے کو اور تھوڑی دیر کے لیے میری ذہنیت قومیت کو بھول کر میری کوئی بات سننے اور اس کا جواب دینے کی کوشش کرو۔ ذرا کے ذرا اس نفرت کو بھول جاؤ جو ہمارے تمہارے درمیان برسوں سے چل رہی ہے موقع پر لڑنے والے سپاہی تک ایک بار سب کچھ بھول کر آپس میں انسانوں کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔ اتنا سوچو ایک پردیسی انسان یہاں سے دور تمہاری مہمان نوازی کا طلبگار ہے"

"کی تو تھی ایک دفعہ تمہارے ہی بھائی بندوں کی مہمان داری۔۔۔ بنیے بن کر آئے۔۔۔ اور۔"

"چہ چہ۔۔۔۔۔ بڑی خراب زبان ہے تمہاری!" وہ خوش مزاجی سے ہنسا۔

"دوسرے حربے بے کار پڑے رہنے سے ساری تیزی اسی پر دھار رکھنے میں صرف ہو گی۔ وہ مثل سنی ہے کسی کے ہاتھ چلیں اور کسی کی جیب!"

ہوٹل کے سامنے ٹیکسی ٹھہری۔ کرایہ چھ روپے ہوا تھا، مگر ٹیلر نے دس روپے دے دیے اس نے جب ریزگاری کے لیے لاچاری سے جیبیں ٹٹولیں تو ٹیلر نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور چلنے لگا۔ ڈرائیور نے جھک کر ایک سلام دیا اور دشمن کی غصے سے بھری نظروں کو دیکھ کر صرف مسکرانے پر اکتفا کی۔۔۔۔ گویا کہتا ہے آگئیں بھاجی مارنے کو ہونا کلوٹی، روزانہ انہی میموں کو لاتا ہوں وہ کچھ بھی نہیں سوچتیں۔

"یہی تو ہے وہ چال جس کی بدولت تم لوگ یہاں حکومت کر رہے ہو" اس نے ٹیلر سے کہا

"یا خدا، کیا ہوا؟"

"یہ تم نے چار روپیہ بخشش دے کر اس کی روح تک خرید لی"

"ارے، مگر میں نے قطعی اس خیال سے روپیہ نہیں دیا، بلکہ مجھے معلوم تھا وہ زیادہ سے زیادہ دو روپیہ نوٹ میں سے واپس کرنا باقی کے لیے کہہ دیتا نہیں ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہیں کہاں نوٹ بھنانے دوڑتا پھروں گا۔ میں نے کہا جہاں دو وہاں چار۔۔۔۔ مصرف ہی کیا ہے ہمارے روپے کا؟ کس کے لیے کمائیں؟"

"عیش اڑانے کے لیے جس کے لیے تم لوگ بنے ہو۔"

"یہی ہوتے ہیں ہمارے عیش، کچھ ناگوں پر کچھ موٹر پر اسی طرح روپیہ اڑ جاتا ہے۔" اس کے طعنے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ٹیلر نے خود سے کہا۔

کھانا کچھ سونا سا رہا۔ ٹیلر بڑا حساس اور خاموش سا ہو گیا۔ شمن کو بڑی خوشی ہوئی کم بخت فلرٹ کرنے کی کوشش میں اسے یہاں لایا ہے۔ ہوٹل سے وہ سیدھا اسے گھر پہنچا گیا۔ ایلما ناٹک گئے جب وہ سو گئی تب آئی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح جب وہ ڈرائنگ روم میں گئی تو دیکھا ٹیلر بیٹھا ایلما کو اپنی البم دکھا رہا ہے۔ معمولی صاحب سلامت ہو گئی جب ایلما دیکھ چکی تو اس نے البم شمن کو پکڑا دی اور خود چائے لانے چل دی۔

معلوم ہوتا تھا البم تہیّہ کو زے میں شہر کے شہر بھر دیے ہیں۔

"بم! بم!" اس کے دماغ میں گونجا، کتنا لطف آئے۔ یہ کھلونے ذرہ ذرہ ہو کر اڑ جائیں۔ پر ہندوستان کا تو یہ بم بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے کچی مٹی کا سینہ چیر کر کیا لطف لیا جا سکتا ہے، وہ تو انہیں گرم گرم نوالوں کی طرح نگل جائے گی۔ پر یہ عظیم الشان سر بفلک عمارتیں کیوں نہ لرزیں بموں کے خوف سے؟

"تم ان عمارتوں کے لیے خود لڑ رہے ہو، پر ہمیں بھی بارود کی جگہ جھونک رہے ہو۔" اس نے انتہائی زہریلے انداز سے کہا کہ ٹیلر جو پُرشوق نگاہوں سے تصویروں کو دیکھ رہا تھا کھسیانا ہو گیا اور اس کا منہ اتر گیا۔

"ایں؟" شمن کو اپنی کم ظرفی پر شرم آ گئی یہ کتنی عجیب انسان ہو! میں تو تمہیں اپنے کیمرے کی چالاکیاں دکھا رہا ہوں اور تم سیاست کہہ بیٹھیں..." وہ روٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

"سچ کہا تھا میرے ایک ہندوستانی دوست نے کہ اگر مغرب مشرق سے دوستانہ معانقہ کرنا چاہے تو وہ اُسے زناٹا کر کے جھٹک دے گا۔" وہ آہستہ سے مڑ کر بولا۔

"کل سے میں برابر تمہاری جلی کٹی باتوں کو ٹالنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر تو بہ ہے... کیا تم سب ہندوستانی اسی ذہنیت کے مالک ہو؟ اگر ایسا ہے تو تمہارا مرض لاعلاج ہے،

ہر بار تم ہاتھ مار کر دوا گرا دیتے ہو اور پھر دوا دیا جاتے ہو؟"

"یہ کرسی کی دوا پینے سے تو بہتر ہے ہم بیمار ہی رہیں!"

"مگر یہاں کرسی کہاں ہے۔ تم سے سیاست کون بے وقوف پوچھ رہا ہے تم سمجھتی ہو کہ تمہیں سیاست سے لگاؤ ہے! اس لیے ایسی باتیں کر رہی ہو غلطی نہیں سیاست کو تم بالکل نہیں سمجھتیں۔ بس دوسروں پر الزام دے کر خود بچ نکلنا، یہ ان کا انصاف ہے مانا کہ انگریز تمہیں بھڑکاتے ہیں آپس میں لڑاتے ہیں مگر تم کیوں اتنے احمق ہو جو لڑ پڑتے ہو معلوم ہوتا ہے ابھی سو دو سو سال تمہیں اور غلامی کی زنجیریں گھسیٹنا پڑیں گی بے وقوف ہے وہ حکومت جو تمہیں آزاد کرنے دشمن ہے وہ تمہاری کیونکہ تم آزاد رہنے کے قابل نہیں، اپنی حفاظت کرنا تمہیں نہ آیا ہے نہ کبھی آئے گا۔ تاریخ کے صفحے الٹو اور مجھے دکھاؤ کہ کہاں کس موقع پر تم نے اکیلے دشمن کا مقابلہ کیا ہے۔ آج اگر یہ چلے جائیں تو دوسرے آجائیں گے نئے سرے سے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہونا پڑے گا۔"

"ایسا ملا بھی بہت ہے جو چھین لینے کی دھمکی دیتے ہو؟"

"ارے بھئی میرے بس میں ہوتا تو کیا کچھ نہ دے دیتا" ٹیلی نے بات کا رخ بدل کر شرارت سے کہا۔

"بس دیکھ لیا، تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو، وہ آزادی ابھی دیکھی جو امریکہ نے نیگرو کو دے رکھی ہے۔"

"میں بتاؤں ایک ترکیب، تم سیاست میں ٹانگ نہ اڑاؤ یہ کھیل نہیں کہ سنی سنائی رائے پر یقین کر کے میدان میں کود پڑے سخت مطالعے کی ضرورت ہے اور میں شرط بدتا ہوں دنیا کی کوئی عورت سنجیدگی سے مطالعہ کر ہی نہیں سکتی۔"

"اور میری رائے میں عورت سے بڑا سیاست داں کوئی نہیں، وہ جو گھر میں حکومت کر سکتی ہے ملک میں بھی راج کر سکتی ہے۔ تمہارے خیال میں یہ سارے نسوانی حربے جن کی بدولت عورتیں مرد کی کمائی، شخصیت یہاں تک کہ تخیل تک کو غصب کر لیتی ہیں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے؟"

"غلط بالکل غلط، کوئی عورت ہماری کمائی زبردستی نہیں چھین سکتی۔ ہم جیسے جی چاہتا ہے خود خرچ کرتے ہیں، رہی شخصیت تو وہ عورت کی عقل سے بالاتر شے ہے، ہاں تخیل کی ملکہ وہ ضرور ہے۔ مگر صرف ہماری دماغی عیاشی کے لیے۔"

"بڑے لطیف مغالطے ہیں۔ اچھا ہے آپ لوگ انھیں مغالطوں میں مبتلا ہیں۔ جب ہی تو کمال ہے کہ بے وقوف بنے انسان اور اپنے آپ کو عقل مند سمجھتا رہے" بیاست سے ہٹ کر گفتگو نے زندگی کے رومانی دائرے میں قدم رکھ دیا۔

"کہا تو میں نے جہاں تک دل کی حکومت کا پھیلاؤ ہے تمہارا ہی ڈنکا بجتا ہے" ٹیلر نے ایسے واضح طور پر شمن کی طرف اشارہ کیا کہ وہ ہنس پڑی۔

"اور دل کی سلطنت کا پھیلاؤ چادر کی وسعت کو دیکھ کر محدود کیا جاتا ہے یا مشرق مغرب..."

"دل کی حکومت سمتوں کی پابند نہیں اس کے لیے مشرق بھی اتنا ہی حسین اور روشن ہے جتنا مغرب!" ٹیلر کی آنکھوں کی شرارت بڑھی اور شمن نے غور کیا کہ اس کی آنکھیں اتنی بھدی نہیں اور بھوؤں کی جگہ بھی خاصے گھنے بال ہیں۔

اتنے میں ایلما چائے لے کر آ گئی۔ آج وہ کچھ بے چین سی نظر آ رہی تھی۔ اُسے بار بار کسی کے انتظار میں خاموش ہو کر پیروں کی چاپ سنتے دیکھ کر ٹیلر نے چھیڑا۔

"بڑا احمق ہے" ٹیلر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون؟" ایلما چونک پڑی۔

"پروفیسر!"

ایلما جھینپ گئی شمن نے دیکھا کہ یہ رنگین نسوانی جذبہ اس کے چہرے کو نرمی اور شیرینی سے منور بنا گیا۔ وہ کرخت اور خشک ایلما گویا موسمِ بہار کی آمد سے شگفتہ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اس کی باغیانہ آنکھیں ایک اطمینان بھری امید میں ڈوبی ہوئی پہلے سے زیادہ بڑی اور جاندار معلوم ہوتی تھیں جیسے کسی نے پھونک مار کر ان پر سے برسوں کی پڑی ہوئی گرد جھاڑ دی ہو۔

اتنے میں پروفیسر لمبے لمبے ڈگ بھرتے آن پہنچے۔ اُن کی زرد پیشانی دُھلے ہوئے شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔

"ہم لوگ دہلی جا رہے ہیں" انھوں نے بچوں کی طرح کہا۔

"مبارک ہو" ٹیلر نے جوش سے پروفیسر کا ہاتھ جھٹکا،

"ایں؟" شمن بے وقوفوں کی طرح دیکھتی رہی۔

پھر ایلما نے اُسے بتایا کہ آخر کو پروفیسر نے اُسے اس تاریک بل سے کھینچ ہی نکالا اب...

وہ خوف زدہ ہو کر جا چھپی تھی۔ اُن کی دوستانہ ہمدردی نے اُنہیں مجبور کر دیا کہ وہ اپنی ریسرچ بیول کا تھوڑا سا بوجھ اُن کے کاندھوں تک پھیلا دے۔ پروفیسر ابتدائی تعلیم پر ریسرچ کر رہے تھے انھیں ویسے بھی اپنی اسکیم کو عمل میں لانے کے لیے ایک مددگار کی ضرورت تھی ویسے اگر کوئی کہتا کہ اُن کی اپنی نجی زندگی میں ایلیا کا وجود کارآمد ثابت ہو سکتا تھا تو یہ بات مشکل سے یقین آتی پروفیسر کچھ عجیب کھدیلو انسان تھا خود وہ اپنے وجود میں نمایاں نظر نہ آتا تھا شاید وہ ان کتابوں کی دیکھ بھال کے لیے ایلیا کو مفید سمجھتا ہو جو اُسے اپنے جسم سے زیادہ عزیز تھیں یہ ایلیا کا کہنا تھا۔

"میں عرصے سے تمہاری ضرورت محسوس کرتا ہوں۔" پروفیسر نے صرف اپنی بات کو بار بار دہرایا۔ "اور یہ ضرورت اسی طرح محسوس ہوتی رہے گی جب تک کہ اسے پورا نہ کیا جائے گا۔"

"میں اس کے اطمینان اور سکون سے تھوڑا حصہ اپنے لیے چرا لوں گی اور وہ مجھے زندہ رکھنے کے لیے کافی ہو گا۔" ایلیا نے کہا۔

شمن کے جانے کے سوال کو ایلیا نے ایک سرے سے سُنا ہی نہیں۔

"تم چاہتی ہو میں نہ جاؤں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"نہیں بھئی یہ کیسے کہہ سکتی ہوں۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔"

"تو اتنے دن گھر کی دیکھ بھال تمہارے سپرد۔" ایلیا نے بات کاٹ کر کہا۔ "ذرا باورچی کو دن دن بھر باتیں مت کھیلنے دینا اور آس پاس کے غنڈوں کو جمع نہ کرنے پائے پچھلی دفعہ میں ایک دن کو گئی رات کو لوٹی تو جوئے خانہ بنا ہوا تھا گھر۔۔۔" ایلیا نے بات کرتے کہا

"مگر ایلیا آخر مجھے جانا تو ہے ہی۔" وہ ڈری کہ ایلیا منزل کا نشان نہ پوچھ بیٹھے

"تو پندرہ دن میں گھس نہیں جاؤ گی۔"

"مجھے نوکری کے لیے بھی تو کوشش کرنا ہے۔"

"ہاں ہاں کر لینا۔ ذرا پہلے چل کر سامان تو درست کر دو تم۔"

"پروفیسر کہہ رہا تھا کہ۔۔۔۔" کپڑے رکھتے رکھتے ایلیا ایک دم کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا کھونا بن کیوں رہی ہو۔"

"اوہو شرم آرہی ہے"
"ہشت، میری بات تھوڑی ہے۔ وہ تو ٹیلر کو کہہ رہا تھا" شمن کے کان کھڑے ہوئے
"کیا؟"
"کہ..... کہ..... اچھا آدمی ہے ٹیلر ہے نا؟ مجھے تو وہ انگریز لگتا ہی نہیں...."
"ہاں..... وہ آئرش ہے...... مگر یہ کیسے کہ وہ لگتا نہیں؟"
"اس کی باتوں سے شمن اگر ہم ایسے انگریزوں سے بھی ملیں تو ان سے نفرت نہ کر سکیں
"ایسے سے تمہارا کیا مطلب؟"
"ایسے سے میرا مطلب جیسا ٹیلر ہے"
"بڑی گدھی ہو......"
"از نہ ہو منت تم خود سمجھتی ہو کہ وہ اور سفید چمڑی والوں سے مختلف ہے"
"مختلف ہو سکتا ہے مگر یہ خصوصیت ان کی جبلت پر اثر نہیں ڈالتی۔ بہت سے سانپ کاٹتے نہیں مگر نگل جاتے ہیں۔ رہے تو پھر بھی سانپ"
"ارے تو نگل ہی گیا آخر" ایلما زور سے ہنسی۔
"پاگل ہو گئی نا۔ ارے چل وہ مجھے کیا نگلے گا"
"مگر تو اسے ضرور نگل گئی...... پروفیسر کہہ رہا تھا کہ......"
"لعنت تیرے پروفیسر پر۔ کہ..... اس کے سوا کچھ نہیں کہتا....."
"تمہیں جیسے کچھ نہیں معلوم؟ تم نہ مجھ سے بنتی ہو..... ڈرائنگ روم میں وہ کوئی چپکے چپکے تو بول نہیں رہا تھا"
"ارے وہ تو مذاق کر رہا تھا"
"میں اُسے تین سال سے جانتی ہوں وہ ایسے مذاق کرنے کا عادی نہیں بھی ایلما ان سے خیر جی اس بات ہی کیا ہے وہ تمہیں پسند کرتا ہے تو اس میں گناہ کون سا ہے"
"گناہ کیوں ہوتا۔ سچ بتا نا ایلما کیا تمہیں پسند ہے وہ"
"ٹیلر؟...... حد سے زیادہ"

"ٹیلر کی خصوصیت سے بات نہیں کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ دراصل مجھے تو اس سفید چمڑی سے ہی گھن آتی ہے۔"

"سفید چمڑی میں اگر سرخ دل ہو تو؟"

"ہوا کرے۔۔۔۔۔ وہ ہم کالوں کے مذاق سے بہت مختلف ہے۔"

"وہ اتنا بیدرد جیسا تو سفید ہے بھی نہیں۔۔۔۔۔ ہمارے یہاں اس سے کہیں گورے آدمی ہوتے ہیں مگر ان سے ہمیں گھن نہیں آتی پھر آخر اس میں کیا بات ہے؟"

"خیالات، ہمارے دل نے ان سب یورپ والوں کو بھوت بنا کر نفرت شروع کر دی ہے۔۔۔۔۔ ذرا بند کرنا یہ صندوق کپڑے بہت ٹھنس گئے۔"

دونوں مل کر صندوق بند کرنے لگیں۔ ایلما بڑے جوش و خروش سے سامان باندھ رہی تھی۔ آزاد چڑیا کی طرح دھیمی آواز میں کوئی ہلکا پھلکا راگ گنگنانے لگتی اور پھر کسی سوچ میں ڈوب جاتی شاید ماضی بار بار اسے کچوکے دینے کے لیے ابھر آتا تھا جسے وہ اپنی قوتِ ارادی سے دور جھٹک دیتی۔

صبح ہی صبح ٹیلر ملٹری کا ٹرک لے کر آن پہنچا مزدوروں کی طرح سامان بھرتا رہا جب چائے پینے بیٹھا تو اس نے بتایا کہ دوسرے دن وہ بھی روانہ ہونے والا ہے وہ کچھ غمگین تھا لیکن اس سے زیادہ وہ دیکھ رہا تھا کہ شمن نے بھی یہ نہیں کہا "سنا شمن ٹیلر بھی جا رہے ہیں۔" ایلما نے شمن کو ٹلتے دیکھ کر نہایت بھدے پن سے کہا۔

"اوہو۔۔۔۔۔ چہ بڑا افسوس ہے۔" شمن نے بڑے تپاک سے کہا۔

"مہربانی ہے اس قدر صدمہ لوگوں کو نہ پہنچاؤ۔" ایلما ٹیلر نے طعن سے کہا اور شمن بھی تکلف سے مسکرا دی۔

"کہیں دیر نہ ہو جائے۔" پروفیسر بڑے بڑے چائے کے گھونٹ پینے لگے۔

"اچھا خدا حافظ شاید پھر ہم نہ مل سکیں۔" ٹیلر نے بڑے تکلف سے کہا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

"خوش قسمت ٹیلر،" ایلما نے ہنس کر کہا۔

"مگر تم تو پرسوں جا رہے تھے" ابلا نے مصافحہ کے لیے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور بڑی معصومیت سے نمک دانی پیش کر دی۔

"شکریہ...." اُس نے بڑھ کر ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔

"ارے میں بھی تم نے نمک مانگا!"

"زخموں پر نمک..... خوب خوب..... بھئی واہ" پروفیسر نے قہقہہ لگایا۔

"واقعی تم میں کسی نمک کی ضرور کمی ہے..... بدمذاق ہو ٹیلر" ابلا نے اٹھتے ہوئے اُس کا کندھا ہلا کر کہا۔

ابلا کی گاڑی روانہ ہو گئی تو ٹیلر نہایت خاموش موٹر چلاتا رہا معلوم ہوتا تھا وہ بڑی تن دہی سے اُسے گھر پہنچانا چاہتا ہے۔ مگر موٹر کی رفتار ضرورت سے زیادہ ہلکی تھی۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"پونا" منہ موڑے موڑے جواب دیا۔

"اچھی جگہ ہے؟"

"بہت، جنت ارضی" ٹیلر نے جل کر کہا۔

"بہت خوش نصیب ہو"

"شکریہ!"

"کیا پٹرول ختم ہو گیا" شمن نے موٹر کی سستی کو ٹوکا اور ایک دم سے ٹیلر نے اسپیڈ اتنی بڑھا دی کہ معلوم ہوا موٹر الٹ گئی۔

"آخر مطلب کیا ہے" شمن نے زبردستی غصے ہونے کی کوشش کی۔

"یہ کہ ہم انسان نہیں..... پتھر کے ٹکڑے ہیں چند بھیڑیوں کی خود غرضی اور مکاری نے پوری قوم کے منہ پر کالک مل دی اور اس حد تک کہ اب کوئی کوشش اُسے نہیں مٹا سکتی۔ کچھ تو ان بھیڑیوں نے ایسا دماغی دُکھ پہنچایا ہے جس نے اس حد کو پہنچا دیا"

"مانتا ہوں..... مگر عقل بھی تو کوئی چیز ہے"

"دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے" شمن نے بہ مشکل اُسے سمجھایا"

"تو کیا واقعی تمہارے دل سے میرے لیے نفرت نہیں مٹ سکتی" ٹیلر نے بڑی نرمی سے کہا۔
"نفرت تو نہیں ہے مجھے" شمن نے جیسے خود کو بتایا۔
"تو پھر تم صرف مجھے جلانا چاہتی ہو" وہ مسکرا دیا۔ "جی چاہتا ہے اسی بات پر موٹر لڑا دوں کسی پیڑ سے" اس نے موٹر کی رفتار دھیمی کر دی۔
"ہمارے دل دکھے ہوئے ہیں"
"خصوصاً اس اگست کے واقعے کے بعد سے" ٹیلر نے بڑی ہمدردی سے کہا۔
"تم بھی یہ سوچتے ہو کہ یہ سب فساد کانگریس نے کروائے ...."
"ہاں اور کانگریس قابل مبارک باد ہے" شمن پھر بے اعتباری سے بھڑک گئی۔ "اتنے مجبور اور نہتے گروہ سے ایسا پر جوش اظہار ایک معجزہ سا معلوم ہوتا ہے۔ لاٹھیاں بھی تو پوری نہیں"
"تو تمہارے خیال میں یہ بے وقوفی نہ تھی؟"
"آزادی سے محبت رکھنا اگر بے وقوفی ہے تو اس کے پانے کے لیے جدوجہد کرنا پہلے بے وقوفی ہے"
"مگر حماقت تو تھی اس طرح اودھم مچا دینے اور بے موت مرنے سے آزادی نہیں ملا کرتی" وہ اس سے جواب مانگنا چاہتی تھی۔
"آزادی کی دیوی بھینٹ چاہتی ہے اور اگر اسے رام کرنا ہے تو ایسی ابھی لاکھوں قربانیاں کرنی ہوں گی جو کچھ انہی سرپھرے جوشیلے بچوں نے کیا وہ واقعی بہت معمولی نظر آتا ہے کیونکہ جو کچھ ہوا بے ترتیبی سے اور بد انتظامی سے ہوا اگر یہ قربانی باقاعدہ دی جاتی تو آزادی کے میدان کا تھوڑا بہت حصہ ضرور ہاتھ آ جاتا۔"
"مگر یہ گاندھی جیسے لیڈر بھلا ہماری جنگ آزادی میں کیا رہنمائی کریں گے اہنسا اہنسا کہیں اہنسا سے بھی ملک جیتے گئے ہیں" وہ خود اپنی مخالفت کرنے لگی۔
"گاندھی نہیں اگر اس وقت چنگیز خاں بھی ہوتا۔ ایسے کہ ہاتھ میں تنکا نہیں تو وہ کیا کر لیتا دیکھا نہیں تم نے کچھ نہ کرنے پر تو یہ سزا ملی اور کہیں ہاتھ بھی ہلا دیتے تو صاف انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔"
"ہنہ میں بھی کس کام کے یہ لیڈر۔ کچھ کیا ہے انھوں نے آج تک، بلا سے مر جائیں تو پیچھے لیڈر پیدا ہوں"
"لیڈر میدان چھوڑ کر نہیں نکل آتے۔ اگرچہ تمہارے یہ لیڈر کچھ نہیں کرتے ہیں مگر پھر بھی ان کی خاموشی ضد

عوام کے جی میں ڈھارس بندھائے ہوئے ہے آزادی کی خواہش نہیں مری اکونس میں جانے سے بہت کچھ عوام پر سے اُن کا بھروسہ اٹھ گیا... بہت سے نا امید ہو کر منکر ہو گئے چڑ کر بگڑ بیٹھے مگر پھر بھی ایک زمانہ آئے گا جب وہ محسوس کریں گے کہ ہمارے لیڈر فضول نہیں بلکہ مجبور تھے۔"

"تو پھر یہ جیل میں گئے ہی کیوں؟ کیا قوم کی خدمت کی؟" شمن نے بچوں کی طرح پوچھا۔

"بہت بڑی خدمت کی جو کچھ وہ زبان سے نہ کہہ سکتے تھے ڈرامے کے ذریعے دکھا دیا۔"

"کیا؟" شمن نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔

"کہ ظالم جب ضد پر آ جاتے ہیں تو وہ کیا نہیں کرتے۔ وہ نفرت جو اُن کے اس عمل سے اس وقت عوام کے دل میں پیدا ہو گئی ہے اسے کوئی مہربانی کوئی رعایت دور نہیں کر سکتی۔ اگر اس وقت حکومت ہمارے لیڈروں پر مظالم نہ کرتی تو تم اس کے ضرور گن گاتے رہتے اور آزادی کی وہ لگن جو تمہارے دانی پور کے دل کو لگے گی وہ ایک ایسی چیز ہو گی کہ..... ارے ہم کدھر نکل آئے؟ چھوڑو ار موڑنے دو۔"

ٹیلر نے اُسے گھر پر اتار دیا اور شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ ابھی دھوپ کافی تھی جو بیرے نے آ کر کہا کہ وہ آ گیا۔

"ارے اتنی جلدی؟ وہ ہلکے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ بخار ہے۔" بخار ہے کیا؟"

"شاید یہاں ہر وقت بخار کا ہی لطف آتا رہتا ہے چلو جلدی چلو کچھ دیکھیں گے... اور وہ..... وہ لگا لیتا سرخ بوندا" اس نے ابرؤں کے بیچ میں انگلی رکھ کر کہا۔

"اچھا بندی؟"

"ہاں ہاں!" اس نے زور زور سے سر کو جھٹکا۔

"کیوں؟"

"اچھا لگتی ہے" اس کی سرخ تھکی ہوئی آنکھیں ہنستے میں بالکل غائب ہو گئیں اور دانت چمک اٹھے بجائے کچھ چلنے کے وہ ہوٹل میں بیٹھے کافی پیتے رہے ٹیلر نے بتایا کہ اس کی منگیتر جیسے چھوڑتے وقت اس کا دل ٹوٹ گیا تھا اُسے یک لخت بھول گئی۔

"اس نے میرے خطوں کا جواب بھی دینا بند کر دیا" اُس نے افسردگی سے کہا۔

"ہم یہاں میدانِ جنگ میں وطن سے دور ایک ان کی یاد میں زندگی کی گھڑی گذارتے ہیں اور وہ چھوٹے موٹے کو بھی ہمارا دل رکھنے کی کوشش نہیں کرتیں۔"

"کوئی گھڑی کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا جب وہ ہمارے خیالوں سے دور رہتی ہوں مگر...... یہ بے وفا عیش کی متوالیاں ہمیں انسان ہی نہیں سمجھتیں۔" شمن خاموش سنتی رہی۔

"تمہیں اب بھی اس لڑکی سے محبت ہے؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

"محبت یک طرفہ نہیں ہوتی۔ یوں تو مجھے لونا لڑکی سے ہی شدید محبت ہے۔" وہ پھر شرارت سے مسکرایا۔ "گذشتہ چند سالوں نے اور بھی کمزور بنا دیا ہے......"

گھنٹوں یکو اس کرکے جی ذرا ہلکا ہو گیا۔ پھر وہ اپنے بچپن اور اپنی ماں کی باتیں بتلاتا رہا۔ اسے اپنی ماں سے بڑی محبت تھی اور بہن کو پیار بھری ملامتیں بھیجنے میں لطف آتا تھا وہ بہت شریر مگر پیاری تھی ہزاروں لڑکے لگا رکھے تھے اور ٹیلر کو بدھو سمجھتی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ اکا چھینپو بنتا۔

دوسرے دن ٹیلر اتنی صبح آیا کہ شمن کو اسے گھنٹہ بھر بیٹھائے رکھنا پڑا۔ نہا دھو کر جب وہ باہر نکلی تو وہ لان پر چائے کی کشتی کے قریب لیٹا ہوا تھا۔

"میں خدا حافظ کہنے آیا ہوں۔ کل صبح جا رہا ہوں۔"

"خدا حافظ!" شمن نے جواب دیا۔

"اوہ...... بس تمہیں اتنا ہی کہنا ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "یہ بھی پوچھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی کہ کہاں جا رہا ہوں...... ویسے نہیں تو رسماً ہی سہی۔"

"مجھے رسم و راہ بڑھانے کی ضرورت؟"

"ہوں، ٹھیک کہتی ہو۔" وہ گھاس پر ماتھا ٹیک کر اداسی سے بولا۔

"رات کو سائیکل پر چلیں۔"

"رات کو؟...... بھئی مجھے رات سے ڈر لگتا ہے۔" اسے برا مانتے ہوئے دیکھ کر جلدی سے بولی۔ "اگر تمہیں شام کو فرصت ہو تو چلو گھوم آئیں......"

"سنو باورچی سے کوئی مزے دار کھانا منگواؤ۔ گرمی نے زبان بھی نوشن کر دی ہے۔"

"مرچیں کھاؤ گے؟"

"ہاں" اُس نے سر ہلایا اور زور سے آنکھیں ہتھیلیوں سے بھینچنے لگا۔

"کیا سوئے نہیں رات بھر؟"

"نہیں" وہ روٹھ کر بولا، "نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ میں مانتا ہوں کہ تم مجھے پسند ہو لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ میں اسے محبت نہیں بلکہ کوئی سخت بے رحم اور تکلیف دہ مرض کہوں گا"

"معلوم ہوتا ہے تو لگ گئی" شمن بات ٹالنے کو زور سے ہنسی۔

"کیا ایسی کوئی بیماری ہے ہندوستان میں، جس میں شدید ترین محبت دیال جان بن جائے؟"

"ہاں لُو کی طرح یہاں عشق کی لُو بھی چلتی ہے۔ مگر آج کل نہیں، وہ برسات کے دنوں میں جب کالی گھٹائیں گھر آتی ہیں۔ کوئلیں کوکتی ہیں اور پپیہے شور مچاتے ہیں"

"تو پھر مجھے خر۔ اس کا کوئی مرض لگ گیا ہو گا؟"

"ہو سکتا ہے۔ کافی خطرناک مرض ہے۔ تم بھوتوں میں یقین کرتے ہو؟"

"میں ـــ؟ ہشت! تم بھی نہیں کرتیں۔ مگر یہاں بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں صرف بھوت رہتے ہیں۔ تم نے وہ مرگھٹ دیکھا ہے؟ وہاں کھوئے ہوئے انسانوں کی روحیں صدیوں سے بھٹک رہی ہیں ہڈیوں کے ڈھیر رات کو جاگ اٹھتے ہیں اور ہر آنے جانے والے کے سر پر سوار ہو جاتے ہیں" کسی کا روپ بھر کر، تا، مثلاً تمہارے روپ میں!"

"ہاں" دونوں ہنس پڑے۔

"اگر میں تم سے شادی کے لیے کہوں تو؟"

"تو؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے تم نے جو ابھی مرچوں دار کھانا منگوانے کو کہا تھا... منگواؤں؟" اس نے چاہا مذاق اڑائے۔

"میں سوچتا ہوں ہم اور تم مل کر انسانیت کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں" اس نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

"مگر اس کے لیے شادی ضروری ہے؟" اُسے سنجیدہ ہونا پڑا۔

"ایں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے نہیں معلوم، مگر نہ جانے کیوں میرا خیال ہے کہ ویسے ہم دونوں

ساتھ نہیں رہ سکتے۔ تمہیں مجھ سے محبت بھی نہیں۔ کیوں؟"

"جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ۔ میں تو ہندوستانی ہوں اور یہاں کے موسم کی عادی ہوں مجھے تو کبھی نہیں لگی۔"

"یعنی ہیمنت، تم محبت نہیں کر سکتیں کیونکہ میں سفید ہوں۔"

"ہمارے ملک میں تم سے بھی زیادہ سفید انسان ہیں ہم اُن سے محبت بھی کرتے ہیں اور شادی بھی۔"

"تو اگر مجھ سے شادی کر دو تو بعد میں محبت کر سکو گی۔ میرا مطلب ہے اگر کوشش کرو تو۔"

"مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرنا نہیں آتی۔"

"تم میں اتنی ہمت ہے کہ مجھ سے شادی کر لو۔"

"کہہ نہیں سکتی۔"

اتنے میں باورچی پھلکیاں اور چٹنی لے کر آ گیا۔ ٹیلر نے ڈھیر ڈھیر سی چٹنی لگا کر تیزی سے کھانا شروع کیں۔ مارے مرچوں کے ناک آنکھ سے پانی بہ نکلا اور منہ کچے گوشت کی طرح لال بھبھوکا ہو گیا۔

"تمہارے سوال کا جواب مل گیا؟"

"ایں؟" وہ بچوں کی طرح ناک پونچھ کر بولا۔

"یہ مرچیں کیا کہتی ہیں؟"

"کہتی ہیں.... کہ تم.... تم بے وقوف ہو شم شم" اس نے پہلی دفعہ اس کا نام لیا وہ بھی بگاڑ کر۔

"اتنا ڈراتا ہوا پھیلتے ڈرتی ہو؟" اس نے طعن سے پوچھا۔

"ہُوا!" شمن کا دل نامعلوم مسرت سے چونکا۔ "زندگی کا لطف اونچے اونچے داؤں لگانے میں ہے۔" اُس نے جیسے خواب میں دہرایا۔

"ہمت ہے اتنی؟" وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"ہمت تو کچھ ایسی مہنگی چیز نہیں۔ مگر تم یہ سٹا کیوں لگا رہے ہو؟"

"میرے لیے یہ سٹا نہیں مجھے ہندوستان سے لگاؤ ہے۔ اُسے زخمی دیکھ کر میرا دل دُکھ رہا ہے مجھے وہ دُنیا کا ایک عضو نظر آ رہا ہے۔ اسی دُنیا کا ایک ٹکڑا جو میری ہے...."

"زندگی کی طرف سے تمہارا رو یہ بھی صرف شاعرانہ ہے تم جانتے ہو یہ سٹا ہے مگر اس کے

نتیجے کا خوف ابھی سے تمہارے خون کی حرکت تیز کیے دے رہا ہے اس خوف میں بڑی لذت ہے مگر تمہیں اس لذت کا چسکا کہاں سے پڑا؟" شمن نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ دور آزاد کے کیمپ میں جو اس نے خوبی وعدہ کیا تھا۔ اس کی لذت اب تک اس کے دماغ میں محفوظ تھی۔

"تم میری فکر نہ کرو۔"

"میں نہ کروں گی تم خود ہی کرو گے۔ تم پچھتاؤ گے۔"

"میں؟"

"ہاں..... اور ابھی یہاں سے جا کر تم اپنی ہر بات کو یاد کر کے شرمندہ ہو گے یہ نشہ زیادہ دیر قائم نہیں رہے گا۔"

"کیسا نشہ؟"

"خود غرضی کا نشہ، کہ یہ تم عجیب و غریب بات کہتے جا رہے ہو۔ میں ہندوستانی تم....."

"چپ رہو..... میں تمہارے اور اپنے درمیان کسی دنیا کو نہیں لانا چاہتا۔ ایک خیال ہے اور وہ یہ کہ میں اور تم قریب تر ہو جائیں..... میری ماں بڑی اچھی ہیں وہ بہت خوش ہوں گی" وہ ایک دم چہک کر بولا۔ "ہم ساتھ ساتھ سارے یورپ کا سفر کریں گے... اوہ... کتنا لطف آئے گا۔ یہ کم بخت لڑائی ختم ہو جائے گی میں پھر سے اپنی پڑھائی شروع کر دوں گا تم بھی وہاں کوئی ڈگری لے لینا..... پھر ہم دونوں ہندوستان آ کر....."

"ارے بڑے تیز ہوا ہو، دم بھر کی سیر کر کے لوٹ بھی آئے؟"

شمن زور سے ہنسی اور رشید بھی کھلکھلا اٹھا۔

"چلو ذرا باہر چلیں نا..." اس نے ہاتھ پکڑ کر اُسے گھسیٹا دو ننھے بچوں کی طرح قہقہے لگاتے دیوانوں جیسی باتیں کرتے دور تک نکل گئے۔

"تم ہاں کہہ دو اور ہماری جنت میں....." زور سے ایک لاری گذری اور دھول کے بھبکے اس کے ہنستے ہوئے حلق کو گھونٹ گئے بات ادھوری چھوڑ کر وہ شمن کے کندھے کا سہارا لے کر کھانسنے لگا۔ سازن عجیب و غریب سین کو آنکھوں میں جذب کرنے کے لیے لاری سے لٹک لٹک کر جھانکنے لگے۔

"دیکھا تم نے؟" شمن نے تلخی سے کہا۔

"میں ان کتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔" وہ بھی جھلا کر بولا کہ یکایک تیجی تو وہ سارے قہقہے جو تھوڑی دیر قبل زنگ و نور کی طرح دل میں پھوٹ رہے تھے یکا یک مرجھا گئے جیسے کسی نے بٹن دبا کر بجلی غائب کر دی۔ وہ خاموش پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ بار بار اس کے شانے میں کوئی چیز چبھتی جیسے کوئی رگ چڑھ گئی ہو۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"انتہا!" اس نے سہم کر جواب دیا۔

"کوئی راستہ؟"

"ناممکن خضر بھی بھٹک رہے ہیں۔"

"علاج؟"

"کوئی نہیں۔"

"دعا؟"

"بے کار!"

جلدی سے اس نے اٹیچی میں وہ ساڑیاں ڈالیں۔ کوئی تو گاڑی جا رہی ہو گی کہیں دنیا کے کسی کونے میں بس یہاں سے دور۔ سامان پھر آ جاتا رہے گا۔ ویسے ہی کیا سامان خانہ بدوش کا؟

"کیا حماقت ہے؟ ایسا بھی کیا خوف؟ وحشت، کیا لگ جائے گا۔ وہ نہیں کہہ صاف صاف دن اور رات کبھی ساتھ نہیں رہ سکتے۔

اس نے اٹیچی دور پھینکی۔ دیر تک یلما کی کتابیں درست کرتی رہی پھر لیٹ کر سو گئی جب آنکھ کھلی تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ بیرے نے کہا ٹیلا آیا ہے جلدی سے ساڑھی لپیٹ کر باہر گئی۔

"کیا ہے رفیق؟"

"ادھر... ادھر آ جاؤ...." وہ سہما ہوا اور پریشان تھا۔ چہرہ بہت لمبا اور زرد ہو رہا تھا۔ بار بار سگریٹ جھاڑنے کے بہانے وہ ہاتھوں کی لرزش کو چھپا رہا تھا۔ برساتی سے نکل کر دونوں گھاس پر پہنچ گئے۔

"میں ... میں سوچتا ہوں میں نے ابھی کسی سے ذکر نہیں کیا۔"
"کیا بات ہے؟"
"یہی ... یہی ..." وہ بری طرح گھبرا گیا۔
"ر دنی گھبرانے کی کیا بات ہے۔ میں بچی نہیں اور نہ ہی تم بچے ہو۔ ہم یہ شادی کیوں کر رہے تھے؟ صرف اس لیے کہ ہم دونوں مل کر بہت کچھ دنیا میں کر سکتے ہیں اس میں محبت کو دخل نہیں۔"
"تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہو سکی۔"
"میں ... میں آج تک محبت کو نہیں سمجھ سکی اور اب تو میں نے اس فضول مسئلے پر غور کرنا بھی چھوڑ دیا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ ٹیلر غور سے اس کا منہ تکتا رہا۔
"میں تمہیں محبت کرنا سکھا دوں گا۔" اس نے شمیں کا ہاتھ ہمدردی سے دبایا۔
"سکھا دو گے؟" وہ زور سے ہنسی۔ اس کی آواز میں تلخی اور خوف کے ملے جلے ساز بج اٹھے۔ "محبت سکھائی نہیں جاتی۔ یہ ایک احساس ہے جو پیدا ہوتا ہے پروان چڑھتا ہے اور ... اوہ چھوڑو اس قصے کو ... تو دیکھو کوئی ایسی حماقت کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔"
"حماقت کیوں کہتی ہو۔"
"یاد ہے وہ لاری ... جو ہمارے پاس سے گذری تو لوگ ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے جیسے ہم بندر ہوں۔ مگر انسان بننے کی جرأت کر رہے ہوں۔"
"مگر میں تو ان کی پروا نہیں کرتا۔" وہ دانت پیس کر چیخا۔
"تو تم غلطی کرتے ہو، قدرت سے جنگ کرتے ہو۔"
"مگر یہ ایسی انہونی بات تو نہیں ہزاروں سفید لڑکیاں ہندوستان میں مسرت کی زندگی گذار چکی ہیں اور گذار رہی ہیں کیا وجہ کہ میں اور تم خوش نہ رہیں۔"
"لڑکیوں اور لڑکوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک بار ایک عورت اپنا سب کچھ چھوڑ کر ایک مرد کے ساتھ ہو جاتی ہے تو خواہ اسے کتنا بھی نیچے اترنا پڑے ___ وہ وہیں اپنا گھر بنا بیٹھتی ہے مگر مرد؟ مرد بڑا نازک مزاج ہوتا ہے ذرا سی بات پر چڑ کر چل جاتا ہے۔"

"مگر......."

"ہم تم ملے...... زندگی کے تجربات میں عظیم الشان ـــــ اضافہ ہو گیا۔ سنو تم کل ہی واپس لوٹ جاؤ........ ارے ہاں میں نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہاں جا رہے ہو؟"

"واپس پونا......"

"صبح گاڑی جاتی ہے۔ میں تمہیں خدا حافظ کہنے پہنچ جاؤں گی۔ دیکھو۔ دیکھو ہماری دوستی ختم نہ ہو گی۔" اس نے ٹیلر کو سر سے پکڑ کر گہری سانس بھرتے دیکھ کر سہارا دیا۔

"ہماری دوستی بڑی کارآمد ثابت ہو گی مجھے ہی نہیں پورے ہندوستان کو۔ تم جیسے دوست مل جائیں تو بھاگ کھل جائیں۔"

"تو تم صبح آؤ گی؟ اسٹیشن پر۔" شب بخیر کہنے سے پہلے اس نے التجا کی۔

"ضرور۔"

سمجھا بجھا کر واپس لوٹی تو معلوم ہوا سر پر لدا ہوا بھاری بوجھ پھینک آئی ــــ سورداس جی ایک بار رسی کے دھوکے میں سانپ کو پکڑ کر بیوی کے مکان پہ پہنچ گئے تھے۔ کیا دنیا میں ایسے بھی جذبے موجود ہیں جو ہمیں اس حد تک اندھا بنا سکتے ہیں۔

ہلکی پھلکی غبارے کی طرح مگن وہ پلنگ پر جا پڑی جیسے کسی نے بال دیر کے جھگڑے سے آزاد کر دیا مگر نیند نہ آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ غبارے کی ڈوری جڑ سے ٹوٹ کر رہ گئی اور وہ دور خلا میں اڑتا چلا۔ کدھر؟ کہاں؟ ہوا بھی تو نہیں چل رہی۔ کہ کوئی رخ کا اندازہ لگا سکے۔

ایک دم نہ جانے کدھر سے بادل اٹھے۔ نہ گرجے نہ چمکے بس برس ہی نکلے۔ نہ جانے کب کے گھٹے ہوئے پرنالے بہہ نکلے تکیے میں منہ گھونٹ کر وہ ہچکیوں میں ملی ہوئی آہوں کو جذب کرتی رہی۔ اسے نہیں یاد تھا وہ کب روئی تھی اور آج جیسے پہلی بار ضبط کا پُل بند ایک ننھی سی چوٹ سے پھٹ پڑا اور کل روان روان بلک بلک کر سسکیاں بھرنے لگا تھا۔ ہمدم غنودگی نے سر پر ہاتھ پھیرا اور آہیں گہری سانسوں میں ڈوب گئیں۔

صبح اس کی آنکھ بجائے سات کے آٹھ بجے کھلی۔ ایک اطمینان کے ٹھنڈے جھٹکے سے اسے یاد آیا کہ ٹیلر جا رہا ہو گا۔ ریل کا ہر جھولا اسے ہر لمحہ اس سے دور گھسیٹے جا رہا ہے۔ بُعد دم بدم بڑھ رہا ہے اور کچھ ہی دنوں میں یہ اتنا لامتناہی ہو جائے گا کہ ناپے نہ نپے گا۔

رات کو محل جلانے والی بجلی کو ملامت کرتی وہ اٹھی۔ نیم گرم پانی سے غسل کیا۔ تھکے ہوئے کندھے بھینچ کر اس نے رہی سہی سستی کو بھی جھٹک دیا۔ بڑی تیز بھوک لگ رہی تھی۔ رات وہ کھانا بھی تو بھول گئی۔ باورچی نے نہ جانے کیا کہا تھا اور پتہ نہیں، اس نے کیا جواب دیا تھا۔ تو یہ نہیں بیرے نے اس کی سسکیاں نہ سن لی ہوں۔ ناشتے کے بعد وہ دیر تک بیٹھی ٹوکری میں سے چلغوزے اور بسکٹ کے ٹکڑے چن چن کر کھاتی رہی۔ اسی ٹوکری میں سے کل اس نے اور ٹیلر نے لان پر بیٹھ کر ناشتہ کیا تھا کتنا لاپروا تھا ٹیلر کا ارننگ تھا تو اوپر کا بٹن نکال کر اس نے جوتوں کی تہ میں گرا دیا تھا۔ نیچے کا حصہ کدھر گیا۔ دو انگلیوں کے سرے سے بٹن کو پکڑے وہ پھراتی رہی اور پھر اسے اپنے بٹوے کی ننھی سی جیب میں ڈال دیا۔

آج وہ کیا کرے۔ یہ لمبا چوڑا دن کیسے کٹے۔ معلوم ہوتا تھا ہندوستان کی زمین ہی ختم ہو گئی اور ہے بھی کیا اس کھنڈر میں؟ تو پھر کیا کیا جائے؟ خیر اس وقت تو بازار کا ایک چکر لگایا جا سکتا رہے گا۔

کمرے میں تالا لگاتے ہوئے اس کے ہاتھ سے کنجی چھوٹ پڑی! ٹیلر کا بھوت مع اپنی تمام مرنی کے دیوار سے سہارا لیے کھڑا تھا۔

”تم جھوٹ بولتی ہو۔ گئیں۔ اسٹیشن پر نہیں آئیں“ اس نے روٹھے ہوئے انداز میں غرا کر کہا۔

”ہیں! تو اس لیے تم نہیں گئے۔

”اس نے نیم مردہ مسکراہٹ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

”مگر......“

لعنت ہے اس اگر اور مگر پہ!“ وہ زور سے بھونکا۔

کمرے میں اطمینان سے بیٹھ کر ٹیلر نے بتایا کہ وہ صبح چھ بجے سے اسٹیشن پر پہنچ گیا تھا تمن کا جی دکھ گیا۔

”چھ بجے...... مع تمام اسباب کے؟“

”نہیں“ وہ شرارت سے مسکرایا اور تمن کے بگڑنے پر زور سے چلایا۔ مجھے معلوم تھا تم ہندوستانی بڑے دھوکے باز ہوتے ہو اور تم ضرور دھوکا دو گی اس لیے سامان لاد کے جانا...... وہ زور سے ہنسا۔

”دیکھو رومی“

"چپ رہو کچھ نہیں دیکھا میں ..... تم عورت نہیں پتھر ہو تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہیں اتنا چاہتا ہوں پھر بھی ..... پھر بھی تم مجھے ٹھکرا دیتے جا رہی ہو بس ہو چکی تمہاری نصیحت ..... اور میں تمہیں یہ بھی بتانے آیا ہوں کہ اب میں پونا دوبارہ کبھی نہیں جاؤں گا۔

"نہیں جا رہی ہوں شام کو؟"

"چلو ..... کتنے بجے کی گاڑی ہے؟" وہ مسرت سے بولا

"چلو سے کیا مطلب گویا آپ بھی ..... دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے؟"

"دماغ سلامت ہوتا تو کہنا تم جا کیا تھا۔ کچھ کھانے کو منگاؤ۔

"کھانے کے کمرے میں چلو"

"نہیں ہم تو یہیں کھائیں گے۔" اس نے بستر پر لیٹ کر کہا

"ٹیکسی یا پھر وہ کل والا پروگرام۔ سائیکل؟" اس نے ناشتہ ختم کر کے کہا۔

"تمہارا سر!"

"میرا سر بہت دکھ رہا ہے۔" ٹیلر نے آہستہ سے اپنا تھکا ہوا سر اس کے گھٹنے پر ٹکا دیا

"نیند کم آئی؟"

"آئی ہی نہیں بالکل۔" اس نے سر بالکل گود میں سرکا دیا۔

"اسپرو لاؤں؟" اس نے آہستہ سے اس کے بھورے رنگ کے بالوں کو چھوا۔

"تین اور تین چھ اور تین نو گولیاں کھائیں۔" ٹیلر نے معصومیت سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

دن آنکھیں میچے چپ چاپ گذرتے چلے گئے ایلا نے بہت ملامت کی کہ اس کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ دسٹری کا دفتر کوئی نامعلوم جگہ تو نہ تھی۔

گیارہ بجے جب وہ سول میرج کے دفتر سے نکلے تو سڑکیں کافی بھری ہوئی تھیں۔ ٹیلر یا۔ یاد مسکرا رہا تھا مگر وہ وحشیانہ مسرت جو دفتر کی میز پر سے سر اٹھاتے وقت بجلی کی طرح اس کی آنکھوں میں کوندی تھی اب معدوم ہو چکی تھی۔ اس کا انداز گفتگو نہایت نرم اور پیارا تھا۔ اور چہرے پر شان دار فتح کے احساس کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن کچھ شدید

کچھ پراگندہ تیز تیز باتیں کرکے اُن اجنبی آوازوں کو نہ سننے کی کوشش کر رہی تھی جو اس کے کانوں میں ہتھوڑے کی چوٹ بن کر پڑ رہی تھیں

"غلط ..... سب غلط ...... آگ اور پانی کبھی بغل گیر نہیں ہو سکتے یہ کوئی بار بار سرگوشیاں کرکے یاد دلا رہا تھا۔

شملے میں چیڑ کے درختوں کے درمیان چھپے ہوئے چھوٹے سے بنگلے میں جب شمیم نے نیا سبز کاہی شب کالیاس پہنا تو ایسا معلوم ہوا کسی نے اُسے برف کے تودے میں دفن کر دیا۔ باہر کے کمرے میں ٹیلر بیٹھا دیر تک ضروری خطوط لکھتا رہا۔ اور وہ صندوق میں سے کپڑے نکال کر جمانے لگی۔

زور زور سے کھانسنے اور منہ دھونے کی آوازوں نے اُسے بتایا کہ ٹیلر غسل خانے میں ہے۔ باہر خشک ہوائیں سوکھی چادروں کی طرح پھڑپھڑا رہی تھیں نامعلوم خوف دہراس فضا میں تیر رہا تھا۔ خاموشی موت کی طرح اداس تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کائنات کسی بھیانک سانحے سے لرز کر ایک دم چپ چاپ رہ گئی ہے۔ دو بلیاں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی کھڑکی سے باہر کو گئیں۔ خزاں رسیدہ پتیاں مردہ چڑیوں کی طرح پیڑوں سے ٹپک رہی تھیں۔

.. کھڑکی بند کر دو" اس نے لجاجت سے ٹیلر سے کہا۔ بڑبڑا کر نہ جانے وہ کیا بولا اور چٹخنی لگا دی۔ جب وہ مڑا تو شمیم نے دیکھا وہ بہت ہنستے ہوئے تھا مگر اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا جیسے کاغذ کا ٹکڑا جو بارش میں بھیگنے پڑے ڈھل کر بے رنگ ہو گیا ہو۔

۴۲

وہ جاگ پڑی مگر آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑی رہی۔ دور کہیں بہت سے گنگروؤں کی جھنکار ہوا کو جان دار بنائے ہوئے تھی یہ گھنگرو چڑیاں بجا رہی تھیں بے تال سُر چیں چیں بھی ملا کر بھیرویں کا الاپ معلوم ہو رہی تھی۔ سب ہی سُر کو مل تھے۔ نیم خوابیدہ احساسات کو جمع کرنے کے لیے اس نے جاگنے کی کوشش کی جسم کو آہستہ سے سمیٹا اور پھر پھیلا دیا پپوٹے کھولنے چاہے مگر نہ کھلے جیسے سورج اس کی آنکھوں میں گھور رہا ہو ایک دم اُسے کچھ یاد آیا۔ دماغ میں سوئی سی چبھی اور کپالا بن گئی۔ آنکھیں بزدل چڑیوں کی طرح چیختی چیختی کھل گئیں۔ کمرہ خالی تھا!

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہاں تھا ہی کیا؟ رات جہاں ٹیبر کے کوٹ ٹنگے تھے وہاں صرف ایک میلی سی سرخ ٹائی لٹکی ہوئی پھانسی لگے ملزم کی طرح جھول رہی تھی جوتوں کی وہ ٹاپ جو اُس نے اپنے ہاتھ سے سیدھی کی تھیں غائب صرف ایک میلا موزہ کونے میں پڑا منہ چڑا رہا تھا خاموش اور منطوج وہ اس میلے موزے کو گھورتی رہی جو بڑھتے بڑھتے ایک ٹیلے پہاڑ کی طرح پھول گیا ہوا کے خاموش جھونکے سے ٹائی گوشت کے لوتھڑے کی طرح پھسل کر زمین پر آ رہا جلدی جلدی اس نے سر پٹختے ہوئے مرچوں دار دھونیا کو دونوں ہاتھوں سے پرے ہٹایا اور بیچ کمرے میں کھڑی ہو گئی

"گیا!..... وہ گیا!!" درو دیوار قہقہے مار کر چیخ اٹھے۔

"تو پھر؟......اب؟.... اب کیا ہو؟" اس نے لجاجت سے جواب مانگا۔

"وہ گیا! تم بھی جاؤ...... کوڑی بھی تو نہیں تمہارے پاس ابھی مالک مکان جب گا کہ تم کہیں اور وہ گیا تو وہ تمہیں [illegible] سمجھے گا جنہیں یہ سفید چمڑی والے آپنے چند سکوں کے عوض لاتے ہیں۔ دھکے مار کر نکال دے گا۔"

"پھر؟.....اب کیا کرنا چاہیے؟"

"بھاگو! جو طاقت تمہارے پیروں میں ہے وہ سب ایک بار لگا دو اور بھاگو وہاں

بدنما کونے میں جو بادل ہے وہی جس میں کل آتے وقت تم دونوں نے جھانکا تھا کہ دیکھیں یہ دن رات کا ملاپ کیسا نظر آتا ہے پانی کے آئینے میں؟ تو تم چمگادڑوں اور مکڑیوں کی فاؤنڈری دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی تھیں۔ یہ تو ہے اُس میں اور ان جلنے کیڑے مکوڑے بھی۔ مگر راستہ بڑا سیدھا ہے۔ اس ٹوٹی ہوئی کمر کے لیے اس سے سیدھا راستہ نہیں۔"

سر ہلا کر وہ وہیں بیٹھ گئی۔ وہ ایک دن کی بیاہی دلہن مگر نہ اُبٹنے کی مہک نہ مہندی کا رنگ ایک چوڑی بھی تو نہیں کلائی میں اس کا سہما ہوا دماغ اور جھجکا۔ یہ بیاہ ہے یا زندہ رہا؟ لڑکھڑاتی ہوئی وہ باہر بھاگی۔ برآمدے میں بہت سے ہاتھوں نے اُسے لپک لیا۔ بہت سے نہیں صرف دو ہی تو تھے، مگر کتنے سکون بخش اور محفوظ اور ٹیبل کا بھوت کتنا سرخ اور تازہ دم ہو رہا تھا۔

"تم اُٹھ آئیں....." اُسے سیڑھیوں کے پاس کھڑا کر کے وہ برآمدے سے کر نیچے کود گیا۔ "میں نے کہا تمہیں کیوں جگاؤں؟" اس نے نیچے سے اس کی کمر دونوں ہاتھوں سے تھام لی "تمہیں ایک چیز..... ہیں؟"

"رومی!" اس نے طوفان کے نیچے سے نکل کر لمبی سانس کھینچی۔

"کیا ہوا؟" اس نے نرمی سے نیچے اتار کر اُسے ایسے دیکھا گویا وہ کوئی چینی کا کھلونا ہے جس کے ٹوٹ جانے کا خدشہ ہو۔

"کچھ نہیں....." وہ آنسو پی کر ہنسنے لگی۔ ڈری ہوئی دھڑکن سے بھری ہوئی مصنوعی ہنسی۔

"رومی..... تمہارے جوتے اور کپڑے کہاں گئے۔" چلتے چلتے وقت اس نے رُک کر پوچھا۔

"جوتے؟..... کپڑے؟..... کیا کرو گی۔ ابھی میں تمہیں اس جھگڑے میں ڈالنا نہیں چاہتا..... تو؟" اس نے بہت سا کھن لگا کر توس دیا۔

"یونہی پوچھا تھا۔"

"کیا بات ہے شم؟" اس نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"آ..... کچھ نہیں..... میں ابھی..... تو تمہاری سب چیزیں غائب تو....."

"تو.....؟" میلر اور سنجیدہ ہو گیا..... "تم سمجھیں....."

"تو میں سمجھی..... ہیں کر چور لے گئے" اس نے بچوں کی طرح بہانہ بنایا۔

"جھوٹ..... مجھ سے جھوٹ مت بولو" ٹیلر کا منہ اتر گیا۔ "میں سمجھتا ہوں"
"خاک سمجھتے ہو"
"اگر یہ خیال رہا تمہاری بے اعتباری کا..... تو....."
"ہشت..... بہت عقل مند بنتے ہو......"
"ہاں، تم سمجھیں میں چلا گیا، تمہیں چھوڑ کر"
"بہت سمجھے۔ اتنی سمجھ ہوتی تو شادی ہی کیوں کرتے..... سچ بتاؤ کہاں گئے
کپڑے؟ واہ یہ بھی کوئی بات ہے" اس نے ایسے بات پلٹی کہ ٹیلر سیدھا ہو گیا۔
"بیرا استری کرنے کو لے گیا ہے۔ دیکھو بھئی میں نے شادی اپنے لیے کی ہے نہ کہ ان کم بخت
جوتوں کے لیے صبح صبح میری تو بات بھی نہ پوچھی اور جوتوں پر نثار ہوئی جا رہی ہیں"
"اچھا کہیں چلو گے گھومنے؟"
"نہیں..... بس یہیں تمہارے پاس....." وہ اس سے لگ کر گھاس پر لیٹ
گیا۔ پورا ہفتہ چٹکیوں میں سوتے جاگتے ہنستے بولتے گزر گیا۔ دن بھر اجڑے ہوئے باغ کے
سنسان کونوں میں سر سے سر جوڑ کر کیٹس اور بائرن کے اشعار اور عمر خیام کی رباعیاں
پڑھی جاتیں۔ ٹیلر کی آواز بہت نرم اور بھاری تھی دھیمی آواز میں محبت بھرے نغمے
اور پھر ملکتی ہوئی نظمیں سنایا کرتا۔
وہ کیا سوچا کرتی تھی اور کیا نکلا اس کا خیال تھا کہ انگریز عام طور پر گندے ہوتے ہیں
دیتے ہیں دانتوں کی صفائی کے لیے ہزاروں دوائیں ایجاد کرنے کے بعد بھی اس کی نظر
سے کوئی چمکیلے سفید دانتوں والا انگریز نہ گزرا ان کے سیاہی مائل زرد دانت دیکھ کر ہمیشہ
ابکائی آنے لگتی۔ ٹیلر کے دانت سفید نہ تھے مگر بالکل ہموار اور بیماری سے پاک تھے۔
"سب سے پہلی چیز جس نے مجھے تمہاری طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا تمہارے نیلگوں
سفید دانت تھے" وہ شمن سے کہتا۔ دانتوں کا رنگ بدلنا ممکن نہ تھا۔ مگر وہ ضرورت سے زیادہ
ان کی صفائی میں منہمک رہتا۔ اکثر وہ شرط کی چال چل کر وہ شمن کے دانتوں سے مقابلہ
کرنے لگتا اور شکست کھا کر بچوں کی طرح بگڑ اٹھتا اور اداس ہو کر کہتا۔

"میں یہ دانت اکھڑوا کر دوسرے لگوا دوں گا۔"

"تم ہندوستانی نہ جانے کس مٹی سے بنائے گئے ہو کہ ہم لوگ دواؤں سے بھی اس کی نقل نہیں بنا سکتے۔" وہ اس کے سانولے رنگ کو دیکھ کر کہتا۔ "اس رنگ میں کتنی کشش ہے آنکھیں جھپکنے لگتی ہیں۔" وہ نیم باز آنکھیں بنا لیتا۔ اُسے پاؤڈر اور رنگ سے بہت نفرت تھی۔

"اس سے جلد کی حسّاس ملائمیت چھُپ جاتی ہے۔"

"میں تو خوشبو کے لیے لگاتی ہوں۔"

"اونہہ.... خوشبو! اس جلد کی خوشبو سے بھی نشہ آور کوئی خوشبو ہے اگر ایسا ہی ہے تو اسے تیز کرنے کے لیے شراب چھڑک لو۔"

"جی چاہتا ہے زندگی کی لمبان لامتناہی ہو جائے یہی چیڑ کے لمبے درخت ہوں اخروٹ کی چھاؤں ہو وہ اور ٹیلر شیلی کی نظموں میں الجھ کر کھوئے رہیں۔ زندگی اتنی نرم و نازک بھی ہو سکتی ہے۔ یہ اُسے معلوم نہ تھا۔ یہ معنے قہقہے گہری نیندیں بڑھی ہوئی بھوک اور کیا چاہیئے تھا۔

ٹیلر روز بروز بدلتا جا رہا تھا شمن سمجھتی تھی کہ اس اجڈ گنوار کو ہندوستانی رنگ میں رنگنا قطعی ناممکن نہیں اگر دشوار ضرور ہے مگر وہ تو خود بڑی تیزی سے ہندوستان کے آب و ہوا اور اکساد طرز رہائش کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ یہ مرد بھی کتنے سہل ہوتے ہیں جو زندہ آنکھیں دینا چاہو دے دو۔ اس معاملے میں نہ اُن کا ملکی اختلاف آڑے آتا ہے نہ قومی حسین آغوش میں گئے آنکھیں بند کر کے سر ڈال دیا اب جو چاہو کر لو۔ دن رات ایک ہی لباس پہنے شمن کا اشتہار بنا پڑا رہتا۔ شیو کرنا بھول جاتا تو داڑھی چھوڑ دیتا مگر شمن نے شدت سے مخالفت کی لہٰذا مجبوراً شیو کرتا۔ پانی سے گھبراہٹ ہوتی خوب مرچوں دار سالن کھا کر تین چار گھنٹے دوپہر کو سوتا۔ بڑی مشکل سے شام کو اٹھتا۔ باہر جانے کے لیے ہزاروں بہانے بنانے لگتا اور جب شمن زبردستی گھسیٹ لے جاتی تو وہ بالکل سنسان اور غیر دلچسپ جگہوں میں گم ہو کر وہاں قدرت کی رعنائیوں اور تعریف کرنے بیٹھ جاتا اس معاملے میں جیسے سدو ہفتے کی چھٹی اور منگائی شمن نے پوچھا تو کہنے لگا اس کی چھٹی واجب ہے

دہشت زدہ ہو کر شمن نے دیکھا کہ وہ ایک پیچیدہ معمّہ بنتا جا رہا ہے زیادہ تر اونگھتا رہتا ہے مگر جونہی جاگتا ہے خوف زدہ ہو جاتا ہے اور پھر جلد ہی اس مدہوش کن تاریکی میں ڈوبنے کی کوشش کرتا ہے۔ رات گئے تک خاموش بیٹھا چپتا رہتا اگر شمن کچھ بات بھی کرتی تو ہوں ہاں کر کے ٹال دیتا لمبی لمبی جماہیاں لے کر آنکھیں بند کر لیتا۔

"میں یوگ کا عمل سیکھ رہا ہوں" وہ مذاق کرتا۔

"یوگ کا عمل؟"

"ہاں نروان حاصل کرنے کا ایک بہترین راستہ ہے۔"

"دماغ خراب ہوا ہے؟" وہ بگڑ جاتی۔

"یہ دنیا فانی ہے۔" مذاق حد سے گذر جاتا اور وہ روٹھ جاتی تو بچوں جیسی حرکتیں کر کے مناتا۔ بے وقوف ناموں سے چپکاتا جس پر وہ اور بُرا مانتی اور اٹھ کر باہر چلی جاتی جب تنہا گھوم پھر کر آتی تو اُسے کرسی پر اسی طرح سویا پاتی۔

اس کی توجہ اور محبت بھی عجیب تر ہوتی گئی شدت میں تصنّع کی ملاوٹ معلوم ہوتی۔ وہ جتنا خاموش رہتا اتنا ہی پُرجوش اظہارِ محبت ہوتا معلوم ہوتا تھا کسی چیز کو دور جھٹک کر وہ جما کھڑا رہتا چاہتا ہے ایک نامعلوم سا خوف اور اکتاہٹ اُسے نڈھال کر دیتی اور وہ جھلاہٹ گہری محبت شمن کو خار بن کر کھٹکنے لگتی۔

ایک دن بڑی زبردستی سے وہ اُسے آبادی کی طرف گھسیٹ لے گئی تھوڑی دیر کو اس کی نیند دور ہو گئی بالکل پرانے بٹا کی طرح کافی پی کر قہقہے لگاتا رہا مگر جونہی ہنسی ختم ہوتی۔ ایک عجیب قسم کی جھجک اس کی حرکات میں معلوم ہوتی جیسے وہ رسّیاں تڑا کر بھاگ جانا چاہتا ہو۔ آدمی سے آنکھیں چند ھیائی جاتی ہوں تھوڑی دیر میں وجہ معلوم ہو گئی کہ لوگ چپ چاپ بیٹھے اس انوکھے جوڑے کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔ بیرا اپنا فرض بھول کر ان کے قریب کسی بہانے سے کھڑا رہ جاتا کاؤنٹر پر ریزگاری لیتے ہوئے گاہک کا حساب کتاب گڑبڑ نظر آتا اور دو چار پُرچی سوکھی ماری بیبیاں تو کھلم کھلا نازاں بیٹھی تھیں۔

"نہ جانے یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں؟" اُس نے زبردستی مسکرا کر کہا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟"

"یہی کہ ...... نہ جانے میں کون ہوں .... اور تم .... اوہ .... سوچنے دو ......

آؤ۔" وہ شمن کے چہرے پر رنگ آتا دیکھ کر ٹالنے لگا۔

"واپس چلو!" شمن نے درشتی سے کہا۔

"کیوں؟ ارے واہ!"

"میں کہتی ہوں واپس چلو۔"

"مگر ......" وہ کچھ جھینپا ہوا سا اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا۔ راستے بھر خاموشی رہی۔

"ہم ان سے ڈرتے ہیں ...... کیا ان کا دیا کھاتے ہیں؟" وہ مارے غصے کے لرزنے لگا۔ "جاہل کمینے!" وہ بُری بُری گالیاں بکنے لگا۔ آخر لوگ اتنے کوتاہ نظر کیوں ہیں؟ آخر انسان ہے تو ایک ہی بیج کا پھل۔ کیا چھوٹا کیا بڑا، کیا کالا کیا سفید۔ مگر کون سمجھاتا۔ کاش وہ اس شادی کے پیچھے چھپا ہوا شاندار مقصد موٹے موٹے حرفوں میں لکھ کر اپنی پشت پر ٹانک لیتے تاکہ یہ کوڑ مغز لوگ متحیر آنکھوں سے نہ گھورتے۔ یہ بے رحم آنکھیں جو معلوم ہوتا ہے پیٹھ میں سوراخ کر کے دل میں گھسی جاتی ہیں۔

"ان کا کوئی قصور نہیں عجائبات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔" شمن کا دل بیٹھنے لگا۔

"مگر انھیں کیا مطلب؟ یہ کیوں مرے جاتے ہیں؟ میں سب جانتا ہوں ان لوگوں کی سفیدی کو، دل کی سیاہی تو کوئی دیکھے۔"

"وہ مجھے کیوں بازاری عورت سمجھتے ہیں۔"

"میں ... میں گولی مار دوں گا ان حرام زادوں کے .... جیسے ان کی سفید بیلیاں تو لیس دی ہیاں ہیں۔" شمن نے اس کے دل کی بات کہہ دی۔ الیاس کا غصہ انتہا سے زیادہ بڑھ گیا۔ پھر وہ شمن سے لڑ پڑا گویا وہی ان سب کو بھڑکا آئی تھی۔

"تم جھکتی کیوں ہو؟" وہ چیخا۔

"میں کہاں جھکتی ہوں۔"

"اور کیا تم گھبرا کر انھیں اور شیر بنا دیتی ہو۔" اپنا الزام وہ شمن پر تھوپنا چاہتا تھا۔

"مگر میں ان کمینی حرکتوں کی ذرہ بھر پرواہ نہیں کرتا۔ اگر یہ لوگ مجھے ذلیل سمجھیں گے تو میں خود

اُن کے مُنہ پر تھوک دوں گا۔" اس نے اس زور سے چنگھاڑ کر کہا کہ ہر لفظ اُن کی ذہنی کوفت کا آئینہ دار بن گیا۔ گو وہ مُنہ سے بکتا رہا مگر اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دل میں مانتا ہے کہ ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں شیمن کو سہما ہوا دیکھ کر جی دکھ گیا اور وہ اسے سمجھانے لگا۔

اس ذہنی کوفت کو اس نے شراب اور زبردستی کی محبت میں ڈبونا شروع کیا۔ مگر اس طرح وہ اکیلا قرار پا جاتا شیمن اس کے رویے سے عاجز آ جاتی۔ اکتا دینے والا عشق مصنوعی اور فضول معلوم ہوتا۔ اپنے ہوش و حواس میں ہوتے ہوئے وہ اُس ملعون کے پاس کیونکر پہنچ سکتی۔

"ڈیوٹا کب چلے گئے؟" اُس نے ایک دم نرمی سے پوچھا۔

"نہیں؟" اس نے اپنے پوشیدہ خوف کو اور چھپانا چاہا۔ "تمہیں چھوڑ کر میں کیسے کام کر سکوں گا"

"مجھے کون چھوڑ نے کو کہتا ہے" شیمن نے جبر یہ ذلت برداشت کر کے کہا۔

"ایں!..... ہاں..... مگر وہاں ڈیوٹی پر مجھ سے نہ جایا جائے گا"

"پھر کیا ارادہ ہے؟ اسی طرح مٹ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے کیا؟"

"اگر تمہاری آغوش میں مٹ بھی جاؤں تو......"

"بکواس مت کرو ردی..... تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے"

"دھوکا..... کون کم بخت دھوکا دے رہا ہے؟" ہنہ! وہ مجرمانہ انداز میں نظریں بچا کر کہنے لگا

"تم مجھے ہی نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دے رہے ہو تم..... پچھتا رہے ہو"

"غلط..... غلط..... یہ سراسر بہتان ہے!" اُس کی تیزی اور جھلاہٹ نے بات کو اور پختہ اور یقینی بنا دیا۔

"میں تمہاری ہر بات سہہ سکتی ہوں۔ مگر زندگی یہ جھوٹ مجھ میں برداشت کرنے کی طاقت نہیں۔ اگر تم صاف کہہ دیتے کہ تم مجھے ساتھ لے جانے میں ذلت محسوس کرتے ہو تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا"

"میں کہیں تمہارے بغیر کبھی نہیں جاؤں گا۔ یہ بات طے ہے اور یہ کیسے کہتی ہو کہ مجھے تمہیں ساتھ لے جاتے ذلت محسوس ہوگی"

"اس میں تمہارا قصور نہیں اس بے جوڑے جوڑے کو دیکھ کر جب لوگ مسکرا اٹھتے ہیں، آنکھ بچا کر اشارہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ تم......"

"تو پھر تو تم بھی جھوٹ بولتی رہی ہو گی۔ گو ظاہر تو یہ کرتی ہو کہ نہ تو تم نے کچھ دیکھا اور نہ سمجھا۔"

"یہ..... یہ میں اس لیے کرتی ہوں کہ..... میں......" وہ کچھ نہ بتا سکی۔

"تب مجھے دھوکا دینا چاہتی ہو۔ تم خوب دیکھتی ہو کہ میرے ہم وطن مجھے تنفر سے بھری ہمدردی کے ساتھ دیکھنے ہیں گویا تم ایک بیماری ہو جو میری حماقت سے میرے سر منڈھ دی گئی۔ اور تمہارے بھائی بند سمجھتے ہیں کہ تمہارے پہلو میں ایک انسان نہیں ان کی ساری قوم کی شخصیت پر ایک ہونی سی داغ لگا ہے۔"

"لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں......"

"تم...... مگر تم مجھ سے کیوں لڑ رہی ہو۔ گویا اس میں میرا کوئی قصور ہے...... تم جانتی ہو میں تمہارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"ہوں، یہ جو تم پستی کی طرف گرتے جا رہے ہو یہ بھی صرف میری خاطر...... تم نیچے اتر کر میرے برابر ہونا چاہتے ہو تم مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہو کہ میرے برابر آنے کے لیے تمہیں اٹھنے کی نہیں بلکہ گرنے کی ضرورت ہے؟"

"یہ تمہارا وہم ہے۔"

"نہیں یہ میرا وہم نہیں میں دیکھ رہی ہوں تم اس دوری اور فرق کو مٹانے کے لیے خود مٹے جا رہے ہو۔"

"تمہاری محبت کی خاطر سوچو تو اگر تمہیں چاہتا نہیں تو پھر......"

"مگر یہ محبت کیسی جو تمہیں میٹ رہی ہے میں سمجھتی ہوں یہ کیا ہے تمہیں محبت ہو یا نہ ہو مگر اتنا یقین ہے کہ مجھے اٹھا کر اپنے برابر کرنے کی کوشش بیکار ہے تم سفید لوگوں کی دنیا اتنی بلند ہے کہ میرے سیاہ وجود کو اس مقدس درجے تک لے جا کر اپنی اور اپنی قوم کی توہین نہیں کر سکتے لہٰذا خود اپنی حماقت کے حضور میں اپنی ہی قربانی دے رہے ہو۔"

"تمہارے وہم سیدھی بات کو بھی بھوت بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ ذہنیت......"

"ہندوستانی ہے کہہ دو" بیچ میں انتہائی تلخی پیدا کر کے کہا۔

"چھ چھ اتنا احساس کمتری! تم ہندوستانیت کو توہین سمجھتی ہو یقین مانو تم نے جو کچھ کیا انجان ہوتے ہوئے کیا۔"

لیکن یہی کیا کم تھا کہ "کیا" آخر قدرت کو اس کے ہر شعبۂ زندگی سے خواہ مخواہ کا بیر کیوں

ہوگیا تھا۔ تلخیاں بڑھتیں پھر دب جاتیں مگر ہر جرم کا ایک داغ چھوڑ جاتا۔ محبت اور انسانیت ہر وقت میدان میں ڈٹے نہیں رہ سکتے۔ ویسے دونوں کا جی بھی اکتا گیا تھا۔ محبت بیحد معلوم ہونے لگی تھی ایک دوسرے کے وجود سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ ہنی مون ہی میں ایک دوسرے کی جدائی کے سپنے تڑپنے لگے اور یہ چھوٹے موٹے جھگڑے اس نفرت کو بڑھانے لگے جو دونوں کے لاشعور میں حلول ہو چکی تھی مگر وقتی طور پر دبی ہوئی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں اپنی بھول پر حیرت زدہ ہیں۔ پچھتانے میں خودداری کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہے لہٰذا سکونِ قلب کا یہ نسخہ بھی ٹھکرایا ہوا ہے۔ یقیناً ٹیلر پر تو کسی قسم کا کوئی سوداوی مرض قابو کیے ہوئے تھا ورنہ وہ اس قدر آسانی سے یہ ڈرامہ نہ کھیل جاتا۔ اوپر سے مرچوں اور شراب نے دھار رکھ دی جھنجھلا کر وہ احساسِ شکست سے بچنا چاہتا۔

بہت ضبط کرنے مگر ذرا سی ٹھیس سے پکا پھوڑا پھوٹ نکلتا اور دونوں کو اپنی خوبیاں اور دوسرے کے عیب نظر آنے لگتے وہی طعنے جو انہیں لوگوں کی آنکھوں میں نظر آتے تھے الفاظ کی مدد سے ایک دوسرے پر پھینکے لگے شکل و صورت کی وہی خوبیاں جو کبھی دیوانہ بنا گئی تھیں آنکھ میں شہتیر بن کر کھٹکنے لگیں۔ ٹیلر کے بال بے جان اور بدرنگ نظر آتے۔ آنکھیں غائب معلوم ہوتیں اور جلد کچے گوشت جیسی لگتی۔ اُدھر ٹیلر کو اس کے سیاہ بال اور آنکھیں ڈراؤنی معلوم ہونے لگیں۔

خدا خدا کر کے ہنی مون کا مصیبت بھرا زمانہ ختم ہوا اور مجبوداً لوٹنا روانہ ہونا پڑا۔ ٹیلر کا خوف تازہ ہو گیا گویا وہ نہایت پرخطر اور اجنبی محاذ پر جا رہا ہے۔ شمن اسے محسوس کرتی اور سارا غصہ اور نفرت لاوے کی طرح سینے میں جمع کر لیتی جو غول بیابانی کی طرح دل و دماغ میں بلبلا رہا تھا۔

اسٹیشن پر ایک دوسرے سے رشتہ داری ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور کمپارٹمنٹ میں بھی اگر کوئی غور سے دیکھتا تو دونوں کو انسانیت سے زیادہ قریبی رشتے میں منسلک تصور نہ کرتا وہ ایک دوسرے سے بے توجہی اپنی تنہائی ظاہر کرنے میں کوشاں تھے۔ کوئی نہ دیکھتا ہوتا جب بھی حساس بنے غصے ہونے کو تیار رہتے آوازوں پر کان لگائے رہتے کہ کہیں اُن کے ہی متعلق تو کانا پھوسی نہیں ہو رہی ہے۔ غیروں کی طرح ڈائننگ کار میں کھانا کھایا اور بل ادا کرتے وقت ٹیلر کے کان سرخ ہو گئے اور شمن نے بیرے کی ناقدانہ نظروں کا بڑی شکل سے مقابلہ کیا۔ دو لیے چوڑے انسان اپنے

جوڑ کے بے نکے پن کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

کبھی بھولے سے وہ بے تکلفی سے کوئی دلچسپ بات ایک دوسرے سے کہتے تو فوراً ڈر کر ادرگرد دیکھنے لگتے کہ لوگوں کی حیرت کا کیا حال ہے اس برادری اور دھوم سے قائم کیے ہوئے جائز رشتے کو گناہ کی طرح چھپانا پڑ رہا تھا جب ٹیلر کا سر سوتے میں تکیے سے ڈھلک کر گر گیا تو شمن کی ہمت نہ پڑی کہ اسے چپکے سے سر کو سیدھا کر دے۔ گو اسے خوف تھا کہ کہیں بے چارے کی گردن نہ رہ جائے وہ معمولی سا خیال جو برسوں کے پرانے میاں بیوی میں ابھی تھوڑا بہت رہ جاتا ہے یعنی ایک دوسرے کی تکلیف سے بے چین ہو جانا اس کے لئے اظہار تعلق بھی چھن چکا تھا اور وہ ابھی تک دو لوگ تھے سامنے ایک ادھیڑ عمر کا جوڑا بیٹھا کھلے بندوں ننھے بچوں جیسے اخلاص کر رہا تھا۔ اگر ابھی اس کی جگہ کوئی سفید قوم کی لڑکی ہوتی تو سر بازار اپنے سیاہ بھٹ میاں کو چپاچپ چومنے کا حق رکھتی بلکہ فخریہ کہتی کہ "لو دیکھو میرے روپہلی حسن کی طاقتیں کہاں کہاں کا جانور پھانس کر لاتی ہیں؟" اور وہ سیاہ آدمی بھی اس روپہلی بادش سے کھل کر فخریہ کہتا کہ "دیکھو تم ہم کو کالا سمجھتے ہو مگر یاد نہیں کرشن جی بھی تو کالے تھے اور گوپیاں ان کی متوالی تھیں......" مگر وہ، حقیر تھی۔

اور اس کا جی چاہا سب کے منہ پر تھوک دے اور اسی وقت سب کے سامنے جھک کر ٹیلر کے ڈھلکتے ہوئے سر کو آرام سے رکھ دے اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے شربتی بالوں کی ریشمی نرمی کو انگلیوں میں جذب ہوتا محسوس کرلے۔ اس کی پلک کا ایک بال جو ٹوٹ کر ہونٹ پر چپک گیا ہے جیسے سونے کا باریک سا تار، وہ اسے انگلی سے ہٹا دیتی تو کتنا اچھا ہوتا کہیں آنکھ کھلے تو اندر نہ جا پڑے ویسے ہی کیا کم کوئلے پڑ چکے ہیں جو اس نے غسل خانے میں آنکھیں مسل کر نکالے۔ کتنا اس کا جی چاہا کہ ساڑھی کا پلو تہہ کر کے منہ کی بھاپ سے گرمی پہنچا دے مگر اسے یہ تجویز ٹیلر کے سامنے پیش کرنے کی ہمت نہ پڑی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ اس ذلت کو برداشت کرنے سے پہلے مرجانا بہتر سمجھے گا۔

اور یہ وہی ٹیلر تھا جو مندری کے کی طرح روز آن کھڑا ہوتا تھا۔ دھن کے پکے بھکاری کی طرح اس نے دروازے پر دھرنا دے کر اسے حاصل کیا تھا اور پھر اپنے کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا تھا یہ وہی انسان تھا جو اس کے گھٹنے پر سر ٹکا کر تیل ملوانے کے لیے مصر ہوتا تھا

پیڑوں کی جڑوں سے کشتی لڑ کر جب پھانسیں لگا لیتا تو شملے کی خنک شاموں کو بجلی کے سامنے وہ سوئی سے انہیں نکالا کرتی اور اس وقت وہ ضرورت سے زیادہ شریر بن جاتا ہر پھانس کا یہ حصول کر کے نکلوا آتا اور دوسرے دن جان بوجھ کر نئی پھانسیں لگا لیتا لیکن اگر اس وقت سب کے سامنے وہ اس کا سر چھو بھی دیتی تو وہ مارے ذلت کے مر ہی جاتا اور وہ خود بھی اسے اپنے آپ پر کچھ کم رحم نہ آتا۔

وہ پہلے سوچا کرتی تھی کہ بھلا کیا جانیں یہ انگریز کہ عشق و محبت کیا چیز ہے ہوا و ہوس کے بندے نہ شرم نہ حیا بھلا ارمان کیا سلامت رہتا ہو گا ان میں؟ کتنی سخت بے دردی اور مطلبی محبت ہو گی لیکن روتی بالکل مختلف تھا وہ ہر ہندوستانی اور غیر ہندوستانی مذاق کو سمجھتا اور اس میں وہ ساری حماقتیں موجود تھیں جنھیں وہ بچپن سے عشق و محبت سے وابستہ سمجھتی تھی وہ بدمذاق نہ تھا گھنٹوں ایک دوسرے کے بچپن کے قصے سن کر ہنستے دنیا کے دو مختلف ٹکڑوں پر بسنے والے ایک ہی جیسے بچپن اور جوانی گزار چکے تھے وہی چھوٹی چھوٹی شرارتیں اور سزائیں معصوم دل چسپیاں اور ویسا ایک ہی جیسے کھیل۔

اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ پھر دور دور رہ جاتے اور ایک دوسرے کے سامنے سے بھاگ جاتے تھوڑی دیر میں کمپارٹمنٹ خالی ہو گیا تو بجائے قریب آنے کے وہ ایک دوسرے کو بزدل اور بے وفا ثابت کرنے لگے اور وہ نرم گرم جذبات جو تھوڑی دیر قبل دونوں کے دل میں جنم لے رہے تھے کملا کر ختم ہو گئے پونا پہنچ کر زندگی سلجھنے کے بجائے اور الجھ کر رہ گئی۔ سب سے پہلے تو نوکروں کی حیرت کا مقابلہ کرنا پڑا پاس پڑوس کی متعجب آنکھوں کے تیر سہنے کے لیے گینڈے کی کھال کی زرہ بکتر پہننا پڑی جاتا تو وہ لینے آتا اور کچھ نہیں تو لے کار کے سودا بیچنے والے ہی جان بوجھ کر تاک لگانے سونگھتے چلے آتے ٹیلر کے دور دراز کے ملنے والے ان کے ہندوستانی دوستوں کے دوست آنکھیں پھاڑے مبارک باد دینے دوڑے آتے۔ ان کی آمد کی خبریں اڑ جاتی وہ لوگ بڑے ہنس ہنس طریقوں سے ان عجیب و غریب بیاہ کا ذکر اول سے آخر تک سننا چاہتے ان کے چہرے تجسس سے پریشان ہو جاتے اور عقلیں پراگندہ! یہ ہوا کیسے ہوا؟

جتنے منہ اتنی باتیں پرانے گھاگ انگریزوں کے خیال تھا کہ وہ کوئی آوارہ عورت

تھی، تو وارد اسے کسی ریاست کی مہارانی سمجھنے چند ایسے بھی تھے جو کچھ فیصلہ نہ کر سکتے مگر دونوں کو خالی الذہن ضرور سمجھتے انتہا ہو گئی کہ ٹیلر کے افسرنے اس کو یلا کراس تمام قصے کو سیاسی نقطۂ نگاہ سے معیوب حماقت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس نے آقاؤں کی قدیم روایتوں کو ٹھیس لگانے کی کوشش کی تھی جواب میں ہی کرتے کرتے ٹیلر تھک ہی نہیں گیا۔ بلکہ خود اپنے اوپر جو اعتماد تھا کھو بیٹھا۔ یہ بات یہیں تک نہیں بلکہ ڈاک کے پردوں پر اڑتی ہوئی امریکہ میں ٹیلر کی بیوہ ماں تک پہنچ گئی وہ کم عقل اور کٹر نہ تھی مگر پھر بھی مغفتی خدا مانگا تھا ٹیلر اس پر بھی چراغ پا ہو گیا۔

"مگر اس میں ایسی کیا برا ماننے کی بات ہے" اس نے بڑھیا کی حمایت کی۔

"کچھ نہیں تم اس کی حمایت صرف میری ضد میں کر رہی ہو۔ میں اسے منہ بھی نہ دکھاؤں گا۔ اگر وہ مجھے اب تک بچہ سمجھے ہوئے ہے تو یہ اس کی بھول ہے" ٹیلر کا غصہ ناک پر دھرا رہنے لگا تھا وہ اب بالکل جاگ اٹھا تھا اور شراب بھی نشہ نہ لا سکتی تھی۔ وہ عموماً ہر جلسے اور پارٹی سے جان چرا تا یا تو اسے کوئی مرض آن دبا تا یا مجبوراً شمن کو ایک آدھ بہانہ تلاش کرنا پڑتا۔ دنیا کو چھوڑ کر وہ ایک دوسرے سے اور بھی اکتانے گئے۔ زیادہ وقت ایک دوسرے کو طعنے دینے اور اپنے حال پر رحم کھانے میں صرف ہوتا۔ دونوں اس مصیبت کا الزام اپنے اوپر سے اٹھا کر دوسرے کے سر منڈھنا چاہتے تھے۔ بہت جلد زندگی خوفناک حد تک بار لین کر رہ گئی۔ اگر وہ ہمت کر کے کسی کے یہاں چلے بھی جاتے تو گھما پھرا کر ان کے بے تکے عشق کا ذکر نکل آتا۔

ایک بار ہمارے ایک لمڈنسے کے چچا نے ایک ریڈ انڈین سے شادی کر لی تھی بڑی باوفا اور نیک تھی ہمیں اپنی زبان کے گیت اور خوفناک جنگلوں کے قصے سنایا کرتی تھی" وہ بڑے جوش سے کہتے۔

"ہندوستان سے دوستی بڑھانے کا یہی طریقہ ہے کہ کالے اور گورے کا امتیاز اٹھا دیا جائے" وہ بڑے فراخ دل بن کر کہتے مگر ان کی یہ سخاوت وہ لوگ اور بھی دکھ پہنچاتی وہ خوب سمجھتے تھے کہ اس کے اصلی معنے یہ ہوئے کہ مشرق اور مغرب کو ملانے کی کوشش اتنی ہی مشکل اور بے سود ہے جتنی سیاہ کو سفید بنانے کی آرزو۔

ہر ملاقات کے بعد نئی ملاقات کا خیال بھیانک بن کر خون خشک کرنے لگا کئی تک دلوں پر مردنی چھائی رہتی جو آپس کی الجھنوں کی شکل میں پھوٹ نکلتی۔ الگ الگ دوستوں کا حلقہ بنایا تاکہ ایک دوسرے کی موجودگی جو سوالات دلوں میں پیدا کرتی ہے اس کی گنجائش ہی نہ رہے مگر لوگوں سے نجات

کہاں تھی۔ لاکھ یقین دلانے کہ یہ سب حماقت محبت کے زبردست ہاتھوں سے مجبور ہو کر کی گئی۔ اب بھی بہت خوش ہیں اور قطعی نہیں پچھتاتے ہر مخالفت کو تیار ہیں مگر اس طرح مستعدی سے تیار ہونا ہی صاف ظاہر کرتا تھا کہ انھوں نے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کش مکش میں خود کو ڈال دیا ہے۔

اور ادھر جاپانی پیاخوں نے بُری طرح فضا کو مکدّر کر رکھا تھا۔ بم تو خیر جہاں گر رہے تھے تباہی مچا رہے تھے مگر جو انسان اُن سے بچنے کے لیے بھاگ رہے تھے اُن کی حالت قابلِ رحم تھی جیسے کھلاسن کر بد حواس بھیڑیں چاروں طرف بھاگنا شروع کر دیتی ہیں اور بجائے محفوظ ہونے کے خود خطرہ بن جاتی ہیں۔ یہ گھبرائے ہوئے کم عقل جانور ایک شہر سے بھاگ کر دوسرے شہر میں پناہ لینے دوڑ پڑے۔ آدھے پونے سامان بیچ کر ریلوں پر حملہ کر دیا۔ بمبئی کے لوگ کلکتہ اور کلکتہ کے بمبئی اس کوٹھی کے دام اس کوٹھی میں بدل کر یہ سمجھ لیا کہ اب بھی تن نہیں لگ سکتا۔ حادثوں سے جتنی جانیں گئیں اتنی شاید سال بھر کی لگاتار بم باری سے بھی نہ جاتیں۔ گھپ اندھیرا سڑکوں ہی پر نہیں عقلوں پر بھی چھا گیا۔

"مگر یہ کیا ہوا؟ یہ ڈھال پر سے اُترتے اُترتے روڑے پر سے پیر پھسل گیا۔ برف کے بے جان سفید بھوت نے چاروں طرف سے ہاتھ پھیلا کر ہٹلر کی بڑھتی ہوئی جرأت کو آغوش میں کھینچ لیا ہڈیاں تک چبا کر رکھ دیں۔ موجیں امڈ امڈ کر چڑھتی ہیں اور سفید چٹانوں سے سر پھوڑ کر لوٹ آتی ہیں۔ اوپر سے برف کے بیٹوں کی دیدہ دلیریاں الاماں۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک دم لوٹ پڑے جیسے چالاک کبڈی باز اپنے پالے میں دور تک دوڑا لائے پھر جو رپٹا لیے ہے تو چین بلا کر ہی چھوڑا۔ تمام دنیا کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں بندھ گئیں۔ ہارتے اور پیچھے بھاگتے ہوئے بھی سنبھل کر ڈٹ گئے۔ سرخ ستارہ جو خون میں لت پت مگر سانس لیے ہوئے نکل آیا وہ دو مہینوں میں ختم ہونے والا نہ تھا الٹ کر جا پڑا۔ ہو گیا۔

"ہم جانتے تھے آخر میں فتح ہماری ہی ہو گی" ٹیلر نے اخبار دیکھ کر غرور سے کہا۔

"تمہاری؟ یعنی یہ فتح تمہاری رہی اور وہ شکستیں جن کا مزہ شاید اب تک وہاں پر ہو گا۔ وہ کس کے حصے میں لگا دیں" شمن نے چڑھ کر کہا۔

"ابھی؟ ..... ہار اور جیت تو ہوا ہی کرتی ہے ......"

"اچھا تو کبھی ہار بھی ہوتی ہے۔ منہ سے تو یہی کہتے رہے کہ جیت رہے ہیں وہ بہادری سے پیچھے ہٹنا کچھ تم ہی لوگوں کی صفت ہے۔ تم میں تو کیا دم تھا کہ ہٹلر جیسے جن سے اٹکتے۔ یہ

ہندوستانی بیٹیاں اس دیوتا کے کلیجے کی آگ کیا بجھا سکیں۔

"تم پالیٹکس نہیں سمجھ سکتیں۔ اتحادی....."

"جب تک ہارنے کا خوف ہے اتحادی بنے ہوئے ہو ادھر جیتے ادھر سارا اتحاد چولھے میں ڈال کر حصے لینے دوڑ پڑو گے اور پھر نہ دیکھو گے بھائی نہ بھتیجا بس سرکار عالیہ رہ جائیں گے اور ان کے چیلے چانٹے۔"

"اب کے ایسا نہ ہوگا۔"

"ابھی فصلیں بھی کہیں بدلی ہیں جرمنی ختم ہوتے پھر روس کی باری رکھی ہے۔ آج روس کے گن گائے جا رہے ہیں کل تک اسے انسانیت کا دشمن کہتے تھے آج جاپان کی چین میں درندگی میں پیار سے ہاتھ ڈالے پھر رہے ہیں کل تک یہی چینی چور ظالم وحشی اور بدمعاش تھے سوائے ڈاکوؤں کے بیکار چیلے کے کبھی کوئی دوسرا عہدہ نہ ملا۔ آج وہی چینی اتحادیوں کی فہرست میں گنے جا رہے ہیں۔ جاپان کے مظالم کا نقل چھاپ رکھا ہے در اپنے نقل انسانیت کی حفاظت بنا کر پیش کیے جا رہے ہیں مگر یاد رکھو ظلم کی ایک انتہا ہوتی ہے جہاں پہنچ کر ظالم خود اپنے ہاتھ سے اپنا گلا گھونٹ لیتا ہے۔"

"ٹھیک ہے ظلم تو ہوتے ہیں لیکن میرے خیال میں ان ہی میں فائدہ ہے غور سے دیکھو تو باوجود مظالم کے ہندوستان بہت ترقی یافتہ ہو گیا ہے اور ہوتا جا رہا ہے۔"

"یہ جو چند کروڑ انسان انگریزی بولنے لگے ہیں اسی کو تم ترقی کہتے ہو گے کاش اسی طرح تمہیں ہٹلر جرمنی سکھا کر مقدس انسان بنا سکتا۔"

"اسے ذاتی لڑائی کیوں بنا رہی ہو" ٹیلر چڑ گیا۔

"کیونکہ یہ ہماری ذات سے وابستہ ہے۔"

"سکون چاہتے ہیں تو ہمیں بہت کچھ برداشت کرنا ہوگا"

"میں سب کچھ برداشت کر لوں گی مگر اپنے ملک کو ان سفید چمڑی والوں کی ایڑی تلے مسلتا دیکھ کر ضرور میرے دل سے خون ٹپکے گا میرا دل روئے گا آنکھیں روئیں گی اور روح ہمیشہ دُعا کرے گی یہ نہ سمجھو یہ پھلجھڑی ٹھنڈی پڑ گئی ہے تو چنگاریاں بھی بجھ گئیں۔ کبھی تو زمانے کی ہوا رخ بدل کر چلے گی پھر انتقام"

"مگر تم نے تو ریجی ہو اپنی ساری قوم کا دبا ہوا جذبۂ انتقام تم میرے ہی سر ختم کر دو گی؟"

گھریلو جھگڑا تلخ تر ہوتا گیا۔

"اور تم؟..... میری قوم کو دماغی مالی اور جسمانی طور پر پیسنے کے بعد اب اس کی روح پر حملہ کر رہے ہو۔ خیر اب تک تو اقتصادی اور سیاسی دنیا کے مالک تھے اب مجھ جیسے بدنصیب عورتوں نے اپنی آخری دولت بھی تمہاری جوتیوں میں ڈال دی۔"

"مگر میں کون سا خوش ہوں۔ مجھے بھی تو خوب انعام ملا میری قوم میرے منہ پر تھوکتی ہے۔ تمہارے وجود کی سزا مجھے ان کی پھٹکار کی صورت میں بھگتنی پڑ رہی ہے۔ سڑے ہوئے انگلی کے پورے کی طرح انھوں نے مجھے کاٹ کر جسم سے دور پھینک دیا ہے۔"

"اور..... اور مجھے؟ زندگی بھی اتنی کمینی نہیں سمجھی جاتی جتنی میں اپنی قوم کی نظروں میں ہو گیا ہوں۔ میں نے ان کے پرغرور سر کو تمہاری ٹھوکروں میں ڈال دیا۔ وہ میری پرچھائیں بھی اپنی شریف عورتوں کے اوپر پڑنا گوارا نہ کریں گے۔"

"مگر اس میں میرا کیا قصور ہے تم بچے تو نہیں تھیں تمہارے کم بخت ملک کی غلیظ آب و ہوا اور خود تمہاری سیاہ کشش نے میرے دماغ کو مفلوج کر دیا میں نے بہت برداشت کیا لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ مجھ سے ضبط نہیں ہوتا۔ لیکن کوئی علاج بھی تو نظر نہیں آتا میں اس راہ پر گم ہو گیا ہوں جو مجھے لوٹنے بھی نہیں دیتی۔"

"یہ الفاظ تمہارے منہ سے نکل رہے ہیں۔ تم جو میری جوتی پر ناک رگڑتے تھے میں نے تمہاری اچھا پلوسی کو سچ سمجھ لیا۔ تم پتھر ہو گیا ایک بار تمہارے برف کے تودے جیسے وجود میں انسانیت کو پالنے کی کوشش کی اور اسی حماقت کی سزا بھگت رہی ہوں مگر معلوم ہو گیا تم لوگ انسان ہو ہی نہیں سکتے۔ لاکھ خول چڑھاؤ حقیقت تمہاری چھپڑیوں کا راز فاش کر کے رہے گی۔ جو تم خواہ در ندے جھوٹے اور فریبی کہاں کے۔"

"خاموش، بدتمیز!"

"ہنہ بدتمیز! چور کو چور اور حیوان کو حیوان کہنا بدتمیزی نہیں راست گوئی ہے سمجھے لیفٹیننٹ"

"میں کہتا ہوں خیریت اسی میں ہے کہ چپ ہو۔" رونی کی زبان ہار گئی اور غصے سے آنکھیں دہک اٹھیں۔ اس کی شکل گھناؤنی ہو گئی۔

"او ہو تم سمجھتے ہو کہ تمہارے بھونکنے سے میں ڈر جاؤں گی۔ چاہے کچھ ہو میں تمہارے فریب کا حال ضرور کھولوں گی۔ اس طرح دھوکا دے کر..... شعلے کی طرح بھڑکا ہوا چہرہ اور بھی سیاہ پڑ گیا۔ پوری طاقت سے چوڑا چکلا ہاتھ کنپٹی اور رخسار کو کچلتا ہوا شمن کو زمین پر گرا گیا۔

ٹیلر کا منہ اُترا، باہر چلا گیا۔ شمن نے ایک آہ بھی نہ بھری وہ بڑی احتیاط سے سنبھل کر کرسی کا سہارا لے کر بیٹھ گئی
"وہ کیا کرے؟ اب کیا کرے؟"

"ٹھنڈے دماغ سے سوچو، ذرا صبر و تحمل سے۔ گناہ کیا ہے تو خمیازہ بھگتنے سے اتنی مت ڈرو۔ تھوہر کا پیڑ سینچ کر انگور توڑنے کی امید نہ کرو۔" ٹھہرو یہ سر پکڑے وہ کئی گھنٹے روتی رہی۔ ٹیلر رات گئے آیا نشے میں دھت تھا اس کے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی چاپ سن کر بھی وہ کانپ اٹھی اور جلدی سے کنڈی لگا کر پلنگ پر گر گئی۔ ٹیلر تو پلنگ پر گرتے ہی سو گیا مگر وہ آنکھیں اڑائے صبح تک کھڑکی سے کالی بھیانک رات کو گھورتی رہی سوچتے سوچتے کنپٹیاں سُن ہو گئیں، دماغ دکھ گیا پر وہ کیا سوچ رہی تھی سوائے شدید غم کے کوئی دوسرا احساس زندہ بھی نہیں رہا تھا۔ جسم تھک کر پکا پھوڑا ہو گیا۔ کاش کسی غیبی جراح کا مشاق ہاتھ اس ٹیس کو ٹھنڈا کر سکتا۔

صبح اس نے چائے کی پیالی بستر پر پڑے پڑے حلق سے نیچے اتاری۔ ٹیلر کے جانے کے بعد وہ اٹھی۔ آج وہ بہت خوش وضع کپڑے پہن کر گیا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے سیٹی بھی بجائی تھی جس کی ہر تان سے مسرت ٹپک رہی تھی۔ دوپہر کو اس نے فون پر لنچ کو منع کر دیا اور سیدھا ٹیس کو وہیں چلا گیا۔ وہاں سے خوب ہار کر اور پی کر رات گئے لوٹا۔ بیرے کو مارتے مارتے چھوڑا۔ یہ ایک نئی ادا تھی۔ اس کا رویہ نوکروں سے عام سفید لوگوں سے بہت مختلف رہا تھا۔ وہ ان سے بہت نرمی سے بولتا اور جھوٹا مذاق کیا کرتا تھا۔ آج وہ ٹیڑھی میڑھی عین جین انگریزی اردو میں احکامات صادر کر رہا تھا۔

دو دن اسی طرح آنکھ مچولی ہوتی رہی اگر بھولے سے سامنا ہو جاتا تو نفرت سے منہ موڑ کر دور ہٹ جاتی۔ ٹیلر بظاہر بڑا ہشاش بشاش رہتا تھا مگر شمن کو یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ وہ بھول بھول کر سر تھام کر پریشانی میں ڈوب جاتا، بار بار چیزیں پٹخ دیتا اور نوکروں پر جھلاتا۔ وہ دکھی تھی تو ٹیلر بھی کچھ تو بھگت رہا تھا۔

شمن کھوئی ہوئی سی بیٹھی تھی جیسے وہ کسی مضبوط پل پر دوڑتے دوڑتے ایک دم ٹھٹک گئی ہو، آگے تختے اکھڑے ہوئے تھے اور نیچے لامتناہی گہرائیاں اور بے رحم چٹانیں۔ شب بیداری سے اس کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے پڑ گئے تھے، کپڑے میلے ہو گئے تھے مگر وہ بے خبر نہ جانے کیا سوچنے کی کوشش کیے جا رہی تھی۔ جو کچھ اس نے کیا تھا اس کی سزا وہ تنہا بھگتنا چاہتی تھی، ویسے اس نے ابھی کسی سہیلی کو اس بیوقوفی کی خبر بھی نہ دی تھی۔ ہمدردی وصول کرتے کیسے لگتی تھی اور خطوں میں بھی اس کی موجودگی نہیں چاہتی تھی۔ اس کے گھر والوں کو ابھی تک خبر مل گئی تھی مگر وہ بھی سناٹے میں خاموش ہو گئے تھے۔

"جب تم ہی اتنی مضبوط ہو تو ہم کون؟" ان کے رویے سے صاف ظاہر ہوتا تھا ایک طرح وہ گو اُس کی طرف سے عرصہ ہوا تھا نا امید ہو چکے تھے اور کوئی بھی خبر انھیں متحیر نہ کر سکتی تھی اگر انھیں اس انجام کی خبر ملتی تو بھی شاید کچھ زیادہ متاثر نہ ہو سکتے کیونکہ وہ پہلے ہی سے اس انجام کی پرچھائیاں دیکھ چکے ہوں۔ روپے کی اُس نے کبھی پروا نہ کی اور آج سے معلوم ہوا کہ اگر پاس روپیہ ہی ہوتا تو زندگی اتنی گھٹی ہوئی نہ نظر آتی گو اُسے نوکری آسانی سے مل سکتی تھی کوئی معمولی سی پڑھانے کی نوکری دیہات سے دور بوسیدہ کتابیں نہ شوق لڑکیاں اور لامتناہی اکیلا پن وہ اس آخری ہونے سے بہت ہی خائف ہو چکی تھی مگر اس دم گھونٹنے والی خلائیں گھرتے ہوئے لرزہ چڑھتا تھا لیکن اب کیا ہوگا؟ سوچتے سوچتے سر کی رگیں سوج گئیں مگر کوئی دھندلی سی شعاع بھی روشنی کی نہ ملی۔

"شمو ..... شمو ....." روفی کی آواز گھبراہٹ اور خوشی سے لرز رہی تھی۔

"کہاں ہو شمو ڈیر ....." وہ گیلری میں بے تحاشا دوڑ رہا تھا "شمو" اس نے دروازے ہی سے اُسے چیخ کر پکارا "یہ ..... یہ دیکھو ..... ممی پاپا کا خط" جلدی سے وہ آکر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ شمو نے چونک کر پیر سمیٹ لیے۔

"یہ دیکھو ..... ذرا دیکھو کیا لکھا ہے" "میں اپنی پیاری بیٹی کے لیے اپنے بیاہ کا بروچ اور لاکٹ بھیج رہی ہوں ..... اصلی ہیروں کا ہے میرے باپ کو ہیروں سے عشق تھا ..... اچھا سنو ..... میں خود اپنے ہاتھوں سے اگر پہناتی تو ....." "اوہ ممی ..... وہ شمو کی گود میں سر رکھ کر قہقہے لگاتے ہوئے آنسو بہانے لگا "ممی ہیرا ہے ہیرا ..... شمو"

اور پھر نہ جانے کیسے ملاپ ہو گیا۔ ٹوٹے ہوئے پل کے تختے جڑ گئے اور پھر ایک بار زندگی کی گاڑی دندنانے لگی۔ شمو نے اپنے آپ کو خوب گالیاں دیں اور کوسا۔ سارا الزام اپنے سر لے لیا بالکل ننھا سا روفی بن گیا اور سوائے ممی اور شمو کے اس کے منہ سے دوسری بات نہ نکلتی تھی۔ رات کو دونوں نے لارل اور ہارڈی کا ایک مذاق سے بھرا ہوا فلم دیکھ کر بچوں کی طرح تالیاں بجائیں باوجود سختی سے منع کرنے کے وہ بے دھڑک سب کے سامنے چومے جا رہا تھا لوگوں کی تجسس سے پھٹی ہوئی نگاہوں کا جواب وہ گستاخ قہقہوں سے دے رہا تھا۔ آج دنیا میں بس تین انسان تھے دو یہ بگڑے دل اور ایک محبت کرنے والی ماں جو ہزاروں کوس دور امریکہ میں بیٹھی انھیں اپنی آغوش میں لیے

چوم رہی تھی۔ شاید اسے معلوم بھی نہ ہوگا کہ اُس نے غریب الوطن بیٹے اور غیر قوم کی بیٹی کو اپنے کتنے قریب کھینچ لیا تھا دونوں کے دل سفید بالوں والی معصوم صورت بڑھیا کے خیال سے ناچ اٹھے تھے وہ اب دنیا میں اکیلے نہیں تھے ایک تیسری جان اُن کی زندگی میں آگئی تھی آج ان کا بھی ایک بزرگ پیدا ہو گیا تھا جس نے نصیحت کو بھول کر رنگ اور قومیت پر لکیر دیے بغیر انہیں پیار بھری مبارک باد دی تھی۔ اس کی بہو ایک عورت تھی جسے اس کے چہیتے بیٹے نے چنا تھا اس کے علاوہ اس نے کچھ بھی نہ سوچا اور ضرورت بھی کب تھی کچھ سوچ بچار کرنے کی۔ آج تک اس بیٹے نے کون سی غلطی کی تھی جو اس کی رائے پر عمل کیا اور کامیاب جوان بن کر اب انسانیت کے لیے ہتھیلی پر جان رکھ وطن سے دور پڑا ہوا تھا۔ وہ عورت جس نے اس انجان غریب الوطن سے پیار کیا ہوگا۔ وہ ضرور قابلِ محبت ہوگی۔ خواہ کتنی ہی کالی ہو مَن کی ضرور گوری ہوگی بس وہ اسی لیے اپنے خاندانی زیور اس کے سپرد کر رہی تھی!

نہ جانے روفی نے اُسے کیا لکھا ہوگا آخر ماں ہے بیٹے کی ضد سے مجبور ہو گئی۔ اور یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ بدگمانی نے سر اٹھایا۔ تو یہ ماں بھی بیٹے کی طرح مکار تھی! اُف یہ سفید چمڑی!

مگر جب روفی خراٹے لینے لگا تو سرہانے کا دھیما لیمپ جلا کر اُس نے خط دوبارہ پڑھا ایک بار۔ دو بار ۔ اور آنسو نہ روک سکی۔ دور بچھڑی ہوئی ماں کا آنسوؤں میں بھیگا ہوا خط، دُنیا کے کسی جھگڑے کا اس میں ذکر نہ تھا۔ نہ اس خونی آشام جنگ کا نہ قومی خدمت کا نہ فتووں سے ڈرایا تھا نہ کہیں ہمت دلائی تھی جیسے دنیا میں اور تیسری چیز کا وجود ہی نہیں۔ ایک ماں ہے اور اس کا اکلوتا بیٹا۔ ہاں ایک چیز اور...... وہ اُن کی کبھی نہ مٹنے والی محبت ایک سیدھے سچے پکے اعتماد اور اس کی نئی بہو جسے ہر سطر میں لاکھوں پیار اور دعائیں بھیجی تھیں۔ بغیر دیکھے بھالے وہ محبت کا بیش قیمت خزانہ اس پر لٹا بیٹھی تھی۔ کتنا فراخ تھا اس ماں کا دل جسے شمن اپنے پروفیسروں سے ملتی جلتی تنگ چڑھی بڑھیا سمجھے بیٹھی تھی۔ بالکل اپنی معلوم ہو رہی تھی۔ بلکہ اپنوں سے بھی زیادہ۔

وہ پارسل بھی دوسرے دن آگیا اگر شمن نہ روکتی تو وہ پولیس کے دفتر میں ہی چیر پھاڑ کر کھول ڈالتا۔ اس میں ماں کی ایک تصویر بھی تھی ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ایک کرسی پر بیٹھی

اخبار پڑھ رہی تھی نظریں اور کیپلے بیٹے دونوں بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی ایک ایک شکن میں ماں کا خزانہ پوشیدہ تھا وہ چھلکتی ہوئی آنکھیں ہجر کی داستان بنی ہوئی تھیں وہ کسی اونچے خاندان کی عورت نہ تھی بیوگی کے بعد اس نے اپنی ساری توجہ اپنے بچے کی پرورش کی طرف مبذول کر دی تھی اس کے کرخت جسم اور اُبھری ہوئی چہرے کی ہڈیوں سے سخت محنتی ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ اس کی عمر کڑی اور ٹھٹھرے موسموں سے بیتی تھی۔ اور اب آخری عمر میں علاوہ اذ چھوٹی ہوئی جنگ کی بخشی ہوئی دکھوں کے یہ بیٹے کی جدائی بھی یہ ان کو آ زادی بن کر لگ گئی تھی آخر کیوں بھیج دیا اس نے اپنے اکلوتے کو جنگ کی بھٹی میں جھونک جانے کے لیے؟ کیا بڑھیا کو اس بیٹے سے بھی کوئی چیز زیادہ پیاری تھی جس کی خاطر وہ ساری عمر کی کمائی کا داؤ لگا بیٹھی تھی۔

ایک بڑا سا آنسو خط پر ٹپکا اور کاغذ کانپ اٹھا دور دراز پڑی ہوئی دو اجنبی عورتیں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئیں۔ زوفی سوتے میں نیند سے تھکی ہوئی کروٹیں لے رہا تھا اس کے ہونٹ لرزاں تھے اور آنکھوں کے کونے بھیگے ہوئے تھے۔

تو ان برف کے تودوں میں بھی محبت چھپی ہوئی ہے ان کے سینوں میں بھی دل ہیں اور ان میں ٹیسیں بھی اٹھتی ہیں! وہ سمجھتی تھی کہ یہ ایثار اور قربانی صرف مشرقی عورت کا ورثہ ہے یہ مغربی موم کی پتلیاں کیا جانیں محبت کیا چیز ہوتی ہے خصوصاً اولاد کی محبت۔ سنا ہے بڑی بدمعاش ہوتی ہیں۔ بوڑھی ہو جاتی ہیں پر ہوش نہیں جاتی۔ جانور ہوتی ہیں کسی ملک کسی قوم کا ہو سکے میں زینت کا طوق بن کر چمٹ گئیں۔ اول تو بچے پیدا ہی نہیں ہونے دیتیں اور اگر بدقسمت رہ گئیں آن ہی ٹپکیں تو کتوں سے بدتر گت بناتی ہیں۔

مگر شمیم نے یہ سب کچھ کہاں سے دیکھ لیا۔ نہ ہی وہ کبھی ان کے ملک میں گئی اور نہ ہی ہندوستان میں آئے ہوئے باشندے ملک اور قوم کے صحیح نمائندے کہلائے جانے کے حق دار ہیں تو پھر کس نے بتائیں یہ ساری باتیں یہی باتیں فولادی دیواریں بنی انسانوں کے بیچ میں آڑی ہوتی ہیں۔ کیا کوئی آنچ انھیں پگھلا سکتی ہے! کیا یہ لاکھوں کروڑ (سفید اور کالے انسانوں کا خون انھیں گلا سکتا ہے

ساس! ساس کے نام پر اسے ہنسی آگئی بچپن سے اس نے مرھٹی ساسوں کے قصے سن رکھے تھے ہر بڑی لگتی چیز کو اس کی ساس کا سر یا کلیجہ بتایا جاتا تھا۔ مگر اسے خواب میں بھی کبھی شبہ نہ ہوا

تھا کہ اُسے ایسی بھولی گڑیا جیسی ساس ملے گی۔ کاش اس کا شوہر بھی زندہ ہوتا۔ ڈکنس کے ناولوں جیسا وہ گردن ہلاتی مُنہ میں پائپ دبائے باغبانی میں دھُت پڑا!

کون کہتا ہے وہ کھو گئی۔ سامنے لمبی سیدھی اور روشن سڑک کہکشاں کی طرح جگمگا رہی ہے اس پر دو نہیں تین کھلونوں جیسے ننھے مُنے انسان آگے قدم بڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔ رونی وہ خود اور ماں!

صبح خط دوبارہ پڑھا گیا۔ ساتھ ساتھ ہزاروں لمبے چوڑے قصے یاد آ گئے۔ ٹیلیفون پہ بھی ملانے کی رائے دی مگر ثمن کے اصرار پر بادلِ ناخواستہ جبراً دفتر گیا۔ جاتے وقت ٹیلیفون پر تاکید کر دی کہ قلم اور بہت سا کاغذ خط لکھنے کے لیے تیار رہے۔ آتے ہی لکھائی شروع ہو جائے گی۔ دوپہر کے کھانے پر شامی کبابوں اور دہی کی خاص فرمائش کی۔ یہ مرد دکھ کا جانتے ہیں تو کھانے سے پہلے روٹھتے ہیں۔

شام کو خط لکھا گیا دو لفظ لکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پیاری ماں...... نہیں کاغذ پھینک دیا۔ بہت پیاری ماں سب سے پیاری! اب؟ آگے کیا لکھے جیسے آگے کچھ کہنا ہی نہ ہو۔ ان تین لفظوں میں دُنیا سما گئی۔ کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد خط لکھا گیا۔ ٹیلیفون کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا۔ نصف سے زیادہ خط ثمن کے بارے میں تھا۔

جیسے بادل چھٹ گئے۔ اب باہر جانے آنے میں کوئی خطرہ نہیں۔ آل چھتری پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ بوند نہیں پڑ سکتی۔ زندگی مزے سے ہچکولے کھاتی گزرنے لگی جیسے ربڑ ٹائر گاڑی کنکریلی سڑک پر ٹھمکتی چلی جا رہی ہو۔ شکر رنجیاں آتیں اور گزر جاتیں۔ ہر جھٹکے پر دور ہو جاتے مگر پھر سر ٹکرا جاتے، دل مل جاتے۔ قہقہوں میں آنسو سوکھ جائیں تو کبھی آنسوؤں میں ہنسی ڈوب جائے۔ دنیا بھی عجائبات کی عادی ہو جاتی ہے خصوصاً صاحب کہ ڈھٹائی پر اتر آئیں۔ اب سڑک پر گردن موڑ کر بھی کوئی نہیں دیکھتا اور اگر دیکھتا ہے تو انھیں نہیں دکھائی دیتا۔ جلسوں پارٹیوں میں بھی جاتے اور کوئی مُتحیر نہ ہوتا۔ لوگوں کو ایک بار مشرق اور مغرب کے مل جانے کا گمان ہونے لگا ان کی شادی ضرب المثل بن گئی۔ حوالے دیے جانے لگے۔

گھر سے بار بار تقاضا ہو رہا تھا کہ آ جاؤ۔ چاہے دو چار ہی دن کو آؤ۔ اور اس کا بھی جی چاہ رہا تھا۔ اتنی دوری پر بھی خون کی کشش مجبور کیے دیتی تھی۔ ارادہ بھی کیا مگر پھر ایسی دہشت ہوئی کہ

نیند اڑ گئی۔ یہاں کے لوگ تو عادی ہو چکے تھے پر یا اب سنے یہاڑ کیسے کھو دے جائیں گے اور پھر ان چیونٹیوں کو ہموار کرنے کے لیے جس بالا ماتھا پھوڑی کی ضرورت تھی وہ کس سے جھیلی جائے گی بڑی بوڑھیوں کے طعنے کیسے سنے جائیں گے۔ سب کی سب ٹیلر کی ماں نہیں بن سکتیں۔ بہن بھائی چھوٹے بچے بچیاں کیا کہیں گے۔ انہیں کون سمجھائے گا چڑیا گھر کی چلتے جلتے میں تو جانور بوکھلا اٹھتے ہیں بھلا یہ خوگیر کی بھرتی کیا نہ دندنائے گی۔ تو وہ نہیں جا سکتی۔

وقت بدل جانے سے زیادہ فرصت بھی کم معلوم ہونے لگی۔ ادھر جنگ کی آگ لپکی ادھر وقت کی رفتار میں بھی کوک بھر دی گئی۔ ہر وقت یہی معلوم ہوتا گھنٹے منٹ سکنڈ ہاتھوں سے پھسلے جا رہے ہیں۔ سپلائی کی نگرانی کے ساتھ ساتھ آئے ہوئے سال کی بھی دیکھ بھال کرنا پڑتی۔ اس کے علاوہ جب ایک ٹوکری میں دو برتن رکھے ہوں تو آپا کی حق کے بل بوتے پر ٹکرا تے ہیں۔ سینما ہی ایسی چیز رہ گئی تھی جہاں بغیر ایک دوسرے سے اکتائے ہوئے وقت کاٹا جا سکتا تھا۔ شمن بے کاری سے اور بھی اکتا گئی آنکھ کھول کر پڑھنا اور پڑھانا کچھ نہ کچھ زندگی کا مصرف رہا۔ اور اب یہ حال کہ دن گذر جاتا تو رات دو بھر ہو جاتی۔ ٹیلر تو تھکا ماندہ آکر مزے سے سو جاتا اور وہ پڑی جاگا کرتی۔ دن کو لازمی طور پر نیند آجاتی اور یہ لمبی لمبی راتیں اور تھکا دینے والی تنہائی اس کا دماغ ہلا ڈالتیں۔ ٹیلر کا وجود تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ دن کو وہ کام میں رہتا اور رات کو نیند میں۔ اور شمن اس کی دنیا سے نکلی ہوئی باوجود ساتھ رہنے کے تنہا ہی رہتی جیسے وہ اس کی بیوی نہیں پڑوسن ہے جس سے بوقت ضرورت بات کر لی ورنہ نہیں۔

”مگر سینما میں بھی جی ہو جاتی“ ”گریٹ ڈکیٹر“ پر کچھ ذاتی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ بزدلی اور چھچھورا پن ہے ...... مذاق تو ہر ایک کا بنایا جا سکتا ہے“ ٹیلر جو بغیر سوچے سمجھے ہنس رہا تھا اس فلسفے پر چڑ گیا۔

”ارے مائی کیٹ پڑھو تو تمہیں معلوم ہو کہ یہ نازی کیا ہیں شیطان ہیں پورے“ اس نے بڑے وثوق سے کہا۔

”کچھ زیادہ فرق تو نہیں نازیوں میں اور ان کے بھائی بندوں میں، شیطان نے تو روپ بھر کر جنم لیا ہے“

"مگر آنا کوئی نہیں۔"

"ہُنہ۔۔۔۔ بھلا تم کیوں کہو گے۔ اُن کے چیلے جو ٹھہرے۔ شاہی پاسبان جو ہوئے۔"

"ہم۔۔۔۔ ہیں۔۔۔۔۔ ہم لوگ برطانوی راج کی حفاظت میں ہرگز نہیں لڑ رہے ہیں۔"

"کہہ دو انسانیت کی حفاظت میں لڑ رہے ہو۔ ہُنہ چوہے بلی جلیبیوں کی رکھوالی کرنے چلی ہے۔ نو سو چوہے تو پورے ہو گئے اب حج باقی رہ گیا ہے۔ کیا کہنے ہیں۔"

"لیکن اس مرتبہ انصاف ہو گا۔"

"کیوں نہیں۔ لیڈر ہی انصاف نہ کریں گے تو پھر اور کون کرے گا۔"

"مگر بھئی میں تو لیڈر نہیں۔ میرے ملک نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔"

"تم لیڈروں کا ساتھ دو گے تو ضرور لیڈر کہلاؤ گے۔ بڑے انسانیت کے پہرے دار بنے ہو ذرا ہندوستانیوں کو بھی انسان سمجھ کر دیکھو۔"

"کون کہتا ہے ہم ہندوستانیوں کو انسان نہیں سمجھتے۔"

"تو پھر ان چالیس کروڑ انسانوں کو نازیوں کی چکی میں پستا دیکھ کر تمہارے کان پر جوں کیوں نہیں رینگتی۔ فرانس کو تم بچانے دوڑے۔ پولینڈ کی موت پر چھاتی کوٹ کوٹ کر روئے برطانیہ کے ہاتھ سے دو تین سونے کی چڑیاں جاپانیوں نے چھین لیں تو کلیجے مسل گئے۔ مگر یہ کیسی انسانیت ہے جو بس تمہیں سفید چمڑی ہی میں نظر آتی ہے۔"

"کیوں ہم چین کے لیے بھی لڑ رہے ہیں۔"

"چلیے لڑ رہے ہو وہ خوب معلوم ہے۔ روس کی بھی تو مدد کر رہے ہو۔ دوسرا محاذ کیسے قائم ہو رہا ہے۔ پر نہ جانے کیا بات ہے کہ کنجی ہی نہیں ملتی۔ ہم جانتے ہیں یہ دوسرا محاذ کب کھلے گا۔۔۔۔ جب جرمنی پسنے لگے گا اور روس تھک جائے گا۔"

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے اب سینما بھی تمہارے ساتھ دیکھنا حماقت ہے" طے ہوا کہ فلم بینی بند۔ مگر یہ عہد زیادہ دن قائم نہ رہا اور فرمائش ٹیلر ہی کی طرف سے شروع ہوئی یہ طے پایا کہ اگر ایک انگریزی فلم دیکھا جائے تو دوسرا ہندوستانی۔ بالکل کھرا سودا۔ یہ نہیں کہ وہاں سے تو دنیا بھر کا کوڑا سمیٹ کر ہندوستانیوں کے سر منڈھ جائے اور یہاں کی ایک تصویر بھی نہ دیکھی

جائے خیر حکومت کے آگے بس نہیں تو گھر میں تو چلے گا اپنا قانون۔ ٹیلر راضی ہو گیا۔ وہ آسان ہندوستانی بخوبی سمجھ لیتا تھا۔

"مگر دو ایک اسسٹنٹ پکچر تو جھیل گیا پھر تو یہ حال ہو گیا کہ دو ریلیں دیکھیں خفقان اٹھا۔

"یہی فلم تو پچھلے ہفتے دیکھا تھا" وہ ضد کرتا۔

"کیسے ہو سکتا ہے ابھی ہفتے تو بن کر آیا ہے؟" شمن لڑتی۔

"نہیں جی یہی تھا۔ وہ جو سا عاشق، کیا میں اسے پہچانتا نہیں جنگلوں میں گاتا پھرتا تھا پھر وہ جینی سی ہیروئین گر پڑی تھی تو۔۔۔۔ چلو چلو یہ تو وہی ہے کوئی دوسرا انگریزی فلم دیکھیں"

اب شمن کا پارہ چڑھ جاتا بولو تو ہر فلم میں یہی ہوتا ہے۔ ہیرو جنگل ہی میں گاتا ہے ہیروئین گرتی ہے تو اسے اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ مگر ٹیلر تو اسے جان بوجھ کر جلانا چاہتا تھا جو فلم اچھی بھی ہوتا تو وہ پورے وقت سوتا رہتا اور شمن جلی بھنی منہ سجائے بیٹھی ضد سے دیکھا کرتی۔ اور جان بوجھ کر انگریزی کے اچھے فلم میں عاجز بن جاتی۔ غرض کوئی بھی فلم ہو دونوں کا مزہ کرکرا رہتا۔

"یہ تمہارے یہاں ہر کیرکٹر گاتا ہے یا روتا ہے۔"

"اور تمہارے یہاں سوائے ہی ہی ٹھی ٹھی کے اور کیا ہوتا ہے" وہ بحث کرتی۔

"یہ کرنا چاہیے کہ امریکن فلموں کی نقل اتار دیں"

"ہونہہ، بڑے امریکن فلم گندے غلیظ، سوائے ننگے پن کے اور بھی کیا" گو اسے معلوم تھا کہ عام طور پر جو ہندوستانی فلم ذرا بہتر ہوتے ہیں ان میں یہی چالاکی استعمال کی جاتی ہے مگر وہ بھی بڑے

"لاجواب ہوتے ہیں۔ تمہارے فلموں میں تو کچھ ہوتا ہی نہیں"

"یہ تمہاری سمجھ کا قصور ہے نہ کہ فلموں کا۔ تم ہم لوگوں کی زندگی کا فلسفہ ہی نہیں سمجھتے تم لوگ تو بس جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کو فلم دیکھتے ہو"

"اول تو ہمارے جذبات بم کے گولے نہیں کہ ٹھیس لگی اور بھک سے اڑ گئے دوسرے اس میں مضائقہ ہی کیا ہے"

تلخیاں اور بڑھتیں بحثیں عام موضوع سے ہٹ کر گھر کی چار دیواری میں آن پہنچتیں نجی باتیں پھوٹ نکلتیں اور ایک مرے سے سینما سے بائیکاٹ کرنا پڑتا مگر ٹیڈی یہی چاہ رہا کہ دورگ

کی طرح لگ گیا۔ ان دونوں کو تو بس کسی بہانے کی تلاش رہتی۔ ٹیلر ہندوستانی گانا سنتے ہی پاگل ہونے لگتا۔ اس کی ضد میں شمن نے پکے "راگ" سیکھنے کے لیے ماسٹر رکھ لیا۔ وقت بھی کٹ جاتا۔ اور جنگ کا مواد بھی مہیا ہو جاتا۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر استادوں کے راگ سنتی۔ ہر تان پر جھوم اٹھتی۔ ہر گٹ کری پر لرز جاتی اور النکاروں میں کھو جاتی۔ مگر جونہی ٹیلر آتا، وہ کھٹ سے لتا پر پہنچتا۔

"یہ ہے اصل نغمہ!" وہ جھوم کر کہتا۔

"ہنہ جیسے پٹا ہوا کتا رو رہا ہے،" وہ جل کر کہتی۔

"جبھی تو کہتا ہوں سمجھنا سیکھو۔ کان پیدا کرو۔"

"تم ہندوستانی گانا سمجھنے لگو تو یہ کائیں کائیں سنو بھی نہیں۔"

"ہندوستانی گانا کسی عقل والے دماغ میں تو سما نہیں سکتا۔"

اس پر بات بڑھ جاتی۔

"تم میرے ملک کی ہر چیز کو حقیر سمجھ کر مجھ سے دور کرنا چاہتے ہو۔"

"میرے ساتھ تو تمہیں میرے ہی رنگ میں رنگنا پڑے گا۔"

"کوئی ضروری نہیں کہ جب میں تمہیں اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش نہیں کرتی تو تم کیوں میرے اوپر جبر کرو۔"

"تم جانتی ہو کہ تمہارا رنگ پھیکا ہے۔ تمہارے مرد زیادہ عقل مند ہیں۔ وہ یورپین لڑکی سے شادی کر کے کس قدر مہذب ہو جاتے ہیں۔ کھانا پینا، رہنا سہنا، بول چال سب میں سلیقہ آ جاتا ہے۔"

"ہنہ خوب۔ یہ ایک اور امپیریلزم کو پھیلانے کی چال ہے کہ اپنی لڑکیاں اوروں کو پھانسنے کے لیے لگا دی ہیں۔ اسی طرح انگریزیت کا پرچار ہو جاتا ہے۔ ان کالیوں میں کر ان کی زبان منہ میں لے کر ان کی عورتوں کی آغوش میں بھلا ان کے خلاف چوں کرنے کی سکت رہ جاتی ہے۔ پھر نہ وہ ہندوستانی ہی رہتے ہیں اور نہ ان کی سیاہ چمڑی انگریز بننے دیتی ہے۔ بیچ ادھر میں معلق ہو جاتے ہیں۔ ان کی اولادیں یا تو اپنے دوغلے حسن کے بل بوتے پر پیشہ چلا لیتی ہیں یا آنے جانے والے ٹامیوں کی جوتیاں چاٹتی پھرتی ہیں۔ ایک طریقہ تھوڑی ہے مٹنے کا۔ یوں جذب کر کے بھی تو فنا کیا جا سکتا ہے۔"

"تو بھئی تم ہی مجھے اپنے نظام میں جذب کر لو۔ گو اس کیچڑ میں رہنے کی عادت ذرا مشکل سے پڑے گی۔

"مگر...."

"مگر اصل بات یہ ہے کہ.... خیر جانے دو"

"کہو میں کوئی بچہ نہیں جو تم چڑاؤ اور رو دوں۔"

"یہ کہ یورپین طرز رہائش بہت بلند ہے اور تمہیں یقین ہے کہ وہ جذب ہونے کے لائق ہے اس لیے تم جان بوجھ کر بجائے اوپر اٹھنے کے نیچے گھسیٹ رکھی ہو تم لوگ دل سے یورپین معاشرت کے مدّاح ہو۔"

"بڑے حسین مغالطے ہیں۔"

جھک جھک ہوئی مگر شمن دل میں ضرور نادم ہوتی۔ یہ کیا بات تھی کہ وہ یورپ کی اتنی بڑی مخالف ہوتے ہوئے بھی انجان طور پر اسی رنگ میں رنگتی جا رہی تھی وہ میز پر چھری کانٹے سے کھانا کھاتی بیڈ پر سوتی اور چھوٹے چھوٹے قواعد پر عمل بھی کرتی۔ یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس ندامت نے ضد کو اور بھی بڑھا دیا۔ وہ جان بوجھ کر اصول توڑتی معمولی بیماری کے بہانے سے کھانا بستر کے پاس منگوا لیتی بجائے نائٹ سوٹ کے اس نے غرارہ اور کرتا پہننا شروع کیا۔ مگر شیلا نے محسوس بھی نہ کیا اسے غرارہ بے انتہا پسند آیا۔ بالکل اسکرٹ معلوم ہوتا تھا۔

تو گویا جس چیز میں اسے اپنی معاشرت کی جھلک نظر آتی تھی وہ اچھی اور قابل پسند تھی! اتنا روشن خیال ہوتے ہوئے بھی وہ انجان طور پر کس قدر کوتاہ بیں تھا جہاں تک ہوش و حواس کا ذکر تھا وہ وسیع نظر تھا۔ مگر یہ لاشعور کی پاسبانی اس کی طاقت سے باہر تھی۔ یہ صدیوں کی جمی ہوئی کائی آسانی سے نہیں کھرچی جا سکتی تھی یہ حال ہے ان روشن خیالوں کا تو کوتاہ نظر والوں کا تو کہنا ہی کیا وہ کتنا بھی چاہیں احساس برتری دماغ سے نہیں نکل سکتا انسانیت ہمہ گیر برابری کو مانتی ہے یہ دماغ میں جو جڑ بیٹھا ہے وہ بھی کبھی کبھی جھانک کر دیکھتا ہے " پانچ انگلیاں یکساں نہیں۔ انہیں کھینچ تان کر یا کاٹ چھانٹ سے برابر نہ کرو.... ہاتھ بدوضع اور بھونڈا ہو جائے گا۔ دنیا کی شوبھا اسی اونچ نیچ سے قائم ہے۔ اس معاملے میں روشن خیالی تمام خیالی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔"

اور گھر میں ایک عجیب کشمکش شروع ہو گئی۔ جیسے گاما اور زلبکو جٹے ہوئے ہیں۔

وہ اپنی طرف کھینچتا ہے، اپنی طرف کبھی یہ داؤں لگا کر حت کرنے لگتا ہے تو وہ پلٹا مار جاتا ہے ساتھ ساتھ ذہنی رسہ کشی بھی بڑھتی گئی۔ کیسے پار لگے گی۔ یہ دو انجنوں کی کشتی جس میں دونوں انجن مخالف سمت کو دوڑ رہے ہیں۔ کبھی وہ بانچ مشرق کی طرف بستی ہے تو کبھی دو بانچ مغرب کی سمت۔ نتیجہ وہی انجاد ڈھلمل اور گوفت اوپر سے طوفان تنا کھڑا ہے موجیں منہ پھاڑ پھاڑ کر دوڑ رہی ہیں اور ناخدا نے جنم ہی نہیں لیا۔

زندگی سے تھکی ہاری ٹہلتی ہوئی وہ نکل گئی۔ آج ہی تیلہ سے چھٹ ہوئی تھی زخم تازہ تازہ تھے پارک میں بنچ پر ذرا دیر کو سستانا چاہا مگر جیسے سانپ نے جھٹک لیا یہ بنچ! آخر بنچ کیوں، چبوترہ کیوں نہیں۔ یہ سارے نوٹس سارے اعلانات یہ انگریزی میں کیوں؟ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ذرہ ذرہ مالکوں کی دست درازیوں سے کچلا ہوا میلے کچیلے تھیلوں کی وضع کے تپلون بھدی ٹوپیاں... ٹوٹے ہوئے پائے والی کرسیاں ادھر کجی ہوئی میزیں۔ ان درندوں کے خونی پنجوں کے نشان چپے چپے پر کھدے ہوئے ہیں کیسے بھر پائیں گے یہ گھاؤ۔

اس کا جی چاہا بنچ کو ایک ٹھوکر لگائے اور زمین پر لوٹ لگائے یا میپر ملیزا نام کے ٹھپے۔ کاش کوئی غیبی ہاتھ ان گندگیوں کو چن کر ملک سے دور سمندر میں جھونک دیتا اور اس کے ساتھ ساتھ ان سفید برص کے داغوں کو بھی دھو ڈالتا جو سیاہی اور گرمی سے تپ کر کوڑھ کے زخم بن گئے ہیں جن کی عفونت نے انسانیت کا دم گھونٹ رکھا ہے۔

"اوہو السلام وعلیکم ...... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں" کسی جانی پہچانی سی آواز نے پیچھے سے پکارا۔ اور وہ چونک پڑی۔

"ارے...... تم...... آپ" وہ حیرت زدہ ہو کر پروفیسر کے بگڑے ہوئے حلیے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ پہلے تو وہ ایک سازش معلوم ہوئی کہاں وہ تک تک سے درست چھیل چھبیلے پروفیسر اور کہاں یہ ڈھیلے ڈھالے کھدر میں غرق بدوضع شاعر تھا لیکن انتہائی غیر شاعرانہ انسان۔

"مگر آپ تو چلے گئے تھے"

" ہاں۔ اور آ بھی گیا تو اس میں اس قدر حیرت کی کیا بات ہے۔ تم تو ایسے چونکیں جیسے میں کوئی مردہ ہوں جو کفن پھاڑ کر آن کھڑا ہوا۔"

" کچھ نہیں اصل میں یوں ایکا ایکی ملنے کی امید تو نہ تھی۔ مگر یہ......"

" کہو کہو...... وہ خوش مزاجی سے مسکرایا۔

" کچھ نہیں بھلا یہ بھی دیکھیے اتنے دن بعد ملیں اور پھر وہی جنگ شروع کر دی کہیے خیریت تو ہے؟"

" یہ پوچھو مت۔ خود دیکھنے کی کوشش کرو۔"

" بس اب دیکھیے مجھے الزام نہ دیجیے گا۔ آپ ہی چھیڑ رہے ہیں۔ کوئی بات منہ سے نکل گئی تو منتا اٹھیں گے۔"

" آزماؤ تو ایک بار۔ اپنے نازک مزاجیاں تو ہیں۔" پروفیسر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

" معلوم ہوتا ہے کسی سے عشق ہو گیا۔"

" اجی ایسا ویسا عشق۔ شدید قسم کا۔"

" مبارک ہو۔ مگر یہ ہوا کیسے؟"

عشق ہونے میں بھی کیا کوئی ہل میل لگتے ہیں۔"

" مگر معاف کیجیے گا یہ ڈھونگ تو کچھ توہم پرستوں کا سا رچایا ہے۔" نا اس نے سر سے پیر تک نگاہ ڈال کر دیکھا

" معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" پروفیسر چپکے سے بولا۔

" مگر یہ بات کیا ہوئی۔ کم از کم آپ سے تو یہ امید نہ تھی۔

" کیا امید...... یہ ڈھونگ رچانے کی......"

" جی...... یہ لباس یہ کاکلیں...... اور یہ لٹکا...... کمال کر دیا آپ نے تو۔ تب تو آپ کمیونسٹ بھی ہو گئے ہوں گے۔"

" لازمی طور پر۔" پروفیسر اب بھی مسکرا رہا تھا۔

" وہ تیرہ سو کی نوکری؟"

" وہ چھن گئی۔"

" وجہ؟ آپ تو......"

" سخت نالائق نکلا جبھی تو یہ روپ دھار لیا۔" پروفیسر کی آواز میں طنز کی تلخی نہ چھپ سکی۔

شمن نے بے اعتباری سے پروفیسر کو گھورا یہ وہ کیا پینترے چل رہا تھا مجھے اس شخص پر بھروسہ نہ تھا میجر میں الو بنا دیا اور پتہ بھی نہ چلا۔ پر آج تو وہ خود بگلا بھگت بنا بیٹھا تھا۔

"کچھ آپ بیتی بھی تو سناؤ ـــــ ہاں بھئی شادی کی مبارک باد تو دینا بھول ہی گیا۔"

"جی ہاں آخر کو ایک کارندہ پھانس ہی لیا جنگ کا زمانہ ہے ہر چیز مہنگی ہو رہی ہے۔"

"میرا ہی جوتا میرے ہی سر لیکن مجھے تم سے یہی امید تھی برا نہ مان جانا۔ دراصل شادی بیاہ کے معاملے میں میری رائے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ مگر کہیں تم نے شادی صرف اس لیے تو نہیں کر ڈالی کہ تمہیں ذرا عجیب و غریب بننے کا شوق ہے..... سنو، سنو بیچ میں نہ بولو۔ اگر اس وجہ سے کی ہوتی تو تم خوش اور اس قدر مطمئن نہ نظر آتیں۔"

"میں خوش نظر آتی ہوں؟" وہ کھوکھلی آواز میں ہنسی۔

"کم از کم صورت اور صحت تو یہی کہتی ہے خیر چھوڑو ان باتوں کو..... یہ بتاؤ کچھ کرتی بھی ہو یا کام چھوڑ دیا؟"

"بہت دن ہوئے چھوڑ دیا۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اوہ بھولی..... آپ تو "کام" کر رہے ہوں گے۔" پروفیسر مسکرایا اور کوئی جواب نہ دیا۔

"اب تو آپ سرکاری کمیونسٹ ہیں۔ اب تو راج ہوں گے۔"

"کیوں نہیں۔"

"قومی جنگ کا بھی کام جاری ہو گا۔"

"بڑی تیزی سے۔"

"بھئی مزے ہیں آپ لوگوں کے۔ ایک بے چارے وہ کمیونسٹ تھے جو چوہوں کی طرح بلوں میں چھپتے پھرتے تھے یا پاگل کتوں کی طرح دوڑائے جاتے تھے۔ ایک آپ ہیں کہ....."

"مزے سے وائسرائے کے ساتھ ڈنر اڑا رہے ہیں..... موٹریں..... گھوڑا..... گاڑی کمی کیا ہے ہم لوگوں کو۔" شمن نے پھر طنز کی کڑواہٹ پر منہ بنایا۔ مگر پروفیسر کی مکار دھنسی ہوئی آنکھوں اور بے معنی مسکراہٹ نے گڑبڑا کر رکھ دیا۔

"اچھا تو وہ آپ کی محبوبہ کون ہیں؟"

"ہے ایک بنگال کی حسینہ "

"بنگال کی "

"ہاں..... تمہیں نہیں معلوم۔ ارے بنگال ہی میں تو میرا تقرر ہوا تھا بس وہیں ایک کافر کے تیر نظر کا گھائل....." شمن گھبرا کر دور ہٹ گئی۔ پروفیسر کی آنکھیں بھیانک طور پر سکڑ گئیں ان میں عجیب نامعلوم سا خوف چھا گیا جیسے وہ کسی ڈراؤنے خواب کو نیم بیداری میں دہرا رہا ہو۔ اس کا جسم پہلے سے نصف بھی نہیں رہا تھا۔ چہرے پر غم کے آثار اچانک ابھر پڑے تھے اس لیے مسخ ہو گیا تھا۔ بال کتنے سفید ہو گئے تھے جیسے وہ بن چکی چھاڑ کر چلا آرہا ہو وہ چکرا گئی۔

"سردی بڑھ گئی ہے گھر چلیں گے یا دیر ہونے کا ڈر ہے" اس نے بنچ پر سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"چلوں ؟" پروفیسر نے جاگ کر جواب دیا۔

"ہاں کیوں نہیں..... ٹیلر تو شاید دیر سے آئے۔

"ٹیلر نہ پھاڑ دے کالا آدمی دیکھ کر!"

"مگر تم تو سرکاری کالے ہو "

"پھٹکارہ..... کیوں ؟" وہ خوش مذاقی سے ہنسا۔

گھر پہنچے تو وہ دیر تک گھوم پھر کر مکان دیکھتا رہا۔ کھانے پر اس نے ہوکے زدہ ہو کر ایک دم نوالے نگلنا شروع کیے۔ مگر پھر ٹھٹک گیا جیسے ایک دم ابکائی نے گلا دبوچ لیا ہو اور پھر نگلنا شروع کر دیا۔

"ذرا ہاضمہ بگڑ گیا ہے مرغن کھانے کھاتے،، وہ پھر بے معنی طور پر مسکرایا۔ کھانا کھاتے ہی وہ روانہ ہو گیا جیسے کوئی ضروری کام یاد آگیا ہو۔

"پھر آؤں گا اب تو گھر دیکھ لیا ہے۔ فرنی خوب تھی " وہ الٹی سیدھی باتیں کرتا رہا اس کے جانے کے بعد شمن چپ چاپ اداس بیٹھی رہی۔ روس بڑھتا جا رہا ہے وہ قطعی متاثر نہ ہوئی۔ سب ڈھونگ بگلا بھگت ہیں کے۔ انسانیت کے سگے بن کر چلے ہیں حمایتی۔ کہیں رہی سہی انسانیت کو بھی نہ ہڑپ کر جائیں۔

رعب جمانے آیا ہوگا جیسے اور وہ کوئی اور ہوں گی جو ان ہتھکنڈوں پر ریجھ جاتی ہوں گی غبن وبن کیا ہوگا کم بخت نے جو نکالا گیا تو اپنی سیاہی کا پردہ ڈھانکنے کو لال جھنڈے کی آڑ میں آن دبکا کچھ ایسی جو رئیں تو ہوتی ہی نہیں یہ بنگالنیں سوائے آنکھوں کے اور ہوتا ہی کیا ہے مگر پردہ ملک کے شاعر انہی پر مرتے ہیں لیکن بنگال میں تو قحط پڑ رہا ہے!

اور یہ کونسی نئی بات ہے قحط پڑے یا ہریالی ہو بیوہ کی مانگ تو ویسے ہی اجڑی رہتی ہے۔ روتی تھکا ہارا جب وہ گھر آتا ہوا آیا اور سو گیا اور کوئی دن ہوتا تو وہ کوئی بات نکال کر اس بنگالی قحط کا تھوڑا سا بدلا تو اس کا خون جلا کر لیتی۔ مگر پروفیسر نے جیسے اس کی روح تک کو کچل دیا ہو۔

جلی بھنی بیٹھی تھی کہ بیرے نے پروفیسر کے آنے کی اطلاع دی جی چاہا کہہ دے دھکے مار کر نکال دو۔ مگر پھر سوچا دو چار جھڑکیاں تو کم بخت کی ڈھیٹ تو یوں ہی پی ہی جائیں چنانچہ بلا لیا۔

پروفیسر کو دیکھ کر وہ پھر چونکی۔ یا خدا یہ دنیا ہے یا مداری کا تھیلا مرغی کا پر ڈالو کبوتر کا بچہ نکال لو۔

"میرے بالوں کو دیکھ رہی ہو..... بہت کاٹ دیے کم بخت نائی نے۔ میں نے کہا بھیا ذرا اچھے کاٹ دینا۔ اس نے گدی کھرچ ڈالی" اس نے گردن سہلا کر کہا اور شمن کے منہ پر طمانچہ سا لگا گویا کہتا ہے تم سمجھتی تھیں مجھے ڈھول تاشوں کی ضرورت ہے ویسے سمجھ میں کچھ دم خم نہیں یہ تو میں نے یہ ہتھیار ہی پھینک دیے اب آجاؤ میدان میں"

"میں تمہارے پاس ایک غرض سے آیا ہوں۔ تنہائی سے اکتا جاتی ہو گی" شمن کے کان تمتما گئے اور وہ بھی سمجھ گیا اس لیے جلدی سے بولا۔

اتنی حساس۔ سنو۔ ذرا غور سے سنو۔ مذاق کو چھوڑو۔ ہاں پہلے میری اس دن کی بکواس کو معاف کر دو میں مذاق کر رہا تھا۔ مگر معلوم ہوا تم بڑی بد مذاق ہو گئی ہو۔ وہ تمہاری قیافہ شناسی کیا ہوئی یہ صرف بنا کرتی تھیں دو لفظوں میں میری داستان سن لو شمن نہ سنو تو کوئی پروا نہیں۔ ہمارے تعلقات نجی باتوں پر نہیں بگڑنا چاہئیں میں کلکتے بھیجا گیا تھا وہاں کیا کچھ دیکھا اور کیسے دیکھا یہ نہ پوچھو ورنہ ہی کوئی بیان کر سکتا ہے سچ تو یہ میں یقین تو نہیں کرتا مگر کوئی ہے آ سید ہے جھپٹ گیا اور مجھے استعفیٰ دے کر بھاگ پڑا۔ آمدم بر سر مطلب ہمارے یہاں کچھ کلرکوں کی کمی آ گئی ہے بہت معمولی کام ہے ہفتہ میں دو تین روز کام دیکھنا دفتر کا کام نہیں۔ وہ تو ہم نے انتظام کر لیا ہے بلکہ..... اگر تم تیار ہو تو خیر

ورنہ ......"

"کیا "کام" ہے؟

"جی تو چاہتا ہے کہہ دوں ......" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"کہیے۔ کہیے نا"

"رہنے دو کہنے سننے کے لیے تو بہت وقت پڑا ہے.... سنو کام یہ ہے کہ ہم نے خفیہ سنٹر مقرر کیے ہیں جہاں ہمارے آدمی جا کر اناج بٹتے وقت انتظام کرتے ہیں"۔

"کیا اناج؟" لیکن وہ جھینپ گئی اسے وہ لمبی لمبی قطاریں بھیڑوں کی طرح ایک دوسرے کے ٹکریں مارتی ہوئی اناج کی دوکان کے سامنے کھڑی یاد آگئیں۔

ایسا مشکل کام نہیں بس عورتوں کو ایک قطار میں بیٹھا رکھنا اور دیکھنا کہ منتظمین خواہ مخواہ تنگ تو نہیں کرتے۔ اناج کے سنٹر کم ہیں اس لیے بھیڑ ناقابل بیان ہوتی ہے سنبھال سکو گی؟"

"سنبھالنے کو کیا ہوا مگر ......"

"کیا تم یہی اس مگر کو دو چار مہینے کے لیے سنبھال کر نہیں رکھ سکتیں میں کوئی بھاگ نہیں جاؤں گا۔ جانتا ہوں تمہارے دل میں ہزاروں کھوکھلے سوال کلبلا رہے ہیں مگر یہ وقت ان سوالوں کو حل کرنے کا نہیں"۔

"بے سمجھے بوجھے کوئی کام ......"

"نہیں کیا جا سکتا یہ تمہارا غلط خیال ہے! اول تو ذرا سا مطالعہ کرو ذرا خبروں میں دلچسپی لو تو خود بخود سارے جواب مل جائیں گے! اور ویسے اگر میں تم سے بحث کرنے بیٹھا تو خوف ہے ہار جاؤں گا!"

"تو آپ کھوکھلی بنیادوں کے رستے پر بحث کریں گے۔ بنیادیں کھوکھلی تو نظام بھی کھوکھلا"۔

"وہ پھوپھی ہار گیا کہتا ہوں تم سے کمیونسٹوں کا کام نہیں خدا را سیج سمجھ کر کر دو۔ اگر جی چاہے تو۔ ورنہ زبردستی نہیں"۔

"پروفیسر نے ہتھیار ڈال کر جو ستیہ گرہ کی پالیسی پکڑی اس پر شمن جھنجھلائی تو بہت مگر کچھ میں نہ آیا کیسے قائل کرے غنیم بحث پر تیار نہیں۔ ورنہ دو لفظوں میں پیچھے اڑ جائیں۔

"کہاں ہے ذرا اشغلہ ہی ہاتھ آ جائے گا۔ جواب دو تاکہ پھر کوئی دوسرا راستہ نکالوں"۔

"میں آ جاؤں گی"۔

"تو میں کل ہی تمہارے پاس ہفتہ بھر کا پروگرام بھیج دوں گا۔"

اور دوسرے دن وہ آٹھ بجے روانہ ہو گئی ابھی اناج بانٹنے میں دو گھنٹے باقی تھے مگر ہجوم کا یہ حال تھا جیسے کسی بڑے سے دیوتا کے درشن کا میلہ لگا ہوا ہے نوچ کھسوٹ دھکم دھکا بس نہیں چلتا کہ ایک دوسرے کو نگل جائیں جونہی منڈی کے پٹ کھلے خلقت طوفان کے ریلے کی طرح ٹوٹ پڑی "ہٹو ہٹو ...... پیچھے ہٹو" پولیس نے کوڑا گھما کر جاتریوں کو پیچھے دھکیلنا چاہا مگر توبہ کیجیے ان دیوتاؤں کی کوشش یوں کوڑوں سے کم زور کیا جا سکتا تو پھر مشکل ہی کیا تھی۔ یہ بپھرتے ہوئے بھوکے خود اپنے ہاتھوں سے جسم کی کھال ادھیڑ لیتے۔ بدن دیکھو تو ایسے سوکھے جیسے گھسے ہوئے کپڑے میں کھپچیوں کا ڈھیر لپیٹ دیا ہو مگر ہوس و کینہ پہلوانوں جیسی۔ چاول کا دانہ دیکھتے ہی جسم میں بھوت جاگ اٹھتے ہیں وہی کھپچیاں جو پیٹ کھلنے سے پہلے بھیڑیے سے بھی زیادہ بے جان ہو رہی تھیں بجلی کی سرعت سے جی اٹھتی ہیں اور پھر زبانیں تو خدا کی پناہ پیٹ بھر نہیں ملتا تب تو اس تیزی سے چلتی ہیں اگر دو چار چٹ پٹے نوالے مل جاتے تو نہ جانے کہاں پہنچتیں اور پھر یہ زبانیں عورتوں کی قطاروں میں چل رہی تھیں۔

بڑی مشکلوں سے ان بے کل کیڑوں کو قطاروں میں کھڑا کرنے کی کوشش جاری تھی اگلے حصے کا انتظام شبنم کے ہاتھ آیا کہ یہاں تو بڑے سکون تھا کیونکہ اناج قریب تھا مگر پچھلے حصے میں باوجود تین چار لڑکیوں کی جدوجہد کے اودھم برپا تھی ڈیڑھ دو فرلانگ لمبی لکیر بالکل زخمی سانپ کی طرح دم پٹخ پٹخ کر تلملا رہی تھی۔

یہ عورتیں تھیں یا بھوکی کتیاں، صنف نازک کس طرح بدحواسی سے ایک دوسرے کو دھکیلتے جی برا ہوتا تھا شبنم نے کئی بار انھیں سمجھانے کی کوشش کی مگر شاید وہ زبان بھی نہ سمجھتی تھیں اور نہ جانے کیا کچھ جنگلی زبان میں چیخ پڑتیں۔ دھوپ تیز تھی معلوم ہوتا تھا سورج سے گیلی گیلی بھوبل برس رہی ہے کوئی جھلسی ہوئی راکھ جسم پر پوت دی ہے اور پھر ان گنوار عورتوں کی گھٹی گھٹی سڑاند۔ ـــــ سر پھٹا گیا۔

سب سے اگلی عورت سخت لڑاکا مٹی کی بنی ہوئی تھی نہ جانے دوکان دار سے کیا چخ چخ لگا رکھی تھی اور کھسکنے کا نام نہیں لیتی تھی کبھی پیر پکڑتی تھی کبھی اسی ہاتھ سے سر کوٹنے لگتی تھی جمعدار جی کا منہ گھوما اور وہ روتی بسورتی گھسیٹ کر دور پھینک دی گئی۔ کچھ اناج کی برائی کر رہی تھی بازاروں میں دو سیر کا تھا تو یہاں ساڑھے تین سیر بھی ہائے ہائے بند نہ ہوتی تھی لیکن سب سے پہلی عورت کا مرض منفرد معلوم ہوتا تھا کیونکہ جو آگے بڑھی اڑ کے رہ گئی اور دو چار کو

ہنٹروں سے ہٹلنے کے بعد قطاریں بدرلیبلاسی کی خبر دوڑ گئی کہ مال گھٹا ہوا ہے۔

اتنے میں اس نے دیکھا پروفیسر بھیڑ میں کہنیاں چلاتا تیرتا چلا آرہا ہے ایک بار اس نے شمن کو دیکھا مگر آگے بڑھ گیا۔ آگے پہنچ کر اس نے ہاتھ چلا چلا کر دوکان دار سے بالکل ایسے لڑنا شروع کیا جیسے وہ عالم فاضل پروفیسر نہیں بلکہ قطار والیوں کا کوئی بھائی بند ہے۔ زبان بھی تو وہ کوئی نئی بول رہا تھا جس میں گجراتی مرہٹی اردو اور انگریزی اُلجھی ہوئی تھی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اناج ملنا بند ہو گیا۔ سانپ نے پیچ و تاب کھانے شروع کیا اور کنڈلی مار کر ایک بار پھر دوکان میں گھسنے کی کوشش کی۔ ڈھیلی شمن کے محاذ پر ہوئی وہ پروفیسر کی طرف متوجہ ہوئی اور رہا دہ ہو گیا۔ باڑ ٹوٹ گئی۔ آہیں اور سسکیاں چاروں طرف پھیل گئیں۔ بھوکے ہاتھ پھر ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچنے لگے زبانیں پھڑ پھڑانے لگیں پچھلے حصے کا انتظام کرنے والے آگے دوڑے۔ پروفیسر بھی دوکان دار سے نبٹ کر موقع پر آ گیا۔

"ابھی ملے گا اناج..... یہ بوریاں غلطی سے آ گئی تھیں۔ تھوڑا صبر کرو بہنو!"

اس نے چیخ چیخ کر آگے پیچھے لپکنا شروع کیا۔ مگر معلوم ہوتا تھا صبر بھی جنگ کے ساتھ کھیل کھلا کر خاک ہو گیا تھا۔ آہیں چیخیں بن گئیں۔ نہ جانے کیا ہوتا مگر معلوم ہوا کہ اناج آ گیا اور پھر لنگر جاری ہو گیا۔

ٹیکسی میں بٹھاتے وقت پروفیسر نے شرمندہ ہو کر اس کی نفیس جارجٹ کی ساڑی کو دیکھا جو قریب کی موری میں ڈوب کر مرے ہوئے چوہے کی طرح لٹک رہی تھی۔

"آج تو تم تماشہ دیکھنے آئی تھیں مگر مجھے یقین ہے۔ بدھ کے دن جب آؤ گی تو اصل لطف آئے گا۔ آؤ گی نا؟ دو دن آرام کرو۔"

"کوشش کروں گی۔" اس نے اپنے دکھتے ہوئے کندھے تکیے پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ ساڑی کا لتھڑا ہوا کونا پنڈلی پر لگا اور اسے پھریری آ گئی

۴۳

کام غیر دلچسپ تھا اور تکلیف دہ بھی لیکن اتنا تو ہو گیا کہ مقررہ شام کی تھکی ہوئی خاموشی ٹوٹ گئی۔ نیلا بڑی دلچسپی سے ان معرکوں کا حال سنتا۔ آئے دن نیا ڈرامہ کھیلنے میں آتا انسانوں کی ایسی ایسی قابل تحقیق کمزوریاں دیکھ کر کبھی تو جی جل اٹھتا۔ آخر ہندستانیوں کو ترتیب سے کیوں اس قدر نفرت ہے۔ ہر کام میں بس گو ڈر پھر جاتا ہے۔

"انھیں سدھانا مشکل ہے" نیلا نے سب کچھ سن کر کہا

"جاہل ہیں نا بے چارے" شمن رسانیت سے بولی۔

"ہاں اور دوسرے کچھ بھی ان کی خصلت ہیں"

"بھوک کے آگے کیا یاد رہے" شمن نے ذرا ضبط کر کے کہا۔

"مگر اناج تو برابر مل رہا ہے۔ دراصل یہ لوگ ہوتے ہی بے اصول ہیں"

"خاک مل رہا ہے اناج سارا پھپھوند لگا ہوا چاول اور گھنا ہوا گیہوں"

"مگر ہم نے پنجاب سے تازہ گیہوں منگوایا ہے"

"منگوایا ہو گا مگر ملتا نہیں، وہ تازہ گیہوں تو گیا کھیتوں میں جب سڑ جائے گا تب نکالا جائے گا۔

"یہ تو بڑی مصیبت ہے"

"اور کیا پھر سرکار سنتی بھی تو نہیں"

"سرکار کیا کر سکتی ہے جب ڈاکو تاک میں لگے ہوئے ہوں"

"یہ ڈاکو بھی سرکار کے ہی چھوڑے ہیں۔ ہر سال انسان کشی کے سلسلے میں خطاب ملتے ہیں ان کو"

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو گویا میں ہی سرکار ہوں"

"سرکار کے حمایتی تو ہو"

"یوں تو تم بھی سرکار کی حمایتی بن گئیں۔ راشن اسکیم میں کام کرتی ہو جو سرکار کی ہے"

رشمی ذرا اس جرح سے لاجواب رہ گئی۔

"تو اس میں عیب ہی کیا ہے" ٹیلر صلح کے انداز میں بولا۔ "تم تو بالکل بچوں سی باتیں کرتی ہو"

"میں سرکاری ہتھکنڈے سے دور ہی رہنا چاہتی ہوں" اس نے اداس ہو کر کہا۔ ٹیلر آج اُسے منانے پر تلا ہوا تھا۔

"صبر کرو۔ وہ وقت بھی آجائے گا"

"کون سا وقت؟"

"جب تم ان ہتھکنڈوں سے آزاد ہو سکو گی۔ نہ جانے تم لوگ اس قدر کم ہمت کیوں ہو۔ ذرا سی بات پر نا امید ہو جاتے ہو ہمارے ملک کی تاریخ پڑھ کر بھی تم نے کوئی سبق نہ حاصل کیا...... یہ احساسِ شکست کب دور ہوگا تمہارے دلوں سے"

"شکست کھا کر بھی محسوس نہ کریں یہ اچھا ظلم ہے"

"شکست کھا کر اگر دوگنے جوش سے آگے بڑھو تو احساس خود بخود زائل ہو جائے گا۔

اگر صرف رونے سے کام چل جایا کرتا تو شاید کبھی کا قصہ ختم ہو جاتا۔ ہندوستان میں کتنی آنکھیں ہیں جو دن رات خشک آنسو نہیں بہاتیں" آج ٹیلر میں کھویا ہوا انسان واپس لوٹ رہا تھا۔ پھر جھگڑوں نے انہیں کس قدر حیوان بنا دیا تھا دونوں طرف مورچہ بندی شروع ہو گئی تھی۔ اور اس آپس کی جنگ نے دنیا بھر میں بھڑکتی ہوئی آگ کو ماند بنا رکھا تھا اپنے گھر و بچوں کے آگے انسانیت کے پیچھے رستا ہوا گھاؤ نظر انداز کر دیا تھا۔

وہ پانی پینے کے بہانے سے اٹھی۔ لوٹ کر اس نے جیسے بالکل انجانے میں ٹیلر کے سنہرے بالوں میں انگلیاں ڈبو دیں۔ کتنا نرم گرم احساس تھا گلے میں اٹکی ہوئی گرہ ڈھیلی ہوگئی

"روحی! وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی اور نہ ہی ٹیلر نے کہنے دیا۔

"ممی کا خط" ٹیلر نے اُسے جاگنگ پارک جا کر ڈاک اٹھا کر دے دی۔" ذرا دیکھنا... بڑی بی نے کیا کیا لکھ مارا ہے۔ سمجھتی ہیں میں اب بھی وہی دو فٹ کی بچی روحی ہوں جسے ہر وقت نگرانی کی ضرورت ہے"

روحی چلا گیا تو وہ بیٹھی خط پڑھتی رہی ماں نے لکھا کہ کیا کیا کھانے ٹیلر کو پسند ہیں لو

اور کن چیزوں سے نفرت ہے۔ وہ رومال بہت کھوتا ہے اور یہ عیب ایک منٹ تک کے لیے پالی جان ہے۔ اس کے موزے بھی بہت پھٹتے ہیں۔ اگر روز رات کو سونے سے قبل گرم پانی سے پیر دھلا کر ٹیلکم پاؤڈر چھڑک دیا جائے تو ......"

ہارا ہوا دماغ نیند میں لیا دھانوں کے ہرے بھرے خواب دیکھتا رہا۔ سانولی سانولی مٹی کے گداز سینے پر دھانوں کے ننھے ننھے سنہرے والے جھنگھروؤں کی طرح بجنے لگے۔ کنجوس مٹی کب تک منہ کیے منہ موڑے رہتی۔ آن کی آن میں سورج کی نوکیلی کرنوں نے انھیں گدگدا کر زندگی کی رمق پیدا کر دی۔ روپہلا پانی چھل چھل ناچتا ان میں جذب ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہرے بھرے دھان شرابیوں کی طرح جھومنے لگے۔

اب کشش ڈھیلی پڑ جائے گی۔ نیا دھان آ گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھیں شبنم بھری کی نیند میں نشیلی ہو جائیں گی۔ نیا دھان آ گیا۔ اب سسکتے ہوئے جنگال کے حلق میں بھی امرت ٹپکے گا۔ نیا دھان آ گیا.... اب قحط ختم! خالی مٹھیوں میں یہ نیا دھان سونے کے ٹکڑے بن جائیں گے۔ خالی ڈھنڈار خزانہ بھی دولت سے مالا مال ہو جائے گا.... کروٹ لیتے میں اس کی گردن ڈھلک کر شیلا کے سینے پر ٹک گئی۔

آنکھ کھلی تو شیلا کی ناچتی ہوئی سیٹی کان میں گونجی۔ وہ آئینے پر جھکا ہوا اپنی نیند سے گال کھرچ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سچے نیلم کے ٹکڑوں کی طرح جگمگا رہی تھیں اور شبنم کو وہ کانچ کی نیلی گولیاں یاد آ گئیں جنھیں بچپن میں اس نے لڑکن کے ساتھ مل کر کیاریوں میں بو دیا تھا۔ وہ یک دم مسکرا پڑی

شبنم کو زور سے ہنسی آ گئی۔ ہائیں! اتنی بے وقوف کیوں ہوتی ہیں سب کی سب ایک ہی جیسی لیکن ٹھیک بھی کہتی ہیں کتنے دن ہو گئے شبنم نے شیلا کے کپڑوں کی مرمت نہیں کی۔ بٹن ٹوٹ گئے ہیں کالر گھس گئے ہیں۔ موزوں کی پچاس جوڑیاں ہوں گی مگر سب کی ایڑیاں اور پنجے غائب دیر تک بیٹھی وہ کپڑوں سے کھیلتی رہی۔

چاہتی تھی کہ کسی طرح کام سے گلو خلاصی ہو جائے۔ پروفیسر سے ہی جھگڑا ہو جائے کہ اس بہانے مصیبت سے جان چھوٹے۔ اب اسے بڑی تھکن ہو جاتی تھی اور موسم بھی ناگوار ہوتا جا رہا تھا۔ ہفتے میں دو کے بجائے تین دفعہ جانا پڑا کیونکہ ملیریا کی وجہ سے مددگار روں ہیں اور کمی آ گئی تھی اور کام بھی کیا گویا بند رسد جانے پڑ رہے ہیں۔ اسکول میں ہمیشہ وہ اعلیٰ جماعتوں کو پڑھایا

کرتی تھی۔ بدتمیز چھوٹے بچے اُسے کبھی نہ کھلتے بڑے لیکن ان عورتوں کو قطار میں کھڑا رہنا سکھانے سے تو بکریوں کو پڑھانا آسان تھا۔ کھوپڑیاں ہی نہ تھیں بس ساری توجہ ہمٹ کر دسان کے دانے سمیٹنے کی طرف لگی ہوتی تھیں۔ خیر دو چار دن کی بات ہوتی تو کچھ نہ تھا۔ مگر یہاں تو مہینوں کا سلسلہ تھا۔

بے وقت کے مہمان سب ہی کو کھلتے ہیں مگر بڑے نیسر کو آتا دیکھ کر تو جی ہی لوٹ گیا۔ کم بخت بھوکا تو آیا ہی ہوگا۔ چائے پر وہ وقت کے کھانے کا انتظام کرنے کا۔ بجز خوش آمدید کہنا پڑا۔

”نہیں چائے پینے کی فرصت نہیں“ شیلا رہ گئی تھی اُسے بھی آج ایک سو چیا بخار چڑھ آیا۔ عورتوں کا معاملہ ہے ورنہ ویسے تو کام چل رہا ہے“۔

وہ کچھ مجبور اور شرمندہ سا ہاتھ ملتے ہوئے بولا ”ایک تم مسلمان ہو جو اس کام میں دلچسپی لے رہی ہو۔ سُنا ہے پردہ چھوڑ دیا ہے مسلمانوں نے بھی مگر شاید صرف جلسوں پارٹیوں کے لیے چھوڑا ہے“

”مگر جب لڑکیاں موجود ہیں تو پھر ہندو مسلم کا سوال کیوں اٹھاتے ہیں“۔

”یونہیں ..... کوتاہ نظر ہوں۔ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہوئے کبھی کبھی خیال آجاتا ہے کہ ..... خیر تم تو آؤ گی؟“

”کیا خیال آجاتا ہے؟ کیا اب اشننگ میں بھی پاکستان قائم کرنے کا ارادہ ہے“ اس نے سوئی چبھو ہی دی۔

”پھر بحث!“

”بات نہ ٹالیے یہ آپ کو کون سے لینن یا اسٹالن نے بتایا ہے کہ حصے بخرے کر دیے گئے تو ساری بلائیں دور ہو جائیں گی“۔

”مگر .....“

”ہندو مسلم فساد نہیں ہوتے تو تم لوگوں نے یہ چال چلی۔

”تم سمجھتی ہو کہ پاکستان دے دیا تو ہندو مسلم فساد ہوں گے..... میری بات بھی تو سنو۔ کون دے رہا ہے پاکستان ہے کس کے پاس کچھ دینے کو“

”آپ ہی لوگ تو رہے ہیں“۔

"جی ہاں ہماری جیب میں رکھا ہوا ہے پاکستان کہ مانگنے کوئی اور ہم دے دیں۔"
"مگر آپ ان کے مطالبے تو مانتے ہیں۔"
"ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے اگر انسانوں کا ایک گروہ کسی خاص قسم کی حکومت پسند کرتا ہے تو ہمیں کیا حق کہ انکار کریں ہمیں ان کے بہت سے مطالبات سے اختلاف ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ سرے سے پاکستان کا مطالبہ ہی ماننے سے انکار کر دیں ہم فیصلہ کرنے والے کون؟"
"مگر مذہبی ڈھونگ رچا کر ......"
"کہہ تو دیا اختلاف ضرور ہیں۔ ان کا فیصلہ ہو جائے گا۔ ابھی تو صرف پاکستان کا مسئلہ پیش ہے"
"اور اگر سکھستان عیسائیستان اور یدھستان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔"
"تو اس پر بھی غور کیا جائے گا کسی مسئلہ پر خواہ وہ کیسا ہی فضول ہو غور نہ کرنا ....."
"مگر مقصد کیا ہے اس طرح کی تضیع اوقات سے۔"
"مقصد صرف ایک ہے۔ اتحاد۔"
"ہُنہ کس قدر گھسا ہوا لفظ ہے کانوں کو بھی متاثر نہیں کرتا۔"
"ہاں گھسا تو بہت گیا ہے مگر ٹوٹا نہیں گیا۔ ابھی شیشے کا دھندلا سا ٹکڑا ہے مگر میں نے کہا تو کہہ کر لیا بحث۔"
"یہ خوب ہے آپ تو دلائل سے گھبراتے ہیں۔ انسان کی قوتِ متخیلہ کو مفلوج کیے دیتے ہیں۔"
"اب میں کیسے ہر منکر کو دلائل سے قائل کرتا پھروں تم ہی سوچو اگر دو چار بھی تم جیسے ضدی پلے پڑ جائیں تو ایک زندگی تو ان ہی کو قائل کرتے کرتے گزر جائے خیر یہ بھی کر لیتے مگر ذرا دیکھو تو کیسی افراتفری پڑ رہی ہے جو بنگال میں ہو گیا کیا چاہتی ہو یہاں بھی ہو جانے دیں۔ مجھے تمہاری ضد کی ضرورت نہ ہوتی تو بھلا اپنا قیمتی وقت یوں برباد کرتا خیر اگر تمہیں فرصت نہیں تو ......"
"جائیے تو پیچھے زیادہ دیر نہ لگے گی" اُس نے جائے بناتے ہوئے کہا۔
"اب دیکھو اگر مجھے اتحاد منظور نہ ہوتا تو تمہیں اتنی خوشامدیں کر دلانے کی ہمت نہ ہوتی جائے کے گھونٹ لے کر پر دفیسر مسکرایا۔ کسی قیمت پر بھی ہم ملاپ کرا کر رہیں گے گو ایسا کرنا آسان نہیں دونوں ہی طرف سے جوتے پڑ رہے ہیں مگر تم دیکھنا ہماری ڈھٹائی کو" وہ زور سے ہنسا۔

"اچھا اب چلیے..... تو ذرا جلدی آنا صبح ....." بغیر کچھ کھائے پیے وہ تیز قدم اٹھاتا باہر
نکل گیا۔ شمن نے دیکھا کہ اس کے بال پھر گدّی پر شاعروں کی طرح بڑھ آئے تھے اور کپڑے میلے تھے۔ یہ
شمن کو ڈانس پارٹیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور ٹیلر بھی یہی کہتا تھا یہ نہیں دل سے یہ مجبوراً
وہ عموماً کترا جاتا۔ مگر یہ پارٹی افسروں کی طرف سے تھی اور اسے کامیاب بنانے کی ذمہ داری بھی
انھیں کے سر تھی۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے شمن کو بخار بھی آ گیا اور یوں کا جھگڑا تو یوں حل ہو گیا۔ پچھلے
کچھ دنوں سے صحت ویسے ہی خواہ مخواہ گرتی جا رہی تھی اور ویسے یہ بخار اور پھر ٹیلر کی لاپروا مصروفیت
پروفیسر بھی غرض سے آتا تھا جب سے بخار آیا وہ رسم پوری کرنے کو ایک دو منٹ کے لیے آتا اور
بھاگ جاتا۔ شاید دوسری لڑکیاں بھی اور نصیحت ہو رہی تھیں اور شمن کی اتنی ضرورت نہ رہی تھی۔
پڑی ہوئی بیٹھی تھی۔ آگے ہی دو طشتریاں اور ایک پیالی پھینک چکی تھی کہ ٹیلر چاق
چوبند ٹائی اتارتا زور زور سے سر کھجاتا آن پہنچا۔
"اوہو بڑے تر مال اڑا رہی ہو" اس نے مسکرا کر کہا اور شمن کا جی چاہا کستی اس کی کھوپڑی
پر کھینچ مارے۔ صبح سے ایک نوالہ حلق سے نہیں اترا اور یہ سمجھ رہا ہے وہ دن بھر چرا ہی کرتی ہے۔
"ممی کا خط پڑھا؟ پاگل ہو گئی ہیں" وہ شرمائے ہوئے انداز سے مسکرایا۔ "بے کار کی
چیں چیں نہ جانے ان عورتوں کو کیا اچھی لگتی ہے۔ بہت فضول" مگر شمن نے خط نہیں اٹھایا
خاموش چائے میں چمچہ چلاتی رہی۔ نہ جانے کیا بک رہا ہے۔
"بے کار کا جنجال ۔۔۔ جی گھبراتا ہے میرا بچوں سے"
"ہنہ، ایک حماقت ہو گئی اب دوسری....."
"ایں؟" وہ کچھ کھسیا کر چونکا
"اور کیا جو ہم نے بویا ہے ہم ہی بھگتیں اور بے گناہوں کے ماتھے پر سیاہ دھبہ کیوں تھوپ جائیں"
"ممی... ان کی خواہش ہے....." کچھ کہتے کہتے رک گیا شدت احساس سے کان سرخ ہو گئے۔
"ممی بچہ تو نہیں جو سمجھ نہ جائیں وہ خود خلاف ہوں گی"
"کون ممی..... اے توبہ کرو دیوانی ہیں وہ بچوں کی..... تمام ادھر ادھر کے بچوں کو جمع کرتی رہتی ہیں"
"تو اب بھی ادھر ادھر کے بچے موجود ہیں شوق سے کھلائیں"

"ہوں" وہ چپ ہو گیا۔

"آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ ہنہ" اس نے انتہائی ریاکاری سے کہا اور خون پھر ٹیلر کے کانوں کی طرف دوڑا

"ہم نے سخت غلطی کی" ٹیلر بجھی ہوئی آواز میں بولا۔

"حد سے زیادہ بڑی حماقت"

"کیسے بھگتی جائے گی یہ دوزخ"

"کیا ضرورت ہے کہ بھگتی ہی جائے۔ اگر زہر کھا لیا جائے تو قصے کیوں نہ کر دی جائے"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ کہ دو زندگیوں کو قبر میں جھونکنے سے بہتر ہے تم اپنا منہ اُدھر کر لو ہم اپنا منہ اِدھر کر لیں"

"کسی ہندوستانی سے کہتیں تو وہ مزہ چکھا دیتا اس وقت" ٹیلر نے دانت پیس کر کہا۔

"شاید"

"اور پھر تمہیں اعتراض بھی نہ ہوتا"

"شاید"

"کس قدر نیچ ہو تم" اس کے منہ میں جھاگ آگیا۔ "ذبح کر ڈالنا چاہیے اس قسم کی حیوان عورتوں کو اف...... مجھے تم سے کتنی نفرت ہے"

"ہنہ۔ اور جیسے میں تمہارے عشق میں دیوانی ہی ہوں"

"تم...... تم میو اسے بھی بدتر کسی خبیث طبقے سے ہو...... کاش ایک بار کوئی تمہارا گلا گھونٹ کر مجھے آزاد کر دے"

"اور تمہیں کیوں نہ مسل ڈالے جو جونک بن کر سارے ملک کا خون چوس رہے ہو۔ ذرا اپنی ماں بہنوں کو تو دیکھو...... بدمعاش زمانے بھر کی"

"چپ کم بخت...... گلاب کے پھولوں کو چھوڑ کر میں نے تھوہر سے ناتا جوڑا......"

"اور تم...... بڑے حسن کے پتلے ہو۔ کوڑھ جیسی رنگت۔ سڑے ہوئے دانت۔ بندر کہیں کے"

"تو پھر کسی بھیل چمار سے جا لپٹو۔ ایسی ہی باحیا ہو تو نکل جاؤ یہاں سے"

"بھیل چمار تم سے لاکھ درجہ بہتر ہے ٹامی کہیں کے" وہ اٹھ کر چلنے لگی۔

مذاق مذاق میں شمن بتا چکی تھی کہ نامی ہم ہندوستانی اس سفید ناجائز اولاد کو کہتے ہیں جو فوج میں بھرتی ہو کے توپوں کے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ شیلا اس کے منہ سے اتنی سخت گالی سن کر کانپ اٹھا تھوڑی دیر وہ ساکت بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کی رنگت سفید پڑ گئی جیسے کسی نے پچکاری سے خون کھینچ لیا ہو۔ شمن نے جلدی سے کمرے میں جا کر دروازے بند کر لیے۔ وہ چیخ چیخ کر گالیاں بکتا رہا۔ شمن نے اسے کبھی اتنا غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل پاگل معلوم ہوتا تھا جیسے ضبط کی لگام ٹوٹ کر غصہ دماغ پر پھٹ پڑا ہو۔ شمن پیر لٹکائے پلنگ پر بیٹھی تھر تھر کانپا کی! اتنی بات بڑھ گئی۔ نوبت یہاں تک پہونچ گئی۔

رات بھر شیلا کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی وہ زخمی چیتے کی طرح تیز تیز قدموں سے چلتا رہا۔ بار بار الماری کھول کر کچھ انڈیلنے کی آواز آئی مگر وہ بھی جلدی خاموش ہو گئی کیونکہ ایک بوتل آنے جانے والوں کے لیے رکھی تھی۔ عادتاً شیلا نہیں پیتا تھا۔

اور پھر سسکیوں کی آواز آئی جیسے کوئی دم گھونٹ کر رونا ضبط کر رہا ہو۔ شمن کا جی بلک گیا وہ رو رہا تھا۔ شیلا جیسا کٹھا قد آور جوان مرد ایک عورت کے مارے ہوئے ڈنکوں پر سسکیاں بھر رہا تھا اس کا جی چاہا جا کر..... مگر وہ لرز اٹھی۔ وہ نیلی کانچ کی گولیوں جیسی آنکھیں جن سے غصہ ٹپکا پڑ رہا تھا۔

دوسرے دن صبح ہی اٹھ کر نوکر نے بتایا کہ وہ اچانک سامان بندھوا کر دہلی روانہ ہو گیا کوئی ٹرنک کال بھی آئی تھی۔ شمن کا بخار بھی نہ اترا اور کمزوری حد سے زیادہ بڑھ گئی۔

پورا ہفتہ گذر گیا اور شیلا کا نہ ہی کوئی خط آیا، نہ خیر خبر۔ اس نے ادھر ادھر ٹیلی فون کر کے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی مگر پتہ نہ چل سکا وہ کسی اہم کام کے سلسلے میں گیا ہوگا جس میں شاید اندر کی کشمکش کا جھگڑا شامل ہوگا۔

دو ہفتے! اور شیلا کا نام و نشان نہیں۔ صرف سرکاری طور پر اس کی تنخواہ تو شمن کو مل گئی۔

ذرا سی چنگاری کو پھیلا پھیلا کر اس نے کتنا بڑا شعلہ بنا دیا کہ دم بھر میں سب کچھ پھک سے اڑ گیا۔ بس شیلا ایک بار واپس آ جائے پھر؟ پھر یہ تاریخ کبھی نہ دہرائی جائے گی وہ آ جائے پھر تو..... بن جائے گا سب کچھ بن جائے گا کھنڈر اتنے بوسیدہ نہیں ہو گئے کہ مرمت نہ ہو سکے۔ زیادہ نہیں بس ایک بار..... آخری بار..... آخری موقع! وہ نہ جانے کس سے

اور کیا مانگتی رہی۔ دن گذرتے گئے وہ کام پر بھی چلی جاتی مگر جی کھویا کھویا سا رہتا۔ اس نے ٹیلر کے سارے کپڑے نکلوا کر دھوپ دی۔ کمزوری باقی تھی اس لیے دور بیٹھی ہدایات دیتی رہی۔ برش خود کیا اور گولیاں ڈال کر بند کر دیے۔ دن میں کئی بار احساسِ تنہائی خوف بن کر چھایا اور وہ خاموش آنسو بہا گئی

اور دن گذر رہے! اس کا کوئی نہیں دنیا میں وہ سب کچھ کھو چکی ایک ایک کر کے سارے ڈورے زہریلے دانتوں سے کتر ڈالے مگر امید کا آخری تار سلامت تھا گو باریک تر ہوتا جاتا تھا کہ اب ٹیلر آئے گا اور اس کی نیند بالکل اچاٹ ہو گئی تھی سارا نظام ہی درہم برہم ہو گیا تھا۔ رات بھر یہی معلوم ہوتا ..... وہ مل گیا راستہ! ٹیلر کی موٹر آ گئی ..... وہ اترا ..... اب زینے پر چڑھ رہا ہے بیس سیڑھیاں طے کر چکا ..... اب دروازے پر کھڑا ہے مگر نہیں سارا اسباب گر کر معلوم ہونے لگتا نہیں بھلا اتنی جلدی موٹر سے کیسے اترا ہوگا منہ سے کہنا اور بات ہے عمل کے سرزد ہونے میں تو وقت لگتا ہے۔ وہ کھٹ سے اس نے موٹر کا دروازہ بند کیا ... اب .... چلا ... سیڑھیوں پر چڑھتا ہے جوتوں کی چاپ سنائی دے رہی ہے ..... مگر یہ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ ختم نہ ہو سکی۔ دس بار سیڑھیاں ہزار چاپ بھی بھی طے نہ ہو پائیں ..... اور پھر اسے معلوم ہوتا جیسے وہ پیر کی چاپ بھی تھی وہ نل کی بوندیں ٹپ میں گر رہی تھیں ٹپ ٹپ مسلسل اور یہ بوندیں انسانی قدموں کی طرح چلتی معلوم ہوتیں جھنجھلا کر وہ اٹھتی اور نل کو خوب مروڑ کر بند کر دیتی تاکہ گلا گھٹ جائے کم بخت کا ___ دماغی خلجان بڑھتا گیا کھانے کی میز پر ایک نوالہ بھی اس کے حلق سے نہ اترتا۔ زبان پر کائی لگ گئی تھی ہر چیز کڑوی بدمزہ لعاب دار اور پھپھوندی معلوم ہوتی۔ تھک گئی تھی وہ ان کھانوں سے، میز کرسی سے نرم نرم صوفوں سے جی چاہتا ایک بار ہی سب کچھ دور جھٹک کر کھڑی ہو جائے آخر تھا کیا ان الجھنوں میں؟ اس پھیکی کسیلی زندگی سے تو یقیناً موت زیادہ چٹپٹی ہوگی ___ شامی کباب کا چھوٹا سا ٹکڑا منہ میں سڑاندی غلاظت کا پہاڑ بن کر پھیل گیا۔ بیرے کی نظروں سے ابکائی بچاتی ہوئی وہ جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ یہ کباب ٹیلر کو کس قدر پسند تھے روکھے روکھے نگل جاتا تھا لیکن اب یہ نہ نگلیں گے جب تک ٹیلر نہ آ جائے ورنہ یونہی گلے میں ابکائی بن کر اٹکتے رہیں گے۔

یہ ذرا سی بات اتنی لمبی کیوں ہو گئی کتنی بار تو اسے ادھورا چھوڑ دیا گیا مگر پھر بھی قسمت میں اس کی تکمیل یوں لکھی تھی مانا کہ وہ ایک دوسرے سے اکتا چلے تھے مگر یہ کون سی نئی

بات ہے اور دو گی بھی تو رشتے بھرنے میں بگڑیوں زندگی کی روانی ٹھوکر کھا کر سنبھل نہیں گر پڑتی۔ ایک جھٹکا آجائے تو؟
تو... کتنا اُلٹا پھر ہوا تھا۔ اگر وہ اس سے معافی مانگ لے گی تو معافی تو کیا اگر وہ صرف ایک معمولی سے
اشارے سے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی تو شاید رشتہ ختم ہو جاتا اتنا غصیل تھا۔ پر جہاں آنسوؤں کی
جھلک دیکھی اور عورتوں کی آنکھیں چندھیائیں اُنکی معافیاں حصے میں آ گئیں ـــــ اور کیا حرج ہے جو ماں
کی بھی بات مان لی جائے۔ یہ سچ ہے تو ماں کی حس نے دور بیٹھے بیٹھے پھٹن دیا کر دہ مختلف طاقتوں کو کھینچ کر ملا دیا
تھ ہی اس کی اوقات یہ کہ وہ اس کی ننھی سی آرزو نہ پوری کر سکی خیر وقت اتنی دور نہیں بھاگا ہے اب بھی تلافی کی جا سکتی ہے
لیکن.... ایک بھیانک لیکن نے اس کے جمع ہوتے ہوئے خیالات کو بکھیرنا شروع کیا۔ مگر اری کا طوٹر
اُسے معلوم ہوا کہ شیلا ابھی پندرہ بیس دن نہ آسکے گا جی کڑا کر کے چاہا اُسے خط لکھے مگر یہ کم بخت قلم ٹوٹا
مجبور آلہ ہے اس کے پاس وہ طاقتیں کہاں جو ایک روٹھے کو منانے کے لیے استعمال کرنا پڑتی ہیں۔
پروفیسر کا فون آیا کہ فوراً آ جائیں تو نہ اٹھا تھا مگر کرنے کو کچھ نہ تھا لیے کار دن اونگھتے گذر جاتا تھا
سے کم نہ تھا راشننگ کے دفتر کی چھوٹی چھوٹی عمارت جھکڑی نظر آتی تھی چند بے بسی کی خبر دے رہے تھے اور کھوکھلے
پیٹوں کی آگ دھڑکا دی تھی بنگال کی بھوک بہت ہی رسیا رہی تھی لوگ اناج پر ٹوٹے پڑتے تھے بلا سہارا جیسے
مفقود ہو چکا تھا۔ انسانیت کو اپنی پیاس دیکھ کر بے جھنجھلا اٹھتا آخر اتنا کا مٹوؤں بھری زندگی تو جیا پائی کیوں تھی
آخر دوسرے ملکوں میں بھی تو بھوک ہے پر ننگی زندگی اور بے حیا نہیں اگر ذرا صبر سے مر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔
دھوپ تیز ہونے لگی مرجھائے ہوئے زرد چہرے تپ گئے جیسے پسینے سے ٹمک اٹھے میلے ہاتھوں پر پپڑی تو پھیلی
پھیل گئی آنکھیں زیادہ دھنس گئیں اور بے رونق ہو گئیں تھکی ہوئی ٹانگیں تھوڑی تپش کے بوجھ سے لرزنے لگیں مجمع ہنڈیا کی
طرح کھد بدا اٹھا تعفن کے بھبکے تمتمانے سے پیچھے کو گھٹنے لگے دھڑا دھڑ کھینچ کر اپنی تشویش بتا رہے تھے جیسے آسمان بیاندھی
گذر گئیں یوں یوں بڑبڑائیں موٹروں کی تہی کے کانوں میں گھسنے لگیں لڑکھڑا کر اس نے پان والے کی دوکان کا سہارا لیا
جوتا۔ سادہ بدبو... ہائیں... بھنیلی پیادی۔ پان والے نے جلدی جلدی کتھے چونے کا بھنڈولا
کو بچایا بھیڑ کے پیچھے تاش کی گڈیوں کی طرح بکھرے سمٹتے ہوا میں لہرائے پیڑ کے نیچے سے تھرتھلیاں کی
پلکوں سے لٹکتی ہوئی زمین کتاب کے ورق کی طرح پھڑ پھڑا کر منہ پر آن چپکی ..... اور کہیں
آگ بجھانے کا انجن ٹن ٹن کرتا خاموشی میں ڈوب گیا۔
جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک نئے کمرے میں پایا۔ گھومتا ہوا دماغ

پھر تو معلوم ہوا کہ وہ اسپتال میں ہے پاس ہی پروفیسر جھکا ہوا ہے ادھر تو ڈر رہا تھا دو تین اور ناواقف چہرے موجود تھے ——— "ایسی حالت میں باہر نہیں نکلنا چاہیئے" ڈاکٹر نے ربر کی نلکیوں والا آلہ تہ کرتے ہوئے کہا۔

"حالت؟ کیسی حالت؟ مگر تھا یہ ڈاکٹر اپنی کہنے میں جو مزہ پاتے ہیں وہ مریض کی سننے میں نہیں پاتے۔ ڈاکٹر نے لمبی چوڑی فہرست احتیاطوں اور دواؤں کی سنادی... دوائیں طاقت کی دوائیں!

اوہ ——— مارے حیرت کے وہ اٹھ بیٹھی وہ بچہ تو نہیں تھی مگر پریشانیوں میں وہ کتنا کچھ بھولی ہوئی تھی اس عظیم انکشاف نے جیسے بھاگتے بھاگتے اسے ایک دم پکڑ لیا پروفیسر کچھ خجل کچھ مجرم سا کھڑا تھا وہ اٹھی تو ایسے سہارا دینے دوڑا گویا وہ نازک کانچ کا گلاس ہے اور ٹھونک مارے سے ٹوٹ جائے گی۔ وہ ٹھیا کر تیز تیز چلتی باہر ٹیکسی میں آن بیٹھی۔

موٹر کی تیز ہوا نے اسے جگا دیا چونک کر اس نے پھریری لی اور ایک دم اس کا دماغ بھی موٹر کے ساتھ بھاگنے لگا۔ جی چاہا زور زور سے ہنسے یا پھر زور زور سے روئے مگر وہ ڈرائیور کی جھینپ گئی ——— "جلدی جلدی" اس نے ڈرائیور کو ٹوکا۔ بس نہ تھا جو وہ اپنے دل کی تیز دھڑکن موٹر کی طاقت میں شامل کر دیتی سچ اس کا جسم ایک دم ہلکا ہو کر اڑ جانے کو تڑپا جا رہا تھا بار بار آنکھوں میں ننھے ننھے آنسو چھلکے آ رہے تھے سامنے آئینے میں اس کی شکل کتنی مردہ زرد جڑی ہوئی نظر آئی مگر کچھ برا نہیں حسن اور بدصورتی یکساں ہو کر اس نئی چمک کے سامنے ماند پڑ چکے تھے بدصورت تھی تب بھی... تب بھی اس کا دل ایک دم کتنا حسین ہو رہا تھا وہاں فقط ایک ٹیڑھا سا خیال نکھار رہی... مدنی ٹیلر... کہاں ہو تم مجھ سے معافی مانگو... بے رحم کہیں کے... اس کا گلا گھٹ گیا۔

وہ ڈانٹ بتائے گی روتی کو۔ آنے دو تو ذرا۔ "ہائے بدنصیبی" کا سارا الزام اس پر تھوپے گی اور پھر روتی! اسے منا ہوں کیسے ہے کا کہ ارمان سے کے جگنی کا بھیا کا! خود غرض جشتی! بھلا گیا تھے دن کے لیے یہ بھی نہ سوچا کہ آج کل ہتھیاں دو میں کہاں ملتی ہیں بلکہ شیم انجکشن لانا جوئے تیسر لانے سے کم ہوگا۔ اور اس وقت یہ لا پڑا گی... مگر پھر اسے وقتی پر پیار آگیا اتنی دور ہو کر وہ کہیں بالکل ہی قریب تو تھا ——— اور ماں! جو بے وقوف پیاری سی ماں لکھا تھا "تم لوگ گھبرانا نہیں ادلی سامان میں سب خود تیار کرلوں گی" شبہ دیوانی پرسی پی ہائے ارمانوں کے مری جا رہی ہیں سمجھتی ہیں جیسے ان ہی میں تو ہے ہی بہت سلیقہ پالنے کا لاڈ میں بگاڑ کر ناس مار دیں گی روتی سے بھی بدتر ضدی اور منہ چڑھا بنا دیں گی اور پھر بڑی بی بی دم کہاں ہوگا جو رات برات ہوا لگ جانے ——— کہتی ہیں آئیں گی۔ مگر یہ بدنصیب جنگ بھی دم دے جبھی تو جینے کی فرصت ملے

جب ہی تو نہ جانے کتنے بچوں کی ماں باپ ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ وہ سوچتی رہی۔ اس خون میں لتھڑی ہوئی دنیا کا خیال کر کے جی دہل گیا۔ کاش یہ جنگ جب تک ختم ہو جاتی۔ خدا ہی کو اس قیامت سے دونوں جہان نے ... کون بچا ہوا ہے؟ اور کب نہ جانے کس وقت آگ برسنے لگے۔ پریشان ہو کر وہ اپنے لمبے چوڑے کنبے کو بچانے کی فکر میں پڑ گئی۔

ارے .... اور کوئی احتیاط نہیں کرتا۔ روشنیاں دھڑا دھڑ جلنے لگی ہیں۔ شیشوں پر سے کاغذ اتر گئے تہ خانہ قبر بنا پڑا ہے۔ مانا کہ خطرہ قریب نہیں مگر چیل جھپٹا مارنے سے پہلے نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔

او نہ، کیا معلوم تھا کہ کوئی دم میں بمباری ہونے والی ہے۔ سٹور میں بھی تو کچھ نہیں۔ سنو! کسی کے پاس تمباکو نہ ملا تو وہ سر کھا جائے گا۔ پاگل آدمی ٹھہرا۔ ____ اور جو وہ روفی کو کچھ نہ بتائے تو؟ مزہ آ جائے۔ ایک دم مارے حیرت کے پاگل ہی تو ہو جائے گا۔ اور جب اسے معلوم ہو گیا تو جینا دوبھر کر دے گا۔ جان کھا لے گا: "یہ نہ کرو، وہ نہ کرو"۔ اسے ایک دم ہنسی آ گئی۔ کیسی اترائی ہوئی باتیں سوچنے لگی تھی۔ وہ بھلا آج کل ہم کہاں؟

مگر احاطے میں داخل ہو کر دھچی اس پر جھپٹ پڑا۔ ملٹری کی بھوری گاڑی برساتی میں کھڑی تھی۔ بے تاب ہو کر وہ بھاگی ..... روفی .... روفی .... ہانپتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ ساڑھی پیروں میں لپٹی اور وہ سہم کر رک گئی۔ ____ "روفی!" اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ دھکیل کر کھولا۔ "روفی!"

"گڈ ایوننگ میڈم!" ایک کلف لگے ہوئے فوجی نے سلام کیا۔

"روفی!" اس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔

"مسٹر ٹیلر بذریعہ ہوائی جہاز محاذ پر روانہ ہو گئے۔ یہ خط۔" اس نے ادب سے خط بڑھایا اور جلدی سے سلام جھاڑتا ہوا لوٹ گیا۔

ہاتھ میں خط لیے وہ ٹھیری ہوئی سوچنے کی کوشش کرنے لگی۔ ہوا میں ہوائی جہازوں کے ہزاروں لاکھوں پر ببر شیروں کی طرح غرّائے۔ چیختے چنگھاڑتے بم لاکھوں کی تعداد میں برس پڑے۔ جنگی گرج کانوں کو سُن کر گئی۔

"روفی..... روفی" اس کی بھٹکی ہوئی روح کراہتی ہوئی موہوم سے دھبے کے تعاقب میں دوڑ گئی۔

روفی سارے اختیارات سونپ کر جنگی محاذ پر روانہ ہو گیا تھا۔ وہ آزاد تھا جسم سے نکلی ہوئی روح کی طرح آزاد! لاوارث، دکھوئی ہوئی ____ "تم نہیں گئے روفی..... روفی یہ نہیں ہو سکتا۔ ظالم ایسا تم کہیں نہیں بھاگ کر جا سکتے" اس نے بڑے ثوق سے پکارا۔ گویا وہ اسے قید کر چکی ہو۔ "سنو روفی...." مگر وہ کسی کو نہ سنا سکی اور گھنگھور گھٹائیں زور شور سے گھر کر اُمڈ آئیں ____ "ٹھیرو ٹھیرو....!" اس نے

منہ زور طوفان کو لجاجت سے چمکارا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا بچے۔ اتنا زور نہ لگاؤ...... ورنہ یہ ننھی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔" "ہم تھک گئے ردنی!" اس نے گھٹتے ہوئے کلیجے کا زور لگا کر پکارا۔ مگر آہ بھی نہ نکلی اور پھر ایک ننھی جان نے اس کی پکار سن لی...... زندگی کی پہلی پھریری لہروں کی طرح تھر آتی اس کے جسم میں تیر گئی۔ ڈوبتی ہوئی طاقتیں تاریکیوں سے ابھرنے لگیں۔ تنی ہوئی رگیں آپ ہی لچک کر ڈھیلی پڑ گئیں...... آنکھوں کی وحشت آنسوؤں سے دھل کر بہہ نکلی۔ سسکیاں ہنسی کے فوارے بن گئیں۔ ادھم باری کا بھیانک احساس دور جھٹک کر وہ بوسیدہ ملبے کے ڈھیر کے نیچے سے رینگ آئی...... اکیلی؟

امریکہ میں بیٹھی ہوئی اُونی کپڑے بننے کی شوقین ماں ہوائی اژدہوں کے پروں پر موت کے ڈھانے کی طرف اُڑ تا رونی...... وہ خود...... اور...... اس کے اپنے وجود سے اس قدر قریب ایک ننھی جان! اتنی لمبی چوڑی برادری میں وہ اکیلی کہاں ہے۔ مانا کہ بہت دور ہیں وہ ایک دوسرے سے ہزاروں میل کا سفر حائل ہے مگر اس وقت اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی ساری دنیا سمٹ کر خود اس کی ہستی میں سما گئی۔ آج اسے کسی کی تنہائی میں بھی کتنی چہل پہل تھی اس بے سر و سامانی میں بھی کتنی سلجھی ہوئی سجاوٹ تھی! آج وہ کتنی متحیر مگر خوش تھی۔ اس سے قبل اس نے اپنے آپ کو اتنا کمزور...... اتنا بہادر، اتنا پریشان...... مگر اتنا مطمئن کبھی نہ محسوس کیا تھا۔ اور دنیا کتنی حسین ہو گئی! زندگی کتنی عزیز!

اور ردنی؟

اس کا جی مسل گیا۔ خالی ہاتھ، اکیلا ردنی! اس کی مفلسی پر اُسے ترس آ گیا جیسے کسی رئیس اعظم کو اپنے محل کی کھڑکی سے کسی قلاش فقیر کو ناداری کی سردی میں ٹھٹھرتا دیکھ کر رحم آنے لگے۔

"ٹھگ کہیں کی" اس نے نئی دولت سے مالا مال ہستی کو طعنہ دیا۔ ایک ہرجائی لٹیرے کو بھی لوٹ لیا!

نشیلے قدم اٹھاتی جیسے اس کے ٹخنوں پر نقرئی گھنگھروؤں کے گچھے آن بندھے ہوں وہ پلنگ کی طرف مڑی اور نہایت احتیاط سے اپنا تھکا ہوا سر تکیے پر ٹکا دیا۔

ختم شد